(نذرِ مقبول)

آصف جاہ اوّل طاب ثراہ

نے میر عبدالجلیل بلگرامی کی قدر افزائی و سرپرستی فرمائی تھی

اسلئے

میر مبرور کا یہ تذکرہ کمال نیاز و عقیدت اور انتہائے اخلاص و ارادت کے ساتھ

اعلیٰ حضرت

آصف جاہ سابع

تاجدار دولت آصفیہ دکن، خلد اللہ ملکہ و سلطانہ

کی بارگاہ اقدس و ہمایوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ کاش کہ شاہانہ توجہات و رافت کا وہ موجزن دریا جو فضل و کمال کی ترویج و ترقی کا ضامن ہو کر اپنے جود و سخا سے ایک عالم کو سیراب کر رہا ہے اور خسروانہ التفات و الطاف کا وہ گہر بار ابر جو علوم و فنون کے نشر و توزیع کا کفیل بنکر اپنے رشحات سے دنیائے علم و عمل کو فیضیاب بنا رہا ہے اس ناچیز علمی و ادبی سعی پر بھی کرم گستر و سایہ افگن ہو اور

مقبول بینوا کی یہ حقیر نذر مقبول

*

انجم بجنست فلک آوازہ باد — نام تو و نامۂ من تازہ باد

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩٢٨ Accession No. ٩٩٦٣

Author جلیل - م [illegible]

Title حیات جلیل

This book should be returned on or before the date last marked below.

وما دام ذکر العبد بالفضل باقیا فذالک حیٌ وھو فی الترب ھالک

تذکرۂ علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی

موسوم بہ

حیات جلیل

حصہ اوّل

متضمن حالات ذات و صفات علامۂ ممدوح

و حواشی و فوائد مشتمل بر ذکر مختلف بلاد و معارف و عمائد

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی

لیٹ ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ۔ و۔ فیلو رائل سوسائٹی آف آرٹس، مینوفیکچرس اینڈ کامرس، لندن وغیرہ

※

یادِ ماضی کے بہت نقش ابھی باقی ہیں — حافظہ دل کی طرح زود فراموش نہیں

فہرست عناوین و مضامین تذکرہ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ اول

فہرست حواشی و فوائد تحت المتن تذکرۂ میر عبد الجلیل بلگرامی حصۂ اول

ف

جدول بعض اغلاط طبع - حصہ اول

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۳	۴	۰	بَہَائیُّ	بَہَارِیُّ	۶۱	۶	۰	ہیں"	ہیں۔
۴	۳	۰	جبہ	جَبْہَہ	؍؍	۷	۰	گلزار ابرار	گلزار ابرار)
۶	۰	۱۵	۲ الخیطر نے)	۲ الخیطر نے	؍؍	۱۹	۰	مذکو الصدر	مذکور الصدر
۲۵	۰	۱۳	للوٗ	۲ لُوَ	۶۶	۱۷	۰	سبحانہٗ	سبحانہٗ
۲۶	۰	۵	مُوَلًّ	مُوَلّٰی	؍؍	۱۷	۰	شانہٗ	شانہٗ
۳۰	۰	۷	للالی	لآلی	۶۸	۰	۱	سفربت	غربت
۳۳	۴	۰	جلاوں	جلاوت	؍؍	۰	۵	کہلاہتا	کہلاتا تھا
۳۵	۰	۴	۲ الغاؤن	۲ الغاوٗت	۶۹	۰	۴	حین	نہیں
۳۸	۴	۰	سعادت خاں ۷۴۵	سعادت خاں ۷۴۵	؍؍	۰	۸	۱۵۲۶ء	۱۵۲۶ء)
۴۳	۰	۱	عِمادؔ	عِمادُ	۷۱	۰	۹	ضیاد پاشا	ضیاء پاشا
۵۳	۸	۰	در بیدہ دری	دیدہ دری	۷۹	۲	۶	لم یکین	لم یکین
۵۶	۱۶	۰	نسخۂ سُرد	نسخۂ سرد	؍؍	۵	۰	استحفاظ	استخفاظ
۵۷	۱	۰	نقل	سے نقل	۸۷	۰	۴	لہٗ	لہٗ
۵۸	۲	۰	بشب	بشپ	۹۷	۰	۱۳	نقرۃ	نقرۃٌ

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	غلط	صحیح
۱۰۱	۸	۰	الانبیاءِ	الانبیاءُ	۲۱۲	۰	۳	فجمعۂ	فجمعہٗ
۱۰۱	۹	۰	فکذبتُ	فکذّبتَ	۲۲۵	۹	۰	تہیاء	تہیۂ
؍	۱۶		یحفضون	یُخفِضُونَ					
۱۱۲	۳	۰	مولانا	مولانا ۹۵۷ھ	؍	۱۵	۰	انجاوم	انجام
۱۱۶	۱	۰	وَأُصُرُّ	وَأُصُدُّ ۹۳ھ	۲۴۸	۱۱	۰	تہیار	تہیۂ
۱۶۴	۰	۱	بانکے پور	بانکی پور	۲۴۹	۳	۰	سنہ ۱۱۱۶ء	سنہ ۱۱۱۶ھ
۱۸۶	۲۱	۰	اعما	إنّمَا	۲۵۱	۰	۳	بنیں	تبیں
۱۹۷	۰	۹	افضلُ	افضلَ	۲۶۴	۴	۰	فضل کمال	فضل و کمال
۲۰۶	۰	۲۲	حنیفۃ	حنیفہ	۲۷۱	۰	۳	تفصیل	تفضیل
۲۱۱	۰	۹	بعض،،	بعض مثل فتاویٰ سراجیہ	۲۷۳	۲	۰	ضعفۂ	ضعفہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربنا لک الحمد

یا ازلی القیام ، یا ابدی البقا ، انت اجیل الغضب انت عجیل الرضا
عشق ترا جان فزا ، شوق ترا دل ربا ، ذکر ترا قوت روح ، نام ترا غم زدا
راہ تقرب مین تھا نفس شقی اژدہا ، جادۂ تسلیم کو ، تو نے بنایا عصا
ہوش کا جب کاروان ، تیری طلب مین چلا ، نعرۂ ہو بن گیا ، شوق کو بانگ درا
مکتب عرفان ترا ، درس گہہ انبیا ، شرح حقیقت تری ، درس حروف ہجا
راہ مین تیری جو ہون صدق و یقین گام زن ، دیدۂ حورا بنے ، حسن مین ہر نقش پا
علت خلق حدوث ، اس کے سوا کچھ نہین ، حسن قدم کے لئے آئنہ ہو ، ماسوا
تیرے حرم کا غبار ، تیرے مکان کا سواد ، غازۂ روے یقین ، سرمۂ چشم صفا
روز ازل کی خبر ، اور کسے جز ترے ، اپنی قدامت پہ تو ، آپ ہے اپنا گوا
پھول مین گلزار ہے ، پھول ہے گلزار مین ، وحدت کثرت نما ، کثرت وحدت نما
تیرا ازل ہے ابد ، تیرا ابد ہے ازل ، کس کو کہون ابتدا ، کس کو کہون انتہا

۱؎ ازل ہمیشگی ۔ وہ زمانہ جس کی ابتدا نہین ۔ ۲؎ ابد ہمیشہ ۔ وہ زمانہ جسکی غایت وانتہا نہین ۳؎ اجیل ۔ دیر کرنے والا ۴؎ عجیل جلدی کرنے والا ۵؎ اژدہا ۔ اژدر ۔ مار بزرگ جثہ ۶؎ حروف ہجا ۔ الف ، بے ، تے ، تے وغیرہ سے مراد ہے ۷؎ حورا ۔ خوب گوری عورت جسکی آنکھون کی سیاہی نہایت گہری اور بال خوب کالے ہون ۸؎ حدوث نئے نئے واقعات اور چیزون کا پیدا ہونا ۔ مخلوقات کی صفت ہے ۔

بادۂ روزِ الست[ف۱]، اس میں ضیا بار ہو — جامِ شرابِ کُہن، ہے یہ دلِ مبتلا

ساحتِ[ف۲] عرفان ترا، ہُو کا عجب ہے مقام — ہوش اسی جا نہیں، فہم و خرد کے بجا

پردہ بھی تیری صفت، آنکھ نے دیکھا نہ کچھ — جب یہ حجاب اُٹھ گیا، ذات ہوئی رُونما

جاؤں کدھر ڈھونڈھنے، پاؤں کہاں ترا مثل — تجھسا ملے بھی اگر، تو ہی ہو، وہ دوسرا

جل کے فنا ہو گئے، سب خس و خارِ ہوس — تیری تپِ عشق جب دل میں ہوئی شعلہ زا

پردۂ زنبور ہے، تیری نقاب جمال — تیرا خفا ہے عیاں، تیرا عیاں ہی خفا

آنکھ میں بھی تو مکیں، دل میں بھی تو جا گزیں — وہ ترا خلوت کدہ، یہ تری خلوت سرا

آبِ بقا کا اثر، تیری تفِ[ف۳] غم میں ہے — یہ مرض لا دوا، آپ ہے اپنی دوا

ہے تو ہی اے لایزال! وجہ قیام زوال — تجھسے عدم کو دوام، تجھسے فنا کو بقا

ساغرِ جمشید میں، ایک جہان کی نمود — بادۂ عرفان سے آنکھ، جامِ دو عالم نما

دونوں جہان بھی نہیں، ایسے لہو کی دیت[ف۴] — خون ہے وہ بے بہا، جس کی بہا تو ہوا

یوں تہِ شمشیرِ عشق، حوصلہ میرا بڑھے — شوق ہر اک ضرب پر مجھسے کہے "مرحبا"

خاک میں جو مل گیا، تیرے لئے ہو کے خاک — وہ ہی ہوا کیمیا، ورنہ کہاں کیمیا

قابلِ بابِ قبول، کیوں نہ ہو میری نماز — عشق کا میں مقتدی، عشق مرا مقتدی

میری تمنّا کہاں، اور نکلنا کہاں — کاش نکلے بجائے تو، دل کا مرے مدّعا

نشترِ غم فضول، فصدِ رگِ جان عبث — رُوح کا دمساز ہے، عشق کا ماخولیا[ف۵]

مرنے سے پہلے مروں، تاکہ ہمیشہ جیوں — میری بقا ہو فنا، میری فنا ہو بقا

بہرِ رسولِ جلیل، کر یہ دعا مستجاب — سہل ہو مقبول پر، سختی روزِ جزا

ف۱ آیۂ کریمہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی کی طرف اشارہ ہے۔ اَلَسْتُ۔ لفظی معنی "کیا نہیں ہوں"۔ ف۲ ساحت۔ کشادگی، فضائے مکان و ناحیہ۔ ف۳ تف۔ بخار و گرمی۔ ف۴ دیت۔ خون بہا۔ ف۵ ماخولیا۔ مالیخولیا کا مخفف یونانی لفظ، خلط سیاہ کے معنی میں ہے۔ ایک دماغی مرض جو سوداویت سے پیدا ہو جاتا اور بہت زیادہ فکر اور سوچنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ایسا دیوانہ کسی کو اذیت و تکلیف نہیں دیتا۔

تیرے کرم کا وفور، عدل پہ غالب رہے ۔۔۔ خلعتِ بخشش ملے، اسکو بجائے سزا

وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِکَ الْمَقْبُوْلِ

یَا اَشْرَفَ الْاَتْقِیَا، یَا اَخَصَّ الْاَوْلِیَا ۔۔۔ قَلْبُکَ عَیْنُ الْجِلَا، نَفْسُکَ اَصْلُ الصَّفَا

اَنْتَ جَمِیْلُ الشِّیَمِ، اَنْتَ بَرِیُّ الْخَطَا ۔۔۔ اَنْتَ شَفِیْعُ الْاُمَمِ، اَنْتَ نَبِیُّ الْوَرٰی

جانتے تھے انبیا، اپنا تجھے مقتدا ۔۔۔ مسجد اقصےٰ میں کی، سب نے تری اقتدا

ناسخ ہر یک کتاب، ماحیٔ کفر و شقاق ۔۔۔ برزخ کبرےٰ لقب [۱۳]، رحمتِ حق مصطفٰے

صاحب فہم و فطن، واقف سِرّ و علن ۔۔۔ عالم علم لدن [۱۴]، محرم راز خدا

خواجۂ گردوں مسیر، مہبط روح القدس ۔۔۔ قُدسیٔ انساں سرشت، باقیٔ فانی نما

دادرس بیکساں، ناصر واماندگاں ۔۔۔ چارہ گر عاصیاں، شافع روز جزا

ماہ سپہر جلال، نیّر اوج کمال ۔۔۔ لعل بدخشان مجد، گوہر بحر علےٰ

مجمع رحم و کرم، مظہر لطف اتم ۔۔۔ منبع دریائے فیض، مصدر جود و عطا

نقش کف پا ترا، شمع رہ راستی ۔۔۔ عارض انور ترا، آئینۂ حق نما

تیری مطہر نگاہ، موجۂ آب طہور ۔۔۔ دیدۂ حق بیں ترا، چشمۂ عین الصفا

شمسۂ ایواں ترا، مہر مبیں کے مثال ۔۔۔ چرخ بریں کا جواب، گنبد خضرا ترا

تیرا وہ چرخ جلال، جس میں کہ بے قیل و قال ۔۔۔ کرمک شب تاب ماہ، انجم و نیّر ہبا [۱۵]

کس کی رہین وجود، ہے یہ جہاں کی نمود ۔۔۔ باعث ایجاد و خلق [۱۶]، کون ہے تیرے سوا

نور سے کس کے بجھا، نار عجم کا چراغ ۔۔۔ جز تری شمع جمال، کس میں تھی اتنی ضیا

ف ۱۳ برزخ کبرٰی۔ خالق و مخلوق کے مابین وسیلہ و ذریعہ۔ دراصل برزخ وہ چیز ہے جو دو متخالف و متغائر چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ ف ۱۴ علم لدن۔ جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے کرم و فضل سے بلا سعی و کوشش کسی کو عطا کر دے یا بغیر دوسرے سے تعلیم پانے کے ذہن و طبیعت سے خود بخود حاصل ہو جائے ف ۱۵ ہبا غبار ناچیز وہ گرد و ہوا، جو روشنی میں روزن در سے آجاتی ہے ف ۱۶ ایجاد خلق کا باعث۔ حدیث قدسی لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ کی طرف اشارہ ہے۔

وہ ہے ترا اسمِ پاک، اے شہِ عالی نژاد! — سُن کے مَلک بھی جسے، کہتے ہیں صلِّ علیٰ
قامتِ عُزّٰے[17] جلا، نارِ غضب سے تری — تیشۂ لا[18] سے ترے، لات کا نقشہ مٹا
ہو کے مُجلّٰی بنی، مہر، اُسی کی جبین — جو تری دہلیز پر، جا کے ہوا جبہ سا
جب بھی تھا چاروں طرف نور ترا ضو فگن — عالمِ لاہوت[19] بھی، تجھ سے نہ خالی رہا
دو سببوں سے نہ تھا جسم میں سایہ ترے — تو ہی تھا نورِ خدا، تو ہی تھا ظلِّ خدا
اُس کی صفائی پہ ہو کیوں نہ طہارت گواہ — رِجس سے قرآن میں پاک، جس کو کرے اِنَّما ف۲
لیکے تجھے چرخ پر، آن میں پہونچا بُراق — صلِّ علیٰ شہسوار، صلِّ علیٰ بادپا
تجکو جو تھا دیکھنا، دیکھ لیا تو نے خوب — تیرے لئے کر دیا، شوق نے کشفِ غطا
ہاتھ رہا کام میں، قلب رہا دوست میں — جنگ کا میدان بھی، تجکو تھا غارِ حرا
بخششِ حاتم کہاں، تیری سخاوت کہاں — اُس نے دیا سیم و زر، تو نے کی جنّت عطا
بذل جو بخشے ترا، بخل کو تاثیرِ جود — دستِ ردِ شوم سے، دم میں ہو مطلب روا
غیب میں آیا نظر، تجکو جمالِ شہود[20] — سُرمۂ مازاغ نے، آنکھ کو وہ دی جلا
تجھ پہ درود و صلوٰۃ، آل پہ تیری سلام — ہے یہ وظیفہ مدام، خاطرِ ف۳ مقبول کا
ناوکِ غم کا ترے، زخم نہ ہو جس کے دل — آنکھ رہے خونچکاں، دل رہے درد آشنا
فردِ عمل ہے سیاہ، پاس نہیں زادِ راہ — تیری شفاعت کا ہے، اُس کو فقط آسرا

[17] عرب کا مشہور معبود۔ ایک درخت تھا جس کی پوجا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے حکم سے خالد بن ولید نے اسکو جلا دیا تھا۔ [18] تیشۂ لا سے مُراد، کلمۂ توحید کے لائے نافیہ سے ہے۔ لات بھی کعبہ کا ایک بُت تھا۔ جس کی پرستش شعیب علیہ السلام کی قوم کرتی تھی۔ [19] لاہوت۔ ذات الٰہی کا عالم۔ سالک کو یہاں پہونچکر فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ 'لاہوت' اصل میں "لاہو الاہو" تھا تا زائد ہے۔ ف۲ آیۂ تطہیر کی طرف اشارہ ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا۔ [20] جمالِ شہود، اہل سلوک کی اصطلاح میں 'رؤیتِ حق' کو کہتے ہیں کہ مراتب کثرات اور موہومات صوری کو عبور کرکے سالک توحید عیانی کے مقام پر پہونچ جاتا ہے اور تمامی موجودات (کی صورتوں) میں مشاہدۂ حق کرنے لگتا ہے۔ غیریت دور ہو جاتی ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے جلوۂ حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ف۳ اضافت توضیحی ہے۔

مقدمہ

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد ومن البلاء تفردی بالسؤدد

علامہ محمد بن احمد نے جب ۵۰۵ھ (۱۱۱۱ء) میں نظامیہ بغداد کی مسندِ درس پر قدم رکھا تو یہ شعر اُن کی زبان پر تھا اور حسرت و عبرت کے آنسو اُن کی آنکھوں میں۔ اُن کو

ا؎ یہ شعر عمرو بن نعمان بیاضی مشہور خزرجی شاعر کا ہے جس نے پردرد داستان پاستان نظم کی اور اپنے خونِ جگر سے اپنی قوم اور اپنے اسلاف کا مرثیہ لکھا ہے:-

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد ومن العناء تفردی بالسؤدد

این الذین عهدتهم فی غبطة بین العقیق الی بقیع الغرقد

العناء- رنج اُٹھانا۔ شاق گذرنا۔ بقیع الغرقد- مدینہ میں انصار کا گورستان ہے جو نخلستان کو صاف کرکے میدان بنایا اور مرنے والوں سے آباد کیا گیا تھا۔

۲؎ ابو المظفر محمد بن ابی العباس الکوفنی الابیوردی- پردادا کا وطن کوفن تھا جو نسار اور ابی ورد کے مابین ایک قصبہ ہے، وہاں سے ابیورد چلے آئے تھے، اسی تعلق سے خاندان 'ابیوردی' کہلاتا ہے۔ ان کو اپنے نسب اور عالی خاندان ہونے پر بڑی نازش و مباہات تھی۔ مورخین میں سے منوچہر بن اسفرسیان بن منوچہر اور ابوزکریا یحیی بن عبدالوہاب بن مندہ (صاحب تاریخ اصفہان) نے ان کے نسب نامہ کی بعض کڑیاں مختلف طور پر بیان کی ہیں، محمد بن احمد ابیورد سے بغداد چلے آئے تھے وہاں سے ہمدان گئے مصر و اصفہان بھی رہے تھے، ابوسعد سمعانی لکھتے ہیں کہ ابیوردی بغداد میں بیس سال رہے تھے اور وہیں اُن کو عربی زبان اور ادب پر عبور و تمرّن ہو گیا تھا اور لکنت بھی دور ہو گئی تھی۔

اِن کو اکثر ملوک خراسان اور اُمرا و وزرا ملکہ خلفائے عراق کے حضور میں رسوخ حاصل تھا۔ موید الملک فرزند نظام الملک اور سیف الدولہ انکی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے خود ابیوردی نے ہمیشہ نہایت شان و شوکت اور اہتمام و احتشام سے بسر کی چلتے تو حوالی و موالی، خدم و حشم، سوار و پیادہ جلو میں ہوتے، ہر شخص ھو کلا نا کنگر

شکایت تھی کہ "دنیا بڑوں سے خالی ہوگئی اور بڑا بن جانے کے لیے تنہا وہی باقی رہ گئے جو بجائے خود ایک بلا یعنی ایک بہت بڑی بدنصیبی و شامت ہے۔"

خطاب کرتا تھا، سرکاری خطاب افضل الدولہ تھا۔ عسرت و تنگی کی حالت میں بھی بقول اہل سیر مہیب محترم و جلیل المعظم رہے۔ باوجود احتیاج شدید و ضیق معاش قطعاً کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ اُن کی زبان پر ہر وقت یہ دعا رہتی تھی، اللّٰھم ملکنی مشارق الارض و مغاربھا۔ ایک بار شکستہ حالی میں اصفہان پہونچے تو وہاں بھی ایک شریف پیشہ اور معزز مشغلہ اختیار کیا، یعنی زین الملک برسق کے لڑکوں کو تعلیم دیتے رہے۔ تاج الاسلام اُن کو اوحد عصر، فرید دہر، معرفت لغت و انساب میں یکتا، حسن السیرت جمیل الامر منظرأ سنیاً عن الرجال (بلند تراز مرداں) لکھتا ہے۔ عماد اصبہانی "عفیف الذیل، غیر طفیف الکیل، صائم النہار، قائم اللیل، متبحر ادب، خبیر بعلم نسب" بتاتا ہے۔ یاقوت رومی "کبیر النفس عظیم الہمت" ظاہر کرتا ہے۔ صاحب وشاح الدمیۃ نے ان کی مدح میں قصیدہ نقل کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ابیوردی کی زندگی کے ہر پہلو کو مورخین نے جانچ کر ایک اعلیٰ اور پاکیزہ رائے قائم کی، اور ہر ایک نے چیدہ اور قابل قدر الفاظ سے ستایش کے ساتھ یاد کیا ہے۔

وہ خصائل حمیدہ میں کامل تھے اور زبان و علوم عربیہ میں بے بدل فاضل۔ فی البدیہہ اور مرتجلانہ اشعار کہنے میں بڑی مہارت تھی، حضرت امام حسن علیہ السلام کے مراثی میں قصائد رنانہ لکھے ہیں۔

کبھی کبھی اپنی غلط روی یا اغیار و اعداء کی سعایت و بدگوئی کا بھی شکار ہوئے ہیں اور گھر بار، دار و دیار چھوڑنا پڑا ہے۔ اعیان سلطنت و اشراف مملکت میں سے الخطیر، ابو اسماعیل، المعین، اور شرف الدین سے معاصرانہ نوک جھونک رہتی تھی۔ عماد محمد بن حامد اصبہانی کتاب خریدۃ العصر میں لکھتا ہے کہ آخر عمر میں سلطان محمد بن ملک شاہ کے بعض درباریوں سے بیچ ہو گیا تھا انھوں (بلکہ خود الخطیر نے) ابیوردی کو زہر دیدیا۔ ابیوردی سریر سلطانی کے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ اُن کے پاؤں نے جواب دیا یا عربی مورخین کی اصطلاح میں "خیانت کی"۔ وہ گرے، لوگوں نے گھر پہونچایا اسی حالت میں برجستہ ایک قطعہ ارشاد فرمایا۔

ابیوردی کے اساتذۂ حدیث میں اسماعیل بن مسعدہ جرجانی عبدالوہاب محمد بن الشہید اور ابوبکر بن خلف شیرازی اور دیگر فنون میں ابومحمد الحسن بن احمد سمرقندی اور عبدالقاہر بن عبدالرحمان جرجانی نحوی کے نام لیے جاتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف یعقوب بن سلیمان اسفرائنی نے رمضان ۵۰۷ھ (جون ۱۱۱۳ء) میں وفات پائی، تو انکی بجائے مولانا محمد بن احمد ابیوردی نظامیہ بغداد میں خزانہ دار دارالکتب (لائبریرین) مقرر ہوئے تھے۔

تیرہ تصانیف ضخیم و عالی یادگار چھوڑی ہیں لغت کی کتابیں اس شمار سے باہر ہیں، ان کی تفصیل ارشاد الادیب لئے

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے، لیکن آج آٹھ سو چالیس سال بعد یہاں واقعہ بالعکس پیش آتا ہے۔ وہاں تو حضرت علامہ کو مسندِ فضل و درس پر جلوہ افروز ہونے میں تکلف و تامل تھا

معجم الادیب کی جلد چہارم میں موجود ہے، اسی کتاب میں وہ خط بھی بنسخہٖ نقل کر دیا ہے جس کو ابی وردی نے امیر المومنین المستظہر باللہ کے حضور میں اپنے اعتذار اور بغداد سے بھاگ جانے کے الزام کی برأت و صفائی میں بھیجا تھا۔ اس کو عربی ادب اور اعلیٰ نظم و نثر کی جان کہنا چاہیئے۔ ابیوردی کا دیوان ۱۳۱۷ھ میں لبنان میں طبع ہو چکا ہے۔ ان کی النجدیات الف بیت فی النسیب بھی قابل دید ہے۔

۲۵۔ ربیع الاول ۵۰۷ھ (۹۔ ستمبر ۱۱۱۳ء) کو اصفہان میں ناگہاں وفات پائی۔ باب ذبرہ میں دفن ہوئے۔ اسمٰعیل المنشی طغرائی نے مرثیہ لکھا۔

اس خیال سے کہ علامہ ابی وردی کا اُن کے ایک اور ہمنام، ہم پیشہ اور ہم عصر سے التباس نہ ہو جائے گزارش ہے کہ وہ بزرگ محمد بن احمد بن طاہر بن احمد خازن نحوی تھے۔ طبقات النحاۃ میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے اپنی کنیت ابو المنصور سے زیادہ شہرت پائی تھی۔ بغداد کے محلہ کرخ میں جو کتب خانہ قدیم تھا اُس کے خازن تھے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ محمد مذکور نحوی، ادیب، فاضل، فقیہ شیعی تھے، بڑے خوشنویس تھے۔ ابو محسن تنوخی وغیرہ سے استفادہ کیا تھا۔ ۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں متولد ہوئے۔ ۱۲۔ شعبان ۵۱۰ھ (۲۱۔ دسمبر ۱۱۱۶ء) کو انتقال کیا۔

۵۲۳ سنین و اعوام ہجری و مسیحی کی مطابقت و تصحیح میں اس ہیچمدان جامع تذکرہ کو اہتمام خاص و التزام کرنا پڑا ہے۔

سال ہجری ۱۵/۱۶ تاریخ ماہ جولائی ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے، اس کا شمار چاند کی حرکتوں پر ہے۔ عقلائے یورپ کو بھی تسلیم ہے کہ سال اسلامی فی الواقع احسن تقویم ہے اور سہل ترین ترکیب کا۔ اس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں اور ہر مہینہ تیس ۳۰ یا اُنتیس ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ تیس سال قمری کے دور میں ہر دوسرے، پانچویں، ساتویں، دسویں، تیرھویں، سولھویں، اٹھارھویں، اکیسویں، چوبیسویں، چھبیسویں اور اُنتیسویں سال کے اخیر مہینہ میں، امتداد وقت کی برابر و یکساں قائم رکھنے کے لئے ایک دن اور جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سال ہجری کا آغاز نئے چاند (ہلال) کی رویت سے قرار دیا جاتا ہے، مگر یہ کلیہ بھی اُس کے تاریخی و حسابی قوام پر اثر نہیں ڈالتا۔ یہ تین سو چون یوم آٹھ ساعت اڑتالیس دقیقہ کا ہوتا ہے جو بقدر دس یوم اکیس ساعت بارہ دقیقہ کے سال شمسی سے کم ہے۔

مسیحی سال کا حساب دورہ شمس پر منحصر ہے، اس کے شمار کرنے کا طریقہ اسٹائل Style کہلاتا ہے جولین یا پرانا طریقہ Julian or old style جولیس سیزر (مشہور و معروف شہنشاہ روم) سے منسوب ہے

یہاں اس آوارۂ وادیِ علم و ادب کو اپنی اس جسارت و دلیری سے شرم ہے کہ وہ ایسے کارِ عظیم کی انجام دہی پر آمادہ ہوا ہے جس کا وہ کسی طرح اہل و صالح نہیں ہے۔

جس نے مہینوں، دنوں اور ساعتوں کے محسوب کرنے کا یہ طریقہ وضع و قائم کیا تھا اس کی ابتدا ۴۶ قبل مسیح سے ہوئی، اس میں ہر سال میں تقریباً گیارہ منٹ کا فرق پڑ جاتا تھا، اس لیے پوپ گریگوری سیزدہم Pope Gregory XIII نے اس تقویم کی اصلاح کی اور اکتوبر ۱۵۸۲ء میں دس دن گھٹا دیے "۳۲۵ء کی کونسل آف نائس کے مجوزہ و مروجہ آئین و ہدایت کے مطابق حساب لگا کر وقت کا تعین کیا، یعنی ۴۔ اکتوبر کو ۱۵۔ اکتوبر قرار دیا اور منتصف اکتوبر ۱۵۸۱ء سے اسکو رائج کیا اس کو گریگورین یا جدید طریقہ Gregorian or new style کہتے ہیں، ۱۷۵۱ء میں برطانیہ عظمی نے پارلیمنٹ کے ایک قانون کی رو سے اس اصلاح کو اختیار و نافذ کیا اور اس طرح پر ستمبر ۱۷۵۲ء میں گیارہ دن گھٹا کر تیسری تاریخ کو چودھویں قرار دیا۔ اس طریقہ کے مطابق ہر وہ سال جو چار کے عدد سے تقسیم ہو سکتا ہو ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے باقی سنین ۳۶۵ دن کے رہیں گے۔ ۳۶۶ دن والے سال کے لیے یہ بھی مشروط ہے کہ وہ سنوٰ سے تقسیم نہ ہو سکے اگرچہ چار سو سے ہو جاسے۔

یہ دلچسپ بحث میرے موضوع کلام سے خارج ہے کہ آیا یہ اصلاح خود جناب پوپ کی زیرکی و ذہن نقاد کا نتیجہ تھی یا انھوں نے کسی حد تک جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے طبعزاد "سال جلالی" سے استفادہ و استفاضہ کیا تھا سال جلالی ۳۶۵ (دن) اور ربع روز کا ہوتا تھا۔ ہر ماہ سی روزہ، آخر اسفندار میں پانچ روز بڑھا لیتے تھے اور چوتھے سال میں چھ روز۔ جدید گریگورین طریقہ میں مہینہ کی سہل اور معینہ تیس دن کی تعداد تو قائم نہ ہو سکی بلکہ وہی پیچیدہ اور حفظ طلب مختلف اعداد ایام مختلف مہینوں کے برقرار رہے، البتہ اس قدر آسانی ہو گئی کہ ہر سال میں چہارم روز (چھ گھنٹہ) شمار کرنے کے بجائے چوتھے سال میں ایک پورا دن بڑھا دیا گیا

اہل ادراک نے سنہ ہجری سے سنہ عیسوی نکالنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ سنہ ہجری میں سے فیصدی ۳ عدد منہا کر کے باقی کو ۵ر۶۲۱ میں جمع کر دیا جائے اور سنہ ہجری کو ۹۷ر میں ضرب دیکر حاصل ضرب کو ۵ر۶۲۱ میں ملا دیا جاسے ان دونوں صورتوں میں جو حاصل جمع آسے سنہ عیسوی ہوگا۔

فاضل محترم پروفیسر مولانا زبید احمد نے ایک آسان، عمدہ، نو ایجاد طریقہ یہ بتایا ہے کہ سنہ ہجری کو ۳۳ پر تقسیم کر کے خارج قسمت کو اسی سنہ ہجری اور ۶۲۲ کی حاصل جمع میں سے منہا کر دیا جاسے، سنہ عیسوی نکل آئیگا۔

انگریزوں کی شروع عملداری میں ہندوستان میں تمام تر سال ہجری کا رواج تھا سلطنت کے سوا عام مسلمانوں اور ہندو امرا کے حسابات و تحریرات کا دار و مدار بھی اسی پر تھا، اس کا سلسلہ بہ یک دم منقطع کیا جانا نہ ممکن تھا نہ مناسب

مدت ہوئی کہ راقم عاجز نے مستشرق عظیم ولیم آیروین[۲۵] کی تحریک وارشاد سے میر غلام علی آزاد[۲۶] کی سوانح حیات لکھنا شروع کئے تھے اور ایک ضخیم جلد چھ سو صفحات کی مرتب کر لی تھی مگر افسوس ہے کہ

اسی طرح انگریزی دفاتر کی ترتیب، کاغذات سرکاری کی تحریر و تکمیل اور احکام کے اجراء کے لیے نہ صرف انگلستان کے ارباب حل وعقد بلکہ ہندوستان کے حدیث الورود ارکان حکومت کی واقفیت وسہولت کے واسطے سال مسیحی کی پابندی ومطابقت بھی ضروری ولابدتھی۔ انہیں ضروریات ومصالح سے مدت دراز (یعنی ۱۸۳۷ء) تک دونوں (بعد ہجرت وبعد مسیح) کے سال، ماہ اور ایام یکساں اور دوش بدوش رائج ورواں رہے۔ ایک صدی کی کثرت عمل اور مُرُون وعادت سے انگریزی تاریخوں کا تنہا اور پورا رواج ہوگیا اور قمری یا ہجری تاریخ کے لکھنے اور جاننے والے باقی نہ رہے الا ماشاء اللہ۔

اس ضرورت کو رفع کرنے یعنی دونوں تاریخوں کے تطابق کے لیے پہلے وارن صاحب Warren نے وکال سنگلیت مرتب کیا، بعد کو اس میں متعدد غلطیاں برآمد ہوئیں تو پلے فیر صاحب نے 'لائحہ تواریخ' Playfair's Chronology شائع کیا، سنین ہجری ومسیحی کی ایک جدول، جیمس وائٹ نے Tables of the Christian and Mohammadan Æras by James White ۱۷۹۰ء میں کلکتہ میں چھاپی لیکن اس میں ۱۸۰۰ء کے بعد کی برسوں میں ایک یوم کی غلطی نکلتی ہے۔ صدر دیوانی عدالت نے جو جنتریاں ۱۷۹۶ء سے شائع کی تھیں ان میں تو بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں خصوصاً ابتدائے ہجری سنین میں، سوء اتفاق سے وہی غلط تاریخیں قوانین سرکاری وآئین ہائے منضبطہ میں مندرج ہوگئی ہیں۔ یہ اغلاط صرف دنوں ہی میں نہیں بلکہ ہفتوں اور مہینوں میں بھی ہیں اور بدیہی ہیں۔ صدر دیوانی عدالت کا طریقۂ ترتیب تقادیم یہ تھا کہ ہر انگریزی سال کے آغاز پر عدالت مذکور کا پنڈت ایک جنتری انگریزی اور دیسی سنین کی تیار کرکے پیش کر دیتا تھا۔ اس کی ایک نقل دفتر عدالت میں رکھ لی جاتی تھی، دوسری گورنمنٹ کو بھیج دی جاتی تھی۔

کپتان جرویس کی جنتریاں Captain Jervis' Tables جو بمبئی میں طبع کی گئی تھیں زیادہ تر صحیح تھیں۔ ان میں اگر کوئی اختلافات تھے تو سالہائے کبیسہ کے متعلق، اور وہ بھی کم۔

سب سے صحیح اور مکمل وہ تیرہ سو اٹھارہ سال کی جنتری تھی جو ۱۳۱۸ھ یا ۱۹۰۰ء تک کی ارل آف آکلینڈ گورنر جنرل کے حکم سے ۱۸۴۲ء میں ولیم رشٹن ورفقا William Rushton and Company نے کلکتہ میں طبع اور شائع کی۔

تذکرۂ ہذا میں مختلف تاریخوں اور سنوں کو درج کرتے وقت ناچیز مؤلف نے ان سب پر نظر رکھی اور خود صحت کی ہے۔ انگریزی سال ۱۷۵۰ء تک تو تاریخوں کا حساب تقویم پارینہ کے اصول پر لگایا ہے۔ اس کے بعد سے جدید قاعدہ

اُس پر نگاہ تکرار نہ ڈال سکا۔ اُن اوراق پریشاں کی تہذیب و تکمیل و اشاعت ایک طرف میری کم مائگی و فقدان لیاقت، دوسری طرف میری گراں باری و انہماک خدمات سرکاری سے ہنوز معرض تعویق

وما توفیقی الا باللہ۔

خیال رہے کہ مسلمانوں کے یہاں سال شمسی ۲۲ یا ۲۳ مارچ سے شروع ہوتا ہے۔ سال قمری کا آغاز کسی فصل یا موسم یا دن پر معین نہیں۔ یوں کہئے کہ برابر گشت میں رہتا ہے۔

۵۲۴ "نظام" یا "نظام الملک" کو علوم و فنون کے نشر و توزیع کے ساتھ ازلی مناسبت رہی ہے، جو مبارک کام عہد حاضرہ میں سلطان العلوم نظام الملک شہریار دکن طال بقاءہ کی نگاہ مہر اور دست جود و سخا سے انجام پا رہا ہے نو صدی پیشتر الپ ارسلان و ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم بلکہ مختار سلطنت نظام الملک طوسی بھی اُسی کا شیفتہ تھا۔ پہلے خاص دار الملک نیشا پور (خراسان) میں اُس نے مدرسۂ نظامیہ قائم کیا۔ اُس چشمۂ فیض سے ایک عالم سیراب ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ اُس نے تمام قلمرو سلاجقہ میں (جس کی وُسعت طولاً کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرضاً قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک تھی) مکاتب و مدارس کھول دیے، ان میں سے مَرو، ہرات، بلخ، اصفہان اور موصل کے کالج علم و ہنر کے مخزن اور شایقان و طالبان کے مرجع و مرکز تھے، یہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے۔

۴۵۷ھ (۱۰۶۵ء) میں اُس نے نظامیۂ بغداد کی بنیاد ڈالی۔ دو ڈھائی سال میں تعمیر ختم ہوئی تو شنبہ کے دن ۱۰۔ ذیقعدہ ۴۵۹ھ (۲۵۔ ستمبر ۱۰۶۶ء) کو بڑے اہتمام و احتشام کے ساتھ مراسم افتتاح عمل میں آئے۔ علامہ ابو اسحٰق شیرازی جو اُس زمانہ میں استاذ الاساتذہ شمار ہوتے تھے پرنسپل یا مدرس اعلےٰ مقرر ہوئے، ابتداءً کچھ روز اس خدمت پر ابو نصر صباغ مصنف شامل بھی رہے تھے۔ ان کے بعد امام محمد غزالی، ابن الخطیب تبریزی شارح حماسہ، ابو الحسن فصیحی شاگرد امام عبد القاہر جرجانی (استرآبادی) وغیرہم نے اس مسند افادہ و افاضہ کو عزت دی تھی۔ استادان فن یا معاونان کی فہرست میں بڑے ممتاز نام مثل امام احمد غزالی، ابو المعالی قطب الدین شافعی، کیا الہرسی وغیرہم کے نظر آتے ہیں۔ نظامیہ کا فیضان اور دائرہ خیر توفیقات ربانی اور اہل اثر کی قدر دانی سے برابر بڑھتا گیا۔ اس کی پروفیسری ہر زمانہ میں علماء کے لئے وجہ نازش و مباہات رہی ہے۔ دو سو برس کی مدت میں اس منصب پر کوئی ایسا باکمال نامور مقرر نہیں ہوا جو اپنے زمانہ میں یکتائے فن اور یگانۂ عصر مانا نہ جاتا ہو۔

دو عظیم الشان اور وسیع شاہی کتب خانے بھی نظامیہ کے متعلق تھے۔ طلبہ کو وظائف اور تنخواہیں دی جاتی تھیں، لاکھوں اشرفیاں سالانہ اس پر خرچ ہوتی تھیں۔

وتاخیر میں ہے ؎

یسعی الفتیٰ لِاُمُورٍ لیس یدرکھا　　　فالنفس واحِدۃٌ والھمُّ مُنتشرٌ

نظامیہ (یونیورسٹی) کے علاوہ بغداد میں تیس بڑے بڑے کالج تھے جن کی رفعت وعظمت کا ذکر سیاح ابن جبیر نے اپنی سیاحتِ بغداد واقع ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) کے سلسلہ میں کیا ہے۔

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی بھی اسی نظامیہ کے دورِ آخر کے طلبہ میں سے تھے۔

۵۲۵ھ ولیم آیروین William Irvine ایک ممتاز محقق وماہر اسلامیان ہند کی تاریخ کے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں آبرڈین واقع اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور اکھتر بہتر سال کی عمر پاکر ۳۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو مضافاتِ لندن میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

آبائی پیشہ قانون ووکالت تھا۔ اس کے ساتھ ان کا تبحّر وتوغّل مایۂ خمیر کہنا چاہیئے۔ لیکن وہ خود ہندوستان کی سول سروس میں داخل ہوئے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۸ء تک صوبۂ مغربی وشمالی میں جواَب ممالک متحدۂ آگرہ واودھ کا ایک جزو ہے حکومت کے مختلف مالی وملکی مناصب پر مامور رہے۔ ملازمت سے دست کش ہو جانے کے بعد ہمہ تن علم وتاریخ کی خدمت میں منہمک ہوگئے۔

ذوقِ علمی کی مناسبت سے میرے والد مرحوم مولوی حکیم سید منظور احمد خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر سے بزمانۂ قیام فرخ آباد ارتباط خاص تھا جس کا اظہار بہ امتنان تاریخ نوابین بنگش فرخ آباد میں دو جگہ پر کیا ہے۔ حضرت مبرور ہی کے فیض صحبت اور لطافت مذاق سے متاثر ہو کر فرخ آباد میں ۱۸۷۹ء میں انھوں نے تاریخ ہندوستان پر توجہ شروع کی تھی۔ دونوں بزرگوں کی متفقہ کوشش وتحقیقات یا اُس عہد زریں کی یادگار بہت سے کاغذات اور علمی وتاریخی تحریرات ایک عالم کو صلائے فیض دے چکی ہیں۔ جب میں نے علمی دنیا میں قدم رکھا تو بزرگانہ شفقت مجھ پر بھی مبذول ہوئی۔ میری استعداد واستحقاق سے زیادہ میری ناچیز مساعی پر تحسین وآفریں فرماتے رہے۔ اکثر علمی نکات اور تاریخی مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے مجھے لکھتے بلکہ اپنے رفقائے کار کی ضرورتوں کے وقت بھی بے تکلف تحریر فرماتے تھے۔ چنانچہ مسٹر بیوریج H. Beveridge نے اپنے ترجمۂ مآثر الامراء میں اس حقیر کو بھی یاد کیا ہے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے آیروین صاحب نے اپنی بیماری اور ضعف پیری کا شکوہ مجھے لکھا تھا۔

انڈیا آفیس اور برٹش میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بیش بہا علمی جواہرات کے خازن تھے، وہاں کی بہت سی علمی کتابیں اور نادر چیزیں ان کی نگاہِ کرم اور دستِ حفظ کی رہین منت ہیں۔

وفات اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) سے کر لارڈ لیک کے (۱۸۰۳ء میں) دہلی فتح کرنے تک کی ایک جامع

اُس کی تالیف کا داعی اَجَل تو حق ہم وطنی وعلاقۂ روحی تھا یعنی آزاد کے مورث اور بزرگوں کے خمیر کا اُسی خاک (شمس آباد ضلع فرخ آباد) سے ہونا جہاں کے توطن کا شرف بندۂ ہیچمدان کو بھی حاصل ہے۔

ومبسوط تاریخ "ہبوط وزوال سلطنت مغلیہ" کے نام سے لکھ رہے تھے ۔ افسوس ہے کہ پیام اجل نے اُس کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی ۔ ایک عظیم قلمی سرمایہ اور سکّوں کا ذخیرہ اس کے لیے فراہم کرلیا تھا۔ البتہ جتنے حصے مکمل ہوتے گئے تھے اُن کو ولایت اور ہندوستان کے مشہور تاریخی رسائل کے نذر کرتے گئے تھے ۔ ایک کتاب "افواج مغول" پر ۱۹۰۳ء میں لکھی تھی۔

ہندوستان کے جدید امپیرل گزیٹیر میں باب دہم یعنی تاریخ مسلمانان ہند لکھنے کے لئے قرعۂ انتخاب مسٹر اِرون پر پڑا اور موصوف نے بڑی خوبی سے اس حصّہ کو تحریر کیا ۔ اُن کے قلم کی قوت ، معلومات کی وُسعت ، اور مطالب و معانی کا ایجاز ایک تاریخی اعجاز دکھاتا ہے ۔

سب سے اخیر تالیف اورنگ زیب کی سیرت تھی جو ۱۹۱۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ ان کے اور بہت سے کراسات ورسائل طبع ہوچکے ہیں۔

منوکی اطالوی کی "تاریخ مغول" کا ترجمہ و تحشیہ و تصحیح ان کی علمی زندگی کا ایک عظیم کارنامہ ہے ۔ یہ کتاب وینس اور برلین کے کتب خانوں کو چھوڑ کر ناپید تھی ۔ ولایت کے نامور طابع کانسٹبل نے ان کو توجہ دلائی ۔ لارڈ کرزن اور گورنمنٹ ہند نے سرپرستی و دستگیری کی اور یہ ضخیم کتاب انگریزی میں کئی جلدوں میں مرتب اور درست ہوکر شائع کردی گئی [نکولا منوکی Manucci N. کی یہ تاریخ ، ہندوستان میں تیمور لنگ کے ہاتھوں خاندان مغلیہ کی بنیا د پڑنے کے زمانے یعنی ۱۳۹۹ء سے جلوس اورنگ زیب واقع ۱۶۵۷ء تک کی ہے ۔

سینر منوکی Signor Manouchi وینس Venice کا رہنے والا تھا جو ہندوستان میں آیا اور کچھ دنوں رہا تھا ، اُس نے اِس ملک کی ہر بات اور طریقۂ حکومت اور حکمرانوں کو بیگانہ نگاہ سے دیکھا اور عیب جویانہ روش سے لکھا ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں عہد مذکور کے تمام بیانات و حالات متعلق دربار شاہی و حرم سرائے سلطانی، اور افواج کی قوت وطاقت ، اور ذرائع آمدنی وغیرہ بالتفصیل مرقوم ہیں۔ اصل یادداشتوں اور تحریرات کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں پادری فرانسیس کیٹرن Father Francis Catron نے کیا تھا جس کا کچھ حصہ اپنی زبان سے انگریزی میں منتقل ہو کر ۱۷۲۶ء میں لندن میں چھپا تھا مسٹر اِرون نے پوری کتاب کو اصل سے اپنی زبان میں لیا اور تہذیب و تکمیل کرکے بہترین صورت و اہتمام سے شائع کرایا]

فارسی و ہندی میں ان کو پوری قدرت تھی ، عربی میں بھی کچھ دستگاہ رکھتے تھے ۔ السنۂ فرنگ خصوصاً فرانسیسی

بد نام کنندۂ نکو نامے چند۔ اسی کے ساتھ حق پسندی و انصاف کوشی کا یہ جاذبہ کہ ایسے نامور نادر روزگار کا کارنامۂ حیات خمول و گمنامی کے گوشہ میں پڑا نہ رہنا چاہیئے۔

جرمنی، اطالوی پر عبور کامل تھا۔ ترجمہ کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اس کہن سالی میں پرتگالی زبان بھی سیکھ لی تھی۔
اتفاقات حسنہ سے بلگرام کے پرانے گزیٹر کی تصحیح و توثیق بھی مسٹر آیروین نے کی تھی۔ اُن کا درست کیا ہوا نسخہ دستخطی ۴۔ نومبر ۱۸۷۰ء ہنوز محفوظ ہے۔

ف۲۶ میر غلام علی آزاد کا مستقل تذکرہ ملاحظہ طلب ہے، پایان کتاب ہذا میں بھی کچھ حال مندرج ہے۔

ف۲۷ سمدن (ضلع فرخ آباد۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں) مسلمانوں کا ایک مشہور قصبہ ہے، حوادث دہر سے گھٹتے گھٹتے اُس کی مردم شماری تین ہزار رہ گئی ہے۔
سادات کی آبادی بہت پرانی ہے، کسی وقت سادات کے بہت سے قبائل و عشائر یہاں رہتے تھے جو عرب و عجم کے مختلف مقامات سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ بہ تقاضائے خدمت یا بہ تلاش معاش ترک توطن کر گئے۔ میر غلام علی آزاد کا خاندان (زیدیہ) بھی انھیں میں سے تھا۔ ان کے مورث ملک بہلول لودی کے عہد میں طلب علم کے لئے بلگرام گئے اور وہیں کے ہو رہے، اسی لیے شیخ غلام حسن ثمین نے شرائف عثمانی میں آزاد کے دعوائے بلگرامیت پر تعریض کی ہے، اور اپنے انگریزی ترجمۂ "احمد شاہ ابدالی و وزیر عماد الملک" کے دیباچہ میں آیروین صاحب بھی اُن کے ہم نوا پائے جاتے ہیں۔
سادات رضویہ کا خاندان ہندوستان میں مشہد مقدس سے شاہ طہماسپ صفوی کی افواج کے ساتھ آیا تھا ہمایون کو تاج و تخت دلانے کے بعد اسی کشت زار میں اقامت فرما ہو گیا۔ مُلّا سید عبدالصمد جامی کے نام نامی کے انتساب سے اُسی وقت ۹۶۳ھ (۱۵۵۶ء) سے اس قریہ کا نام صاد سے بھی لکھا جاتا ہے ؎

خدا جانے تراجی لگ گیا سمدن میں کیوں تید — اُجاڑ اک چند گھر میں بے حقیقت سی یہ بستی ہے

اسیر میراں علامہ ابو الفتح معروف بہ سید معدن جو فتاوائے عالمگیری کی ترتیب و تالیف میں دیگر علمائے عصر کے دست و بازو تھے اسی خاک پاک میں راحت گزیں ہیں۔ سید حامد، سید ابراہیم و سید جلال کے سے جلیل المنزلت علماء کو بھی اسی دودمان عالی سے توسل تھا۔ سید لار (جن کا نام بزرگان جاوید دولت کی جدول میں آئین اکبری میں موجود ہے) اور خواجہ حافظ سید احمد کبیر المعروف بہ خواجہ پیر کبیر (جن کا ذکر تاریخ فرشتہ میں ہے) اسی برگزیدہ طبقہ کے رکن رکین تھے۔
ان آسودگان خاک پاک حضرت سمدن نور اللہ مضاجعہم کی زیارت کے لئے اب بھی اہل نظر اور صاحبان

فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر نفس نیا رنگ بدلتی اور نئی نئی مصلحتوں کا بہانہ ڈھونڈھتی یا تقاضا کرتی ہے، ترمیم و تنسیخ شئون آلہیہ کا ایک جزو اہم ہے اور مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا اٰیَاتِ

بصیرت آتے اور اُس گورستانِ کُنارے سے جو باغ برہانہ (بیرہانہ) کے نام سے معروف ہو اقتباس انوار کرتے اور فیوض و برکات پاتے ہیں۔

(از کتاب سلسلۃ الانساب سادات صمدنیہ مولفہ مولوی حکیم سید منظور احمد و تاریخ عزیزیہ نوشتہ حاجی سید عبدالعزیز خان بہادر و تاریخ نوابین بنگش مرتبہ مسٹر آیروین)

اپنی حالت دیکھ کر مقبول ہیچ میرز کو ان اجداد صالح کی آل ہونے پر کیا نازش ہو سکتی ہے ؎

ان افتخرت باٰباء مضوا سلفا قلنا صدقت ولکن بئس ما ولدا

۵۱۹ھ ابو عبداللہ محمد بن صفی الدین ابو الفرج محمد بن نفیس الدین ابو الرجا حامد بن محمد بن عبداللہ بن علی بن محمود بن ہبۃ اللہ پورا نام و نسب، اُلُغ‌زُف؛ عماد الدین کاتب اصفہانی لقب تھا۔ ابن اخی العزیز بھی کہلاتے تھے۔ ان کے چچا العزیز بڑے نامور اہل علم سے تھے۔ [اُلُغ بفتح الف و ضمہ لام و سکون غ۔ عجمی زبان میں عقاب کو کہتے ہیں، جو ایک طائر معروف ہے]

عماد شافعی المذہب فقیہ تھے، شعرا و رسائل میں ان کا پایہ نہایت بلند اور شرح و تفصیل سے مستغنی تھا۔ اصفہان میں نشو و نما، تعلیم و تربیت پائی، جد آسن میں علوم مروجہ سے فارغ ہو کر بغداد چلے آئے۔ کچھ زمانہ تک مدرسۂ نظامیہ میں فقہ کی تکمیل اور کمال اتقان کے ساتھ فنون ادب کی تحصیل کی۔ شیخ ابو منصور سعید بن محمد الوزان، پروفیسر نظامیہ سے سند پائی۔ ابو الحسن علی بن ہبۃ اللہ بن عبد السلام، ابو منصور محمد بن عبد الملک بن جیرون، ابو المکارم مبارک بن علی سمرقندی، ابو بکر احمد بن علی الاشقر وغیرہم نامور اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی اور مدت تک وہاں مقیم رہے، جب تمام علوم میں ماہر و متبحر ہو گئے تب باہر نکلے۔ اور وزیر عون الدین یحییٰ بن ہبیرہ کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ وزیر اُس وقت بغداد میں اقامت گزیں تھا۔ وزیر نے عماد کو بصرہ کا والی یا ناظر (حاکم) مقرر کر دیا کچھ دن بعد اُسی عہدہ پر واسط بھیجدیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عمر بھر ایک جگہ نہ رہ سکے اِدھر سے اُدھر تبدیل ہوتے رہے۔

وزیر عون الدین نے جب ۵۶۰ھ (مطابق ۱۱۶۵ء) میں وفات پائی تو اس کے اتباع و منتسبین کا شیرازہ منتشر ہو گیا سب پریشان و متفرق ہو گئے۔ بعض کو ناگوار و ناقابل برداشت حالات بھی پیش آئے۔ بیچارے عماد بھی اسی طرح بحال تباہ کچھ روز واسط میں پڑے رہے پھر شہر دمشق کو چلے آئے۔ شعبان ۵۶۲ھ (مئی جون ۱۱۶۷ء) میں وہاں پہونچے۔ ملک العادل نور الدین ابو القاسم محمود بن اتابک زنگی سلطان تھا لیکن حاکم ذی اختیار

یُخْرِجُ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (ہم کوئی آیت منسوخ کردیں یا ذہن سے اُس کو اُتار دیں تو اُس سے بہتر یا ویسی ہی نازل کردیتے ہیں۔ جزر اول سورۂ بقرہ ع ۱۳) اس کا مصداق۔ ہر نظر جو بعد کو پڑتی ہے

اور متولّی مہام، تدابیر دولت قاضی کمال الدین ابوالفضل محمد بن الشہرزوری تھا اُس سے تعارف ہوگیا اور اُس کی مجالس میں جانے آنے لگے۔ ایک بار اُس کے یہاں کسی مسئلہ اختلافی پر گفتگو ہو رہی تھی، عماد کو اس مباحثہ میں امیر کبیر نجم الدین ابوالشکر ایوب والد سلطان صلاح الدین نے پہچان لیا، وہ ان کے چچا العزیز کو قلعہ تکریت سے جانتا تھا، اعزاز و اکرام کے ساتھ اِن سے پیش آیا اور احسانات کئے۔ باپ کی معرفت دمشق میں سلطان صلاح الدین سے بھی معرفت و شناسائی ہوگئی۔ انھوں نے قصائد لکھے اور پیش کئے۔ اُدھر قاضی کمال الدین نے سلطان نورالدین سے عماد کی بڑی تعریف و ستایش کی۔ کتابت و انشا کے لئے ان کو شایان و مناسب بتایا، سفارش منظور ہوئی۔ خود عماد کو بھی اس منصب خطیر (دفتردار یا افسر دار الانشا) کے قبول کرنے میں تامل تھا۔ نہ کبھی اس کا سابقہ پڑا تھا نہ اپنے میں اس کی قابلیت پاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مواد و استعداد تو بجد وافر نہیں مجتمع تھا لیکن نوبت مہارت نہیں پہونچی تھی۔ چار و ناچار منظور کیا، اور کچھ روز بعد عدیم النظیر و فقید المثال کاتب ہوگئے، عربی و عجمی (فارسی) دونوں زبانوں میں یکساں اور بے مثل لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں صلاح الدین سے مودّت اکید ہوگئی اور امتزاج تام پیدا ہوگیا۔ اُدھر نورالدین کے دربار میں بھی روز افزوں ترقی مراتب ہونے لگی۔ عماد اُس کے رازدار اور سکرٹری خاص ہوگئے۔ امام مستنجد کے زمانہ میں اِنکو سفیر (اُس وقت رسول کہلاتا تھا) بنا کر دار السلام بغداد کو بھیجا گیا۔ جب واپس آئے تو اُس مدرسہ میں جو دمشق میں اِن (عماد) کے نام سے معروف تھا پڑھانا شروع کیا۔ ماہ رجب ۵۶۶ھ (مارچ ۱۱۷۱ء) یا ۵۶۷ھ (فروری و مارچ ۱۱۷۲ء) میں ان کو "اشراف دیوان" کا رتبہ عطا ہوا۔ یہ زمانہ ان کے مستقیم الحال اور رضی البال ہونے کا تھا۔ نورالدین کے انتقال پر اُس کا فرزند ملک الصالح اسمٰعیل جانشین ہوا۔ وہ صغیر السن تھا۔ عماد کے مخالفین کی بھی ایک جماعت تھی جس نے ان کو تنگ و پریشان کیا، اور خوب دھمکایا، وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کے بغداد کے ارادہ سے چل نکلے۔ موصل پہونچے تو سخت بیمار ہوگئے۔ یہاں پر سلطان صلاح الدین کے دیار مصر سے اس طرف کا رخ کرنے اور دمشق لے لینے کی خبر پائی۔ انھوں نے عراق کا عزم فسخ کیا، شام کو واپس جانے کی ٹھان لی۔ ۴ جمادی الاولیٰ ۵۷۰ھ (۱ دسمبر ۱۱۷۴ء) کو موصل سے چل دیے۔ صحاری و بیابان طے کرتے ہوئے، ۸ جمادی الآخرہ (۹ جنوری ۱۱۷۵ء) کو دمشق پہونچے۔ صلاح الدین حلب لے چکا تھا اُسکی خدمت میں جانے کا قصد کیا۔ شعبان (مارچ ۱۱۷۵ء) میں قلعہ حمص بھی حوالہ ہوگیا تو عماد حاضر ہوئے اور قصیدۂ تہنیت پڑھا۔ اُس وقت سے برابر سفر و حضر، رزم و بزم، جلوت و خلوت

ثانی ہو، یا ثالث، وھلم جرًّا، تصنیف کو نئے پیرایہ میں دیکھنا اور نئے الفاظ و عبارات میں بدل دینا چاہتی ہے۔ عماد کاتب اصفہانی نے جب قاضی عبدالرحیم بیسانی کے کلام پر اعتراضات فرما کر علم مناقشہ

میں سلطان کے رفیق رہے سلطان نے ان کو اپنا کاتب مقرر کر لیا۔ اعتماد و قرب روز بروز بڑھتا گیا حتی کہ وزراء بھی رشک کرنے لگے۔ [فی زمانہ کاتب کو میر منشی نہیں، بلکہ چیف سکریٹری کہنا چاہیئے جسب تحریر ابن خلدون دول خارجہ سے مراسلت اور فرامین شاہی کا اجراء اُس کے متعلق تھا وہ وزیر اعظم سے کسی طرح کم درجہ پر نہ تھا]

قاضی فاضل اکثر اوقات حضور سلطانی سے دور ہو جاتے تھے اُن کو بار بار مصالح ملکی و انتظامات سلطنت کے لئے مصر کو جانا پڑتا تھا۔ اس لیے عماد برابر شام میں ملتزم بارگاہ عالی رہتے اور اسرار سلطنت کے حافظ و محافظ سمجھے جاتے تھے۔

بہت سی تصانیف فائقہ چھوڑی ہیں (۱) کتاب خریدۃ القصر وجریدۃ العصر جس کو ابوالمعالی سعد بن علی الوراق الحظیری کی زینۃ دمیۃ الدہر کے ذیل کے طور پر لکھا تھا۔ واضح رہے کہ حظیری نے اپنی کتاب دمیۃ القصر وعصرۃ اہل العصر مصنفہ باخرزی کے ذیل میں، اور باخرزی نے اپنی کتاب یتیمۃ الدہر ثعالبی کے ذیل میں، اور ثعالبی نے اپنی کتاب ہرون بن علی المنجم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی تھی، عماد نے اس خریدہ میں اُن تمام شعرا کا ذکر کیا ہے جو پانچویں صدی ہجری کے بعد سے سال پانچسو بہتر (۵۷۲ھ ۱۱۷۶ء) تک گذرے ہیں۔ اس میں شعرائے عراق و عجم و شام و جزیرہ و مصر و مغرب کی تخصیص نہیں، حتی الوسع کسی کو چھوڑا نہیں اور نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے۔ دس جلدوں میں ہے۔ (۲) البرق الشامی سات جلدوں میں ایک مجموعۂ تواریخ ہے۔ ابتدا اپنے ہی احوال اور عراق سے شام جانے کے بیان سے کی ہے سلطان نورالدین محمود کی خدمت اور سلطان صلاح الدین کے تعلق اور بعض فتوحات شام کا بھی ذکر کیا ہے، نادر کتاب ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اُس زمانہ کے اوقات عزیزہ کو اُن کی خوبی اور سرعت انقضا کے لحاظ سے برق خاطف قرار دیا تھا (۳) کتاب الفتح القدسی فی الفتح القدسی دو جلد میں ہے۔ اس میں بیت المقدس کی فتح کے حالات مندرج ہیں۔ (۴) السیل علی الذیل، اس کو ابن سمعانی کی کتاب الذیل کا ضمیمہ کہنا چاہیئے، ابن سمعانی نے خود خطیب حافظ کی تاریخ بغداد پر یہ کتاب الذیل لکھی تھی مگر قاضی احمد بن خلکان لکھتے ہیں کہ نہیں، السیل کو اپنی ہی کتاب خریدۃ القصر کے تتمہ کے طور پر تحریر کیا تھا (۵) نصرۃ الفطرۃ وعصرۃ القطرۃ۔ دولت سلجوقیہ کے اخبار کے متعلق ہے (۶) دیوان رسائل (مکاتیب) اور دیوان اشعار چار چار مجلدوں میں تھے۔ قصائد بھی نفیس و طویل ہیں۔ (۷) ایک دیوان صغیر مختصر سا ہے جس میں صرف دو دو ابیات۔ جمع کر دیے ہیں۔

بلند کیا تو قاضی صاحب نے نہایت سادگی اور راستبازی سے یہ مختصر سا جواب دیدیا تھا:-
قَدْ وَقَعَ لِی شَیْءٌ وَّمَا اَدْرِی اَوَقَعَ لَکَ اَمْ لَا وَهُوَ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَا یَکْتُبُ کِتَابًا

عماد اور قاضی فاضل کے مابین مکاتبات نازک اور محاورات نفیس اکثر چلتے تھے معاصرانہ چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار سر راہ دوچار ہوئے۔ قاضی توسن خوشخرام کی پشت پر تھے۔ انھوں نے کہا سر فلا کبا بك الفرس فاضل نے جواب دیا دام علا العماد۔ ان کو مقلوب بھی پڑھ لیجئے تب بھی مفہوم صحیح رہے گا۔ (واضح رہے کہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے، مقامات حریری میں ایک پورا مقامہ اسی صنعت میں موجود ہے۔ ادھر سے پڑھئے تو بھی وہی عبارت اور الٹ کر پڑھئے تو بھی وہی۔ یہ ہی بات قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی آیت میں ہے۔ ربك فكبر)۔ ایک بار موکب سلطانی میں دونوں یک جا تھے، سواروں کی کثرت سے اس قدر خاک اوڑی کہ ساری فضا پر چھا گئی۔ دونوں متعجب تھے۔ عماد نے برجستہ پڑھا ؎

اما الغبار فانه　　مما اثارته السنابك　　والجو منه مظلم　　لكن انارته السنابك

یا دهر لی عبد الرحیم　　فلست اخشی مس نابك

اس کو حسن کلام کہہ لیجئے یا اتفاق وقت کہ تینوں شعروں میں مجانست (صنعت تجنیس) پیدا ہو گئی ہے۔ قاضی فاضل جب ۵۷۵ھ (۱۱۷۹-۸۰ء) میں مصر سے بعزم حج روانہ اور کشتی پر سوار ہوئے تو عماد کاتب نے جو خط ان کو لکھا تھا اُس کو فصاحت و بلاغت کی جان اور ادب و آداب، لطائف و ظرائف اور نثر و ایجاز کی روح کہنا چاہیے یاد ہو گا کہ جب وزیر عون الدین بن ہبیرہ کی وفات پر اس کے اعوان و انصار دیوانات شاہی و خدمات سرکاری سے ہٹا دیے گئے تھے اور اُن سے دار و گیر ہوئی تھی تو عماد بھی اُسی گرفتار بلا گروہ میں تھے کیونکہ اُس زمانہ میں وزیر کی نیابت و اسط میں کرتے تھے۔ جب قید ہوئے تو محبس سے عماد الدین بن عضد الدین بن رئیس الرؤسا کو جو اُس وقت دار مستجدیہ میں استاد تھا شعبان ۵۶۰ھ (جولائی ۱۱۶۵ء) میں یہ قصیدہ لکھکر بھیجا

قل للامام علام حبس ولیکم　　اولوا جمیلکم جمیل ولائه

اولیس اذحبس الغمام ولیه　　خلی ابوك سبیله بدعائه

اُس نے فوراً حکم رہائی دلایا۔ اس میں ایک نازک لطیفہ ہے جس کو عربی محاورہ میں "تلمیح غریب" کہتے ہیں۔ اس میں حضرت عباس بن عبد المطلب (عم نبی صلے اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کے ایک قضیہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں ایک بار پانی نہیں برسا، اہل زمین خشکی سے پریشان تھے۔ حضرت عمر جناب عباس اور جماعۃ الناس کو ہمراہ لے کر استسقاء (طلب باراں) کے لئے نکلے، جب شہر سے باہر ٹھہرے تو

فِی یَوْمِہٖ اِلَّا یَقُوْلُ فِی غَدِہٖ لَوْ غُیِّرَ ھٰذَا لَکَانَ اَحْسَنَ وَلَوْ تُرِکَ ذَالِکَ لَکَانَ اَوْلٰی وَ ھٰذِہٖ عِبْرَۃٌ عَظِیْمَۃٌ وَحُجَّۃٌ مُّسْتَقِیْمَۃٌ عَلٰی اِسْتِیْلَاءِ صِفَۃِ النُّقْصَانِ عَلٰی طَبِیْعَۃِ

دعا فرمائی، کہ اے بار الٰہ ہم پر جب قحط پڑتا تھا تو ہم تیرے نبی کا وسیلہ پکڑتے تھے تو ہم کو سیراب کر دیتا تھا ہم آج اپنے نبی کے چچا کا توسل لے کر تجھ تک آئے ہیں تو ہم کو سیر کر دے چنانچہ بارش ہو گئی اور خوب ہوئی۔ ان اشعار میں وُلی سے وہ مطر (باراں) مراد ہے جو بعد وسمی کے آتا ہے۔ وسمی "ربیع الاول کی بارش کو کہتے ہیں جو وسم سے منسوب ہے۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ زمین کو نبات وسبزہ سے وسم کر دیتا ہے۔ ولی اُس بارش کا نام اس وجہ سے قرار پایا کہ وہ "وسمی" کے نزدیک ہوتا ہے۔ متنبی نے ایک ہی شعر میں ان سب اسماء واقسام کو جمع کر دیا ہے۔

امنعمۃ بالعودۃ الظبیۃ التی — بغیر ولی کان نائلھا الوسمی

عماد کاتب اپنے مرتبۂ بلند اور منزلت رفیع پر برابر قائم رہے۔ جب سلطان صلاح الدین نے وفات پائی تو ان کی حالت پریشانی اور تکلیف کی تھی، ذرائع آمد مسدود ہو گئے تھے۔ جب اپنے لیے کوئی دراجابت وا نہ دیکھا تو خانہ نشینی اختیار کر لی اور تصنیف وتالیف میں مشتغل ہو گئے۔ اس روئیداد کو برق الشامی کے اوائل میں اضافہ کر دیا ہے۔ ابن التعاویذی کاتب مشہور کو ایک بار "فروہ" اور "رسالہ" اور "قصیدہ" کی طلب میں خط لکھا تھا۔ یہ سوال وجواب دونوں نہایت مختصر اور پر لطف چھوٹے چھوٹے جملوں میں دیکھنے کے قابل ہیں

عماد کی ولادت روز دوشنبہ ۲ جمادی الآخرہ (۷ جولائی) اور بروایت دیگر شعبان (ستمبر) میں ۵۱۹ھ (۱۱۲۵ء) میں اصبہان میں ہوئی تھی۔ وفات بروز دوشنبہ مستہل ماہ رمضان المعظم ۵۹۷ھ (۲۰ مئی ۱۲۰۱ء) کو دمشق میں پائی، باب النصر کے باہر صوفیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

عماد کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں کسی وقت قسطنطنیہ میں موجود تھیں، ہالینڈ کے اہل نظر انکو سولھویں صدی کے وسط میں اپنے حسن تدبیر سے مع اور بہت سی نادر کتابوں کے اڑا لے گئے۔ اُس ملک (ہالینڈ) کے مشہور کتب خانہ لیڈن میں یہ نایاب ذخیرہ اب تک محفوظ ہے۔ عربی کے بڑے بڑے کتب خانوں میں یہ کتب خانہ بھی شمار ہوتا ہے۔

۵۲۹ھ ابو علی عبدالرحیم بن قاضی اشرف بہاء الدین ابی المجد علی بن قاضی سعید لخمی عسقلانی، کا قاضی فاضل عُرف، اور مجیر الدین لقب تھا۔ میر غلام علی بلگرامی نے سرو آزاد میں انکو "نسائی" لکھا ہے۔ اس کو کتابت یا تجنیس کی غلطی کہنا چاہیئے۔ وہ نسائی نہ تھے (منسوب بہ نساء۔ بفتح نون وسین مہملہ۔ آخر میں ہمزہ۔ جو خراسان کا ایک مشہور شہر ہے اور جہاں سے بڑے بڑے نامور اہل علم وفضل نکلے ہیں) قاضی احمد بن خلکان وفیات الاعیان

اِلْاُنْسَانِ۔

"میرے دل میں تو یہ ایک بات آئی ہے میں نہیں جانتا کہ آپ کو بھی محسوس ہوئی ہے یا نہیں

میں ان کا مولد عسقلان (شام کا مشہور شہر ساحل بحر پر) اور جائے قیام مصر لکھتے ہیں، ضیاء الدین ابو الفتح، نصر اللہ معروف بہ ابن اثیر جزری موصلی نے "الوشی المرقوم فی حل المنظوم" میں قاضی فاضل عبدالرحیم کو البیسانی لکھا ہے، وہ دمشق میں ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں ملا تھا جب قاضی دولت صلاحیہ کا کاتب تھا۔ ان کا باپ شہر بیسان کا قاضی تھا اس لئے بیسانی کہلاتے ہیں، ان کا مورث موفق یوسف بن خلال دیار مصر کو چلا آیا تھا اور یہاں فنِ انشا میں کمال شہرت پائی تھی۔ اس کے بعد بندرگاہ اسکندریہ میں سرکاری خدمت منظور کر لی تھی اور مدت تک قیام گزیں رہا تھا۔ فقیہ عمارۃ الیمنی اپنی کتاب النکت العصریۃ فی اخبار الوزراء المصریۃ میں اس کی مدح و ثنا کرتا ہے۔

قاضی فاضل سلطان الملک الناصر صلاح الدین کا وزیر تھا، ساری زندگی کمال تمکنت و ثروت سے بسر کی، انشاء و ادب میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتا تھا حتی کہ متقدمین سے تفوق لے گیا تھا۔ اپنی علمی یادگاریں عجیب و غریب اور بکثرت چھوڑی ہیں۔ ابن خلکان نے واقف حال فضلائے ثقات سے سنا تھا کہ اس کے رسائل کے مسودات بھی بہت سی جلدوں میں اور تعلیقات اوراق میں تھے، جمع کئے جاتے تو سو مجلد سے کم شمار میں نہ آتے۔ با ایں ہمہ کثرت وہ "مجید" (بڑے پایہ کے) تھے۔ باوصف تعلقات معاصرانہ عماد کاتب اصبہانی نے کتاب الخریدہ میں اس کی شان میں بڑی عظمت و احترام کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ "رب القلم والبیان واللسن واللسان.... والبدیھۃ المعجزۃ والبدیعۃ المطرزۃ..... فھو کالشریعۃ المحمدیۃ التی نسخت الشرائع ورسخت بھا الصنائع....." قاضی کا کمال اور انشا پردازی دکھانے کے لئے اس کا ایک لطیف رسالہ بھی نقل کر دیا ہے جو خطیب عیذاب کے لئے صلاح الدین کو لکھکر بھیجا تھا اور جس میں اس کو خطابت کرک پر مقرر کرنے کی سفارش کی تھی۔ قلعہ کوکب کی تعریف میں ایک رسالہ ہے جس میں لکھا ہے "وھذہ القلعۃ عقاب فی عقاب ونجم فی سحاب...." ایک اور رسالہ کے ذیل میں قاضی نے لکھا ہے "وقد کبر المملوک وقد وھت رکبتاہ وضعف التیاہ وکتب لام الف عند قیامہ وجلاءہ ولم یبق من نظرہ الا نقابتہ ومن حدیثہ الا خرافۃ...."

نظم بھی اسی شان سے لکھتا اور تمام محاسن ولطائف شاعری پیش نگاہ رکھتا تھا۔ ابن مکنسہ ابو طاہر اسمٰعیل بن محمد بن حسین قرشی اسکندری کو اپنا کلام اکثر سناتا اور داد سخن لیتا تھا۔

کہ انسان آج ایک بات لکھتا ہے تو دوسرے دن کہتا ہے کہ اگر اسطرح بدل دیا جاتا تو بہتر ہوتا اور اگر یہ چھوڑ دیا جاتا تو کیا خوب ہوتا اور یہی ایک بڑی عبرت اور مضبوط دلیل اس امر کی ہے کہ انسان کی طبیعت پر ناقص ہونے کی صفت غالب ہے۔"
اس صاف وسادہ جواب کی بیساختگی وصداقت چشم حقیقت بیں سے پوشیدہ و مخفی نہیں۔

ملک العزیز اپنے باپ صلاح الدین کی حیات میں قاضی فاضل سے بہت میل (یا عربی محاورہ میں میل) رکھتا تھا۔ باقتضائے بشریت عزیز کو ایک کنیز جاریہ سے بے حد محبت و شغف ہو گیا جس کے باعث سے وہ مصالح و معاملات ملکی پر توجہ نہ کرتا تھا۔ باپ کو خبر پہونچی تو اُس کو ترک کردینے اور قاضی کی صحبت سے علٰحدہ رہنے کا حکم دیا۔ ملک العزیز پر بہت شاق گذرا، مگر یہ جسارت نہ کرسکا کہ اُس سے ملے اور باپ کے حکم سے سرتابی کرے۔ کنیز جب طول فراق برداشت نہ کرسکی تو عنبر کا ایک گولہ بنا کر خادم کے ہاتھ بھیجا۔ توڑا گیا تو اندر سے زرِ خالص نکلا۔ شاہزادہ نے غور و فکر کیا مگر مطلب تک نہ پہونچ سکا۔ موقع پاکر قاضی سے اس کا تذکرہ کیا اور صورت حال بتائی۔ قاضی نے یہ دو شعر لکھکر بھیجدیے ؎

اهدت لك العنبر في وسطه زر من التبر دقيق اللحام
فالزر في العنبر معناهما زره كذا مستترا في الظلام

اس کی ولادت ۵ جمادی الآخرہ ۵۲۹ھ (۳۰- اپریل ۱۱۳۵ء) کو شہر عسقلان میں ہوئی تھی۔
سلطان صلاح الدین کی وزارت میں جو عروج و اعتماد اسکو نصیب تھا اُس کی وفات کے بعد اُسکے بیٹے ملک العزیز کے زمانہ میں بھی حاصل رہا۔ جب عزیز نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا ملک المنصور اپنے چچا ملک الافضل نورالدین کے حسن تدبیر سے مملکت پر قابض ہوا تو بھی قاضی کا اعتبار و احترام و اختیار بدستور قائم رہا۔ حتی کہ ملک العادل پہونچا اور اس نے ملک مصر فتح کرلیا جس روز وہ قاہرہ میں داخل ہوا ہے اُسی دن یعنی شب چہارشنبہ ۷- ربیع الآخر ۵۹۶ھ (۲۶- جنوری ۱۲۰۰ء) میں قاضی نے قاہرہ میں ناگہاں وفات پائی۔ دوسرے دن قرافہ صغرے کے سفح مقطم میں دفن ہوا۔ قبر کے گرد سنگ رخام کا کٹہرہ نصب تھا جس پر تاریخ کندہ تھی۔ اس کو ابن خلکان نے دیکھا تھا۔ قاضی کی نسبت لکھتا ہے "وكان من محاسن الدهر وهيهات ان يخلف الزمان مثله" قاہرہ کے بازار ملوخیہ میں اس نے مدرسہ بنوایا تھا اُسکا افتتاح اور تعلیم و تدریس کا آغاز روز شنبہ یکم محرم ۵۸۰ھ (۱۴- اپریل ۱۱۸۴ء) کو ہوا۔
لقب کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ اہل خاندان کہتے تھے کہ محی الدین تھا۔ قاضی ابن خلکان نے خود ایک مراسلت دیکھی تھی جس میں شیخ شرف الدین عبد اللہ بن ابی عصرون نے اسکو مجیر الدین سے مخاطب کیا تھا
قاضی فاضل کا بیٹا قاضی اشرف بہاء الدین ابو العباس احمد تھا، اس کی قدر و عزت بھی ملوک و

كُلُّ أَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِأَوْقَاتِهٖ وہ وقت بھی قریب آنے والا ہے کہ جب تذکرۂ آزاد میرے پنجہ سے آزاد ہوکر خلعتِ طباعت پہنے گا۔ اس کا وقت آچکا تھا کہ میں نے اپنی فرصت قلیل کے لمحے میر عبد الجلیل بلگرامی کے حالات کے فراہم کرنے میں صرف کئے اور اس اندیشہ نے مجھ کو

سلاطین بہت کرتے تھے، سماعتِ حدیث وتحصیل کتب کا بڑا شایق تھا۔

قاضی فاضل کا عربی دیوان نہایت خوشنما چھوٹی تقطیع پر مدراس کی گورنمنٹ مینسکرپٹ لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں بہت سی نادر کتابیں سلطان صلاح الدین اور بعض یمنی سلاطین کے خاندان کی پہونچی ہیں، اور محفوظ ہیں قلمی کتابوں کا یہ سرکاری ذخیرہ نہایت عمدہ اور قابلِ قدر ہے۔

۵۳ ابو الفیض السید محمد بن محمد بن محمد بن عبد الرزاق الشہیر بہ مرتضیٰ الحسینی الحنفی الواسطی البلجرامی الزبیدی کا پرائے نام حال ایڈورڈ ولیم لین نے اپنی عربی انگریزی کی لغت مَدُّ القَامُوْس کی تمہید میں لکھا اور اُس احسان واعانت کا تشکر واعتراف کیا ہے جو ان کو اپنی کتاب کی ترتیب میں تاج العروس سے پہونچی تھی۔ مزید تحریر کے لیے میں تاج العروس کے مصری طابع وناشران کا سپاس گذار ہوں۔

اُن کو اقرار ہے کہ سید اصل میں بلگرام کے رہنے والے تھے جو قنوج سے پانچ کوس پر دریائے گنگ کے اُس طرف ہندوستان میں واقع ہے۔ اصلہ من قصبۃ البلجرام علی خمسۃ فراسخ من قنوج وراء نھر جنجہ بالھند۔

مائۃ سالفہ کا نامور مصری مورخ علامہ شیخ عبد الرحمن الجبرتی عجائب الآثار فی التراجم والاخبار میں لکھتا ہے کہ سید مرتضیٰ کا سال ولادت ۱۱۴۵ ہجری تھا جو ۳۳-۱۷۳۲ عیسی کے مطابق ہوتا ہے۔ ابتدائی تربیت وتعلیم کے مدارج وطن میں طے ہوئے، صاحب برنامجہ نے تین سو شیوخ واساتذہ کے نام تحریر کئے ہیں جن سے سید مرتضیٰ نے افادہ کیا تھا۔ محدث علامہ محمد فاخر بن یحیٰی الہ آبادی المتخلص بہ زائر اور شیخ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ اور مولوی خیر الدین سورتی کے نام نامی ان میں ممتاز ہیں۔

خانوادۂ قادریہ میں سید یٰسین حموی کے مرید تھے۔ شیخ جعفر علوی مدنی سے بھی سند اجازت پائی تھی، یہ بزرگ دمشق سے ہندوستان آئے تھے۔

علم کا شوق بلکہ عشق سید مرتضیٰ کو وطن سے یمن لے گیا، وہ زَبید (بفتح زاء) میں عرصہ تک رہے جو یمن میں ساحل مغربی کے قریب ایک مشہور وقدیم شہر ہے۔ وہاں اتنی مدت گذاری کہ خود زَبیدی مشہور ہوگئے۔ یہی ولولۂ وشوق ان کو بارہا بلد الامین کو کھینچ لے گیا۔ اور وہ ہر بار اس کی بدولت اجر بے مزد یا شرف حج کی سوغات

استغال و استعجال پر آمادہ رکھا کہ مبادا تذکرۂ آزاد کی طرح تذکرہ میر عبدالجلیل بھی غیر مختتم و غیر مطبوع نہ رہ جائے۔ با ایں ہمہ کہ سامان مشورت و اصلاح خاطر خواہ میسر و مہیا نہ تھا اور یہ نقش کسی حسب مرضی عمل پیرانہ ہوا تھا، یہی ناقص تحریر ناظرین اولی الالباب کے حضور میں پیش کیجاتی ہے۔

ساتھ لیکے لوٹے۔

۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء، ۵۴ عیسوی) میں مصر گئے، وہیں شادی کی۔ مگر یہ تاہل و پابندی اُن کی آزادہ روی کو روک نہ سکی۔ وہ ممالک روم کو بھی گئے وہاں کے اعیان و سلاطین نے ان کے شایانِ شان عزت و توقیر کی۔ شیخ الشیوخ اور محدث کے نام سے مشہور تھے۔

قاہرہ کی مسجد کردی میں (جو ان کے مسکن کے سامنے تھی) بعد نماز جمعہ طاعون میں مبتلا ہوئے۔ دو روز بیمار رہکر شعبان ۱۲۰۵ھ (مئی ۱۷۹۱ء) میں یکشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔ وہیں مشہد معروف بہ سیدہ رقیہ میں دفن ہوئے قبر اپنے لئے پہلے سے تیار کرالی تھی، کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کے معاصرین لکھتے ہیں کہ بڑے علم دوست وسیع الاخلاق منکسر مزاج صاحب کیف وحال تھے۔

تصانیف شریفہ کا شمار سنو سے متجاوز ہے، اکثر شرح و حواشی نہایت سنجیدہ و پسندیدہ لکھے ہیں، صاحب بحر الزخار نے بعض کے نام بھی بتائے ہیں:-

۱ - اتحاف الصفا فی صلوٰۃ المصطفےٰ،

۲ - اتحاف الاصفیا فی سلاسل الاولیا،

۳ - اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیا علوم الدین۔ دس جلد میں عجیب و غریب چیز ہے۔ مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

۴ - کتاب الرجا والخوف من المنجیات،

۵ - الابتہاج بختم صحیح مسلم بن الحجاج،

۶ - اقرار العین بذکر اولاد الحسن والحسین،

۷ - اکلیل الجواہر الغالیہ فی روایۃ الحدیث الحالیہ،

۸ - تفسیر سورۂ یونس فی الامالی الحنفی،

۹ - حدیقۃ الضیا فی الدین المصطفےٰ،

۱۰ - الدرۃ المضیۃ فی الوصیۃ المرضیۃ،

توقع ہے اور آرزو کہ میری لغزشیں اور خطا کاریاں چشم عفو و نگاہِ مکرمت سے دیکھی جائیں۔
ابو الفیض محمد مرتضیٰ حسینی واسطی، جس کا خمیر اسی بلگرام کی خاک سے تھا مگر زبید (یمن) میں رہا اور مصر میں جا کر پیوند زمین ہوا میرا مدعا اپنی زبان میں ادا کر گیا ہے۔ ۵۰

۱۱ - رفع الاشتباہ من مناقب بسم اللہ،
۱۲ - المقاصد العبدیہ فی المشاہد النقشبندیہ،
۱۳ - عقد الجواہر الثمین فی تخریج حدیث اطلبوا العلم ولو کان بالصین،
۱۴ - الفیض الجاری فی اسانید البخاری،
۱۵ - عقد الجمان فی شعب الایمان،
۱۶ - عقد الجمان المنتظم فی ذکر امہات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،
۱۷ - کشف المغطّیٰ فی الصلوٰۃ الوسطیٰ،
۱۸ - النفحۃ القدوسیہ بواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ،
۱۹ - الازہار المتناثرہ،

علامہ الجبرتی اور نواب صدیق حسن خاں نے بھی کم و بیش انہیں حالات کو نقل کیا ہے،
خیال رہے کہ تاج العروس وقمع النفوس ایک اور مختصر رسالے کا نام بھی ہے جو مواعظ و اخلاق میں ابن عطاء اللہ السکندری نے لکھا ہے۔

سید مرتضیٰ نے تاج العروس شرح قاموس کی تالیف قاہرہ میں شروع کی تھی۔ اپنے قلمی نسخہ کی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں کہ چودہ سال دو ماہ کامل اس میں صرف ہوئے۔ عرب و عجم کو تسلیم ہے کہ تاج العروس فن لغت، اس کے اصول و تاریخ اور اشتقاق کی تشریح و توضیح میں لاثانی ہے۔ لین Lane کہتا ہے کہ "وہ بہترین مطول و مکمل تالیف ہے جسمیں لغات عربیہ کو ایک رواں اور سہل الفہم شرح کے طور پر قلمبند کیا ہے، جسمیں کوئی پہلو ضروری خوردہ گیری اور نکتہ بینی کا اٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔ جس میں امثال و نظائر اور حوالے اصلی ماخذوں سے اور صرف مشاہیر ادبا و شعرا کے کلام سے دیئے گئے ہیں ...... جسمیں قاموس اور دیگر لغات کے بعض اغلاط کی تصحیح بھی کر دی ہے۔" بایں ہمہ عزیزانِ مصر کی ایک قلیل جماعت اسکے بارہ میں متشکک و متامل ہے۔ اُس کا زعم یہ ہے کہ تاج العروس کو سید مرتضیٰ نے نہیں بلکہ کسی اور اہل علم (شخص لامعلوم) نے ترتیب دیا تھا۔ وہ بزرگ افریقۃ الغرب سے ادائے حج کیلئے قاہرہ ہو کر مکہ جا رہا تھا۔ اس اندیشہ سے کہ صحرائے اعظم میں ساری زندگی کی

یا ناظراً فی کتابی حین تقرؤہٗ اقرءِ ھدایت بلا ریب و لاشطط
ان مرسھو فلا تعجل بسبّک لی واعذر فلست بمعصوم من الغلط

محنت رائیگاں نہ ہو جائے اُس غریب الدیار نے یہ گنج شائگاں سید مرتضیٰ کے حوالہ کر دیا، اور راضی برضاء اللہ ہو کر خاک میں ملگیا۔ اہل درایت کو اس روایت کے ماننے سے قطعاً انکار ہے۔ پہلے تو اس پاک طینت جاں باز کا نام ہی نہیں بتایا جاتا ہے۔ پھر سید مرتضیٰ کے علم و تبحر اور جامعیت و کمال کو دیکھکر ایسی بے سر و پا حکایت کو کون باور کر سکتا ہے سُبحٰنکَ ہٰذَا بُہتَانٌ عَظِیمٌ۔

سید نے لسان العرب (مولفہ امام جمال الدین محمد بن علی الافریقی المعروف بہ ابن منظور۔ ۲۰ جلد) اور المحیط (مولفہ صاحب بن عباد متولد ۳۲۶ھ و متوفی ۳۸۵ھ بہ ترتیب حروف ہجا۔ سات جلد) کے سوا ایک سو سے زائد اُن کتب لغت کے نام بتائے ہیں جن سے تاج کی ترتیب و ترصیع میں مدد لی تھی۔ یہ جامع کتاب (تاج العروس) مصر میں بڑی تقطیع کی دس جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

تاج کی تکمیل کے ساتھ ہی صاحب تاج کی قدر تاجداروں کی طرف سے ہونے لگی۔ سید مرتضیٰ نے ایک نسخہ اپنے قدیم محسن و منعم و مرتبہ شناس بادشاہ صنعاء کے حضور میں تحفۂ نیاز مندانہ بھیجا۔ شیخ الجبرتی ناقل ہیں کہ ایک نسخہ محمد بائے ابو الذہب نے اپنے جامعہ میں رکھنے کیلئے لیا تھا اور ایک لاکھ درہم نقرہ سید کی نذر کئے تھے۔ یہ آٹھ ضخیم جلدوں میں تھا جسکی تصحیح اور حاشیہ نویسی خود اپنے قلم سے سیّد نے فرمائی تھی۔ ایک تیسرا نایاب نسخہ چوبیس ۲۴ ضخیم جلدوں والا امین صاحب نے الازہر میں دیکھا تھا جس کی نقل شیخ ابراہیم الدسوقی کے قلم سے تیرہ سال میں ختم ہوئی تھی۔

ان کے علاوہ خود سید مرتضیٰ کے قلم کے لکھے ہوئے کئی نسخے ۱۸۶۲ء تک مصر میں موجود تھے ایک جو جامع الازہر الاعظم کے رواق شامی میں رکھا تھا چودہ جلدوں میں تھا کچھ حصے محفوظ تھے باقی غائب یا تلف ہو چکے تھے۔ دوسرا کچی افندی الحکیم کے یہاں تھا جو سرکار خدیوی کے حکم سے مصر کی سالانہ تقویم مرتب و شائع کرتے تھے۔ یہ دو بڑی بڑی جلدوں میں تھا سیّد مرتضیٰ کا خط باریک گٹھا ہوا اور گھنا تھا۔ اس نادر خزینہ کو وزیر اعظم نے سعی مفرط سے حاصل کر کے قسطنطنیہ روانہ کیا تھا۔ حسرت ہے کہ منزل مقصود اور قدر شناس ہاتھوں تک نہیں پہونچا ؎

ہر چہ دل کرد فراہم ہمہ اشک دیدہ بباخت اللہ اللہ کہ تبہ کرد کہ اندوختہ بود

مخطوطات مبارک میں سے حدیث ام زرع کی تاویل بطور تصوف (سید مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی) مولانا ابو الحسن ذو الفقار احمد صاحب قضاء الارب نے بھوپال میں دیکھی تھی۔

معجم المشائخ خود انکے قلم کی لکھی ہوئی شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے کتب خانہ واقع مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ

اسلاف کرام کا معمول تھا کہ ضبطِ آثار میں احوال زمانی کو حوادثِ مکانی پر تقدیم دیتے تھے۔ میر عبدالجلیل کے حالات و ذاتیات سے پیشتر اس تذکرہ یا عام تبصرہ کے قلمبند کرنے میں راقم عاجز نے سنت الاولین کا اتباع کیا ہے۔

میر عبدالجلیل نے جس وقت عرصۂ ہستی میں قدم رکھا ہے طبقۂ اوسط کے نام اُس وقت لمبے چوڑے القاب سے پاک ہوتے تھے، نہ مولوی کا دورہ دورہ تھا نہ مولانا کا زور و شور۔ مولوی[۱] اور ملا زیادہ تر اہل علم بیشہ کے لئے استعمال ہوتے تھے، مولانا اکابر دین و مقتدایان ملت کیلئے

[۱] مَولوِی کو اہل لغت فتح میم و فتح لام کے ساتھ مَولا (یعنی خداوند و آزاد کنندہ) سے منسوب بتاتے ہیں۔ یائے نسبت کے الحاق سے مَولا کا الف جو حرف تھا حسب قاعدۂ نحویہ واؤ سے بدل گیا۔ بہ روایت پروفیسر براؤن ترکوں میں مَولوِی کا تلفظ مِوْلَوِی اور مَولا کا مِوْلَا (بکسر میم) ہے۔ وہاں "درویشان رقصان" کا ایک مستقل فرقہ مِوْلَوِی کے نام سے قائم ہے، جو خود کو مولانا جلال الدین رومی سے منسوب کرتے اور حضرت مولوی کو اپنا مولا (آقا) اور مقتدی بتاتے ہیں۔

علمائے کرام کا قول ہے کہ عربی زبان میں مَولیٰ کا استعمال چند معانی کے ساتھ پایا گیا ہے اور خود مصحف ناطق میں مختلف معانی کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ (۱) کبھی اولیٰ کے معنی ہیں جیسا کہ منافقین کے حق میں ارشاد ہوا ہے۔ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ۔ اے اولیٰ بکم۔ تم سب کا ٹھکانا ہے دوزخ۔ وہی تمہاری رفیق ہے۔ جزء ۲۷۔ سورۃ الحدید ع ۲-۵۔ یعنی تمہارے مناسب حال ہے۔ اور

(۲) کبھی بمعنی ناصر و یاور۔ جیسے قولہ تعالیٰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ۔ اَی لَا نَاصِرَ لَهُمْ (یہ اس سبب سے کہ مسلمانوں کا مددگار تو اللہ ہے اور اس سبب سے کہ کافروں کا کوئی مددگار نہیں (جزء ۲۶۔ سورۂ محمد ع ۱-۵) یعنی ناصر و حامی نہیں۔

(۳) کبھی بمعنی وارث، جیسے آیۂ کریمہ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ۔ اَی وَرَثَة (اور

مخصوص تھا۔ ایک اور لقب بھی کبھی کبھی نظر آتا ہے یعنی علامہ[۳۲]۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے چھ سات سو برس کے عہد حکومت اور نشر علوم و فضائل میں اس کی ہمہ گیری و تصرف کی بدولت اس کے متصف و جامع صرف چند اشخاص پائے اور مانے گئے ہیں۔ پہلا اکبر کا مشہور اہل علم اور صاحب سیف و قلم وزیر ابوالفضل[۳۳] علامی تھا۔ دوسرا جہانگیر کا مایہ نازش امیر اور شاہجہاں صاحب قران

جو ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں تو ہم نے ہر ایک۔ (مرنے والے کی میراث) کے حق دار ٹھہرا دیے ہیں۔ جزو ۵ سورۃ النساء ع ۲-۵) یعنی وارث۔ اور

(۴) کبھی بمعنی عصبہ کما قال اللہ تعالیٰ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ ای عصبتی (اور اپنے [مرے] پیچھے مجکو بھائی بندوں سے خوف ہے۔ جزو ۱۶ سورۃ مریم ع ۱-۴) یعنی اپنے عصبہ سے۔

(۵) نیز بمعنے دوست، جیسے یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا ای صدیق عن صدیق (جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئیگا۔ جزو ۲۵ سورۃ الدخان ع ۲-۱۵) اور

(۶) سید و معتق کے معنی میں بھی کبھی کبھی آتا ہے (یہ بحث نور الابصار میں ملاحظہ طلب ہے) جیسے حضرت عمر نے فیروز غلام مغیرہ سے کہا تھا۔ احسن الی مولاک واتق اللہ (اپنے سردار کے ساتھ بھلائی کر اور خدا سے ڈر)

۳۲ علامۃ و علامی۔ دونوں لفظ عین کے فتح اور لام کی تشدید کے ساتھ ہیں بمعنی "بہت بہت جاننے والا"۔ ان دونوں لفظوں کے آخر میں تا اور یا تانیث و نسبت کے لیے نہیں بلکہ مبالغہ کے واسطے ہے گویا ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک میں دو دو علامتیں مبالغہ کی موجود ہیں۔

۳۳ ابوالفضل۔ شیخ مبارک ناگوری کا منجھلا بیٹا اور ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی کا بھائی تھا۔ شیخ صاحب ناگور کے رہنے والے تھے لیکن ان دونوں بھائیوں کا مولد آگرہ ہے۔ ابوالفضل ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کا تھا کہ تمام علوم معقول و منقول سے فارغ ہو گیا۔ کئی سال عزلت و تجرد میں بسر کئے، پھر بعض خیر خواہوں کے اصرار سے اکبر اعظم کے دربار میں حاضر ہوا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھ کر پیش کی۔ الطاف خسروانہ مبذول ہوئے۔ پہلے منشی گری کی خدمت پر پھر عہدۂ وزارت پر ممتاز و سرفراز ہوا۔ بعض ممالک کی فوج کشی و فتح کے لیے بھیجا گیا۔ قلیل عرصہ میں بادشاہ کے دل میں اتنی جگہ پیدا کر لی کہ امرا اور شاہزادے بھی حسد کرنے لگے۔ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں دکن سے آگرہ حسب الطلب جا رہا تھا کہ شاہزادہ سلیم کے ایما سے راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ والی اوڑچھہ کے ہاتھ سے انتری (ریاست گوالیار، ضلع نرور) میں ۴ ربیع الاول (۱۳ اگست) روز جمعہ کو مارا گیا۔ ترپن سال کی عمر تھی۔ اعظم خاں وزیر نے بطریق تعمیہ تاریخ نکالی۔ یفعل اللہ ما یشاء بحکم اللہ ما یرید۔ تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید۔ دونوں مصرعے تاریخی ہیں۔ دو

ثانی کا مدبر و فلسفی وزیر، افضل[۳۴] خاں علامی۔ تیسرا تاجِ شاہجہانی کا بے نظیر الماس، وزیر السلطنت سعد اللہ[۳۵] خاں۔ چوتھا، اُسی دورِ یا قران کا لعل شب چراغ (سعد اللہ کا بیٹا) لطف اللہ[۳۶] خاں [آزاد مرحوم]

میں سر باغی یعنی ب کے دور کر دینے سے باقی حروف کے اعداد سے تاریخ نکل آتی ہے۔ صحیح تاریخ نکالنے کے لیے پہلے مصرعہ کو یفعل اللہ ما یشاء یحکم ما یرید پڑھنا چاہیے۔ مشہور ہے کہ شیخ نے خواب میں آکر کہا تھا کہ "تاریخ فوت من بندۂ ابو الفضل"۔ اس کی ضخیم و عظیم الشان تصانیف میں جامع اللغات و مکاتبات علامی و عیار دانش (۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۸ء) اور اکبرنامہ (۱۰۱۰ھ یعنی ۱۶۰۲ء) و رسالہ مناجات (۹۹۳ھ مطابق ۱۵۸۵ء) اور آئین اکبری (۱۰۰۶ھ یعنی ۱۵۹۸ء) ہیں۔ آئین اکبری کا ترجمہ کلکتہ میں فرانسیس گلیڈوین نے ۱۷۸۳ء میں شائع کیا تھا۔ امور سلطنت ہند میں انگریزوں کو اس سے ابتداءً بڑی مدد ملی۔ اکبرنامہ کا ترجمہ انگریزی میں مستشرق نامور مسٹر ایچ، بیوریج H. Beveridge نے کیا ہے اور شائع ہو گیا ہے۔

۳۴ نواب افضل خاں علامی کا اصلی نام شکر اللہ (ولد عبد الحق) اور لقب ملا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں شیراز سے دکن آئے۔ عبد الرحیم خاں خانخاناں سے کمال موافقت حاصل ہوئی۔ انہی کی معرفت بارگاہ جہانگیری میں رسائی ہوئی۔ منصب ملا۔ جوہر قابل دیکھ کر شاہجہاں نے ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں ارادت خاں برادر آصف خاں جعفر بیگ کی جگہ وزارت کل پر مقرر کر دیا۔ شد فلاطون وزیر اسکندر (۱۰۳۸ھ) تاریخ ہے۔ آخر میں ہفت ہزاری منصب اور چار ہزار سوار کے رتبہ تک پہونچ گیا تھا۔ ستر سال کی عمر میں ۱۲ رمضان ۱۰۴۸ھ (۷ جنوری ۱۶۳۹ء) کو لاہور میں انتقال کیا۔ ع زخوبی بردہ گوئے نیکنامی" تاریخ ہے۔ دوسری تاریخ "علامی از دہر رفت" ہے۔ چینی روضہ آگرہ میں دفن ہے۔ صاحب مفتاح التواریخ نے علّامی کو غلامی پڑھا اور غلامی کو نواب کا تخلص بتایا ہے۔ افضل خاں بڑا مزاج داں اور موقع شناس تھا۔ شاہزادہ دارا شکوہ اپنے منشی چندر بھان برہمن تخلص کو شاہجہاں کے سلام کے لئے لے گیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اپنا کوئی شعر پڑھے برہمن نے عرض کیا ؎

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار ۔۔۔ بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ نہایت ناخوش ہوا اور پوچھا اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے؟ افضل خاں حاضر تھا فوراً شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود ۔۔۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد

بادشاہ نے تبسم فرمایا اور پھر کچھ نہیں کہا۔

۳۵ نواب سعد اللہ خاں چنیوٹی شاہجہاں کے منصب داران کبار سے تھا پیشگاہ سلطانی سے جملۃ الملک خطاب

دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ ابوالفضل کے بعد علّامہ کا خطاب سلاطین تیموری میں سعد اللہ خان چنیوٹی کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوا کہ وزیر شاہجہاں کا تھا]۔ اودھ کی کم عمر و ناپائیدار امارت یا مملکت نے بھی اپنے ایک رکن تفضل حسین خاں کشمیری کو یہ عزت بخشی تھی اور محققین کی ایک جماعت اعتراف کرتی ہے

تھا، اہل علم وکمال کے متفقہ فتوے سے "علامی فہامی" کہلاتا ہے۔ انگریز مورخین (جن میں نواب کا معاصر اور چشمدید شاہد ڈاکٹر برنیر اور دوسرا انیسویں صدی کا تاریخ نویس وگورنر الفنسٹن خاصکر قابل ذکر ہیں) لکھتے ہیں کہ "سرزمین ہند پر سعد اللہ خاں سے بڑھکر کوئی مدبر کوئی قابل کوئی راستباز وزیر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ذات پر ہندوستان جس قدر فخر کرے بجا ہے۔" وہ ایشیائی وزراء کا بہترین نمونہ بتایا جاتا ہے۔ شاہجہاں کے ہر ایک ملکی وانتظامی کام میں وہ پیش پیش نظر آتا ہے۔ دہلی کی مسجد جامع شاہجہانی مشہور بہ مسجد جہاں نما کی بنیاد بادشاہ کے حکم سے ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ (۲۸۔ اکتوبر ۱۶۵۰ء) کو ڈالی جاتی ہے تو دیوان اعلیٰ (سعد اللہ) اور خان ساماں (فاضل خاں علاء الملک تونی) کی موجودگی حضرت سلطانی کے جانب سے کافی سمجھی جاتی ہے۔ عالمگیر بھی اپنے مراسلات میں برابر اس کا حوالہ دیتا اور مدح وستایش کے ساتھ متواتر ذکر کرتا ہے۔ سعد اللہ خاں نے درد قولنج میں ۲۲۔ جمادی الثانی ۱۰۶۶ھ (۹۔ اپریل ۱۶۵۶ء) کو اڑتالیس برس کی عمر میں وفات پائی۔

۵۳۵ سعد اللہ خاں کا بیٹا لطف اللہ خاں (باپ کے مرنے کے وقت) گیارہ سال کا تھا۔ شاہجہاں نے اُسکی سرپرستی کی، منصب دیا، خاندان کے مرتبے کے مناسب اعلیٰ تعلیم وتربیت فرمائی۔ عالمگیر کے عہد میں پایۂ والائے وزارت پر ممتاز ہوا۔ ۱۰ شعبان ۱۱۱۴ھ (۲۰۔ دسمبر ۱۷۰۲ء) کو بزمانہ تسخیر قلعہ گندانہ غلبۂ استسقا سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ ۵۸ سال عمر پائی۔ "صد افسوس ز لطف اللہ خاں" میں ۱۱۱۴ھ تاریخ نکلتی ہے۔

۵۳۶ خان علامہ۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں نائب الریاست اور مدار کل تھے بڑے صاحب تصانیف تھے۔ ایک کتاب ہیئت حکماے فرنگ میں دوسری صناعت جبر ومقابلہ میں یادگار دنیا د چھوڑی ہیں، نواب وزیر علی خاں کی معزولی اور اسکو صحیح النسب تسلیم نہ کرنے میں یہ بھی شریک تھے اور اسی لیے شعرا اور اہل غرض نے انکو ناشایستہ الفاظ سے یاد کیا ہے، سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ واپس آرہے تھے کہ مابین کلکتہ ومرشدآباد کے ۱۵۔ شوال ۱۲۱۵ھ (۲۰۔ فروری ۱۸۰۱ء) کو وفات پائی، میر انشاء اللہ خاں نے دریاے لطافت میں ان (کے ایک شاگرد) کی گفتگو سے روزمرہ اور ایک دہقانی خادم باد ام سنگھ سے طرق مکالمت کا یہ نمونہ نقل کیا ہے "اس مردک بدرگ نے خود کو کیا قرار دیا ہے کہ رُو د بس غطار فہ سے دم شادی مارتا ہے اور عواقب امور سے بے اندیشۂ محض ہو کر طوالت کلام لاطائل سے صماخ سامعین پریشان کرتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ احوال زمانے کا علی التخارج

کرخان علامہ اپنے تبحر علمی میں فرید عصر تھا حکمائے فرنگ کی ہیئت جدیدہ، جبر و مقابلہ اور بہت سے علوم وفنون غریبہ میں جو نادر کتابیں اُس نے یادگار چھوڑی ہیں، اُس عصر عشرت و عیش میں اُن کی مثال پائی نہیں جاتی۔ میر عبدالجلیل کو اُن کے بعض معاصرین واخلاف نے اُن کا فضل و کمال اور تقدس

شتی ہے۔ غایت ما فی الباب یہ کہ سفہا و بلہا و حاقین کے اذہان قاصرہ میں مرتسم ہو کہ یہ شخص اپنے اکفاء و اماثل واقران میں بڑا طلیق و ذلیق، لوذعی المعی لا یکل لسانہ فی الکلام ہے۔ لو فرض و سلم کہ کوئی اپنے افراط اخلاق سے اس کی خرافات وطامات بیجا پر راد نہ ہوا تو بھی لسّادیہی اُس کی اذہان اشخاص رفیع القدر کے ساتھ مابونی کے نزاوتیین کی طرح سافین سے ثابت نہ ہو سکے گی"۔

۵۳۔ شاہ میر عبدالجلیل بن میر عبدالواحد قدس سرہ پنجشنبہ ۲ ماہ رجب ۹۷۲ھ (۲۴۔ فروری ۱۵۶۵ء) کو پیدا ہوئے جذبات قویہ اور کیفیات عالیہ رکھتے تھے۔ آغاز شباب میں وحشت دل دامنگیر ہوئی۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کر جنگل کو چل دیے، بارہ سال باہر رہے۔ دلق درویشی میں اقصائے عالم کی سیاحت کی، مدتہائے دراز صحرا و بیابان میں بسر فرمائیں۔ درختوں کے پتے اور خود رو نباتات قوت لایموت بہم پہونچاتے، خلق اللہ سے اجتناب و گریز رہا۔ ایک زمانہ تک ان کی خیر خیریت نہیں ملی۔ اقربا مایوس و ناامید ہو چکے تھے۔ بارہ سال کے بعد حضرت بدیع الدین شاہ مدار رحمۃ اللہ علیہ کا موسم عرس آیا جن کی زیارت کے لئے اطراف واکناف دور دست سے خلائق اُمڈی چلی آتی تھی۔ تو زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ آپ بھی وارد بلگرام ہوئے۔ یہاں سے شاہ مدار کا مرقد منور واقع مکن پور بارہ کوس رہ جاتا ہے۔ اتفاقاً شاہ عبدالجلیل کا گذر اُس کوچہ سے ہوا جہاں آپ کی حقیقی ہمشیر رہتی تھیں۔ میر صاحب اُس وقت اکثر بیخودی کے عالم میں رہتے اور نعرے لگایا کرتے تھے۔ جب بہن کے مکان کے سامنے پہونچے تو وہاں بھی نعرہ لگایا۔ بہن نے باوجود طول ایام جدائی اور اُن کی حیات سے مایوس ہو جانے کے بھائی کی آواز پہچان لی اور یہ کہتی ہوئیں کہ "یہ آواز تو عبدالجلیل کی معلوم ہوتی ہے" بے اختیار ڈیوڑھی (دہلیز خانہ) تک دوڑی چلی آئیں اور بھائی سے لپٹ کر زار زار روئیں۔ شاہ صاحب نے ہر چند نا آشنا بنا اور کنارہ کرنا چاہا لیکن صلۂ رحم غالب آیا اور وحشت مہر و الفت سے بدل گئی۔ پھر وہ عفیفہ ان کو گھر میں لے گئیں۔ رفتہ رفتہ لباس پہنایا۔ میر صاحب نے بعد چندے شادی بھی کی۔ صاحب اولاد ہوئے۔ آخر عمر میں بلگرام سے قصبہ مارہرہ (حال واقع ضلع ایٹہ) کو تشریف لے گئے اور قیام فرمایا۔ وہیں دوشنبہ کے دن آٹھویں ماہ صفر ۱۰۵۷ھ (۵ مارچ ۱۶۴۷ء) کو رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار خالص الانوار مارہرہ میں زیارت گاہ انام اور سجادۂ ہدایت باعث فیضان خاص و عام چلا آتا ہے (از مآثر الکرام)

واتقا تسلیم کرنے پر بھی عموماً صرف "میر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ البتہ اُن کے فرزند ارجمند میر سید محمد شاعر اور اُن کے مایۂ نازش نواسہ میر غلام علی آزاد نے کبھی کبھی "علامہ" بھی لکھا ہے جو بادی النظر میں محض اُن کے حسن عقیدت اور شرف انتساب پر محمول ہو سکتا تھا مگر دیدۂ حقیقت میں اسکی وجہ اور بھی بتاتا ہے

۱۳۹ ہندوستان کے مغل بادشاہ تیمور یا تمرلنگ کی نسل سے براہ راست تھے، اسی نے ہندوستان فتح کیا تھا لیکن اس کی تو وہ پودہ سمرقند The Maracanda of Quint-Curtius میں رہی سہی اور بڑھی۔ اُس کے پرپوتے بابر کو یہ خیال سب سے پہلے پیدا ہوا کہ اُس نے اپنے ممالک و جاگیر کو جو ازبک تاتاری (عرفاً توران) میں واقع تھی چھوڑ کر اُس سے کم دشوار طلب اور زیادہ زرخیز ملک (ہندوستان) میں قیام اختیار فرمایا۔

۱۴۰ یہ تخت نادرۂ روزگار اور شاہجہاں کی دولت و حشمت کا بہترین اور مشہور یادگار تھا۔ اس کی سقف اندر سے بیشتر مینا کاری تھی اور کچھ جڑاؤ۔ باہر سے لعل و یاقوت اور بیش بہا پتھروں سے مرصع تھی۔ اس کا چتر بالکل مرصع و مغرق بنایا گیا تھا جو زمرد کے بارہ ستونوں پر قائم تھا۔ اس کے اوپر طاؤسوں کے دو پیکر جو جواہر و لآلی آبدار سے مکلل تھے لگائے گئے تھے ان دونوں طاؤسوں کے درمیان ایک درخت مرصع لعل و الماس اور زمرد و مروارید سے تعبیہ کیا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لیے تین پایوں کی ایک سیڑھی جو آبدار جواہر سے مرصع تھی بنائی گئی تھی۔ یہ تخت سات سال کے عرصہ میں ایک کرور روپیہ سے زائد کی لاگت میں تیار ہوا تھا مشہور سیاح ٹیورنیر Tavernier جس کا موروثی پیشہ زرگری و جواہر فروشی تھا لکھتا ہے کہ اس میں تقریباً ساڑھے چھ ملین اسٹرلنگ (ساڑھے چھ کرور روپیہ) سے کم صرف نہ ہوا ہوگا۔ اس تخت میں جو جواہر نصب کئے تھے اُن میں صرف ایک لعل ایک لاکھ روپیہ کا تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے زنبیل بیگ کی معرفت جہانگیر بادشاہ کو تحفتاً بھیجا تھا۔ جہانگیر نے فتح دکن کے صلہ میں اسے شاہجہاں کو دیدیا تھا۔ وزن میں بارہ مثقال تھا (ایک مثقال اٹھائیس رتی کا ہوتا ہے) یہ لعل خاص مرزا الغ بیگ کی ملکیت تھا مرزائے مذکور نے اُس پر خط نسخ میں الغ بیگ ابن میرزا شاہرخ بہادر بن امیر تیمور گورگان کندہ کرا دیا تھا۔ گردش روزگار سے یہ لعل منتقل ہو کر خاندان صفویہ میں پہونچا تو شاہ عباس نے اُس پر خط نستعلیق میں "بندۂ شاہ ولایت عباس" کندہ کرایا۔ جب جہانگیر کے پاس آیا تو اُس نے اپنا نام مع اپنے آبا کے ناموں کے اُس پر لکھایا۔ پھر شاہجہاں نے اپنا نام اضافہ کرا کے اُس کو تخت کے وسط میں جڑوا دیا۔ شاہجہاں نے اُس تخت کے اندر حاجی محمد جان قدسی کی ایک مثنوی کے بیس شعر کی مینائے سبز سے لکھائی تھی۔ اورنگ شاہنشاہ عادل اور سریر ہمایوں صاحبقرانی (۱۰۴۴ھ مطابق ۱۶۳۵ء) اس کے تاریخی نام تھے۔

کشمیر کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد شاہجہاں نے اس تخت پر مستقر الخلافہ اکبرآباد میں جلوس فرمایا اور نو دن تک جشن

بزرگان بلگرام اور مشاہیر زمانہ میں ایک اور بزرگ بھی میر عبد الجلیل گزرے ہیں۔ ان کا نام نامی اور شہرۂ مشیخت وعظمت اہل وطن میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اس لئے ان دونوں ہموطن وہم نسب حضرات میں تمیز کرنے کے لیے یہ کلمہ (علامہ) اُس بزرگ کے لیے استعمال کرنا ضروری ولابد سمجھا گیا تھا جو اپنے اوصاف عالمانہ اور فضل وتبحر کے لحاظ سے حقیقتاً اس کا اہل بھی تھا۔ بہر کیف اس قدر معلوم ہے کہ "میر علامہ" کے لقب نے باوجود سبقت زمانہ "خان علامہ" (تفضل حسین) کے

منایا تھا۔ یہ تخت دودمان تیموریہ میں محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ تک چلا آیا جب نادر شاہ نے ہندوستان فتح کیا تو یہاں کے غنائم داشتہ گرانمایہ کے ساتھ اسکو بھی لیکر ایران چلا گیا۔

۵۴؎ عمر بن عبد العزیز بن مروان رضی اللہ عنہ۔ ابوحفص کنیت۔ سلیمان بن عبد الملک کے عہد میں مصر کے گورنر رہے تھے۔ یونانی علوم اور فنون سے خوب آگاہی رکھتے تھے اُن کی تحقیقات واشاعت میں کمال رغبت ودلچسپی کا اظہار فرماتے۔ علوم وفنون کے بڑے شائق اور سچے قدر دان تھے۔ بعض کتابیں عبرانی وسریانی سے ترجمہ کرائی تھیں اور ایک اچھا خزانۃ الکتب مجتمع وفراہم کر دیا تھا۔

سلیمان کی جگہ مسند آرائے حکومت ہوئے تھے۔ تمام مورخین نے خواہ عرب کے ہوں خواہ عجم، خواہ فرنگ کے ان کا ذکر نہایت ادب وتکریم کے ساتھ کیا ہے۔ آپ نہایت زاہد ومتقی تھے۔ ان کے اعمال خیر کی تفصیل سے ان کی سیرت وتذکروں کے اوراق معمور ہیں۔ مسٹر براؤن اپنی تاریخ ادبیات ایران میں لکھتے ہیں کہ "ناخدا شناس، حریص وخود پرست فرمانروایان خاندان امیہ میں عمر بن عبد العزیز تنہا ایک روشن اور شریف استثناء نظر آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی حکمرانی تمام وکمال عالم معاد کے مفادات وملاحظات پر مبنی تھی نہ کہ اس دنیائے دنی کے، لیکن وہی (حکومت) آملی (مالگذاری) سلطنت کی تباہی کا باعث ہوئی۔ انھوں نے نہایت وفاداری وپابندی کے ساتھ انھیں طریقوں کی نقل وتقلید فرمائی جو اِن کے جلیل الشان وعظیم القدر ہمنام عمر بن الخطاب کے زمانِ خلافت میں رائج تھے۔"

براؤن پر کچھ منحصر نہیں، خود مورخان اسلام اور سیرت نویس خلفا عمر بن عبد العزیز کے پیشروؤں کو ایسہ جور اور خلفائے تغلب ومطامع بتاتے ہیں۔

اکابر سلف ان کو عموماً "عمر ثانی" اور "شیخ بنی امیہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور عہد حاضر کے مورخین اور مصنفین "موذی خلیفہ" کے نام سے۔ ان کا شمار خلفائے راشدین میں (خامس) ہوتا ہے تخت نشین ہوتے ہی

مقابلہ میں زیادہ شہرت و بقا نہیں پائی۔ شاید اسکی وجہ یہ ہی رہو کہ سید موصوف وکالت مطلق، وزارت یا کسی بالا منصب تک نہ پہونچے تھے۔ بے شبہ میر عبدالجلیل ایک نہایت باکمال شخص تھے، اور ہر ایک شعبۂ کمال اور جملہ اصناف فنون میں ممتاز دخل رکھتے تھے۔ اُن کا ذکر اُن کے معاصرین اور بعد کو آنے والے تذکرہ نویسوں نے فضلا، اہل لغت، شعرا اور صلحا کے ذیل میں کم و بیش ضرور کیا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ زمانہ ناموافق پایا تھا اور اقبال نامساعد۔ میرے سات بادشاہوں کا

انھوں نے اصطبل شاہی کے سب گھوڑے فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرادی۔ ان کی نیک خصال و متقیہ بی بی فاطمہ خاتون نے جو خلیفہ عبدالملک کی ناز پروردہ بیٹی اور دو بادشاہوں ولید اور سلیمان کی بہن تھیں اپنے تمام جواہر و زیور بیت المال میں بھیج دیے۔ یہ تقویٰ اور خشیت الٰہیہ کی کیفیت اُس شخص کی تھی جو ایام شاہزادگی میں بڑی امارت و عیش و تنعم کی زندگی گزار رہا تھا اور جس نے گورنر مدینہ ہوتے اور اختیار و حکومت پاتے ہی یک قلم زہد و درویشی اختیار کر لی۔ حضرت انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم متوفی بصرہ ۹۳ھ) کی موعظت اور تعلیم صلوٰۃ و اسرار دین کا جناب عمر کی پاکیزہ طبیعت پر زیادہ اثر پڑا تھا۔

تحریر و تدوین سنن اور اخبار نبوی بھی آپ ہی کے آثار شریفہ سے ہے۔

آپ نے سمح بن مالک خولانی کو حاکم اندلس مقرر کیا جس نے جنوبی فرانس کے علاقہ اور ناربونہ فتح کئے۔

افریقہ کے بربروں نے محض عمر کے فضائل اور حسن خصائل کو سُنکر اسلام قبول کیا تھا، پھر تولس و طرابلس کے باشندوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ سندھ اور بعض ممالک ترکستان کے رہنے والے آپ ہی کی دعوت و اعلاء حق سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بعض گرجاؤں کی زمینیں عیسائیوں کو واپس دلادیں، دمشق کے گرجا کا وہ حصہ جسکو عیسائیوں کی مرضی کے خلاف انھیں کی تیز مزاجی و بدزبانی کی وجہ سے ولید نے جامع مسجد میں شامل کر لیا تھا، عیسائیوں کو واپس کر دینے کا حکم دیا۔ پھر جب عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہم صلح ہوگئی تو اس مصالحت کے موافق انہدام مسجد کو منع کر دیا، اور عیسائیوں کو غوطۂ دمشق کے تمام گرجے واپس و حوالہ کر دیئے۔

مولانا شبلی اپنے رسائل میں بہ ذیل حقوق الذمیین لکھتے ہیں کہ "ایک عیسائی نے ہشام بن عبدالملک پر جو بڑی عظمت و اقتدار کا خلیفہ گزرا ہے ایک جایداد کا دعویٰ کیا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمر نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا، اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہوکر جواب دہی کرو۔ ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا حضرت نے کہا نہیں تم خود سامنے کھڑے ہوکر جواب دو۔ ہشام نے عیسائی کے ساتھ

زمانہ دیکھا، اُن کے درباروں میں رسوخ بھی حاصل کیا۔ سلطنت کے اہل حل وعقد اور امرائے دولت سے برابر کا رابطہ وسابقہ رکھا لیکن اُس وقت تیموری کے اخلاف کا تاج ہوا میں اُڑ رہا تھا، ملک میں منازعات وانقلابات عظیم رونما تھے۔ اکبر وجہانگیر کا ارث جاہ وجلال تخت طاؤس کے ساتھ ساتھ بیرونی واندرونی حملہ آوروں کی ہیبت وجلادلی سے تھرّا رہا تھا۔ بیچارے میر عبدالجلیل کی قدر اُن کے مرتبہ کے موافق کون کرتا۔ ملک الشعرا، یا تاج العلماء کون بناتا، علامہ کون کہتا۔

اب رہے امرائے دولت اور اعیان سلطنت۔ ایک تو وہ بجائے خود متردد وپریشان تھے، نوع بنوع

سخت کلامی شروع کی، حضرت عمر نے نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ روئداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا اُسکو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اس نے پیش کی تھی چاک کردی جائے۔"

مساجد کے منبروں پر جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بُرائی خطبوں میں کی جاتی تھی اُسکو آپ نے بند کردیا۔ آل رسول کو باغ فدک نذر کردیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ذریت طیبہ وعترت اطہار کی بڑی تعظیم وتوقیر فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہا کسی کام سے ان کے پاس گئے۔ عمر نے کہا کہ "جب آپ کا کوئی کام ہوا کرے تو آدمی بھیجکر مجھے بلوا لیا کیجئے میں حاضر ہوں گا۔ یا مجھے رقعہ لکھ بھیجا کیجئے۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ وہ آپ کو میرے دروازے پر دیکھے۔"

ایک بار آقائے مومنین مولائے رحمۃ للعالمین اسامہ بن زید کی صاحبزادی عمر بن عبدالعزیز کے پاس گئیں، عمر نے اُن کو بڑی عزت وتکریم کے ساتھ اپنی جگہ پر بٹھایا خود اُن کے سامنے بیٹھے اور اُن کا ہر کام پورا کردیا۔

اسوۂ صحابہ میں بحوالہ اسد الغابہ مرقوم ہے کہ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیز شام میں لوگوں کا وظیفہ تقسیم فرما رہے تھے ایک شخص اسی غرض سے حاضر ہوا اور کہا کہ "میں قریش سے ہوں" انھوں نے پوچھا "قریش کی کس شاخ سے ہو؟" بولا "بنو ہاشم سے" فرمایا "بنو ہاشم کے کس خاندان سے" بولا "میں علی بن ابی طالب کا غلام ہوں"۔ انھوں نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ "میں بھی علی کا غلام ہوں" پھر اپنے خزانچی سے دریافت کیا کہ غلاموں کو کیا وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ "سو سے دو سو درہم تک" فرمایا "یہ علی ابن ابی طالب کا غلام ہے، اس کو ساٹھ دینار دو"۔ پھر کہا کہ "اپنے ملک میں جاؤ ہر سال تم کو اس قدر رقم پہونچتی رہیگی جتنی

کے مصائب و آفات میں مبتلا ہ دوسرے حکمار کا قول ہے کہ جس شغل کی طرف سلاطین کے طبائع مشغول ہوتے ہیں زمانہ کے لوگ بھی اسی کو پسند کرتے اور انھیں کی پیروی و تتبع کرنے لگتے ہیں۔ تجربہ اور بداہت عقلی سے بھی یہ کلیہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ عمر بن[۱۴۱] عبد العزیز کے عہد میں لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو نماز، روزہ نوافل و اذکار و اوراد کی بات چیت اور سوال وجواب ہوتا تھا۔ سلیمان[۱۴۲] بن عبد الملک کے زمانہ میں نکاح و عشرت، عشق بازی اور الوان طعام کا چرچا رہتا اور گفتگو ہوتی۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی حکایتیں اور واقعات دانشمندان عرب کے اس قول کی

غلاموں کو ملتی ہے"۔

آپ کے عہد میں جب جدار قبر مطہر حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام درست کی گئی تو بقدر ایک شبر (بالشت) مُسنّم و مُرتفع کر دی گئی، ائمہ اربعہ اس کی اجازت دیتے اور استحباب فرماتے ہیں، بخلاف مسلک قدمائے شافعیہ کے جو تسطیح کو مستحب بتاتے ہیں۔

دو سال پانچ ماہ خلافت کر کے رجب سنہ ۱۰۱ھ (سنہ ۷۱۹ء) میں راحلہ پرداز بقا ہوئے یا بقول مستشرقین فرنگ آپکی وفات پہلی صدی اسلامی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ہوئی۔

[۱۴۲] سلیمان بن عبد الملک خلفائے بنی امیہ سے تھا، اپنے بھائی ولید کی جگہ سنہ ۹۶ھ (سنہ ۷۱۵ء) میں سریر امارت پر بیٹھا اور دو سال سات (یا آٹھ) ماہ حکمرانی کر کے ۲۰ صفر سنہ ۹۹ھ (۲۰ اکتوبر سنہ ۷۱۷ء) کو وفات پائی۔ خراسان و دیگر ممالک و اقطاع فارس میں اسلام اس کے بھائی اور پیشرو ولید کے اور خود اس کے عہد میں پھیلا۔ یزید بن مہلب حاکم کوفہ نے طبرستان اور جرجان فتح کیا۔ اس کے بھائی مسلمہ بن عبد الملک نے قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی، اور عرصہ تک محاصرہ کئے پڑا رہا۔ بالآخر حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے فوجیں واپس بلالی گئیں۔

یہ بادشاہ نیک نیت اور معتدل مزاج سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اختیار پانے پر حجاج کے اسیر ستم کئی ہزار قیدیوں کو مخلصی دیدی۔

شعرا، اور اہل کمال کا بڑا قدردان اور سرپرست تھا۔ فرزدق اس کا درباری شاعر تھا۔ ایک بار مجلس خاص میں اپنا قصیدہ پڑھ رہا تھا جب اس شعر پر پہونچا ؎

فبتن بجانبی مصرعات وبت افض اغلاق الختام

تائید کرتے ہیں کہ الناس علیٰ دین ملوکھم بادشاہ وقت یا حکمران قوم کے شیم واخلاق جب ہنرمندی و ہنر پروری پر رہبری و دلالت کرتے ہیں تو ارکان دولت اور اکابر مملکت بھی اکتساب فضائل میں پیش پیش اور استحصال فنون و کمالات میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کی عادات و خصائل کو دیکھکر اہل علم و صاحبان کمال کی سرپرستی اور عزت افزائی کی توقع کس سے ہو سکتی تھی۔

مرزا غالب نے ایک موقع پر کہا ہے ؎

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز　　ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

یہ محض ادّعاے سخنورانہ نہ تھا بلکہ "موئینہ پوش" شاعر کی سرگزشت تھی لیکن فلسفۂ ارتقا کا سبق یہ ہے کہ علم اور جاہ توام ہیں۔ دوش بدوش رہنا چاہیے۔ بلا مساعدت یکدگر شہرت و عروج نصیب نہیں ہوتا۔ انھیں زندۂ جاوداں ہستیوں کو دیکھیے جن کے نام ابھی لے چکا ہوں۔ ایک امیرزادہ

(تو انھوں نے میرے پہلو میں پڑے پڑے شب گزاری اور میں نے یوں رات کاٹی کہ بند دروں کی مہروں کو توڑتا رہا) تو خلیفہ بولا "ارے کمبخت فرزدق! تو میرے سامنے اقرار زنا کر رہا ہے تجھپر حد شرعی لابد ہوگئی"۔ فرزدق نے عرض کیا کہ "مجکو تو کتاب اللہ حد سے محفوظ ہونے پہ آگاہ کرتی ہے"۔ پوچھا "کہاں اور کیسے" کہا کہ خداوند عز اسمہٗ فرماتا ہے وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ (اور شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو گمراہ ہیں۔ جزء ۱۹۔ سورۃ الشعراء ع۔ ۱۱-۱۵) الیٰ قولہ تعالیٰ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (بیشک وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ جزء ۱۹۔ الشعراء ع ۱۱-۱۵) سلیمان ہنس پڑا اور چھوڑ دیا۔

فخرالدین محمد رازی صاحب تاریخ حدائق الانوار لکھتے ہیں کہ سلیمان نہایت پرخور شخص تھا۔ ہر روز ایک من کے قریب کھانا کھا جاتا تھا۔ جامع التواریخ میں مرقوم ہے کہ اسکو طعام و نکاح سے کمال رغبت تھی، اسی لئے اسکے زمانہ میں لوگوں کی خواہش بھی انھیں دو چیزوں پر منحصر تھی۔

اہل تاریخ نے اسکی بسیار خوری کے متعلق عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں۔ اپنے زمانۂ خلافت میں ہیلا حج کرنے ۹۷ھ (۷۱۶ء) میں گیا۔ مدینہ منورہ پہونچا تو بڑی سیرچشمی سے اہل شہر کی دعوت کی۔ چوراسی دُنبے ذبح ہوئے۔ ان سب کے کلّے پائے اور گردے بھون بھون کر دعوت سے پہلے ہی ہضم کر گیا۔ پھر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر شکم سیر ہو کر کھایا۔ طائف شریف میں ابن ابی زہیر ثقفی نے ضیافت کی۔ یہاں اس نے ایک دنبہ چھ مرغیاں

لطف اللہ خاں) کو چھوڑ کر باقی سب نے جھونپڑوں میں پرورش پائی تھی، زوایا و مساجد کے صحن میں چٹائیوں پر بیٹھکر یا درختوں کے نیچے کسب علم کیا تھا۔ لیکن شہرت و نام نے اُس وقت قدم چومے کہ جب تخت و تاج کے سایہ و سرپرستی میں آگئے۔

اپنی جامعیت کمالات و مہارت السنہ اربعہ و تبحر علمی کے لحاظ سے میر فرد فرید تھے اور ورع و تقویٰ میں ممتاز۔ اُن کو خزینۂ غیب سے دولت جمعیت دارین نصیب تھی وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (اور ہم نے اُن کو دنیا میں بھی بہتری دی تھی اور آخرت میں بھی وہ ضرور نیک بندوں میں ہوں گے۔ جزو ۱۴۔ سورۃ النحل ع۔ ۱۶۔ ۲۲۔)

میر تقی میر کا یہ شعر بعینہٖ میر جلیل کے حسب حال تھا ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس! تمکو میر سے صحبت نہیں رہی

بیس رقاق (نان تنک) اور ایک سو ستر انار نوش جان فرماتے تھے۔ حج کے لیے بھی بڑے تزک و احتشام اور سامان و اہتمام کے ساتھ گیا تھا۔ صرف اس کی ذات خاص کی پوشاکیں سات سو اونٹوں پر بار تھیں۔

یادِ بخیر پُورب

سلامی علیٰ شرقٍ و من حلّ فی شرقٍ   سلامی علیٰ سکّانہ قلّ عن حقٍّ

پورب کی تاریخ قدیم سے علم و علماء کے دامن سے وابستہ، اور یہ سرزمین اُن کی بدولت معدنِ فضل و شرف رہی ہے۔ سید محمد کرمانی جو سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی کے مرید رشید تھے سیر الاولیا میں لکھتے ہیں کہ "مولانا فرید الدین شافعی، اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ جن کے روبرو بڑے بڑے علمائے متبحرین نے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ مولانا علاء الدین نیلی[۱] اودی، کشاف کے قاری ہوتے تھے اور مولانا شمس[۲] الدین یحییٰ سے نامور، اور دیگر فضلائے اودھ سامع"۔ پائے تختِ خلافت کے حصار کو چھوڑ کر جو ہر قسم کے اہلِ کمال کا مرجع اور مرکز ہو رہا تھا، اور ہونا چاہیے تھا صوبہ اودھ و الہ آباد کو جو خصوصیت حاصل تھی اور کسی قطعۂ مملکت ہند میں پائی نہیں جاتی۔ یہاں والوں نے ہر زمانہ میں اپنے تراکم افکار و اجتماع عقول سے جملہ کمالات نفسی کو علماً، عقلاً، اور نقلاً انتہائے ترقی پر پہونچا دیا تھا۔ اودھ کے پورے صوبہ اور الہ آباد کے اکثر حصہ میں پانچ کوس تک شرفا و نجبا کی آبادی تھی جن کو سلاطین و حکام نے وظائف و زمین، مدد معاش میں دے رکھی تھیں۔ مساجد، مدارس، خانقاہیں تعمیر کی تھیں جن کے دروازے اہلِ تلاش کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ علما ہر جگہ مشغول افاضہ و تدریس تھے۔ اطلبوا العلم کی صلائے عام کانوں میں گونج رہی تھی۔ طلبہ جوق جوق ایک شہر سے دوسرے کو جاتے اور موافقت مزاج و مذاق پا کر مصروف

---

[۱] ابن ابی الحجاج شاعر کے ترجمہ میں قاضی ابن خلکان لکھتا ہے کہ "نیل" دراصل ایک نہر کا نام ہے جو حجاج بن یوسف نے کھدوائی تھی اور نیلِ مصر کے نام پر اُسکا نام رکھا تھا۔

قاضی نور اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ "نیل" رود فرات کے کنارے بغداد اور کوفہ کے درمیان ایک شہر تھا۔

[۲] سألت العلم من احیاک حقا   فقال العلم شمس الدین یحییٰ   یہ مبالغہ شاعرانہ نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے جو مولانا شمس کے نامور شاگرد شیخ نصیر الدین محمود اودی الدہلوی کے معجز رقم قلم سے بے ساختہ ادا ہو گیا ہے۔ اہلِ علم نے متفقاً تسلیم کیا ہے کہ اس ملک میں علم کے جسم بے جان میں مولانا ہی نے جان تازہ ڈالی۔

تحصیل ہو جاتے، ہر بستی کے صاحب توفیق، طالبان علم پر نظر رکھتے اور اس جماعت کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ جانتے تھے۔ صاحب قران ثانی شاہجہاں کو ناز تھا کہ "پورب شیراز مملکت ما است"۔ ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ع) تک علم و علماء کا یہ ہنگامہ اس گل زمین پر گرم رہا تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں[۴۵] نیشاپوری آغاز جلوس محمد شاہ میں صوبہ اودھ کا حاکم مقرر ہو کر آیا اور صوبہ الہ آباد کے اکثر اچھے شہر مثل جون پور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہان آباد وغیرہ کے ضمیمہ حکومت ہو گئے تو قدیم و جدید خانوادوں کے وظائف و منشنیں یک قلم ضبط کر لیں۔ شرفا و نجبا پریشان ہو گئے۔ اضطرار معاش نے کسب علم سے باز رکھا۔ سپہ گری کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ تدریس و تحصیل علوم کا اُس درجہ رواج نہ رہا۔ پرانی پرانی مشہور درسگاہیں تباہ ہو گئیں اور اربابِ کمال کی مجلسیں برہم۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

وہ اودھ (یا اجودھیا۔ دار الامارۃ پورب) کے رہنے والے تھے۔ اور مولانا ظہیر الدین بکری اور مولانا فرید الدین شافعی کے تلمیذ رشید۔ خرقۂ خلافت سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایونی دہلوی سے پہنا تھا۔ اپنے مرشد کے وصال کے دو سال بعد ۷۲۶ھ (۱۳۲۶ع) میں رحلت فرمائی۔

[۴۵] محمد امین نام، سادات موسوی نیشاپور سے تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا۔ ابتداءً کچھ روز نواب سربلند خاں تونی صوبہ دار گجرات کے ساتھ گذارے پھر محمد فرخ سیر بعدازاں محمد شاہ کے حضور میں پہونچا ترقی کی، وسوخ حاصل کیا نواب برہان الملک سعادت خاں خطاب مرحمت ہوا صوبہ داری اودھ پر سرفراز کیا گیا ہفت ہزاری منصب پایا محاربۂ نادرشاہی میں موجود تھا۔ جنگ کے بعد مگر قتل عام سے ایک شب پہلے ۲۹۔ ذیحجہ ۱۱۵۱ھ (۱۰ مارچ ۱۷۳۹ع) کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ وجہ موت درد کی شدت اور زخم کی کلفت تھی کئی ماہ سے ایک بنل نے ستا رکھا تھا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ "برہان الملک" امیر الامرا ہونا چاہتا تھا اسمیں ناکامی ہوئی تو آزردہ خاطر ہو کر نادرشاہ قہرمان ایران سے ملگیا۔ اور بدگوئی و سعایت کی۔ جنگ کے آغاز میں مجروح و اسیر ہوا پھر صلح کے لئے سلسلہ جنبانی اور پیغام رسانی کی۔ نادرشاہ محض اُسی کی تحریک و اشارہ سے بہ بہانۂ ضیافت کرنال کے میدانِ جدال سے شاہجہاں آباد آیا، اور قلعہ میں داخل ہو گیا تھا۔ ورنہ در اصل اُس کا ایسا ارادہ نہ تھا۔ زر موعودہ تو قع پہونچنے میں دیر ہوئی۔ نادرشاہ نے سختی کی اور برہان الملک کے مونھ پر تھوک دیا۔ میر محمد قاسم عبرت نامہ میں لکھتے ہیں کہ برہان الملک اسی وجہ سے زہر کھا کر مرگیا تھا۔ تاریخ وفات "بے سعادت نمک حرام بمرد"

برہان الملک کی رحلت پر اُس کا بھانجہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ [۱] حکمران ہوا، اُس کے وقت میں بھی وظائف و اقطاعات بدستور ضبط رہے۔ محمد شاہ کے اواخر عہد یعنی ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں صوبہ داری الہ آباد پر بھی صفدر جنگ کا تقرر ہوگیا تو رہے سہے وظائف جو اس صوبہ میں اب تک ضبطی سے محفوظ تھے اُنکی بھی شامت آگئی۔ احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ نے پایۂ وزارتِ اعلیٰ پر ترقی و سرفرازی پائی۔ نائب صوبہ نے ارباب وظائف کو نہایت تنگ اور پریشان کیا اور ان صوبجات میں حوادث روزگار سے یہ پامالی حدِ انتہا تک پہونچ گئی۔

اس داستان الم یا سرگذشت عہد گل کو میر غلام علی بلگرامی کے خوں چکاں و خونیں نوا قلم نے مآثر الکرام کے صفحات پر خوب ادا کیا ہے ع

عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

---

[۱] ۱۱۵۲ھ ہے۔ ۱۱۵۱ھ ہونا چاہیئے تھا، ایک عدد زیادہ ہے۔

عمدۃ الملک نواب امیر خاں (تخلص بہ انجام) سے نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ ایک روز دونوں نواب دربار شاہی میں حاضر تھے، سعادت نے طنزاً کہا ؎ پسرِ نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد طعن یہ تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد ہوکر تم نے یہ شیوہ ناشایان اختیار کیا ہے اور مسخر و مذاق کیا کرتے ہو امیر خاں نے فی البدیہہ جواب دیا کہ صحیح ہے ؎ سگِ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد یعنی آپ گمنام تھے یہ شہرہ و مرتبہ پاگئے۔ سعادت خاں دہلی میں اپنے بھائی سیادت خاں کے مقبرہ میں دفن ہے والہ داغستانی نے مرثیہ لکھا تھا ؎

دُور از تو سپہر و اثر گوں می گرید
بنگر کہ زمانہ بے تو چوں می گرید

رفتی ز جہاں و پشت شمشیر شکست
با قامت خم ہمیشہ خوں می گرید

میر غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں برہان الملک کی زندگی کے ہر پہلو کو پاک اور خوشنما بنا کر دکھایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مورخ نہ تھے، شاعر تھے اور شاعروں کی طرح تذکرہ نویس۔ یا یوں کہئے کہ بلگرام کی سکونت و تعلقات اور نواب شجاع الدولہ کی حکمرانی اودھ سے مجبور تھے ؎

حافظ بخود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

پورب کی تعریف میر آزاد سبحۃ المرجان میں فرماتے ہیں کہ "وہ دہلی سے جانب شرق ایک وسیع ملک ہے، جس کے متعلق تین صوبے، اودھ، الہ آباد اور عظیم آباد ہیں"۔ اور "صوبہ زمین وسیع و محدود کو کہتے ہیں کہ جسمیں دارالامارۃ واقع ہو۔ اور دیگر شہر بھی متعلق ہوں"۔ "ہر شہر کے تابع چند قصبے ہوتے ہیں جو اُس کی طرف مضاف کردیے جاتے ہیں"۔ "پورب کے قصبے بھی شہروں کے برابر ہیں، ان میں عالیشان عمارات اور شرفا و نجبا، مشائخ و علما اور مختلف اقوام اور انواع و اقسام کے پیشہ وروں کے مکانات اور مساجد و مدارس و پرستش گاہیں موجود ہیں۔ وہاں کی مسجدیں جمعہ و جماعت کی نمازوں سے آباد ہیں اگر اُن کو شہر کہیے تو بجا ہے"۔

صوبۂ اودھ کے مردم خیز قصبات نے جس قدر اور جس پایہ کے اہل علم و فضل پیدا کیے ہیں مجموعًا سارے ملک ہند نے بھی ایسے باکمال پیش نہیں کیے۔ مولانا شیخ سعد الدین خیرآبادی، ملا قطب الدین شہید سہالوی، مولوی قطب الدین شمس آبادی، شیخ غلام نقشبند لکھنوی، شیخ احمد ملا جیون امیٹھوی، مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، ملا حمد اللہ، ملا حسن، ملا کمال، قاضی مبارک، ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ، میر عبد الجلیل بلگرامی، میر غلام علی آزاد، اسی خاک سے اُٹھے تھے جو علم و شہرت کے آسمان پر شمس و قمر ہو کر چمکے۔

۴۶ اصلی نام مرزا مقیم، ابو المنصور خاں کنیت و لقب، وزیر الممالک نواب منصور علی خاں صفدر جنگ خطاب تھا۔ سیادت خاں کا بیٹا، برہان الملک سعادت خاں کا بھانجا اور داماد تھا۔ ماموں کے مرنے کے بعد شروع سال ۱۱۵۲ھ (اپریل ۱۷۳۹ء) میں دو کرور روپیہ بطریق پیشکش نادر شاہی خزانہ میں داخل کرکے محمد شاہ کے حضور سے صوبۂ اودھ کا خلعت حاصل کیا۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں احمد شاہ بادشاہ کے تخت نشین ہونے پر عہدۂ وزارت اعلیٰ پر سرفراز ہوا۔ سات سال تک تمام انتظامات سلطنت اور اختیارات شاہی اپنے ہاتھ میں رکھے۔ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں وزارت سے معزول ہوا۔ پایۂ سریر سلطنت سے رخصت ہو کر اپنے مستقر حکومت صوبۂ اودھ و الہ آباد کو جا رہا تھا کہ لکھنؤ سے تین منزل اس طرف پاپڑ گھاٹ میں ۱۷۔ ذی الحجہ (۱۴۔ اکتوبر ۱۷۵۴ء) کو جادہ نورد منزل بقا ہوا۔ برہان الملک کی طرح اس کا خاتمہ بھی ایک بڑے دانہ کے نکلنے اور درد کی شدت سے ہوا تھا۔ اس کی لاش برائے چندے گلاب باڑی فیض آباد (اپنے دار الحکومت) میں امانتاً سپرد زمین رہی۔ بعد ازاں

سلام! اے پورب کی سرزمین سلام!! تجھ پر اور اُن قدسی پیکروں پر رحمت اور سلام!!! جو تیری پاک آغوش میں راحت گزیں اور محو خواب نوشیں ہیں جن کے اعمال حسنہ اور حسنات جاریہ کی برکات ایک عالم پر سایہ فگن ہیں جن کی یاد میرے اور تیرے سینہ میں موجزن ہے۔ اس تار و تنگ دنیا کے در و دیوار شاہد ہیں کہ کبھی تو نے اپنی تجلیوں سے اُسکو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ اہل دل اور اہل نظر کے لیے تو محبت کی چیز ہے ؎

ومن شیمتی حب الدیار لاھلھا   وللناس فیما یعشقون مذاھب

شاہجہاں آباد بھیجی گئی۔ شاہ مردان کی درگاہ کے متصل اس کا رفیع الشان اور منیع البنیان مقبرہ مع ایک وسیع و پُر فضا باغ کے اب بھی نہایت اچھی حالت میں موجود ہے۔ تیس لاکھ روپیہ اس کی تعمیر میں صرف ہوا تھا۔ اُس کی بجائے اُس کا بیٹا نواب شجاع الدولہ صوبہ داری اودھ پر مامور ہوا۔

صفدر جنگ کے زمانۂ وزارت میں بہت سے تنازعات برپا ہوگئے تھے۔ وزارت سے ہٹایا گیا تو مقابلہ و مقاتلہ کے لئے مستعد و آمادہ ہوگیا چند امرائے با اقتدار سے سازش کر کے اپنے مخالفین سے جنگ و پیکار شروع کر دی۔ اس کے رفیق اور مدار مہام سورج مل جاٹ نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ دہلی کا یہ محشر خیز سانحہ "جاٹ گردی" کے نام سے مشہور ہے۔ ہر چند اس کی جاگیر کے محالات کا متصل و مہتمم اور راج اندر گوشائیں ملتزم خدمت و نگران کار تھا۔ اس کی فرد جرائم کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ بہ حیلۂ ضیافت و مہمانی اس نے نواب بہادر جاوید خاں کو بلوا کر مروا ڈالا تھا اور دغا کی تھی۔

ن دیدنی

دار السلام بلگرام

بلگرام کا نامور شاعر، شاعر تخلص جس کا تذکرہ مختصراً پایان کتاب ہذا میں بھی آئیگا، اپنے وطن کی مدحت و ستایش میں نوا سنج ہے:۔

سیر باید کرد یاراں نوبہار بلگرام — برزمرد ناز دارد سبزہ زار بلگرام
ہر نفس عطر گلستان یمن بو می کنند — خوش دماغاں از نسیم مشکبار بلگرام
عطف از فردوس می سازد عنان دیدہ را — چشم بینا ے کہ می گردد دوچار بلگرام
اہل معنی کسب انوار سعادت می کنند — از سواد اعظم دولت مدار بلگرام
شش جہت تنگ است بر جولان خرش همتش — بر فراز عرش نازد شہسوار بلگرام
یاد ہندوستاں کجا از خاطر طوطی رود — میکند شاعر بجا وصف دیار بلگرام

شاعر سخنور پر منحصر نہیں، خود اُسکے پدر گرامی قدر (صاحب تذکرہ ہذا، میر عبد الجلیل) نے ایک پوری مثنوی 'امواج الخیال' نام لکھکر وطن پسندی اور وطن دوستی کی داد دی ہے۔ "حب الوطن من الایمان" کا حق بلگرام کے اور بھی بہت سے اہل کمال نے ادا کیا ہے۔ امواج الخیال کی چند لہریں اپنی رَو میں قارئین محترم تک آجائیں گی لیکن اَوروں کے نغمہ و نشید کی ان معدود اوراق میں گنجایش نہیں۔ اِسی الفت کا اقتضا کہئے یا سوئیت طوئیت و حسن عقیدت کا جاذبہ کہ بزرگان بلگرام، بلگرام کا نام بھی ہمیشہ کمال عظمت و حرمت کے ساتھ لیتے رہے ہیں۔ میر غلام علی نے اسکو "دار السلام" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ وزن و قافیہ کی رعایت سے یہ نازک خیالی قابل داد ہے!

حسب تحریر محققین متاخرین (و روایت مآثر الکرام) بلگرام کا طول البلد ایک سو سولہ درجہ پندرہ دقیقہ اور عرض البلد چھبیس درجہ پچپن دقیقہ سمت قبلہ ہے اور پچپن دقیقہ مغرب سے جانب شمال۔ مسافت مابین مکہ و بلگرام ۳۵ درجہ ترپن دقیقہ ہے اور باعتبار شما فراسخ ساٹھ سو نواسی کوس۔ مساحت جدیدہ

(گرین ایچ واقع انگلستان) کے مطابق پیشتر عرض البلد ستائیس درجہ دس دقیقہ تیس ثانیہ شمالاً اور طول البلد اسّی درجہ چار دقیقہ تیس ثانیہ شرقاً بتایا جاتا تھا مگر اب ستائیس درجہ گیارہ دقیقہ شمالاً اور اسّی درجہ دو دقیقہ شرقاً ثابت ہوتا ہے۔

بلگرام کی وجہ تسمیہ کی نسبت رُواۃ اور افسانہ خوانان کہن کا بیان ہے کہ یہ نام ایک دیو "بل" نامی سے منسوب ہے۔ بعض "الالا پسر بلال" سے اس کا انتساب ظاہر کرتے ہیں جسکو نیمسار کے متبرک و مرتاض رشیوں کے ایما سے سری کرشن جی کے بھائی "بلرام" نے قتل کیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ "بل" وہ دیو تھا جس کو ابتدائے زمانہ اسلام میں شیوخ نے ہلاک کیا تھا۔ شیوخ بلگرام کا دعوےٰ ہے کہ ان کے اسلاف نے جو محمود غزنوی کی رفاقت و ہمرکابی میں یہاں آئے تھے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں راجپوتوں کو خارج البلد کر کے قصبہ کا نام بلگرام رکھا تھا جس کی تائید و تصدیق میں اشعار ذیل پیش کرتے ہیں:۔

مسلماں رسیدہ بہ ہندوستاں ۔۔۔ ز قوماں ہمی بود صد بقیاں

جنود و حلیس بود انصاریاں ۔۔۔ ز ترکان و افغان و انصاریاں

ز چار و صد و شش ہجری تمام ۔۔۔ سری نگر را نام شد "بلگرام"

آزاد لکھتے ہیں کہ اکابر طریقت میں سے خواجہ عماد الدینؒ و سید محمد صغراؒ نے سب سے پہلے بلگرام کو بلگرام بنایا اور اپنے مقدم گرامی سے شرف و اکرام بخشا تھا۔ چنانچہ میر سید محمد خواجہ صاحب کی شان میں فرماتے ہیں ؎

ﷺ خواجہ عماد الدین حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی (اوشی) دہلوی کے مرید اور اسی مقام کے صاحب ولایت تھے۔ حسب روایت مآثر الکرام خضر علیہ السلام سے ملاقات تھی۔ فقر و تصوف میں مقامات عالیہ طے کر چکے تھے اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری کا نقاب ڈال کر ایک خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ کبھی کسی کو خلیفہ حتیٰ کہ مرید بھی نہیں کیا۔ سید شریف بن سید عمر حسینی واسطی بلگرامی نے کتاب مرأت المعتقدین میں آپ کے حالات کمال عظمت و احترام کے ساتھ لکھے ہیں۔ باوجودیکہ قنوج اور بلگرام کے مابین دریائے گنگ حائل ہے لیکن بحالت طالب علمی روزانہ

خواجۂ کامل عماد الدین قطب الاولیا　　حلقۂ باب حریم او حصارِ بلگرام
از دُرودِ موکب این خسروِ عالیجناب　　سرمۂ چشم مَلک باشد غبارِ بلگرام
آستانِ اشرفِ او بوسہ گاہِ آسماں　　بارگاہِ اقدسِ او افتخارِ بلگرام

دسویں صدی کے پیشتر کی تاریخ تو بہت کم معلوم اور کم قابل اعتماد ہے، تاہم بلگرام کے متعلق کچھ افسانے یا حوالے "بھونیت کرت" اور اس کے ترجمہ "پریم ساگر" میں ملتے ہیں۔ یا کچھ قصّے کہانیاں بعض زبانوں پر باقی ہیں۔ البتہ دریائے گنگا کے فراخ و دراز کنارے اور بلند پہاڑیاں اُن خونریزیوں کی شاہد ہیں جو اس زرخیز و مردم آفریں خطہ کی فتح و تسلط کے لئے ازمنۂ ماضیہ میں وقوع میں آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقام ٹھٹیرا قوم کی حکومت و قبضہ میں مدت ہائے دراز سے چلا آتا تھا۔ کبھی اس کا تعلق ہستنا پور کی غربی سلطنت سے ہو جاتا (جس کا تذکرہ مہابھارتہ میں ہے) اور کبھی اجودھیا کی شرقی بادشاہت سے (جس کے کارنامے رامائن میں مرقوم ہیں) پھر پچھم سے راجپوتوں نے قدم بڑھایا۔ ریکوار راجہ سری رام نویں یا دسویں صدی عیسوی میں دریائے گنگ کو عبور کر کے قنوج سے مع اپنے رفقا و عساکر کے یہاں آیا اور اس کے بلند ٹیلہ پر قصبہ آباد کیا، قلعہ و شوالہ تعمیر کیا۔ ایک وسیع تالاب یا ساگر بنا کر شہر کا نام سری نگر رکھا۔ بعد ازاں ۶۰۵ھ (۱۲۱۰ء) میں بسرکردگی قاضی یوسف جوامراو سالاران افواج محمود سے تھے فتح مند عثمانی شیوخ آئے اور ریکواروں کو شکست دیکر پورے راج کو فتح کر لیا۔ مشہور ہے کہ مصالح ملکی کے اقتضا سے یا اپنے راج کے استحفاظ کے لئے راجہ سری کا بھائی بھی مشرف باسلام ہو گیا تھا۔ اُس کا نام مختار الدین اور اُس کے بیٹے کا اختیار الدین رکھا گیا۔ "شرایف عثمانی" کی تالیف

صبح کو قنوج جاتے اور سبق پڑھکر شام کو واپس آجاتے تھے۔ کبھی کسی کو اپنی کیفیت سے آگاہ نہ ہونے دیا۔ آخر ایام زندگی میں ایک امر خارق عادت سرزد ہو گیا تھا جس نے سارا راز فاش کر دیا۔ سلطان شمس الدین التمش کو بھی حقیقت حال سے خبر ہو گئی۔ اعتقاد و انقیاد کا شرف بجا لایا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد خواجہ نے ۲۔ شوال ۶۳۲ھ (۲۷۔ جون ۱۲۳۵ء) کو عالم ارواح کو انتقال فرمایا۔ مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ فلاں بلندی پر مجھے دفن کرنا۔ وہ پریوں اور دیووں کی جگہ ہے۔ ان کا آسیب شہر سے دور ہو جائے گا۔

کے وقت تک قاضی یوسف موصوف کا ایک سجل[۴۹] مرقومہ ۴۲۳ھ (۱۰۳۱ء) میر سید عزیز الدین معروف بہ لال پیر گوپاموی کے احفاد و اخلاف کے قبضہ میں موجود تھا۔ میر غلام علی آزاد بھی اس روایت کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن انگریز مورخین اسکو تسلیم نہیں کرتے۔ انکی تحقیقات کا ماحصل اسکو مشتبہ کرتا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ تو ممکن ہے کہ محمود کی فوجیں بلگرام سے گزری ہوں اور لوٹ مار ہوئی ہو کچھ شیوخ یہاں رہ گئے ہوں مگر نظر بہ واقعات مابعد مسلمانوں کا قبضہ اور مستقل قیام تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایلیٹ صاحب (Sir H. M. Elliot) نے اپنی تاریخ ہندوستان جلد دوم میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مرأت مسعودی سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ سید سالار مسعود قنوج سے سترکھ جاتے ہوئے اس طرف سے (۴۲۳ھ یا ۱۰۳۲ء میں) گزرے تھے۔

بہرحال جب بہ عہد شہاب الدین محمد غوری اُسکے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں راجہ جے چند پر حملہ کر کے قنوج فتح کیا اور قرب وجوار کے تمام رؤسا و راجگان کی قوت، حکومت و سطوت کو خاک و برباد کر دیا تو اسی سلسلہ بلکہ اسی سال میں بلگرام پر مسلمانوں کا قبضہ بھی مسلسل و مستحکم ہو گیا۔ اس کے ایک قرن بعد سلطان شمس الدین التمش نے اپنے عساکر قاہرہ پھر قنوج نیز ان اطراف [illegible] تسلط و تنظیم حکومت کے لئے بھیجے۔ چنانچہ اُس کے دو سردار شیخ محمد فقیہ عراقی اور سید محمد صغری نے [illegible] خراسان کی جانب سے ہندوستان آئے تھے) ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں سری نگر اور اس کے مضافات کو ریگواروں سے چھین لیا اور رعایا و باشندگان کو مطیع و منقاد کیا۔ تاریخ "فتح خداداد" ۶۱۴ھ ہے۔ انہیں دونوں حضرات (شیخ و سید) کی اولاد یہاں آباد و اقامت گزیں ہوئی اور پرگنہ بلگرام کے مختلف مناصب و خدمات، چودھری و قانونگو و قاضی پران کا تقرر اُس وقت بالذات عمل میں آیا مگر بعد چندے یہ عہدے

[۴۹] سید محمد صغری: بلگرام کے تمام سادات حسینی واسطی کے جد اعلیٰ ہیں ان کا لقب دراصل صاحب الدعوۃ الصغریٰ تھا۔ آپ بھی خواجہ قطب الدین دہلوی کے مرید اور فضائل صوری و معنوی میں فرد فرید تھے۔ اعلائے کلمۂ دین اور احیائے سنت سنیہ میں ہمیشہ راسخ قدم اور استوار رہے۔ بظاہر سلطان التمش کی ملازمت میں بسر کرتے اور خود کو نظر خلائق سے پوشیدہ و متواری رکھتے تھے۔ ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں غازیان اسلام کی ایک جماعت کے ساتھ بلگرام آئے۔ راجہ سری

ان کے خاندانوں اور قبیلوں میں موروثی اور مستمر کردیے گئے۔

سید محمد صغری فاتح بلگرام نے جب بحکم سلطانی یہاں قیام فرمایا تو ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں وسط شہر میں ایک بلند ٹیلہ پر ایک قلعچہ حاکم نشیں تعمیر کرایا، سنگ کتابہ پر یہ عبارت منقوش تھی۔

حامی البلاد راعی العباد ذی الامان لاہل الایمان وارث ملک سلیمان، صاحب الخاتم فی ملل العالم ظل اللہ فی الخافقین ابو المظفر التمش السلطان ناصر امیر المومنین ادام اللہ تمکینہ فی شہور ۶۲۷ھ سبع وعشرین وست مأتہ۔

اس کے بعد کی تاریخ بھی دلچسپ واقعات اور اہم معرکوں سے معمور ہے لیکن راقم اوراق اپنے تذکرہ کی تنگ دامانی سے معذور۔ ضروری و مختصر یہ ہے کہ جب ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں صوبہ اودھ کی حکومت ملک حسام الملک کو تفویض ہوئی تو اُس نے سلطنت کے اس حصہ پر بھی توجہ کی اور تاسیس واستحکام ملک داری وامن کی تدابیر عمل میں لایا۔ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں ملک الشرق خواجہ جہان کا قبضہ ہوا۔ باوجود متواتر ومتوالی معرکہ آرائیوں کے حسین شاہ کے وقت تک اودھ کا علاقہ جونپور کے حدود مملکت میں داخل رہا۔ ۸۹۳ھ (۱۴۸۸ء) میں حسین شاہ کو شکست ہوئی اور یہ قطعہ پھر سلطنت دہلی کے متعلق ہوگیا۔ ظہیر الدین بابر نے ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں فتح کیا۔

تاج وتخت دہلی کے دو رقیب دعویداروں میں ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں اس جگہ معرکہ آرائی و قوت آزمائی ہوئی۔ مغل تاجدار ہمایوں نامدار کی رفاقت میں نوے ہزار نبرد آزما جوان تھے، اور حوصلہ مند شیر خاں سُوری کے زیر فرمان پچاس ہزار آزمودہ کار سپاہی۔ ان شیر دل جوانمردوں

نے مقابلہ ومقاتلہ کیا۔ خود مع اقارب داعیان سپاہ کے ته تیغ ہوا۔ آپ نے مع فرشوری شیوخ اور ترکمانوں کے یہاں قیام اختیار فرمایا۔ اور ایک ہی مقام پر اکتیس سال بسر کردیے۔ ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ (۱۵۔ دسمبر ۱۲۴۷ء) کو عالم قدس میں راحت فرمائی۔ مزار پر پیشتر ایک لوح سنگین نصب تھی جس پر آیۃ الکرسی اور تاریخ وفات منقش تھی۔ پتھر گرگیا۔ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں قبر کی درستی ومرمت از سرنو ہوگئی

کے خون کی بو خاک بلگرام سے اب تک آجاتی اور اُس موقع کا نشان دیتی ہے جہاں نا ہمایونی و نامساعدت بخت سے ہمایوں کو ناکامی و شکست ہوئی تھی۔

آئین اکبری میں بلگرام کو "بلگرانو" لکھا ہے جو ایسے ناموں کے تلفظ و املا کا قدیم طریقہ تھا بلگرام اُس وقت سرکار قنوج متعلق صوبہ اودھ میں شامل تھا۔ جامع آئین لکھتا ہے کہ "بلگرام قصبہ ایست خوش ہوا بیشتر مردم آں خوش فہم و سرود سرا۔ ودر آنجا چاہے است کہ ہر کہ چہل روز آب از وآشامد شناسائی و حسن منظر افزاید"... "قلعہ از خشت پختہ دارد" یہ سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) یعنی آئین اکبری کی تالیف کے زمانہ میں اس قلعہ میں ایک ہزار فوج پیادہ اور بیس سوار رہتے تھے۔

اکبر کی وفات سے لیکر اودھ کی جداگانہ امارت یا سلطنت کے قائم ہونے تک ان اطراف کے متعلق تاریخوں میں بہت کم حالات پائے جاتے ہیں لیکن بلگرام اور اہل بلگرام کی تاریخ اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ مقام ہمیشہ ممتاز و معروف رہا ہے۔ بلگرام والوں نے اپنے شہر کا نام ہر صورت و عنوان سے روشن کیا ہے۔ اس شہر کی اہمیت کسی وقت اس قدر تھی کہ اس سرزمین پر سلطان اورنگ زیب نے بھی قدم رکھا تھا۔

میر غلام علی آزاد مآثر الکرام میں تحریر فرماتے ہیں کہ "در صوبہ اودھ محروسہ بلگرام از قدیم منشار فضلار کرام و مظہر علمائے عظام است و فراواں دانشمند ازیں شہر برخاستہ و مجلس افادہ و استفادہ بکمال خوبی آراستہ...."

آرایش محفل (تاریخ ہندوستان) میں بلگرام کی نسبت مرقوم ہے کہ "..... ایک بڑا قصبہ ہے۔ اکثر وہاں کے لوگ قابل و شاعر، صاحب طبع ہوئے ہیں۔ قصبہ مذکور میں ایک کنواں ہے جو کوئی

---

۴۹ سجل بکسر سین وجیم و تشدید لام۔ چک جس پر مہر ہو۔ یا کوئی تحریر جس پر قاضی کی مہر و دستخط ثبت ہوں۔ قبالۂ شرعی یا قاضی کا حکمنامہ۔

۵۰ قلعہ کی عمارت مرور دہور سے جب گرنے لگی تو ڈھائی سو برس ہوئے یہ پتھر سید میاں کی مشہور مسجد واقع محلہ سید واڑہ کی دیوار میں نصب کر دیا گیا۔ "اللہ ہے انقلاب مجل ہیں یہ پتھر" پتھر فقط عمارتِ شاہی کا رہ گیا

چالیس دن متصل اُس کا پانی پیے، خوب گانے لگے، سوائے اس کے اکثر اہل کمال گذرے ہیں" مغل میں یہ لئے غالباً آئین کی بلند آہنگی سے پہونچی ہے۔ مسٹر جے۔ سی ولیمس نے پہلی رپورٹ مردم شماری میں اسکو نقل و ترجمہ کرکے اس قدر اضافہ کیا ہے کہ "بزرگان بلگرام کے علم و فضل کا شہرہ مدتہائے دراز سے چلا آتا ہے، تاریخ و فلسفہ و منظومات میں تالیفات عالیہ یہاں کے لوگوں نے فرمائی ہیں"

موسیر رایمان فرانسیسی معروف بہ حاجی مصطفےٰ سیر المتاخرین کے ترجمہ (جلد اول صفحہ ۳۵۲) کے تحت میں لکھتا ہے کہ "باشندگان بلگرام بھی اپنی شجاعت و دلاوری کے لئے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں"

فی الواقع خاک بلگرام سے بڑے بڑے نام آور اُٹھے اور نام کرکے پیوند ہوگئے ہیں۔ علم و ادب کے عَلَم بردار بھی اور تیغ و تفنگ کے دھنی، مرد میدان بھی۔ تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے مقرب و مزاجداں امیر نعمت خاں عالی[۵۲] نے، جو اپنی ظرافت، خوش طبعی، شوخ نگاری و معاملہ بندی سے شہرت تام رکھتا ہے، ایک موقع پر لکھا تھا کہ "سادات بلگرام فی الواقع ذوی الاحترام اندچوں تختۂ مسجد و ورق قرآن۔ نہ لایق سوختنی نہ قابل فروختنی۔ باید کہ سر سنگ شدید مثل ابن زیاد و یزید برسر ایشاں گمارند تا زرباقی بہ معرض وصول درآرند" سادات کی اس سے زیادہ توصیف و تکریم کیا ہو سکتی تھی؟

---

۵۱ گلیڈون Gladwin نے اپنے انگریزی ترجمہ آئین اکبری میں اس کو Belgrong لکھا ہے۔

۵۲ مرزا محمد شیرازی، عالی تخلص۔ طبابت پیشہ حکماے شیراز کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد حکیم فتح الدین بھی ہندوستان آئے تھے۔ حکیم محسن خاں چچا تھے جو عہد شاہزادگی میں شاہ عالم بہادر شاہ کی مصاحبت کا اعزاز رکھتے تھے۔ حکیم حاذق خاں اُن کے بیٹے تھے جنکو اپنی حیات کے آخر سال میں عالمگیر نے "حکیم الملک" کا خطاب دیا تھا۔ بعد ازاں عہد محمد شاہ میں پنج ہزاری منصب اور "حکیم الملوک" کے خطاب سے عزت پائی۔ مرزا محمد ہندوستان میں پیدا ہوئے صغیر سن میں پدر بزرگوار کے ہمراہ شیراز گئے اور کسب کمال کیا تھا۔ ملا شفیعائی یزدی مخاطب بہ دانشمند خاں سے بھی تلمذ تھا

اکبر کے درخشاں جواہر میں ایک بے نظیر الماس، شیخ میر عبدالواحد بلگرامی شاہدی نام تھا جس نے بہت سے رسائل و کراسات مختلف فنون و علوم میں لکھے تھے۔ اصطلاحات و مسائل تصوف کو نہایت خوب سمجھا اور سمجھایا تھا۔ ابوالفضل علامی، میر علاؤالدولہ قزوینی، اور شیخ عبدالقادر بدایونی و دیگر معاصرین نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری کے انگریزی ترجمہ (جلد اول جزو ششم صفحہ ۵۴۷) میں بلاک مین Blochmann بھی آپ کا حوالہ دیتا ہے۔

شیخ نظام بلگرامی تخلص بہ ضمیری ان سے کچھ پہلے گذرے تھے جو علم و عمل اور فقر و فضل میں یکتا تھے اور شیخ سلیمان ضمیری کے ماموں اور سرپرست جن کے زیر بار منت ہمایوں بادشاہ تھا۔

لکھنؤ کا اکبری دروازہ قاضی محمود بلگرامی کی یادگار ہے جو اسی عہد امن و فلاح کے آخر میں یہاں نائب صوبہ دار تھے۔ جنھوں نے چوک کے متصل داہنی طرف محمود نگر اپنے نام سے اور بائیں جانب شاہ گنج بادشاہ کے نام سے آباد کیا اور یہ (اکبری) دروازہ تعمیر کرایا تھا۔

مرزا خلد مکاں کے سلسلۂ ملازمت میں داخل تھے۔ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں شہر حیدرآباد فتح ہوا تو تاریخ فتح "شد فتح بہ جنگ حیدرآباد" حضور شاہی میں پیش کی اور خلعت پایا۔ ۱۱۰۴ھ (۱۶۹۲ء) میں نعمت خاں خطاب اور داروغگی نعمت خانہ (باورچی خانہ) کا عہدہ پایا۔ اسکی تاریخ "شکر نعمت واجب، واجب" نکالی۔ اور آخر عہد میں مقرب خاں، خطاب ملا اور داروغہ جواہر خانہ مقرر ہوے۔

عالمگیر کے انتقال کے بعد جب محمد اعظم شاہ اپنے بھائی شاہ عالم کے مقابلہ کے ارادہ سے دکن سے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا تو میرزا اسکے ہمرکاب تھے، دونوں فوجوں کے آمنے سامنے ہونے کا موقع قریب آیا تو اعظم شاہ نے بنگاہ کو گوالیار میں چھوڑا۔ جواہر خانہ کی حفاظت کے لئے مرزا گوالیار میں رہے۔ اعظم شاہ کے مارے جانے پر مرزا شاہ عالم کے ملازم ہوگئے اور نواب دانشمند خاں عالی خطاب پایا۔ شاہ نامہ کی تحریر پر مامور ہوئے۔ مگر سرہنگ اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کو پورا کر لیتے۔ ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) یا ۱۱۲۰ھ میں نسخۂ حیات کا ورق الٹ گیا۔ حیدرآباد و دائرہ میر مومن میں دفن ہیں۔

مرزا کو نظم و نثر دونوں پر قدرت عالی حاصل تھی۔ بالخصوص نثر میں حیرت انگیز طلسم بندی کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں ہر قسم کے قصائد و غزلیات موجود ہیں۔ منشآت و نثرات بھی مدون تھے۔ سخن عالی نام مثنوی لکھی تھی۔ دیگر تالیفات

حافظ محمود قرآن خواں کا ذکر شیخ عبدالصمد بن افضل محمد (خواہر زادہ فیضی و ابو الفضل) نے کتاب اخبار الاصفیاء میں ان الفاظ میں کیا ہے:-

حافظ محمود قرآن خواں ممتاز وقت و سرآمد عصر بود۔ گویند از آں روز کہ او بہ روحانیاں پیوستہ ہر شب جمعہ نکتہ نیوشان خدا شناس از مرقد منور او آواز قرآن خواندن می شنوند۔ و من بہ زبان آں حق گویاں کہ خود بہ گوش ہوش شنودہ اند نوشتہ ام۔ آرام گاہ بلگرام۔

قاضی کمال کا حال صاحب مرآت المبتدین نے لکھا ہے، یہاں نقل کی گنجایش نہیں۔

میر عبدالواحد کے پرپوتے سید برکت اللہ ملقب بہ صاحب البرکات تخلص بہ عشقی نے بھی بڑی شہرت پائی تھی۔ درویش کامل تھے، سجادہ کالپی سے اجازت و خلافت پائی تھی۔ آخر ایام میں اپنے جدّ امجد شاہ میر عبدالجلیل کے مرقد منور پر مارہرہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ بروز عاشورا ۱۱۴۲ھ (۲۶ جولائی ۱۷۲۹ء) فردوس اعلیٰ میں قدم رکھا۔ ہندی و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ "ریاض عشق" دیوان اسم بامسمیٰ چھوڑا تھا۔

"حسن و عشق"، "محاصرہ گلکنڈہ"، "وقائع نعمت خاں عالی"، "خوان نعمت"، "باورچی خانہ"، "جنگ نامہ" وغیرہ مشہور ہیں۔ خان عالی کی وضع احتیاط و حقیقت نگاری کا ایک واقعہ رائے رایان انند رام مخلص لکھتے ہیں کہ جب دونوں شاہزادوں کی معرکہ آرائی کے متعلق خان نے جنگ نامہ تحریر کرنا شروع کیا تو ذوالفقار خاں کی نسبت لکھا تھا:-

"اول کسے کہ مقدمۂ جنگ یک رو ناشدہ پشت داد اسماعیل ملقب بہ ذوالفقار خاں بود"۔ ذوالفقار خاں نے ہر چند منت و سماجت کی، پانچ ہزار روپیہ بھی پیش کیا تاکہ یہ فقرہ نکال دیا جائے مگر خان عالی نے نہ مانا اور نہ نکالا۔ اللہ اللہ اُس وقت اہل قلم کا کس قدر وقار و اختیار تھا۔ اُن کا ایک ایک حرف نقش صداقت بنکر صفحۂ روزگار پر باقی رہ جاتا تھا۔

۵۳ میر عبدالواحد حسینی واسطی شاہدی تخلص۔ شیخ صفی سائی پوری کے بھتیجا ن خاص اور شیخ حسین سکندرہ کے خلفائے بیش قدم سے تھے۔ روّح اللہ روحہم۔ ایک مدت دراز تک مسند ارشاد و ہدایت پر زیب افزا رہے۔ اہل حق کو حق شناسی و حق پرستی کے سبق دیے۔ تصانیف شریفہ سے سنابل (۹۶۹ھ مطابق ۱۵۶۱ء) حل شبہات شرح کافیہ ابن حاجب (بطور تصوف) حقانی ہندی، شرح نقد چار برادر، شرح مصطلحات دیوان خواجہ حافظ شیرازی

میر عبدالواحد ترمذی، واحد و ذوقی تخلص (پسر سید اشرف درگاہی) ہندی و فارسی میں بڑے پایہ کے شاعر و سخن شناس تھے۔ شکرستانِ خیال، نظم میں آپکی بڑی پر لطف اور دلچسپ تصنیف ہے، جسمیں ہر قسم کی مٹھائیوں اور حلووں کا بیان ایک انداز خاص سے کیا ہے جمعہ ۲ محرم ۱۱۳۴ھ (۱۳۔ اکتوبر ۱۷۲۱ء) کو حوالی موضع راہون ملک پنجاب میں شہادت پائی۔

میر عبدالجلیل اور اُن کے نواسے میر غلام علی آزاد کے علمی و ادبی و تاریخی کارناموں کے لیے ایک دفتر درکار ہے، ان صفحات پر صرف ایک دھندلا سا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

میر عظمت اللہ بیخبر کا تذکرہ سفینۂ بے خبر مشہور اور کسی تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے۔

موجود ہیں۔ سید محمد گیسو دراز کے رسالہ عجیبہ (تصوف) کی شرح نہایت عمدہ لکھی ہے۔

شرح نزہۃ الارواح نے کسیوقت زیادہ شہرت پائی تھی۔ اصطلاحات صوفیہ میں بہت سے رسائل لکھے تھے۔ شعر کم کہتے تھے مگر حسب اور حسن قدر کہتے تھے نہایت خوب کہتے تھے۔ کسی سے تلمذ نہ تھا۔ الشعراء تلامیذ الرحمن۔ حل شبہات میں فرماتے ہیں "در ابتداے حال بعضے مشکلات علم شریعت و طریقت از علمار کبار و مشائخ نامدار می پرسیدم و جواب شافی نمی یافتم۔ بخاطر قرار دادم کہ اقصاے عالم را بگردم تا مگر با مردے ملاقات شود کہ حل ایں مشکلات نماید ......

شیخ عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ "شیخ عبدالواحد بلگرامی بسیار صاحب فضائل و کمالات و ریاضت و عبادات است و اخلاق سنیہ و صفات رضیہ دارد و مشرب او عالی است ....." میر علاؤالدولہ بن میر یحیٰی سیفی قزوینی نفائس المآثر میں تحریر کرتے ہیں "میر عبدالواحد از اکابر سادات قنوج است۔ وخالی از نشاء فقر و درویشی نیست و سلیقۂ شعر خوب دارد"۔ شیخ محمد غوثی مندوی کتاب گلزار ابرار میں رقم طراز ہیں "سید عبدالواحد بن سید ابراہیم قنوجی خداوند مجاہدہ و مشاہدہ، صاحب صحت حال و فصاحت مقال۔ بر نزہۃ الارواح شرحے لایق متین بر نگاشتہ فراوان توجیہ و تاویل بکار بردہ۔ جمیع مقاصد عبارات را متوجہ سمت حقیقت گردانیدہ است"

حضرت سید قنوج میں کدخدا ہوئے تھے اور کچھ روز وہاں قیام بھی رہا تھا۔ اسی لئے ان دونوں مورخوں نے ان کو قنوجی لکھا ہے۔ مولانا بدایونی کی تحریر سے بھی سید صاحب کے قیام قنوج کا پتہ چلتا ہے۔

شب جمعہ ۳۔ رمضان ۱۰۱۷ھ (۱۳۔ دسمبر ۱۶۰۸ء) میں وصال ہوا۔ غزلوں کا دیوان چھوڑا تھا۔

اکبر بادشاہ نے آپ کو کمال تمنا کے ساتھ ملاقات کے لیے بلایا تھا، جب درگاہ سلطانی میں پہونچے تو بادشاہ۔ نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا اور بطریق سیورغال (مددمعاش) بلگرام میں پانسو بیگہ زمین نذر کی

شیخ غلام حسنؒ صدیقی تمین تخلص ایک بلند پایہ مورخ اور وقائع نگار تھے۔ شرائف عثمانی کے سوا کئی تاریخیں اور سوانح نامے لکھے ہیں۔ ان کا تذکرہ پھر مناسب مواقع پر آئے گا۔

ہندی شعر گوئی کے فن میں مرزا جانجاناں مظہر مشہور درویش اور شاعر کا استاد ایک بلگرامی سید زادہ میر غلام نبی تھا۔ جس کا حال بقدر مقدور آیندہ لکھا جائے گا۔

بندگی سید محمد حسن تخلص بہ ایا، شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ملازم خاص اور معتقد علیہ تھے۔

مفتی امیر حیدر کا نام عالم علم وعمل میں شہرۂ خاص اور وقعت و امتیاز رکھتا ہے جنھوں نے عہد اکبر کی ایک جامع تاریخ "سوانح اکبری" نام لکھی اور اس کی تکمیل و تہذیب تمامی ذرائع معلومات

---

۵۴ شیخ نظام بلگرام محلہ قاضی پورہ کے رہنے والے تھے۔ ضمیری تخلص تھا، صغر سن میں یتیم ہو گئے تھے۔ شیخ سلیمان ماموں نے جو اکبر شاہ کے ممتاز دربار رس تھے بہن کی عزیز یادگار اپنی آغوش عاطفت میں لے لی اور کمال شفقت و سلیقہ سے تربیت کی۔ شیخ نے علوم متعارف کی تحصیل کے بعد شعر و سخن کی طرف توجہ فرمائی اور اس فن میں بھی رشد و کمال حاصل کر لیا، قصیدہ خوب لکھتے اور تاریخ گوئی میں ملکۂ خاص رکھتے تھے۔ میر عبد الواحد نے کتاب سنابل میں شیخ کے حالات مع انکی روداد درد و عشق کے درج کئے ہیں۔

شیخ امرائے عہد کے ساتھ مساویانہ داعیہ و انداز سے ملتے اور رہتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ آخر زندگی میں تجرد و انفراد اختیار کر لیا تھا۔ قصبہ سفیدون تابع دار الخلافہ دہلی میں وارد تھے کہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں نزہت کدۂ آخرت کی گلگشت پسند فرمائی، "آہ، آہ نظام" تاریخ وفات مبارک خاں دہلوی نے لکھی۔ دیوان پندرہ ہزار شعر کا چھوڑا تھا۔

۵۵ شیخ سلیمان بلگرامی محلہ قاضی پورہ کے باشندے تھے۔ ہمایوں بادشاہ جب شیر شاہ سے شکست کھا کر بلگرام پہونچا تھا تو شیخ صاحب نے بقدر وسعت و مقدرت اسکی بڑی خدمت و تکریم کی تھی، بادشاہ انکو اپنی انگوٹھی دیکر کہہ گیا تھا کہ یہ میری نشانی ہے۔ اسکو احتیاط سے رکھنا، اور اگر میں پھر بادشاہ ہوکر ہندوستان آؤں تو میرے پاس آنا۔ چنانچہ جب ہمایوں دوبارہ بادشاہ ہوکر ہندوستان آیا تو شیخ مذکور پائے تخت کو گئے۔ اسی انگشتری کے وسیلہ سے شرف ملازمت حاصل کیا۔ صاحب دولت ہو گئے۔ مولانا ضمیری اپنے بھانجے کو بھی ہمراہ لیتے گئے تھے۔ دونوں صاحب پائے تخت میں برابر موجود رہے۔

اور وسائل مختلفہ سے کی تھی۔ اکبر نامہ، طبقات بدایونی، تاریخ فرشتہ، اکبر نامہ شیخ الہ داد سرہندی، مکاتبات علامی (ابو الفضل۔ چہار دفتر) وغیرہ سے کی تھی۔ بلاک مین اس کا ذکر بڑے قابل قدر اور رفیع الفاظ میں کرتا اور تمام تاریخ نگاران مابعد کو اسکے تتبع اور تقلید اور اس سے اخذ و روایت کا مشورہ دیتا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ اس کے ذرائع معلومات و استناد بالکل جدید اور نہایت واثق و معتبر ہیں، اس سے قبل کسی مورخ نے اس اہتمام و جامعیت کے ساتھ واقعات کا تفحص و تبصرہ اور استکمال نہیں کیا تھا۔ فی الواقع وسیع النظر مؤلف کو اسکی تالیف میں عہد مذکور کی ہر قسم کی تاریخوں پر نگاہ ڈالنا اور اُن کے اوراق و صفحات کو چھاننا پڑا ہوگا۔ یہ کتاب ولیم کرک پیٹرک William Kirkpatrick کے نام نامی سے منسوب کی گئی تھی۔ بلاک مین نے اس کے متعلق نہایت نکتہ بینی و دریدہ وری سے کام لیا اور اس کی ستایش و مدحت میں اتنا لکھا ہے جس کا ایک یورپین ماہر و ناقد کے قلم سے نکلنا حیرت و استعجاب سے خالی نظر نہیں آتا۔

شیخ سلیمان نے اکبر شاہ کے عہد میں ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں وفات پائی۔

۵۶ قاضی محمود بلگرامی، پسر اوسط قاضی ابو الفتح عرف قاضی کمال، اکبر بادشاہ کے عہد میں پایہ امارت پر پہونچے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد تک زندہ تھے۔ شاہجہاں نے ان کو اپنا ایلچی مقرر کرکے بادشاہ ایران کے دربار میں بھیجا تھا، وکفیٰ بذالک فضلاً و فخراً۔

۵۷ میر عظمت اللہ، بے خبر، میر سید لطف اللہ کے خلف الصدق تھے، ان کا درجہ تصوف اور شاعری دونوں میں بہت بلند تھا، ادائے حقوق میں امتیاز و شہرت خاص رکھتے تھے، خط شکستہ خوب لکھتے تھے، موسیقی میں بھی دخل تھا۔ ان کے حُسن اخلاق اور رنگینی صحبت سے ملنے والے بہت لطف اٹھاتے تھے اور بقدر ظرف و استعداد متمتع ہوتے تھے۔

مرزا عبد القادر بیدل سے راہ و رسم خاص تھی جسکا تذکرہ اپنے تذکرہ میں کیا ہے میر غلام علی آزاد کا سا نہایت رہا تھا۔ بے خبر نے کسی مجلس میں اپنا ایک مطلع پڑھا، ایک دوسرے بزرگ نے جنکو اپنی شاعری کا دعویٰ اور اپنی ذہانت و مضمون آفرینی پر ناز تھا جواباً اپنا مطلع پیش کیا، جو معنی و مطلب سے مطلقاً معرّیٰ تھا۔ کسی بے تکلف دوست نے کہا کہ بیخبر کے مطلع کا لطف تو ظاہر ہے مگر آپ کے مطلع کا لطف سمجھ میں نہیں آیا، جواب دیا کہ ابھی

سید غلام مصطفےٰ اور شیخ نواز محی الدین، نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی کے درباری اور حضوری میں اور باہمہ اعزاز دنیوی و وجاہت و حشمت ظاہری درویش کامل اور خداشناس و خداپرست تھے۔

سید عبداللہ قابل کی، اُن کے فضل و کمال اور سپہگری و دلاوری کی وجہ سے، نواب موصوف بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے عدالت معسکر کی خدمت پر ممتاز کیا پھر صوبہ گجرات احمد آباد کا منصب صدارت تفویض فرمایا تھا۔

سادات بلگرام نے بعہد اورنگ زیب عالمگیر خاصکر شہرت و ترقی پائی تھی۔ محمد فاضل بلگرامی نے ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں پرگنہ باون فتح کیا اور جاگیر سیر حاصل حاصل کی تھی۔ ارباب دانش و خبرت میں سے سید دادر اور محمد ماہ اورنگ زیب اور شاہ عالم کے دربار میں مناصب جلیلہ و خدمات معزز پر مامور رہے تھے۔ رکن عالم خاں گجرات کی صوبہ داری تک پہونچ گئے تھے۔

سید احمد احمدی، سید عظیم الدین اور سید غلام نبی محب، نواب صفدر جنگ کے مصاحب و معتمد و مشیر خاص تھے جن کا انکے زمانہ کی تاریخوں اور وقائع میں بار بار نام آیا ہے۔

حسب تحریر سیر المتاخرین سید نورالحسن خاں بلگرامی اس عہد کے تمام اہم امور ملکی اور معاملات سیاست میں کافی و وافی دخل رکھتے تھے۔ راجہ بنارس اور نواب وزیر (شجاع الدولہ) اور حکام انگریز کے مابین ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ء) میں انھیں نے فیصلہ کرایا تھا۔ اس سے پہلے جب ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) میں نواب احمد خاں بنگش اور عساکر مغلیہ و وزیر کے باہم لڑائی ہوئی تھی تو یہی فوج ہراول کے سردار تھے اور کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔

گزشتہ صدی کی تاریخ و سرگزشت پر نظر ڈالنے سے چند اشخاص اور ممتاز و قابل ذکر نظر آتے ہیں

اس میں لطف ڈالنا باقی ہے! بروز دوشنبہ ۲۲۔ ذیقعدہ ۱۱۴۲ھ (یکم جون ۱۷۳۰ء) دہلی میں رحلت فرمائی۔ جوار مرقد سلطان المشائخ میں دفن ہوئے۔ سفینۂ بیخبر، تذکرہ شعرا ۱۱۴۱ھ کی تالیف ہے۔

بعہد شجاع الدولہ .... باقر علی چکلہ دار بانگر۔ اور
بزمانۂ آصف الدولہ .... حشمت علی و چراغ علی، و قدرت علی، مختلف مقامات پر چکلہ دار
اور بہادر علی خاں لکھنؤ میں کوتوال یا پولیس کے افسر اعلیٰ تھے۔
بعہد غازی الدین حیدر .... شیخ محمد عطا چکلہ دار جلال آباد اور
بزمانۂ واجد علی شاہ .... محمد عسکری چکلہ دار رسول پور تھے۔

اس ذیل میں شیخ الہ یار خاں بلگرامی اور اُن کے خلف الصدق شیخ مرتضیٰ حسین مصنف حدیقۃ الاقالیم کا نام لینا باقی ہے۔ شیخ الہ یار مخاطب بہ رستم زماں خاں مبارز الملک کے بخشی اور سردار فوج تھے۔ شش ہزاری منصب ہو گیا تھا، بعہد فردوس آرام گاہ محمد شاہ راجہ ابھے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کے معرکے میں دسہرہ کے دن ۸۔ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ مطابق ۵۔ اکتوبر ۱۷۳۰ء کو شہید ہوئے۔ تسخیر قلعہ احمد آباد میں کارہائے نمایاں کئے تھے۔ روح الامین خاں پسر قاضی شیخ محمد سعید، شیخ الہ یار کے عزیز قریب (بہنوئی) تھے۔ شش ہزاری منصب مع جاگیر اور دو ہزار سوار کے پایا تھا۔ بڑے معاملہ فہم اور خوشگو شاعر تھے۔ ۱۵۔ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۳۔ فروری ۱۷۳۹ء) کو انتقال کیا۔ بعض محالات اودھ میں بھی حکمراں رہے تھے۔

بارھویں صدی ہجری میں عربی شاعری اور عربی ادب و زبان میں تبحر کی وجہ سے حسان الہند میر غلام علی آزاد نے جو شہرت عربستان اور دیگر ممالک اسلامی میں پائی تھی وہی شہرت و نام ڈاکٹر سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو قرون حاضرہ میں حاصل ہوا ہے۔ یہ دونوں بھائی زبان انگریزی اور دیگر السنۂ یورپ کے جیسے مسلم الثبوت ماہر اور انشا پرداز تھے، ویسے ہی وہ مشرقی فنون میں کامل اور قدیم علوم کے زبردست فاضل تھے۔ ان کے احیا و قیام میں ہمیشہ ساعی رہے۔ دکن کی بزم علم و ادب کو ان ہی شمعوں کی روشنی نے منور کیا تھا۔ نواب صاحب کی ادبی قابلیت اور اعلیٰ خدمات و اوصاف کا اعتراف سرکاری تاریخ نویس نے بھی (تتمہ گزیٹر ضلع ہردوئی مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں) کیا ہے نواب صاحب کا انتقال حال میں ہوا ہے۔ اُن کی

رحلت پر قدیم و جدید (دونوں) علم دوست طبقوں نے یکساں ماتم کیا ہے ؎

نعاہ الفضل والعلیاء والنسب ناعیہ الارض والافلاک والشہب

فلا یب دائما حبوب لمذ بحین مضی فای حزن وقلب فیہ لم یجب

نعم الارض نیعی والسماء علی فقید کریا سراۃ المجد والحسب

نواب مرحوم کے سلسلہ میں اُن کی ایک برمحل روایت یاد آئی جو لطف و دلچسپی سے خالی نہیں فرماتے تھے کہ اُن کے خاندان کے متوسل بھاٹ (یاد فروش) نے ایک دہ مجلس، ہندی بھاشا میں لکھی تھی۔ اُس کا شہرہ نواب وزیر کے دربار تک پہونچا اور وہ لکھنؤ بلایا گیا۔ اس کو پشتہا پشت کی نمکخواری و وفاشعاری کا کرشمہ کہئیے یا اپنے مخادیم کا جذبۂ احترام کہ وہ شاہی شوکت وشان سے مرعوب نہیں ہوا اور اُس نے سب سے پہلے اپنے ججمانوں یعنی سادات بلگرام کی مدح وثنا کے گیت گائے اُس کے بعد بادشاہ کی تعریف و توصیف کی۔

ان افراد فرید کے ذکر خیر کے بعد بلگرام کی گذشتہ علمی و عملی صحبت، زمین کی سرسبزی و زرریزی کی نسبت بعض شرق نوازان وسیاحان فرنگ کے اقوال و تحریرات یا ہدایائے رہ آورد و حالات چشمدید نقل کئے جاتے ہیں۔

مشہور عالم اور اہل قلم مسٹر بلاک مین J. H. Blochmann (جلد دوم صفحہ ۱۰۱ جرنیل میں) رقمطراز ہے کہ "عہد اکبر سے لے کر موجودہ صدی تک بلگرام مسلمانوں کے علوم و فنون کا ایک بڑا مرکز رہا ہے۔" یہاں کے اہل کمال کے متعلق وہ اپنے قلمی نسخہ 'سرو آزاد' کا حوالہ دیتا اور اُس سے استناد کرتا ہے۔

بشپ ہیبر Rt. Revd. Reginald Heber, D. D., Lord Bishop of Calcutta ۱۸۲۴ء میں بلگرام آیا تھا، اس قصبہ کے متعلق اُس کی یادداشتیں، اس کے سیاحت نامۂ صوبجات بالائی ہند، واقع ۱۸۲۴ء و ۱۸۲۵ء

Narrative of a journey through the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay in 1824-25. London, 1828.

نقل کی جاتی ہیں۔

"ہماری منزل آج ملانواں سے سات کوس چلکر لگرام تھی۔ وہی ہموار زمین اور پُر برگ و بار اشجار اور درختان میوہ دار برابر یہاں تک چلے آئے ہیں۔ اس مقام کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے انگریزی فوج جو اُس وقت برٹش ایڈ وانسڈ فورس British Advanced Force کہلاتی تھی یہیں مقیم رہی تھی۔ بعد کو کانپور منتقل کر دی گئی تھی۔ اب تک (۱۸۸۲ء میں) بہت سے نشانات باقی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ بادشاہی سواروں کی فرودگاہ تھی۔ اور اُس جگہ افسران فوج کے بنگلے ہمزور تھے مگر اب تو وہاں صرف چند ویرانوں کا ایک ٹکڑا ہے اور خشت پاروں کا ڈھیر۔

"قصبہ چھوٹا ہے مگر آثار کہتے ہیں کہ کسی وقت بڑا رہا ہوگا چنانچہ اب بھی بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے کہنہ مکانات، نیز تحصیلدار و کوتوال وغیرہ کے مساکن یہاں موجود ہیں۔ ایک مدت دراز کے بعد میں نے یہاں بھی بہت سے متفرق درخت تاڑ اور کھجور کے دیکھے۔ اور درختان انبہ تو ہر سمت نہایت عالی اور شاندار نظر آتے ہیں۔

"گماشتہ نے کہا کہ اودھ کی اراضی دنیا کی بہتر سے بہتر زمینوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہر چیز خواہ بنگالہ میں پیدا ہوتی ہو خواہ ایران میں یہاں بھی پیدا ہوتی اور خوب بڑھتی ہے۔ یہاں ایک ہی وقت میں چانول، نیشکر، روئی اور کھجور ملتی ہیں اور گندم، جو، جوار اور تمام دالیں بھی۔ ہوا اچھی، پانی اچھا، اور گھانس مویشی کے لئے بالخصوص مفید اور پرورش کرنیوالی بافراط میسر ہے۔ مگر قانون و آئین اچھے نہیں ہیں۔ حکام بُرے ہیں، زمینداران بدتر، اینیان (عاملان) بد سے بد۔ ہر چیز رعیت سے چھین جاتی ہے۔ بادشاہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ خبر رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اراضی کا لگان فی بیگہ کیا ہوگا۔ جواب دیا کہ عموماً چار روپیہ اور بعض جگہ چھ روپیہ۔

یہاں سے ہم لوگ شلغم اور آلو کے ایک عمدہ اور صاف قطعہ میں پہونچے۔ اُس نے آلوؤں کی نسبت کہا کہ پہلے تو لوگ ان کو نہایت ناپسند اور ان سے احتراز کرتے تھے مگر اب یہ چیز مرغوب و مقبول ہوتی جاتی ہے۔ خصوصاً مسلمان ان کو کارآمد اور اپنی ثقیل و روغندار غذاؤں کے لئے لابد سمجھتے ہیں۔"

ٹیفن تھیلر مشہور سیاح اور اہل نظر جس Des Pater J. Tieffenthaler. نے بشپ ہیبر سے تقریباً ساٹھ سال پیشتر بلگرام کو دیکھا تھا اپنے وقائع نامہ Beschreibung von Hindustan, I. P. 193.1785. میں لکھتا ہے کہ "یہ قصبہ بہت سے باغات و مرغزاروں کے وسط میں واقع ہے۔ کوچے تنگ ہیں بہت سے مکانات پختہ اینٹ کی تعمیر ہیں۔ ایک قلعہ خام بھی ہے جس کے چاروں گوشوں پر چار مدور اور بلند برج بنے ہوئے ہیں۔"

ایک دوسرا نامور سیاح اور مورخ ٹنانٹ Tennant جو یہاں ۱۷۹۹ء میں آیا تھا اپنے سیاحت نامہ ہند The Indian Recreations, II.397-398. میں تحریر کرتا ہے کہ "بلگرام ویران عمارات کا ایک ڈھیر ہے۔ انمیں چند خس پوش بھی نظر آتی ہیں جن کے نیچے مقتدر و متمول اسلاف کے خلف باقی اپنا وقت مجبورانہ عسرت سے گذار رہے ہیں۔"

وہ اس قصبہ کی ویرانی و تباہ حالی کی وجہ الماس خاں خواجہ سرا کی بیدردی جبر ستانی اور سخت گیری بتاتا ہے۔ جو آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے عہد میں مالگذاری اودھ کا اجارہ دار تھا۔

آئین اکبری کی تحریر کو کپتان تھارنٹن نے گزیٹیر مطبوعہ سنہ ۱۸۵۶ء میں نقل کیا ہے مگر وہ اسکی نسبت کمال حیرت و استعجاب ظاہر کرتا اور کنوئیں والے حصہ کو تو بڑے اشتباہ و شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آثار قدیمہ میں سے جتنی عمارات اب بھی یہاں باقی ہیں اطراف و نواحی کے کسی اور قصبہ میں اتنی نہیں پائی جاتیں، نہ قدامت و استحکام و خوبی تعمیر کے اعتبار سے اپنی نظیر رکھتی ہیں۔

(۱) درگاہ قاضی یوسف۔ سالار فوج سلطان محمود غزنوی ۔ سنہ ۶۰۸ھ (سنہ ۱۲۱۱ء)

(۲) سید صغریٰ کی درگاہ واقع باغ سید مبارک، بلگرام کے شمال موضع پوچھر میں سنہ ۶۱۴ھ (سنہ ۱۲۱۷ء)

(۳) مسجد محلہ سید واڑہ ۔ سنہ ۶۲۷ھ (سنہ ۱۲۳۰ء)

(۴) مسجد چوہٹہ ۔ سنہ ۸۸۲ھ ۔ (سنہ ۱۴۷۷ء)

(۵) درگاہ پیر عبداللہ ۔ سنہ ۹۰۹ھ (سنہ ۱۵۰۳ء) واقع سواد جنوبی شہر طرف میدان پل۔

(۶) مسجد شیخ ڈہن (عہد اکبری) ۔ سنہ ۹۸۴ھ (سنہ ۱۵۷۶ء) جسکی سنہ ۱۰۶۶ھ (سنہ ۱۶۵۶ء) میں شیخ

ابو المعانی نے تجدید کرائی تھی۔

(۷) گنبد مرقد حاجی افضل۔ سنہ ۹۸۰ھ (سنہ ۱۵۷۲ء) ۵۵۸

ان کے کتابے یا قبروں کے سنگ بالیں، ان کا سال و تاریخ زبان حال سے بتا رہے ہیں۔ انکے علاوہ

(۸) مولوی پیر بخش کی مسجد۔ سنہ ۹۵۶ھ (سنہ ۱۵۴۹ء)

(۹) ویران مسجد واقع موضع نصرت نگر قریب کھجوا تالاب۔ سنہ ۱۰۱۱ھ (سنہ ۱۶۰۲ء) کتابہ فارسی موجود ہے۔ ایک کنواں بھی اُسی سال کا تعمیر ہے۔

(۱۰) مسجد قاضی محمود۔ سنہ ۱۰۱۱ھ (سنہ ۱۶۰۲ء) ۵۵۹

(۱۱) درگاہ قاضی ابو العلا عرف قاضی بڈھ۔ واقع موضع محمود نگر سنہ ۱۰۲۴ھ (سنہ ۱۶۱۵ء) ۵۶۰ تحصیل کے جنوب میں، کتابہ فارسی نصب ہے۔

---

۵۵۸ حاجی افضل بلگرامی۔ بڑے بزرگ اور معتقد علیہ تھے۔ بلگرام میں عرصہ تک مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد تردی بیگ سلطان نے سنہ ۹۸۰ھ میں انکے مرقد پر گنبد عالی شان سنگین تعمیر کرایا۔ شیخ نظام ضمیری کا یہ قطعہ نستعلیق میں نہایت خوشخط لوح سنگیں پر کندہ کر کے دروازہ گنبد کی پیشانی پر نصب کیا گیا۔ لیکن تردی بیگ کا نام کوئی نہیں جانتا سالار بیگ کے نام سے جو تعمیر کا میر اہتمام تھا یہ گنبد شہرت رکھتا ہے ؎

بدوران شہ اکبر کہ گشتہ — خطاب او جلال الدین محمد
چو حاجی افضل از تقدیر حق رفت — ازیں دار فنا در دار سرمد
ز تردی بیگ سلطاں یافت بنیاد — برائے مرقدش ایں پاک گنبد
ضمیری جست سال ایں بنا را — بلفظ فارسی و ہم بہ ابجد
بتاریخش نہان و آشکارا — خرد گفتا سنہ ہشتاد و نہصد ۹۸۰ھ

"سنہ ہشتاد و نہصد" جو آخر مصرع میں آیا ہے خود بھی تاریخ ہے اور از روے حساب ابجد بھی تاریخ نکلتی ہے۔

۵۵۹ قاضی محمود بلگرامی نے یہ جامع مسجد بعہد اکبر بادشاہ تعمیر کرائی تھی تاریخ تعمیر یہ ہے

گفتم ایں مسجد عالی بہ کہ نسبت دارد — ہاتفم گفت ہماں نے کہ بقاضی محمود سنہ ۱۰۱۱ھ

۵۶۰ قاضی ابو العلا معروف بہ قاضی بڈھ پسر قاضی کمال قاضی محمود کے چھوٹے بھائی تھے عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ قاضی محمود کی نیابت میں بلگرام وغیرہ محالات اودھ کی حکومت انجام دہی تھی کچھ روز امور قضا میں بھی مشغول رہے تھے بلگرام میں قاضی عبد الدائم کے باغ کے متصل ایک باغ نصب کیا تھا اور اس میں نفیس و پختہ تعمیرات کرائی تھیں

(۱۲) مسجد محمد زاہد۔ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء)

(۱۳) عیدگاہ محلہ کٹرہ۔ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء)

(۱۴) مسجد سید کرم اللہ، واقع وسط محلہ میدان پورہ ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء)

(۱۵) مسجد علی حسن۔ ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء)

(۱۶) مسجد مرزا حسن علی دانا ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں نواب صفدر جنگ نے از سر نو تعمیر کرائی۔

(۱۷) گردھر ناتھ کا مندر واقع لکنیا ٹولہ

اور بھی بہت سی پختہ عمارات اور چاہات پرانے اور فن تعمیر کے بہترین نمونے موجود ہیں مثلاً سہجن کنواں اور امیر تردی بیگ کا کنواں جو عہد اکبری کی یادگار ہے، اور جس پر فارسی میں کتابہ موجود ہے۔ تین کنوئیں ڈھلائی سو برس پرانے ہیں، دست برد زمانہ سے پرانا قلعہ جو وسعت و کہنگی میں خود اپنی مثال تھا اور ویران و مسمار ہوگیا تھا کھود کر ہموار کر دیا گیا ہے صنادید دیرینہ کے عوض اس پر سرسبز و شاداب قطعات زراعت لہلہاتے نظر آتے ہیں سرکاری مدرسہ بھی اسی اراضی پر بنایا گیا ہے۔ پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں، سڈول و خوش قطع تراشیدہ کنکر ہست کار ستون، مورتیں، وسیع و فراخ محلات و قصور کے نشانات، پرانے مندروں اور شوالوں کے آثار، دور دور تک اور بکثرت پائے جاتے ہیں ؎

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک   دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

ان دیرپا چاہی اور حجری تاریخوں کے سوا بولتی ہوئی اور زندہ تاریخیں بھی بلگرام کی بہت سی ہیں

(۱) مآثر الکرام جس کا حوالہ صفحات آئندہ میں بارہا ملیگا خانوادہائے سادات کی تاریخ ہے اور جسکے

ایک گنبد بلند ۱۰۲۰ھ میں تعمیر کیا تھا جس میں بعد مرگ دفن ہوئے۔ قطعہ تاریخ یہ تھا ؎

خوشا گنبد کز الطاف الٰہی   ثنائے اوپہر شہر و بہر کو

بعہد شاہ نور الدین جہانگیر   مرتب شد مثال چرخ مینو

چو تاریخش ز ہاتف جستم آنگہ   بگفتا گنبد قاضی بڈھ کو   ۱۰۲۰ھ

معارضہ وایراد بلکہ جواب میں شرالف عثمانی شیوخ کی تاریخ لکھی گئی تھی۔

(۲) تبصرۃ الناظرین۔ فارسی۔ میں بھی سادات کے حالات ہیں، مولفہ میر سید محمد بن میر عبدالجلیل

(۳) مثنوی امواج الخیال جس کا ذکر ہوچکا اور آئندہ بھی ہوگا۔ اولیائے بلگرام کے مدائح میں ہے

(۴) جنوریہ (۵) شجرہ طیبہ دوجلد میں سادات کے خاندانوں کے احوال و انساب ہیں۔

(۶) شرالف عثمانی (۷) نصرۃ الناظرین۔ تاریخ اولیائے قصبہ میں بزرگان شیوخ کے کارنامے، محامد و فضائل مندرج ہیں۔

ان مبسوط و مکمل مقامی تاریخوں کے علاوہ مرأۃ المبتدئین۔ کتاب سنایل، نفائس المآثر، گلزار ابرار نورس سنگھار، معارج الولایۃ اور لسان الزمان میں بھی بزرگان بلگرام کے حالات کم و بیش ملتے ہیں اسی سلسلہ میں یہ آگاہی رکھنا بھی ضروری ہے کہ سرہنری ایلیٹ نے نادر قلمی کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ چھوڑا تھا جس پر مشہور مشرق نواز ڈاکٹر اسپرنگر Dr. Springer نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جلد بست و سوم بابتہ ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ بلگرام سے متعلق حسب ذیل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مسٹر آیروین امکو پرانے گزیٹر میں نقل کرتے ہیں۔

"شمارہ - ۱۹۰ - مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ یہ نظم شہنشاہ فرخ سیر اور مہاراجہ اجیت سنگھ کی لڑکی کی شادی کے متعلق ہے جو ۱۱۲۸ھ یعنی ۱۷۱۶ء میں ہوئی تھی۔ اس کے نو سال بعد مصنف نے دہلی میں وفات پائی۔

شمارہ - ۱۷۵ - مآثر الکرام، مؤلفہ میر غلام علی آزاد۔ اس کتاب میں ممتاز مسلمانان ہند کے سوانح حیات مندرج ہیں۔ اس کتاب کی نسبت وسیع النظر ڈاکٹر نے نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا مصنف شاعر مذکور السدر کا نواسہ تھا مگر اس خلف صالح نے اپنے سلفِ محترم سے کہیں زیادہ شہرت پائی۔

شمارہ - ۱۸۰ - تبصرۃ الناظرین۔ مشہور اولیائے بلگرام کی یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے کئی سو صفحات کی

ضخیم و مطول تالیف ہے۔"

سرکاری رپورٹوں اور یوروپین سیاحوں کی تحریرات میں سے بلگرام کا تذکرہ حسب ذیل میں ملتا ہے

(۱) سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ممالک محروسہ واقع کشور ہند اور ریاست ہائے ہندوستانی کا گزیٹیر جو آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم سے مسٹر ایڈورڈ تھارنٹن نے انھیں کاغذات و تحریرات سے مرتب کیا تھا جو کمپنی کے قبضہ و دفاتر میں موجود تھے۔ مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء

A Gazetteer of the Territories Under the Government of the East-India Company and of the Native States on the Continent of India. By Captain Edward Thornton. Vol. I. 1854. London. Pages 328-329.

(۲) اودھ کی بادشاہت میں سفر۔ سر ولیم سلی مین کے۔ سی۔ بی۔ مطبوعہ ۱۸۵۶ء۔

A journey through the Kingdom of Oude, by Sir W. Sleeman, K. C. B.—1856.

(واضح رہے کہ سر ولیم ۱۸۴۹ء میں یہاں آئے تھے اور اسی وقت کے حالات تحریر کئے ہیں)

(۳) تاریخ ہندوستان حسب تحریر مورخین ہند۔ مولفہ سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ۔ ۱۸۶۷ء

The History of India as told by its own Historians, by Sir H. M. Elliot, 1867.

(۴) صوبہ اودھ کا گزیٹیر۔ مرتبہ اے کارل ٹپ۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء۔

The Gazetteer of the Province of Oudh. By A. C. Tupp. 1877.

(۵) تاریخ ہندوستان حسب تحریر مورخین خود۔ مولفہ پروفیسر ڈاوسن۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

History of India by its own Historians, by Pro. Dowson, 1877.

(۶) ہندوستان کا امپیریل گزیٹیر مرتبہ مسٹر ہنٹر۔ مطبوعہ ۱۸۸۱ء لندن۔ جلد دوم۔

The Imperial Gazetteer of India by W. W. Hunter, C. I. E., LL. D., Vol. II, London, 1881.

(۷) مملکت ہند کا امپیریل گزیٹیر۔ جلد دوم۔ مرتبہ مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ سی۔ایس۔آئی۔سی۔آئی۔ای ایل۔ایل۔ڈی۔ مطبوعہ لندن ۱۸۸۵ء

The Imperial Gazetteer of India by W. W. Hunter, C. S. I., C. I. E., LL. D., Volume II, 1885, London.

(۸) انتیم رپورٹ بندوبست ضلع ہردوئی ۹۸-۱۸۹۷ء

Final Settlement Report of the Hardoi district, 1897-98, by Mr. J. S. C. Davis.

(۹) منتخبات کاغذات سرکاری، محفوظہ محکمہ فوج۔ مرتبہ جی، ڈبلیو فارسیٹ۔سی۔آئی۔ای۔ کلکتہ ۱۹۰۲ء

Selections from State papers preserved in the Military Department, by G. W. Forrest, C. I. E., Calcutta, 1902.

(۱۰) گزیٹیر ضلع ہردوئی۔ جلد ۴۱۔ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۴ء۔ مرتبہ ایچ۔آر۔نیول۔ الہ آباد۔

The Gazetteer of Hardoi, Vol. XLI, by H. R. Nevill, 1904, Allahabad.

(۱۱) مملکت ہند کا گزیٹیر صوبہ متحدہ۔ قسمت لکھنؤ۔ ۱۹۰۵ء۔ گورنمنٹ پریس الہ آباد۔

The Imperial Gazetteer of U. P., Lucknow Division. Government Press, Allahabad. 1905.

(۱۲) مملکت ہند کا گزیٹیر۔ جلد ہشتم۔ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۸ء

The Imperial Gazetteer of India, Vol. VIII, Oxford, 1908.

(۱۳) تتمہ قواعد و اعداد۔ جلد ۴۱ متعلقہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ۔ بابتہ ضلع ہردوئی۔ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۱۵ء

Supplementary Notes and Statistics to Vol. XLI of the District Gazetteer of the United Provinces of A. and O., Allahabad. 1915. Hardoi District. B. Vol.

بلگرام کی تاریخ کی چند اور کڑیاں (بے لطف سہی، مگر تحریر کے قابل ضرور ہیں۔

۱۔ نواب برہان الملک سعادت خاں نے سلطنت دہلی سے اودھ کا افتراق کر کے جداگانہ سلطنت قائم کی تو سرکاروں اور محالات کا نظم و سلسلہ بحالہ قائم و برقرار رکھا۔

۲۔ سنہ ۱۷۷۳ء کے معاہدہ کے مطابق اودھ میں امن و اماں قائم رکھنے کی غرض سے زیر قیادت افسران برطانیہ ایک فوج کا رکھا جانا قرار پایا تھا جسکی چھاؤنی بلگرام سے ڈھائی میل پر تھی اور جہاں اب تک لشکرگاہ ہونے کے نشانات موجود اور کھیتوں کے نام فوجی تعلقات اور اصطلاحات سے منسوب چلے آتے ہیں۔ یہ موقع اُس وقت اہم اور قدیم شاہ راہ (یا بقول انگریزوں کے (King's high way) پر واقع تھا، جو لکھنؤ سے سانڈی و فرخ آباد ہوتی ہوئی دہلی جاتی ہے۔ بشپ ہیبر کی تحریر اسکے متعلق نقل کر چکا ہوں۔

۳۔ سعادت علی خاں نے جب سنہ ۱۸۰۱ء میں مالگذاری کا نیا طریقہ جاری کیا تو محال[†] بلگرام لکھنؤ سے منتقل کر کے نظامت خیرآباد میں شامل کر دیا گیا۔

۴۔ فروری سنہ ۱۸۵۶ء میں اودھ کا الحاق سلطنت برطانیہ ہند سے ہوا تو بلگرام بھی اُسکے ساتھ انگریزوں کے پرچم دولت و اقبال کے سایہ میں آگیا۔

وہ بلگرام جو کبھی ایک بڑا قصبہ، علم و فضل کا مخزن اور امارت و شہرت کے لحاظ سے شہرۂ ہند تھا آج اس سے علم و عمل و دولت و اقبال تقریباً رخصت ہو چکا اور اجازت دائمی لے گیا ہے۔ علمی جوش سرد پڑ گیا،

ملحقہ محال اُس زمانہ میں ملک کا ایک چھوٹا قطعہ کہلاتا تھا۔ انگریزی عملداری کے طریقۂ بندوبست و تشخیص جمع میں ہر موضع یا اس کا جزو ایک محال لکھا جاتا ہے جسکے لئے اقرار نامہ ادائے مالگذاری سرکاری جداگانہ لیا جاوے۔ قطعات اور دیہات کی تقسیم و ترتیب کے متعلق قدیم و جدید اصطلاحیں یہ ہیں

	سابق	حال		سابق	حال
۱	محال	پرگنہ	۲	دستور	ضلع
۳	سرکار	قسمت	۴	صوبہ	صوبہ

انکے سوا ایک نام اور تھا یعنی "ٹپہ" یہ وہ قطعہ اراضی تھا جو کسی چھوٹی پہاڑی کے ارد گرد واقع ہو۔ یہ عموماً پرگنہ سے چھوٹا ہوتا تھا۔

اور درس وتدریس کا چرچا جاتا رہا ہے. تعلیم وتعلم کے مستمرہ طریقے سب مٹ گئے۔ وہ دو ڈھائی ہزار مکانات ویران ونیم آباد کا ایک مجموعہ رہ گیا ہے ؎

پھول بھی تھے پھل بھی تھے اس سرزمیں پر کیا نہ تھا آج ہے ویراں کبھی آباد وہر ویرانہ تھا

موجودہ قصبہ بلگرام دریائے گنگ کے کنارے بلندی پر آباد ہے۔ ہردوئی سے جانب جنوب سولہ ۱۶ میل اور فرخ آباد سے تینتیس ۳۳ میل پر قنوج سے شمال وغرب ذیل میں پر واقع ہے. قنوج جانے کے لئے بلگرام سے کچھ دور چلکر دریائے گنگ کو عبور کرنا پڑتا ہے.

صوبۂ اودھ کے سلطنت برطانیہ سے الحاق پر اودھ کی سب سے پہلی مردم شماری سنہ ۱۸۶۹ء میں ہوئی اُسوقت اودھ کے شہروں اور قصبوں میں بلحاظ آبادی بلگرام کا نمبر بارھواں اور نفوس کا شمار ۱۱،۵۳۴ تھا.

دوسری مردم شماری بارہ سال بعد سنہ ۱۸۸۱ء میں ہوئی تو یہاں کی آبادی ۱۰،۶۷۰ پائی گئی اس کے بعد ہر دسویں سال شمار ہوتا رہا ہے. چنانچہ سنہ ۱۸۹۱ء میں آبادی ۱۱،۴۵۷ اور سنہ ۱۹۰۱ء میں ۱۱،۱۹۰ اور سنہ ۱۹۱۱ء میں ۹،۵۰۷، اور سنہ ۱۹۲۱ء میں ۹،۱۱۲ تھی.

بلگرام میں میونسپلٹی یکم اپریل سنہ ۱۸۷۷ء کو قائم اور اپریل سنہ ۱۸۸۹ء میں شکست ہوئی. ایکٹ بابت سنہ ۱۸۵۶ء (چوکیدارہ) کے رُو سے قصبہ (ٹون) قرار دیا گیا. یکم اپریل سنہ ۱۹۱۱ء سے رقبۂ مشتہرہ (نوٹی فائیڈ) کردیا گیا ہے.

عمارات محلہ میں حکیم مہدی علی خاں ناظم (عہد غازی الدین حیدر) کی تعمیر کردہ دو بازار (چھوٹی اور بڑی) ایک سرائے اور دو مسجدیں، ایک امام باڑہ اور قصبہ سے باہر بازار کفایت گنج ہے حکیم صاحب سنہ ۱۸۰۳ء سے سنہ ۱۸۱۶ء تک اضلاع محمدی وخیرآباد میں اجارہ دار رہے تھے دیگر عمائد اور اہل دولت کے بنوائے ہوئے آٹھ امام باڑے اور مساجد ہیں. سرکاری عمارات میں تحصیل ومنصفی وتھانہ وشفاخانہ وڈاک خانہ ومدرسہ ہیں. ریل کا اسٹیشن قصبہ کے قریب ہے

ولادت

دم صبح از نفس بادِ صبا مشکیں شد　　　ہمدمے می رسد وہم نفسے مے آید

اہل سیر کا دستور ہے کہ روئیداد ولادت کو دلفریب اسلوب اور بہین آئین کے ساتھ باغ وبہار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ راقم عاجز کو نہ یہ قدرت حاصل ہے نہ میرے نزدیک اسکے لئے رنگین عبارت اور پرشکوہ الفاظ کی ضرورت۔ اس واقعہ یا فاتحۃ الآثار کے متعلق مجھے اس قدر تحریر کردینا کافی ہے کہ میر عبدالجلیل نے ۱۳ ماہ شوال ۱۰۸۱ھ کو اس عالم آب وگل میں قدم رکھا تھا۔ اس تاریخ کی یادداشت خود میر جلیل کے قلم سے لکھی ہوئی اُن کے کاغذات میں میر غلام علی آزاد کی نظر سے گزری تھی۔ آبائی مسکن محلہ میدان پورہ، قصبہ بلگرام تھا۔ وہی انکا مولد ومسقط الراس ہے۔

مسٹر بیل اپنی محققانہ تالیف 'بیاگرافی کل ڈکشنری' میں انگریزی تاریخ ۲ جون ۱۶۶۱ء لکھتے ہیں۔ زیچ جدید یعنی گریگوری کی تقویم کے حساب سے یہ تاریخ بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ دن سہ شنبہ کا پڑتا ہے۔

یہ محلہ میدان پورہ ایک وسیع اور ہموار قطعہ زمین پر آباد ہے، جو دریائے گنگ کے بازگشت وگریز سے پیدا ہوگیا تھا۔ اسی مردم خیز خطہ کو بہت سے نام آور اہل علم اور اہل قلم حضرات کی ولادت گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

تسمیہ

دریائے رحمت وکرم جوش میں آیا، خاندان کی مُراد بر آئی۔ شکر گزار ارباب نے بارگاہِ حق سبحانہٗ عزشانہٗ میں سجدۂ نیاز ادا کیا۔ حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام اَحَبُّ اسماءکم الی اللّٰہ تعالیٰ الخ نے رہنمائی ودستگیری فرمائی یعنی عبدالجلیل نام رکھا گیا۔ یُمن واقبال نے آغوش میں لیا۔ دعا دی کہ یہ بندۂ جلیل، خدائے جلیل کا سچا بندہ، جلیل القدر، جلیل العلم اور جلیل الشان ہو۔

بزرگوں کا نام روشن کرے، افتخار دودمان ہو الاسماء تنزل من السماء نے آمین کہی اور تصدیق کی۔

شرف نسب و فضل نجابت و حسب

شرافت نسب اور فضیلت حسب کا مسئلہ ہمیشہ سے متنازعہ فیہ و زیر بحث رہا ہے۔ اہل عقل و نقل اور اکابر ملل و امم نے اسکے متعلق مختلف و متضاد رائیں اور خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ہندوستان جہاں ذات پات اور چھوت چھات کا بہت بڑا زور ہے اور جس نے کثیر التعداد فرقے مختلف المراتب والدرجات پیدا کر رکھے ہیں بہ بانگِ بلند کہتا ہے ؎

جات (ذات) پانت (فرقہ) پوچھے نہ کو ہر (خدا) کو بھجے (یاد کرے) سو ہر کا ہو

عرب العربا ارشاد خداوندی یاد دلاتا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (بیشک خدا کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔ جزء ۲۶ سورۃ الحجرات ع ۲-۱۴)۔ اکبر کا مشہور فلسفی ندیم و کاتب ابو الفضل پایان اکبر نامہ (دفتر سوم) میں لکھتا ہے کہ "نسب سرائیدان از تہیدستی باستخوان نیاکان بازرگانی نمودن و کالائے نادانی بہ بازار آوردن است و از شوریدہ مغزی بہ ہنر دیگراں نازش کردن و آہوئے خویش نادیدن" لیکن اسی کا بڑا بھائی فیضی حسب افتخار و مباہات شاعرانہ کا موقع پاتا ہے تو بے تکلف سخن سرا ہوتا ہے ؎

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود | از آسماں بلند تر، از خاک کمترم
با ایں چنیں ہنر کہ نوشتم نگارشش | در فضل مفتخر ز گرامی برادرم

۱۲۵ شیخ مبارک عرف، مبارک اسم نام، شیخ خاندانی لقب تھا۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا۔ شیخ موسیٰ ہندوستان چلے آئے اور سیوستان (سندھ) کے علاقہ میں قصبہ رہل میں قیام گزیں ہوگئے۔ دسویں صدی کے شروع میں شیخ خضر اپنے ان غریب الدیار بھائیوں اور ہندوستان کے مشائخ کو دیکھنے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ناگور میں جا بسے ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ ابھی بچے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے ایک شریف الطبع

اسی برادر گرامی قدر (شیخ فیضی) کا دعویٰ تھا۔

آنم کہ فنون ذو فنوناں دارم — انوار چراغ رہ نموناں دارم
ایں کالبدم ز خاک ہند است ولے — در ہر بُن مو ہزار یوناں دارم

کریم النفس سید کے یہاں عزت و تکلیف کے ساتھ ان کی پرورش و تربیت کی اور تعلیم دلائی۔ چودہ سال کی عمر میں تحصیل علوم و اکتساب فنون سے فارغ ہو گئے۔ خواجہ عبید اللہ احرار (مدفون سمرقند) کے مرید ہوئے۔ حضرت سید احمد گیسو دراز احمد آبادی سے بھی رسم و عقیدت تھی۔ خطیب ابو الفضل گازرونی شیرازی نے بہت سی معقولات طے کرا دیں اور الٰہیات و فلکیات کے تمام درجے اور راستے دکھا دیے۔ شیخ یوسف مجذوب کے کہنے سے آگرہ آئے۔ شیخ علاء الدین مجذوب نے خیر مقدم فرمایا۔ رام باغ (جو بعد میں چار باغ کہلاتا ہے) کے قریب اُترے۔ دہیں شادی کی شہرت بڑھی تو شیر شاہ اور سلیم شاہ نے خزانۂ عامرہ سے کچھ مقرر کر دیا۔ جاگیر دینا چاہی منظور نہ کیا۔

معاصرین میں سے مخدوم الملک، ملا عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبد النبی اور شیخ صدر نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر ہمیشہ زک اُٹھائی۔ ان کے لڑکوں کے دربار میں پہونچنے سے پیشتر بڑی بڑی آفتیں ڈھائی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انکی دو ثلث زندگی یعنی تریسٹھ برس تک تمام تر مصائب و محن میں گزری۔

اکبر نے شیخ مبارک سے پڑھا بھی تھا۔ آخر عمر میں بصارت نے رفاقت ترک کر دی تھی۔ درس و تدریس مجبورانہ چھوڑ دیا تھا۔ اسی عالم میں ایک مبسوط و کامل تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العلوم لکھی جس کو اہل الرائے اور ارباب نظر امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے ہم پلہ بتاتے ہیں۔ حیٰوۃ الحیوان کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی نہایت شیریں لکھتے تھے۔ ابو الفضل نے زبان کی حلاوت باپ کی میراث میں پائی ہے۔ شیخ جید عالم اور بڑے محقق و دانشمند تھے آئین اکبری میں شیخ مبارک کا نام خدا پرستاں کی فہرست میں سرفہرست ہے۔

شیخ اپنے سعادت مند اور نامور فرزندوں کا عروج و عزوجاہ دیکھکر نوے سال کی عمر میں ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵ اگست سنہ ۱۵۹۳ء) کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ گردن میں دنبل نکلا تھا جان لیکر ٹلا۔ ملا عبد القادر بدایونی نے "شیخ کامل" تاریخ کہی۔ فیضی نے "فخر الکمل"۔ لاہور میں سپرد خاک کیا۔ وہاں سے لاکر آگرہ میں لاڈلی بیگم کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ عالی شان دروازہ کا عربی کتابہ شاہد حال ہے۔

یہ لاڈلی بیگم شیخ مبارک کی بیٹی اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاء الدین چشتی سے بیاہی تھی۔ اپنے سلیقہ و حسن معاشرت اور جود و سخا سے اسلام خاں کے نام کو چار چاند لگا دیے تھے۔ شیخ کی چاروں بیٹیوں میں سے شہرت اسی نے پائی اور دنیا میں اپنی یادگار نیک چھوڑ گئی ہے۔

شیخ کے لڑکے آٹھ تھے (۱) فیضی ابو الفیض (۲) ابو الفضل (۳) ابو البرکات (۴) ابو الخیر (۵) ابو المکارم۔

ایک دوسرا ادب آموز فرماتا ہے ؎

چو نادانان نہ در بند پدر باش | پدر بگزار و فرزند ہنر باش
چو دود از روشنی نبود نشانمند | چہ حاصل زانکہ آتش راست فرزند

(۶) ابوتراب (۷) ابوحامد (۸) ابوراشد

۹۶۳ شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی نادرۂ روزگار شخص گذرا ہے عجائب و غرائب علوم مین اپنا ثانی نہین رکھتا تھا یہ اُسی کا دعویٰ ہے اور بالکل بجا ہے

مورخین کا اتفاق ہے کہ شعر و معمّٰی و عروض و قافیہ و تفسیر و تاریخ و خط انشا مین ہندوستان مین نہین بلکہ آفاق مین اس جامعیت کا کوئی شخص نہین گذرا

ابوالفیض پانچوین شعبان سنہ ۹۵۴ھ (۲۰ ستمبر ۱۵۴۷ع) کو مستقر الخلافہ اکبر آباد مین پیدا ہوا اکتساب علوم اپنے باپ شیخ مبارک سے کیا صغر سن یعنی پندرہ سال کی عمر مین علوم و فنون متداولہ کی تحصیل سے فراغت پائی اور فضل و کمال حاصل کر لیا۔ اسکی قدرت کلام اور وسعت علم و نظر کی شہرت سُنکر اکبر بادشاہ نے سنہ ۹۷۴ھ (۱۵۳۶ع) مین طلبی کا فرمان بھیجا فیضی دربار مین حاضر ہوا تو نقرئی کٹھرے کے باہر کھڑا کیا گیا۔ اُس نے بے تکلف و برجستہ یہ رباعی پڑھی ؎

بادشاہا! برون پنجرہ ام | از سر لطف خود مرا جا دہ
زانکہ من طوطیِ شکر خایم | جاے طوطی درون پنجرہ بہ

سنہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ع) مین "ملک الشعرا" خطاب پایا [یہ خطاب فیضی سے پہلے سلاطین تیموریہ مین سے اکبر نے غزالی مشہدی کو دیا تھا، اُسکے بعد جہانگیر نے طالب آملی کو، اور شاہجہان نے ابوطالب کلیم ہمدانی کو عطا کیا تھا] حسن اتفاق یہ ہے کہ فیضی نے دو تین روز پہلے ایک قصیدہ لکھا تھا جسمین لسان الغیب نے اُسکی زبان سے یہی مضمون ادا کرا دیا تھا ؎

آن روز کہ فیض عام کردند | مارا ملک الکلام کردند
مارا بہ تمام در ربودند | تا کار سخن تمام کردند
از بہر صعود فکرت ما | آرائش ہفت بام کردند

فیضی کو ہر قسم کا تقرب و اختصاص مصاحبت والا مین حاصل تھا۔ اسنے بادشاہ کی مدح مین بڑے بڑے قصائد فارسی مین لکھی ہین علمی و ادبی خدمات کے علاوہ فیضی نے بہت سی سیاسی اور مُلکی ذمہ داریان بھی اپنے سر لے لی تھین جن کے حُسن انجام سے اُسکی ذہانت و لیاقت، روشن دماغی اور خوبی تدبیر کا سکہ قدرشناس بادشاہ کے دل پر جم گیا تھا۔ وہ سنہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ع) مین راجہ علی خان حاکم آسیر و برہان پور کے یہان بسلسلہ سفارت بھیجا گیا پھر اُسی حیثیت سے برہان الملک والی احمدنگر کے حضور مین پہونچا سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ع) مین ان تمام خدمات کو بہ احسن وجوہ انجام دے کر پابوس سریر سلطنت ہوا

بادۂ حقیقت کا مست جام معرفت بدست نواسنج ہے ؎

اعتبارِ شرفِ آدمیان از حسب است بہرِ تحقیق نسب آدم و حوّا کافی است

باوجود اشتغال ملازمت، و فضلا کی صحبت، شعرا کے کلام اور کتابون کی تصنیف و تالیف کا بڑا شائق تھا۔ اسکی فضیلت کی ایک روشن دلیل، اسکی غیر منقوط اور بسیط تفسیر موسوم بہ "سواطع الالہام" ہے جسکو دیکھ کر عقل دنگ ہوجاتی ہے اور جس کو اس نے صرف دو سال مین لکھا تھا۔ باوصف کمالات ذاتی وہ شعرا اور اہل فن کی بڑی قدر کرتا تھا جب میر حیدر معمائی کاشانی نے اس تفسیر کی تاریخ سورۂ اخلاص (پوری سورۂ قل ہو اللہ) سے (۱۰۰۲ھ) نکالی تو اسکو فیضی نے دس ہزار روپیہ صلہ دیا۔ اُسنے ایک اور مہمل (بے نقط) رسالہ "مواعظ و نکات علم اخلاق مین "موارد الکلم" لکھا ہے بادشاہ کے ایما سے لیلیٰ مجنون کے مقابلہ مین "نلدمن" چار ہزار دو سو بیت کی مثنوی، صرف پانچ ماہ مین نظم کی۔ لیلاوتی کا، جو بھاسکر پنڈت متوطن بیدر کی باکمال و ہنرمند دختر کی، فن مساحت و حساب مین، مشہور کتاب ہے سنسکرت سے فارسی مین ترجمہ کیا۔ بیج گنت (ریاضی) کے ترجمہ سے ہندو لٹریچر بھی اسکے گوشۂ چشم التفات کا منت گذار ہے بھگوت گیتا کا بھی سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ جیسا کہ خود پسند اہل کمال اور نازک مزاج لوگون کا شیوہ ہے فیضی کو بھی اساتذہ ماسبق کے کلام کا جواب دینے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ خمسۂ نظامی مین سے مخزن اسرار کے مقابلہ مین مرکز ادوار لکھی تھی تبیض کی نوبت نہین آئی تھی فیضی کی وفات کے بعد شیخ ابو الفضل نے مسوّدہ کو صاف کرایا۔ اُسنے شیرین خسرو کے پہلو بہ پہلو سلیمان و بلقیس کو جلوہ گر کرنا چاہا اور کر گذرا۔ اسیطرح سکندرنامہ کے مقابلہ مین اکبرنامہ لکھا تھا دیوہفت پیکر کا جواب ہفت کشور لکھ رہا تھا کہ پیغام اجل آپہونچا اور تمام نہ کرسکا مہابھارتہ کا فارسی ترجمہ درست کر رہا تھا کہ اور ضروری کامون مین لگا دیا گیا تھا گوتم اور انہر دن دید کی طرف بھی توجہ کی تھی بعض تسلیم کرتے ہین اور بعض انکار۔ ان کے علاوہ اور رسائل بھی عربی و فارسی مین یادگار چھوڑے ہین۔ وہ اپنے معاصرین و متقدمین پر بھی طعن و تعریض کرنے مین بے باک تھا فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (تو جس بات مین یہ لوگ جھگڑ رہے ہین قیامت کے دن اللہ ان مین اس کا فیصلہ کردے گا۔ الجزء الاول سورۃ البقرۃ۔ ع ۱۴-۱۴)

باین ہمہ ہم عصر شعرا نے دل کھول کر اسکی ستایش و ثنا کی ہے شیخ علی نقی کمرہ نے پینتیس[۳۵] شعر کا قصیدہ اصفہان سے لکھ کر ہندوستان بھیجا تھا حکیم عین الملک شیرازی کے بیٹے نور الدین محمد عبد اللہ نے شیخ کے مکتوبات جمع کئے اور انشاے فیضی و لطیفۂ فیاضی، کے نام سے ۱۰۳۵ھ مین ترتیب دئے تھے۔ ملا ظہوری ترشیزی نے ایک لطیف نثر شیخ کی مدح مین لکھ کر بھیجی تھی اسکو بھی مکتوبات کے اخیر مین درج کر دیا ہے۔ مرزا صائب ہمیشہ شیخ کو بڑی عظمت سے یاد کرتے اور لکھتے ہین ؎

این آن غزل کہ فیضی شیرین کلام گفت در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ است

شیخ نے آخر عمر مین چھوٹے بھائی علامی کے موازنہ و مناسبت سے فیضی کی بجائے فیاضی تخلص اختیار کیا تھا۔

ایک دوسرے موقع پر یہ سبق ملتا ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامیؒ ۔۔۔ کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزی نیست

وہ کہتا ہے ؎

زین پیش کہ سکّہ ام سخن بود ۔۔۔ فیضی رقم نگین من بود

اکنون کہ شدم بعشق مرتاض ۔۔۔ فیاضی ام از محیط فیاض

شیخ کو بنا تخلص راس نہ آیا وہ دو تین مہینے کے اندر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دسوین صفر ۱۰۰۴ھ (۱۴ اکتوبر ۱۵۹۵ء) کو ضیق النفس (دمہ) سے رحلت کی اور اپنے باپ شیخ مبارک کی قبر کے پاس اکبر آباد میں دفن ہوا۔

فیضی کی کلیات میں ہر قسم اور ہر درجہ کا کلام ملتا ہے۔ پندرہ ہزار شعر کا مجموعہ ہے۔ دیوان خود ترتیب دیا تھا طباشیر الصبح نام۔ قصائد بڑے جوش سے لکھے ہیں۔

مسٹر بیل اس کی تصانیف کی تعداد ایک سو ایک بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر براؤن اپنی تاریخ ادبیات فارسی کی جلد خاتم میں لکھتے ہیں کہ ضیا دپاشا مشہور ترکی شاعر و مصنف نے اپنے "مجموعہ خرابات" کے دیباچہ میں جہان شعرا فارسی کے متعلق بحث کی اور جامی اور اسکے کمال و کلام کی داد دی ہے وہان عرفی و فیضی کو بھی قابل صد مدحت و ستائش شمار کیا ہے۔ اسکے ایک قصیدہ غرا میں فیضی و عرفی میدان سخن میں ہمدوش نظر آتے ہیں

اسی کے ساتھ اہل وطن اور بعض معاصرین کا طرز عمل بھی قابل لحاظ ہے۔ اس جماعت نے فیضی و ابو الفضل پر لعن و طعن کا کوئی دقیقہ نہ ان کی حیات میں اٹھا رکھا تھا نہ بعد ممات فیضی کی وفات کی تاریخ ان الفاظ میں نکالتی ہیں

"(۱) بود فیضی ملحدے

(۲) ؎ فیضی بیدین چو مُرد سال وفاتش فصیح ۔۔۔ گفت "سگے از جہان رفتہ بحال قبیح"

۵۶۴ فیضی خود آگرہ میں پیدا ہوا لیکن بزرگ باپ کا مولد و منشا ناگور تھا۔ اس نے ناگور کو ہمیشہ یاد رکھا اور دلی تعلق و محبت سے ذکر کیا ہے۔ یہ ناگور (اجمیر کے شمال و مغرب) اب ریاست جودھ پور مارواڑ (راجپوتانہ) میں ایک ضلع ہے۔ عالمگیر کے عہد میں ایک سرکار صوبۂ دار الخیر اجمیر کے متعلق تھا۔ شہر کی آبادی ۱۸۹۱ء میں ۱۳۳،۷۷ نفوس تھی، جو بیس سال بعد ۱۰۲۲ رہ گئی۔ اس کے بانی ناگا راجپوت تھے۔ یہی وجہ تسمیہ ہے۔ پرتھوی راج چوہان اور محمد غوری وغیرہ سلاطین کے زیر حکومت رہا۔ اکبر نے راجہ بیکانیر کو جاگیر میں دیا تھا۔ شاہجہان نے ایک راٹھور خاندان کو عنایت کیا۔

شہر پناہ طول میں چار میل ہے۔ بروج فصیل اور دمدموں پر عربی و فارسی کے بہت سے کتابے لگے ہوئے ہیں۔ جب لڑائی اور محاصروں سے اسکی حالت خراب ہونے لگی تو راجہ بخت سنگھ نے مساجد کو منہدم کرا کے اسکی مرمت کرادی اور ان پتھروں کو اسی دیوار پر نصب کرا دیا۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السّلام سے پوچھا گیا کہ انسانوں میں اشرف کون ہے۔ آپ نے سامنے کی خاک سے دو مٹھیاں بھر لیں پھر فرمایا کہ ان دونوں میں شریف تر کون ہے، بعد ازاں دونوں کو یکجا کر دیا پھر پھینک دیا اور فرمایا کہ انسان سب مٹی ہیں ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

حضرت سلمان فارسیؓ صحابی رسول صلعم کی جلالت شان و مرتبت معلوم ہے۔ ایرانی النسل تھے اور آب الملک کی اولاد سے لیکن ایک مرتبہ جب خود آپ سے نسب پوچھا گیا تو آپ نے "سلمان بن اسلام"

قلعہ کی دیوار دُہری ہے۔ اس میں اب بھی بعض محلات، فوارے اور چشمے، عہد اکبری کی یادگار ہیں۔ شاہجہان کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی باقی ہے۔

اس قطعہ کے (ناگوری) بیل بڑی عمدہ نسل کے ہوتے اور سارے شمالی ہند میں شہرت رکھتے ہیں

اکبر نے اپنی بہن بختی بیگم کے شوہر شرف الدین حسین مرزا کو ناگور مع متعلقات ناگور کے جاگیر میں دیا تھا۔ اجمیر سے واپسی ناگور میں مقام ہوا تو باشندگان شہر کی عرض پر گیلانی تلاؤ، اور شمس تلاؤ، (کوکر تلاؤ) کو صاف کرا دیا۔ کوکر تلاؤ ایک سوداگر نے اپنے کتے کی محبت اور اسکی یادگار میں بنوایا تھا۔ انھیں دونوں تالابوں کے پانی پر رعایا اور جانداروں کی زندگی منحصر تھی۔

شیخ مبارک کے سوا (خود مبارک کے استاد) شیخ عطن ترک نژاد اور شیخ سالار اسی ناگور کے رہنے والے تھے قاضی شیخ حمید الدین کے علاوہ سکونت کا شرف و شہرہ بھی اسکو حاصل ہے۔

۵۶۵ مولانا نور الدین عبد الرحمن بن احمد جامی کے فضائل و کمالات آفتاب سے زیادہ روشن ہیں۔ ان کے دادا صاحب مولانا شمس الدین محمد اصفہانی محلہ دشت کے رہنے والے تھے۔ تو ایک زمانہ سے وطن چھوڑ کر خراسان چلے آئے اور قصبہ جام میں متوطن ہوئے۔ ان کے والد مولانا نظام الدین احمد دشتی اصفہانی تھے۔ مولانا جامی جام میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) کو متولد ہوئے اسی لئے جامی تخلص اختیار کیا تھا۔ بعد ازاں دار السلطنت ہرات میں سکونت گزین ہو گئے خواجہ عبید اللہ احرار سے بہت اخلاص و اتحاد تھا۔ مولانا سعد الدین کاشغری کے خلیفہ تھے۔ چوالیس سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں شرح کافیہ، شواہد النبوۃ، یوسف زلیخا، نفحات الانس، سلسلۃ الذہب اور تفسیر القرآن زیادہ مشہور ہیں۔

ستر برس کی عمر میں ۸۸۸ھ (۱۴۸۳ء) میں یوسف زلیخا لکھی تھی۔ اکیاسی برس کی عمر میں جمعہ ۱۸ محرم ۸۹۸ ہجری (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) کو رحلت فرمائی۔ تمام بادشاہان ہرات کے یہاں مقبول و محترم تھے سلطان بایزید خان نے منت و اصرار سے یہاں بلایا۔ ہدایائے گران بہا بھیجے۔ مگر پائے قناعت نے جنبش گوارا نہ کی عذر کر دیا۔ بعض اہل طریقت تاریخ وفات ۹ ربیع الثانی ۸۹۹ھ شب جمعہ (۱۷ جنوری ۱۴۹۴ء) بتاتے اور اسی حساب سے عرس و صال مناتے ہیں ہرات مدفن قرار پایا۔

بتایا یہ جذبۂ شیفتگی اسلام کا تھا کہ غیر ملک کے شاہزادے اسکی عظمت کے سامنے اپنے خاندان اور شرف سلف کو تحقیر و بے وقعتی سے دیکھنے لگتے تھے۔

ایک روایت خالدبن عبداللہ القشیری[۵۶۷] سے ہے۔ آپنے وصل بن عطا سے اُن کا نسب دریافت کیا

مصنف نقضار الارب نے سال وفات ۹۲ھ تحریر کیا ہے۔

۵۶۶ حضرت سلمان فارسی کا ایرانی نام روبہ تھا بڑے خاندانی اور صاحب نسب عالیہ تھے۔ رام ہرمز (خلیج فارس) وطن تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے فرمایا تھا کہ خوب جانچ پڑتال کرکے اور صداقت اسلام سے مطمئن ہوکر ایمان لایا ہوں اور جستجو کرتا ہوا آستانۂ رسالت پر پہونچا ہوں۔ انکے متعلق خندق کھودتے وقت مہاجرین و انصار میں بحث پیدا ہوئی۔ انصار ان کو اپنا بتاتے تھے اور مہاجرین اپنا۔ رحمت دو عالم کی زبان صدق ترجمان نے بیچ میں پڑکر یون قضیہ چکا دیا کہ سلمان مناا اھل البیت ”سلمان ہمارے اہل بیت سے ہے“ کسی صاحب نظر کا قول ہے ۔

کانت مودۃ سلمان لہ نسبا ولم یکن بین نوح وابنہ رحم

اہل تحقیق لکھتے ہیں کہ ڈھائی یا تین سو سال کی عمر میں ۱۰ رجب ۳۳ھ (۵ فروری ۶۵۴ء) کو وفات پائی اور شہر مدائن میں دفن ہوئے۔

۵۶۷ ابویزید و ابوالہیثم خالد بن عبداللہ القشیری انکا پورا نام و نسب قاضی احمد بن خلکان نے خالد بن عبداللہ بن یزید بن اسد بن کرز البجلی ثم القسری لکھا ہے۔ اسی کو مزید تفصیل کے ساتھ ہشام بن الکلبی نے بھی کتاب جمہرۃ النسب میں نقل کیا ہے۔ (قسری (بفتح قاف و سکون سین مہملہ بعد ازان را) قسر بن عبقر کیطرف منسوب ہے جو بجیلہ کا ایک قبیلہ ہے)

طبری اپنی تاریخ کبیر میں لکھتا ہے کہ خالد ۸۹ھ و ۷۰۸ء میں والی مکہ رہا تھا پھر ہشام بن عبدالملک اموی (تخت نشین ۱۰۵ھ متوفی ۱۲۵ھ) نے شوال ۱۰۵ھ (مارچ ۷۲۴ء) میں عمر بن ہبیرہ کو معزول کرکے خالد کو عراقین کا والی و گورنر مقرر کردیا۔ جمادی الاول ۱۲۰ھ مئی ۷۳۸ء میں ہشام نے انکو بھی برخاست کردیا اور اسکی جگہ یوسف بن عمر الثقفی (حجاج کے برادر عم زاد) کو دی

خالد کے دادا یزید کو رسول اکرم صلعم کا شرف صحبت نصیب ہوا تھا مگر اُس کی ماں نصرانیہ (عیسائی) تھی۔ خود خالد کی دینداری کی نسبت سخت شبہہ کیا جاتا اور اتہام لگایا جاتا تھا لیکن اسمین شک نہین کہ وہ مذہبی تعصبات سے بیگانہ تھا۔ اپنی ماں کے لیئے اُس نے خود کلیسا گرجا بنوا دیا تھا جہاں وہ عبادت کرنے جاتی تھی۔ اسی بناپر فرزدق نے

اُس کی ہجو کی تھی۔

اسی غیر ملتزم الدین خالد کی دینداری کا ایک تاریخی واقعہ یادگار ہے۔ جعد بن درہم جسکی طرف خاندان اموی کا سب سے آخری خلیفہ مروان بن جعد کی منسوب ہے۔ صفات الٰہیہ کا منکر اور عقیدۂ تعطیل کا بانی و مبلغ تھا مسلمانوں میں اس فتنہ کا آغاز اسی نے کیا۔ خالد نے اس (جعد معطّل) اور اسکے متبعین کا استیصال کیا تھا۔ وہ منبر پر گیا اور مسلمانوں سے مخاطب ہوا۔ «اے معشر اسلام! قربانی کرو۔ خدا تمھاری قربانی قبول کرے گا میں جعد بن درہم کی قربانی کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ نہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا»، پھر منبر سے اُتر کر جعد کو ذبح کر دیا۔ اعاظم اسلام حسن بصری وغیرہ نے اُسکے اس عمل کی ستائش کی اور شکر گذار ہوئے۔

خالد کا شمار عرب کے ممتاز لوگوں اور نامور خطیبوں میں ہوتا ہے جو فصاحت وبلاغت کے معرکوں میں بقائے دوام کی سند پا چکے ہیں۔ وہ نہایت سخی اور کثیر العطا تھا۔ ہفتہ میں ایک دن محض شعرا کے لئے دربار کرتا۔ اُن کا کلام سننے داد سخن دیتے اور بخشش واکرام کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اُسکی داد ودہش کے کئی واقعات طبری نے بیان کئے ہیں۔ اُس نے بہت سی نادر کتابیں ترجمہ کرائیں اور قابل دل ودماغ والوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا جو گروہ یا فرقے کسی حکمران یا امیر کی سخت گیری و مذہبی پاسداری سے بے درد بے کس پھرتے تھے، اُن کی سرپرستی و دستگیری کرتا۔ پناہ دیتا اور مراعات کرتا۔ خالد اپنے مشاغل علمی اور دلچسپ ادبی صحبتوں کے لئے ہمیشہ مشہور رہے گا۔ جس وقت کہ قید و بند میں تھا اُس وقت بھی شعرا اُسکی مدح کرتے اور وہ جب ان کو صلہ بھیجتا تھا۔

معزولی کے بعد بدنصیب خالد کچھ مدت تک قید و حبس میں رکھا گیا اور پھر بڑی بے رحمی و بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اُسکے ضبط وتحمّل کی یہ کیفیت تھی کہ باہمہ تکلیف پائی اور اذیت رسی وہ نہ زبان سے کچھ نکالتا اور نہ آہ وزاری کرتا۔ اس کا دردناک خاتمہ ذی قعدہ ۱۲۵ھ (ستمبر ۷۴۲ع) یا محرم ۱۲۶ھ (نومبر ۷۴۳ع) میں ہوا شب میں ناحیہ حیرہ میں دفن کر دیا گیا۔ حیرہ کوفہ سے ایک فرسخ ہے۔ کبھی ملوک عرب آل نعمان بن المنذر کا تخت گاہ رہا تھا

قاضی ابن خلکان کے سوا ابوالفرج اصبہانی نے بھی کم وبیش یہی واقعات تحریر فرمائے ہیں

۵۶۵ واصل بن عطاء الغزال القاضی (ابو حذیفہ کنیت) مرد زبان دان اور قادر الکلام گزرا ہے بدنصیبی سے وہ الثغ (توتلا) واقع ہوا تھا حرف را کو بول نہ سکتا تھا غین کی آواز نکلتی تھی۔ بات اس طرح کرتا تھا کہ اسکے کلام میں «ر» نہ آنے پائی اور اسکے لثغہ (توتلے پن) کا عیب سامعین پر کھلنے نہ پاتا تھا۔ یہ اس قدرت زبان اور احتیاط اظہار مطالب سے وہ ضرب المثل ہو گیا تھا شعرا اور مؤرخین نے اسکا تذکرہ کیا ہے۔

کردیا اور جس نے اُس کو محفوظ رکھا اُسنے اپنا نسب بھی محفوظ رکھا" خالد بولے "واقعی عبد (بندہ) کا جوہر اور مرد آزاد کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے"!

ابو عمار ابراہیم النخعی سے (جو مشاہیر فقہائے تابعین سے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے اُستاد تھے) کسی نے پوچھا کہ آپ کا نسب کس شخص تک پہونچتا ہے" فرمایا "تم کو میرے نسب کے جاننے سے کیا حاصل ہوگا

ابو العباس المبرد کتاب الکامل میں لکھتا ہے "کان واصل بن عطاء احد الاعاجیب وذالک انہ کان الثغ قبیح اللثغة فی الراء فکان یخلص کلامہ من الراء ولا یفطن لذالک لاقتدارہ علی الکلام وسہولة الفاظہ"

صاحب بن عباد وزیر کی مدح میں ابو محمد یزدان لکھتا ہے ؎

نَعَم تَجَنَّبَ لا یومَ العطاءِ کما ۔۔۔ تَجَنَّبَ ابنُ عطاءٍ لثغةَ الراءِ

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

وَجَعَلْتَ وَصْلِي الرَّاءَ لَمْ تَنْطِقْ بِهِ ۔۔۔ وَقَطَعْتَنِي حَتَّى كَأَنَّكَ وَاصِلُ

ملا فرج اللہ شوستری جو فارسی کا نغز گو شاعر تھا اور جس کا حال سید علی معصوم نے سلافۃ العصر و تذکرہ شعرائے عرب میں بڑے طمطراق سے لکھا ہے عربی بھی خوب کہتا تھا اسی واصل کی نسبت اشارۃً کہہ رہا ہے ؎

لا غَرْوَ اِن لَم تُنقِه الایامُ لی ۔۔۔ اَلْهَو ابنُ عطاءٍ دافِ الرّاءِ

وَلَئِن اَجری طبعَ الزمانِ واهلِہ ۔۔۔ دُونَ الکلامِ واهلُہ احیاءُ

پروفیسر براؤن اپنی تاریخ ادبیات میں لکھتے ہیں اور دیگر مورخین اسلام نے بھی نقل کیا ہے کہ یہ واصل حضرت حسن البصری کا شاگرد تھا جو ائمہ تابعین اور اکابر متکلمین عراق سے تھے۔ اُستاد سے اس بات پر اختلاف ہوگیا کہ آیا مومن ارتکاب گناہ کبیرہ کے بعد بھی مومن کہلانے کا مستحق رہتا ہے یا نہیں۔ خود واصل کا خیال یہ تھا کہ ایسا آدمی نہ تو مومن کہا جا سکتا ہے نہ غیر مومن (یا کافر) بلکہ منزلۃ بین المنزلتین در ہوگا۔ ان دونوں کی بحث یہ ہوئی کہ واصل مسجد جامع کے ایک دوسرے گوشہ میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے ہم سبق طلباء سے گفتگو اور اپنی رائے و خیال کا اظہار کسی قدر شرح و بسط سے کرے خصوصاً ان سے جو اسکے ہم آہنگ ہوچکے تھے۔ شیخ حسن بصری نے سنا تو ان لوگوں سے جو اُن کے گرد تھے فرمایا "اعتزل عنا" ہم سے علیحدہ ہوگیا"۔ واصل کی جماعت اُسی وقت سے معتزلہ کہلانے لگی۔ عراق و دمشق میں اُسنے بڑی شہرت پائی۔ اہل فرقہ کا پیشوا و مقدم تھا۔ اسکے پیرو اور ہم خیال خود کو اہل العدل والتوحید کہتے تھے۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار ممکن نہ ہوگا۔ انھیں کا قول یہ ہے کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے اور بدی خود اپنے نفس سے۔ واصل نفی اثبات اور قدر کا قائل تھا۔ مرتکب کبائر کے لئے خلود فی النار کو تسلیم کرتا تھا۔

بیچارے حسن بصری اپنے تلامذہ کی ناسعادتمندی و کج روی کا ہمیشہ شکار رہے ہیں انکا ایک اور

میر اجداعلےٰ اپنے نام سے خود آگاہ ہے"
فخر المتاخرین مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہین کہ حقیقت حسب کسی شخص کے خاندان کی

شاگرد ابن ابی العوجا رہتا جو مرکز توحید و خداشناسی سے منحرف ہوگیا تھا۔ لوگون نے پوچھا کہ اپنے استاد کے مذہب کو کیون چھوڑ دیا اور ایک بے اصل و حقیقت عقیدت اختیار کرلی جواب دیا کہ میرا استاد ایسی باتین کرتا تھا جو عقیدت توہم و پریشانی ہوتی تھین کبھی قدریہ کے آئین پر چلتا اور کبھی جبریہ کے طریق پر۔ میرے پندار مین تو کبھی ایک مذہب پر بھی قائم نہ تھا

دانشمند نے تصانیف کی ایک تعداد کثیر چھوڑی ہے کتاب المقامات الخمسة۔ کتاب فی التوبہ۔ کتاب فی المنزلة بین المنزلتین۔ کتاب معانی القرآن۔ کتاب طبقات اہل العلم والجہل وغیرہ۔ اسکے خطبون کی بھی کتاب ہے جسکی خصوصیت یہ ہے کہ حرف را کہین آنے نہین پایا ہے۔

سنہ ۸۰ھ (سنہ ۶۹۹ء) مین مدینة الرسول مین پیدا ہوا اور سنہ ۱۳۱ھ (سنہ ۷۴۹ء) مین رحلت کی

۲۶۹ ابو عمار۔ مشاہیر فقہائے تابعین سے تھے۔ آپ کے والد یزید بن الاسود النخعی اور والدہ ملکیہ دختر یزید بن قیس نخعین سنہ ۵۰ھ یا سنہ ۴۷ھ (سنہ ۶۶۷ء یا سنہ ۶۷۰ء) مین جس شب مین کہ حکم بن عیینہ فقیہ تابعی کی ولادت ہوئی آپ بھی پیدا ہوئے تھے۔ ایام رشد و شباب مین شوق علم بدرجہا غالب تھا۔ پہلے اپنے دونون ماموں عبدالرحمن اور اسود پسران یزید بن قیس سے تلمذ و اکتساب کیا پھر علقمہ بن قیس النخعی سے جو ان دونون صاحبون کے چچا اور فقہائے سبعہ کے معاصر تھے استفادہ فرمایا اور ہر علم و فن کو سیکھا۔ ابو زرعہ نے آپکی نسبت لکھا ہے النخعی من اعلام الاسلام یعنی ابراہیم نخعی علمائے دین حنیف سے ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زیارت بھی کی تھی نخعی کے حالات خصوصیات مین مروی ہے کہ نوامیس آلہیہ اور شرائع مقررہ کے سوا دوسری طرف توجہ نہ فرماتے تھے بلکہ ہسکو بیہودہ و لغو جانتے تھے اور قطعا التفات نہ کرتے۔ اگر کوئی اس قسم کے سوال کر بیٹھتا تو جواب مین تعرض نہ فرماتے بلکہ تعریض مین لب کھولتے۔ آپ کے ملنے والون مین سے کسی نے پوچھا آپکے حالات شب و روز کیسے گذرتے ہین ؟ جواب دیا اگر آپ کی یہ رائے ہو کہ میری پریشانی کو مجتمع (رفع) کرین یا قرض کو ادا فرما دین یا ستر پوشی مجھے پوشاک پہنا دین تو اپنا حال بار بار عرض کرسکتا ہون ورنہ میری حالت آپکی حالت سے زیادہ عجیب نہ ہوگی کہ میرا حال تو پوچھ رہے ہین اور خود بدولت اپنی کیفیت نہین دیکھتے کسی نے پوچھا کہ آپ کب متولد ہوئے تھے اور اس عالم مین کب قدم رکھا ؟ فرمایا کہ جس وقت میری ہستی کی حاجت ہوئی مین نے عرصۂ ہستی مین قدم رکھا"

آپکی جلالت قدر اور رفعت شان اس حد تک تھی کہ امام اعظم کوفی نے آپ کے ورک حضوری پر فخر کیا ہے انچاس سال تک زندہ رہکر سنہ ۹۵ھ یا سنہ ۹۶ھ (سنہ ۷۱۳ء یا سنہ ۷۱۵ء) مین دار فانی سے رخصت ہوئے۔ جب

بزرگی ہو بشرطیکہ آبائے قریبہ یعنی سات پشت کے اندر پائی جائے مثلاً کوئی شخص سلاطین یا اُمرائے کبار یا کسی اچھے شیخ کی اولاد سے ہو یا کسی مشہور عالم کی نسل میں ہو نسب کی حقیقت کسی شخص کے خاندان کی بزرگی آبائے بعیدہ کے سلسلے سے مانی جاتی ہے جیسے حسینی و ہاشمی ہونا یا قریشی ہونا یا ابراہیمی ہونا علیٰ ہذا القیاس بعض اشخاص میں یہ دونوں تفوق موجود ہوتے ہیں مثلاً حضرت غوث اعظم کی اولاد، جو سید بھی ہیں اور انھیں ایسے بزرگ جلیل القدر کی اولاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

آفتاب عمر معرض غروب میں دیکھا اور سکرات کے آثار اپنے میں مشاہدہ کرنے لگے تو اضطراب سخت و جزع شدید طاری ہوا۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا حال ہے۔ آپ ایسے آشفتہ و پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ کہا کہ "میری کیفیت جو اس وقت ہے اس سے زیادہ سخت اور کون حالت ہوگی اسلئے کہ رب العزۃ کی جانب سے قاصد کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا جنات نعیم کی بشارت دیتا ہے یا درکات جحیم کی خبر خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میری آرزو یہی ہے کہ قیامت کے دن میری جان عزیز میرے حنجرہ (گلے) میں گردش کرے اور اس کالبد سے باہر نہ جائے تاکہ جو ہولناک عقوبتیں ہر شخص دیکھیگا میں نہ دیکھوں"

فائدہ۔ فقہائے سبعہ کا ذکر یہاں آگیا اسلئے کسی قدر تفصیل کردینا ضروری سمجھتا ہوں فقہائے سبعہ جنکو کتب رجال میں فقہا لکھا ہے فرقۂ تابعین سے تھے۔ جو مدینہ طیبہ میں احکام الٰہیہ و احادیث نبویہ و علوم شرعیہ کو اصحاب رسول اکرم صلعم سے حاصل کرکے مسلمانوں کو تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ کتب معتبرہ میں انکے نام نامی یہ لکھے ہیں (۱) سعید بن مسیب بن حزن (۲) عروہ بن زبیر بن العوام (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (۴) عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام (۵) عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ہذلی (۶) خارجہ بن زید بن ثابت (۷) سلیمان بن یسار
اہل التشیع خصوصاً ثقۃ الاسلام کلینی صاحب کافی، اسحٰق بن جریر سے حکایت کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ سعید بن مسیب، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ابو خالد کابلی کو علی بن الحسین زین العابدین رضی اللہ عنہما کے حضور مبارک میں وثوق و اعتماد حاصل تھا۔

ف ۵ مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی حافظ قرآن و امام مفسرین و مقتدائے متکلمین زمانہ تھے سلالۂ علم و علما میں پیدا ہوئے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ سے تمام علوم معقول و منقول پندرہ سال کی عمر میں حاصل کرلئے۔ کمالات باطنی کی تکمیل فرمائی پدر بزرگوار کی رحلت پر اپنے آبا و اجداد کی مسند افادہ و ارشاد پر متمکن ہوئے۔ اسّی سال کی عمر میں صبح یکشنبہ، شوال ۱۲۳۹ھ (۵ جون ۱۸۲۴ء) کو وفات پائی۔ فنون مختلفہ میں تصانیف کثیرہ چھوڑی ہیں۔ تفسیر میں فتح العزیز، مناظرہ میں تحفہ اثنا عشریہ، مجموعہ فتاوی۔ وغیرہ بہت

بعض مین حسب ہوتا ہے نسب نہین ہوتا جیسے تیموریہ اور راجپوتان - اور اولاد حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بعض مین صرف نسب ہوتا ہے حسب نہین ہوتا جیسے قدوائیان جاہل وسادات بارہ شرافت ونجابت عرف عام مین بزرگی نسب کے مقام پر استعمال ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب "

اہل لغت حسب کو شرف وبزرگی بلحاظ مال وجاہ ودین بتاتے ہین اور لکھتے ہین کہ یہ لفظ اکثر نسب کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے نسب کے معنی نسل ونژاد کے ہین ابن السکیت[۵۷] کہتا ہے " الشرف

مقبول اور مستند کتابین ہین - سال ولادت ۱۵۹ھ (۷۷۶ء) تھا

۵۷؎ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق اہتمی - المعروف بابن السکیت نحوی کی نسبت قاضی احمد بن خلکان لکھتے ہین کہ اس کا باپ اسحاق اصل مین دورق خوزستان (خراسان) کا متوطن صالح نیک کردار علم دوست وعالم نواز تھا - آستان مقدس حضرت رضا کی حضوری اور امامین کرام تقی ونقی علیہما السلام کی زیارت وصحبت سے بھی مستفیض ہوا تھا چنانچہ ان حالات وثقات واقوال واحادیث کو کتاب عیون اخبار الرضا مین نقل کیا ہے یعقوب اپنے باپ کے ساتھ مدت تک بغداد مین تعلیم وتربیت اطفال مین مشغول رہا - باپ نے کسی وقت خانہ کعبہ مین دعا مانگی تھی کہ لڑکا فن نحو مین امام ہو - چنانچہ یہ دعا بارگاہ الٰہی مین قبول ہوئی اور یعقوب فن نحو ذکو فیین اور لغت مین یکتائے عصر ہوا - اس نے ان فنون کو اساتذہ وماہرین مثل فراء ابی عمرو اسحاق بن مرار شیبانی ، اثرم ، ابن اعرابی وغیرہم سے تحصیل کیا تھا - بعد فراغ کچھ عرصہ تک بطور خود عام لڑکے لڑکون کو پڑھاتا رہا - چونکہ اسکے علم وفضل کا شہرہ بڑھا اور محمد بن عبد اللہ بن طاہر خزاعی قائد وسپہ سالار عباسیہ نے اسکو اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے پانسو دینار سالانہ پر مقرر کر لیا پھر ہزار دینار سالانہ تک ترقی کر دی - رفتہ رفتہ خود خلیفہ متوکل کی صحبت ودربار مین پہونچ گیا اور معتز وموفق دونون شاہزادون کی تربیت پر مامور ہوا - بارہا انعام واکرام پائے - اکثر شب خلیفہ نے پچاس ہزار درہم عطا کئے تھے - تقدیر الٰہی تھی کہ ایسی قدر شناس وذکی نواز سرپرست کے حکم سے اپنے عقائد کے اظہار کی بدولت یا کسی گستاخی وبدزبانی کی سزا مین مارا گیا - متوکل نے اسکے فرزند یوسف کو دس ہزار درہم بھیجے اور کہلا بھیجا کہ تمھارے باپ کا خون بہا ہے - ابو العباس ثعلب کہتا ہے کہ ابن سکیت تمامی علوم مین مہارت رکھتا تھا اور بالاجماع ابن اعرابی کے بعد علم لغت مین یعقوب سے زیادہ کوئی مستند ومعتبر شخص نہین گزرا - کتب تاریخ وسیر مین ابو الحسن علی بجبانی کے ساتھ یعقوب کا جوانی اور طالب العلمی کے زمانہ مین مناظرہ ، اور ابو الحسن کا ناکام وشرمندہ ہونا اور پھر باہمہ تبحر وکمال ایک وقت پر یعقوب کا ابو عثمان مازنی سے وزیر محمد بن عبد الملک زیات کی محفل مین مغلوب ومنفعل ہو جانا منقول ہے - ابن السکیت نے اٹھاون سال کی عمر مین ۵ یا ۶ رجب ۲۴۴ھ

والمجد یکونان بالآباء - یقال رجل شریف ماجد لہ آباء متقدمون فی الشرف - والحسب والکرم یکونان فی الرجل وان لم یکن لہ آباء لہم شرف"

پلاس[۵] بن ہرمز کا قول ہے "حسب زیور است و نسب جمال - چنانکہ زیور صاحب جمال را درخور است حسب اہل نسب را لائق تر"

اب مربیان کرام و مقتدایان عظام کے اقوال نقل کرتا ہون جو احتفاظ نسب و حسب اور نگہداشت مراتب اقربا کے بارہ مین تقریباً متفق و یکسان ہین۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہین کہ "اپنے خاندان کی تکریم کرو - یہ تمھارے بازو ہین جن سے تم اڑتے ہو یہی تمکو ملاؤ اور یہی تمکو بڑھاتے ہین یہی مصیبت کے وقت آڑے آتے ہین - ان مین کے کریم کا اکرام کرو جو بیمار ہو اسکی عیادت کرو اپنے معاملات مین ان کو شریک کرلو اور انکی مشکلات و تکالیف مین انکو آسانی بخشو"۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تمھارا قریب ہو اور تم پاؤن سے چل کر اسکے پاس نہین گئے

(۲۸ رجب یا ۱۹ اکتوبر ۸۵۸ء) کو دوشنبہ کے روز وفات پائی - بہت سی نافع اور جامع تالیفات یادگار چھوڑین - اس کی کتاب اصلاح المنطق کی تعریف مین علما کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ "از جسر بغداد کتابے در علم لغت مانند او نہ گذشتہ است ... بعد مبرد گفتہ کہ در رسائل کتب بہت نمی آمد۔ باصلاح المنطق رجوع می کردند" ایڈورڈ ولیم لین Edward William Lane بھی اسکی نہایت تعریف کرتا اور لکھتا ہے کہ ابن السکیت نے عروہ بن الورد بن زید العبسی شاعر جاہلی کے دیوان کی نہایت عمدہ شرح لکھی تھی

لہ۵ یہ تحریر مسلمان اہل قلم کی ہے انھین نے یہ نام بھی لکھا ہے۔ لیکن دانایان پارسی کو اسکی اصلیت مین کلام ہے۔ میرے واجب الاحترام مکرم اور زردشتیون کے مقتدائے اعظم شمس العلما ڈاکٹر جیونت جی جمشید جی مودی کی تحقیق یہ ہے کہ طبقہ حکما یا مشاہیر سے کسی پلاس کا "پلاس بن ہرمز" کے نام سے پتہ نہین چلتا ہے۔ البتہ ایران مین ایک بادشاہ "پلاش" یا "بلاش" نامی تھا جو ۴۸۴ء سے ۴۸۸ء تک فرمانروا رہا اسکے سکے بھی ملتے ہین۔ مگر اسکا عہد چندان ممتاز نہ تھا - اسی وجہ سے بعض مورخین نے اسکا نام ہی نہین لیا نہ ذکر کیا ہے - بعض کا قول ہے کہ وہ ہرمز پسر یزدجرد دوم کا بھائی تھا - بعض کہتے ہین کہ نہین وہ ہرمز کا بھتیجا یعنی فیروز برادر ہرمز کا بیٹا تھا - رومانی مورخین اسی کو Balas بتاتے اور لکھتے تھے

اور اپنے مال سے اُسے کچھ نہین دیا تو حضور رحمت نے اُس سے قطع تعلق کیا

ایک صاحب کہتے ہین کہ اقارب کا حق یہ ہے کہ چھوٹا اپنے بڑے کی تعظیم کرے اور بڑا چھوٹے پر شفقت" رحمت عالم و عالمیان صلعم نے فرمایا ہے کہ بھائیون مین سے بڑے کا حق اپنے چھوٹون پر اتنا ہی ہے جتنا باپ کا اپنے بیٹے پر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہین کہ اپنے انساب کا علم حاصل کرو۔ اس سے تم اپنی اصل و

فاضل ڈاکٹر نے اسکے متعلق اپنی تالیف " ایشیاٹیک پیپرس حصۂ دوم مین لکھا ہے نیز اُس مضمون مین جو خوارزم (خیوا) کے سفید ہُن لوگون (ہنو۔ مزدکیان۔ ایران) کی قدیم تاریخ پر دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ بمبئی کے رسالہ میں ۱۹۱۶ء مین شایع کیا۔ شرح حجاشی میں لکھا ہے کہ بلاس بہرام گور کا بیٹا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ سکندر کے نامور ندیم حکیم بلیناس کا اس روایت سے کچھ تعلق ہو۔

۵۳ خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوحفص تھی۔ لقب فاروق تھا۔ بڑے جلیل القدر صحابی اور سپر اسلام و اسلامیان تھے علی الراجح نبوت کے سال ششم مین ستائیس ۲۷ برس کی عمر مین ایمان لائے تھے (الذہبی) آیہ پاک یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (اے پیغمبر اللہ اور مسلمان جو تمھارے تابع فرمان ہین تمکو کافی ہین۔ جزء ۱۰ سورۃ الانفال ع ۸-۴) کا نزول مفسرین آپکی شان مین بتاتے ہین اور مَنِ اتَّبَعَكَ سے مراد حضرت فاروق اعظم کو لکھتے ہین۔ جامع ترمذی اور مستدرک حاکم مین مناقب عمر مین جو احادیث مروی ہین اُنسے آپکے علو مرتبت اور جلالت شان کا اندازہ ہوسکتا ہے لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب۔ لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ ما طلعت الشمس علی رجل خیر من عمر رحمۃ دو عالم نے آپکے حق مین دعا فرمائی تھی اللّٰھم اعز الاسلام بہ۔ اللّٰھم ایّد الاسلام بعمر بن الخطاب یہ دُعا بذیرا ہوئی (دار قطنی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے آپکا نسب کعب ابن لوی پر پہونچکر ملتا ہے حضرت کے مولد شریف سے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ آپکی شادی سات بار ہوئی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم بھی آپکی زوجیت مین تھین۔ آپ کی بیٹی حضرت حفصہ زوجہ رسول اور ام المومنین تھین ایام جاہلیت مین جب قریش کے قبیلون مین لڑائی ہوتی تھی تو آپ سفیر ہوکر جایا کرتے تھے۔ اکثر منافرہ (حسب و نسب کے فیصلہ) کے جلسون مین بھی پیش ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر کی وفات پر بروز سہ شنبہ ۲۳ جمادی الاخر ۱۳ھ (۲۵ اگست ۶۳۴ء) کو مسند آرائے خلافت ہوے سب سے پہلے آپ ہی امیر المومنین کہلائے

دنیا سے آگاہ ہو جاؤ گے پھر صلہ ارحام تک پہونچو گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر انساب سے آگاہی نہ ہوتی تو دشمنوں کی صولت سے احرار اور برابر والوں سے تنازع برپا رہتا۔ اسکا سکھانا

مورخین لکھتے ہین چونکہ حضرت ابوبکر خلیفہ رسول کہلاتے تھے۔ اسلئے جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو فرمایا کہ اگر لوگ مجھے خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہنے لگین گے تو بڑا لمبا خطاب ہو جائے گا۔ مغیرہ بن شعبہ اوٹھ کھڑے ہوئے اور بولے کہ آپ ہمارے امیر ہین اور ہم مومن ہین تو آپ امیر المومنین ہین۔ تمامی حاضرین واصحاب بالاتفاق اس کو پسند و منظور کیا۔ اُسیوقت سے آپ امیر المومنین کہلانے لگے اور پھر آپ کے بعد آنیوالون نے بھی اس کی تقلید و تبعیت کی۔ مدینہ مین مسجد نبوی کی توسیع ۱۷ھ مین آپکے عہد مین ہوئی۔ سب سے پہلے آپ ہی نے تاریخ لکھی اور حضرت ابوبکر کو مصحف قرآنی کے جمع و یکجا کرنے پہ آمادہ کیا تھا۔ ماہ رمضان المبارک کا قیام اور رونق آپ ہی کی بدولت ہوئی۔ تعزیر و تادیب کے لئے دُرّہ آپ ہی نے مقرر فرمایا تھا۔

حضرت عمرؓ نے تمام ممالک شام و فونیشیا کو ہرقلیس قیصر روم کے ہاتھ سے چھینا۔ یروشلم (بیت المقدس) کو سخت محاصرہ کے بعد صلحاً ۱۶ھ (۶۳۶ء) مین فتح کیا جسکی کنجیان لینے کے لئے خود حضرت عمرؓ کو مدینہ سے وہان تشریف لیجانا پڑا۔ ہجرت کے سولھوین سال مسلمان ملک عجم پر بھی مستولی ہو گئے۔ سلطنت کسریٰ برباد ہوی۔ یزدجرد پسر خسرو پرویز سے فارس لے لیا۔ کلمہ گویان اسلام کی تعداد بڑھائی۔ مصر و اسکندریہ آپکے عہد مین فتح ہوا۔ کتب خانہ اسکندریہ کے جلا دینے کی جھوٹی روایت جو معاندین حضرت عمرؓ اور مخالفین اسلام نے ایک مدت تک مشہور کر رکھی تھی دانایان محققین نے نہایت قوی و واثق ذرائع و دلائل سے اُس کی تردید کر دی ہے۔ آپ کے زمانہ خلافت مین بحر احمر و دریائے نیل کے درمیان پھر نہر قائم کی گئی۔

چھتیس ہزار شہر اور قصبے جیسے بعل بک۔ حمص۔ حلب۔ انطاکیہ۔ تبریز۔ آذربیجان۔ ہرات۔ جرجان وغیرہ مسلمانون نے فتح کئے۔ چودہ سو مساجد تعمیر کین۔ بروایت حدائق الانوار و دیگر کتب معتبرہ آپ کی مدت خلافت دس سال پانچ ماہ و تیس روز تھی۔ بڑے عادل اور منصف، صاحب عظمت و جبروت خلیفہ تھے۔ رات کے وقت شہر کی پاسبانی فرماتے۔ کسی گھر سے گانے بجانے کی آواز آتی یا شرابیون کا شور و غل سُنتے تو احتساب شرعی فرماتے توبہ کرلیتا تو درگزر کرتے ورنہ سزا دیتے۔ تازیانہ اور رات کے لئے چوکیدار مقرر کئے۔ دفتر مرتب کیا گیا۔ شہرون مین قاضی بھیجے۔ رمضان کے مہینے مین مسجدون مین قندیلین جلائین۔

تقدیر الٰہی تھی کہ چہار شنبہ ۲۵ ذیحجہ ۲۳ھ (۳ نومبر ۶۴۴ء) یا بروایت مجالس المومنین ۲۶ ذیحجہ کو ابو لؤلؤ فیروز نہاوندی (مجوسی یا یہودی) غلام مغیرہ نے بحالت اشتغال نماز مسجد نبوی (واقع مدینہ منورہ) مین آپ کو خنجر سے مجروح کیا۔ پھر سات اور آدمیون کو قتل کر کے خود بھی ہلاک ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اسکے تین دن بعد وفات پائی۔ بروایت واقدی روز یکشنبہ غرہ محرم ۲۴ھ (۷ نومبر ۶۴۴ء)

بھی نہایت ہوشمندی اور انتہائے ثواب کی بات ہے۔ حضرت شعیبؑ علیہ السلام کی قوم کا قول یاد رکھنے کی چیز ہے۔ وہ بولی (وَ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ) اور اگر تمہاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تم کو سنگسار کر چکے ہوتے (جز ۱۲ سورہ ہود ع ۸) ظاہر ہے کہ خاندان والوں کی بدولت یہ بچ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی فرمایا ہے۔ عربیت سکھاؤ۔ اس سے جوانمردی

کو دفن کیے گئے ۶۳ تریسٹھ سال عمر تھی۔ اہل ایران نے اس واقعہ کی یادگار جس طریقہ پر قائم کی اور جسکو وہ صدیوں سے مناتے چلے آتے ہیں۔ اس کو نامور فرنگی سیاح وارنگ Waring نے اپنے سفر نامہ شیراز سنہ ۱۸۰۲ء میں بہ تفصیل لکھا اور ان کی بدعات و مراسم کو بیان کیا ہے۔ انھیں حرکات ناپسندیدہ کو قاضی نور اللہ شوستری نے اہل کاشان سے منسوب کر کے اپنی کتاب مجالس المومنین میں میر مخدوم شریفی شیرازی کی کتاب (نواقض الروافض) کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

آپ بڑے سخن شناس اور سخنور تھے لیکن احتیاط و ادب کا یہ پایہ تھا کہ کوئی شخص حدود معینہ شرعیہ سے تجاوز یا کلام میں مبالغہ نہیں کرنے پاتا تھا۔

آپ کے حالات و کرامات و عادات کو حیوۃ الحیوان، فوائد ابو القاسم بن بشران، کتاب العظمۃ لابی الشیخ، ریاض النضرۃ، دلائل النبوۃ لابی نعیم، شرح السنۃ للالکائی، کرامات الاولیا لابن الاعرابی، اصابہ لحافظ ابن حجر، تلقیح فہوم الاثر لابن الجوزی، مستطرف للابشیہی نے نقل کیا ہے۔ شاہنامہ اسلام یزدجرد کے آغاز میں فردوسی کہتا ہے ؎

چنان بد کہ چون سر فراز عرب | کہ از تیغ او روز گشتی چو شب
عمر آنکہ شد مومنان را امیر | بودہ نور را خالق بے نظیر

۵۴ حضرت شعیبؑ انبیائے کرام اور اولاد حضرت صالح علیہ السلام سے تھے خدا کے نہایت برگزیدہ اور صالح بندے بڑے فصیح اللسان تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو پیغمبروں کا خطیب فرمایا ہے۔ خدائے عزوجل نے اپنے کلام پاک کے بارھویں پارے (وما من دابة) سورۂ ھود میں آپ کا ذکر خیر فرمایا ہے۔ آپ کی بددعا سے آپکی ناخدا ترس قوم پر ہلاکت اور آگ کا عذاب نازل ہوا تھا۔ مدین میں قیام تھا مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسےؑ نے آپ کی آغوش تربیت میں کامل آٹھ سال بسر کیے تھے اور فرعون کے تاج و تخت کو تاخت و تاراج کرنے یہیں سے تشریف لے گئے تھے اس عالم فانی میں بارہ سال تک بصارت ظاہری سے محروم مگر دعوت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مشغول رہے

بڑھتی ہے اور نسب بتاؤ بہت سے ارحام ایسے مجہول تھے جو اپنے نسب کے پہچان لینے سے واصل ہوگئے۔

یاد رہے کہ عرب کی صحت نسب کی تصدیق بزعم خود نسب ناموں اور تاریخی وخاندانی روایات سے ہوتی تھی بلکہ سب سے معتبر معیار ان کی روایات وحکایات کا ان کے اشعار تھے۔ وہ اُمّی تھے اسلیے بدوان آمیزش وتحریف پانے کے اُن کے کلام وقصص آباعن جد محفوظ چلے آتے تھے۔

شرافت پر نظر مختلف پہلوؤن سے

اسلام نے علو انساب وشرف قبائل کی بزرگی وفضیلت کو دور کرکے اخلاقی زندگی کو ایک برتر وبہتر معیار قرار دیا اور اس کا مکمل نمونہ پیش کیا اور نوع بشر کی مساوات اور تمام کلمہ گویان اسلام کی مواخات کا بلا فرق مراتب اعلان کیا اور نسب اور سلف کا امتیاز مٹا کر صرف تقوی کو وجہ فضیلت قرار دیا إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (ہمنے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری ذاتین اور برادریان ٹھہرائین تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو ورنہ) اللہ کے نزدیک تم مین بڑا شریف وہی ہے جو تم مین بڑا پرہیزگار ہے (جزو ۲۶ سورہ الحجرات ع ۲-۱۴)

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ قیامت مین نسب کا حصہ بکسر اٹھا دیا جائے گا نہ قرابت مندی کام آئے گی نہ کوئی کسی کی مدد کرسکے گا چنانچہ (جزو ۱۸ سورہ مومنون ع ۶-۱۰۲ مین) وارد ہوتا ہے فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ (پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس دن نہ تو لوگون مین رشتے داریان باقی رہین گی اور نہ ایک دوسرے کی بات پوچھین گے) اپنے حبیب ورسول صلعم سے اللہ جل شانہ خطاب فرماتا ہے وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (اور خاص کر) اپنے قریب کے رشتہ دارون کو (عذاب خدا سے) ڈراؤ (جزو ۱۹ سورۃ الشعراء ع ۱۱-۱۵)

صحیح مسلم مین ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورعالم نے فرمایا مَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ

بہ نسبہٖ [جسکے ساتھ اسکے عمل نے دیرلگائی اسکے ساتھ اس کا نسب کچھ جلدی نہ کرسکے گا]

انھین پاکیزہ تعلیمات کے روشن نتائج وہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ تھے جو جماعت اسلامی کے ایک ایک فرد مین نظر آنے لگے۔

یہ صحیح ہو کہ بارگاہ خداوندی مین کوئی لحاظ انساب وخاندان واقوام وقبائل کا نہین رکھا گیا ہے وہان دولت وافلاس آزادی وغلامی، رنگ اور روپ، ملک وزبان کی پرسش نہ ہوگی۔ وہان جس گرانمایہ متاع اور کمیاب جنس کی قدر ہوگی وہ فقط ورع وتقویٰ ہو لیکن اس کے ساتھ سردار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرملت وائمہ دین کی اولاد امجاد اور آل اطہار کے دنیوی اعزاز اور اُخروی احترام کو نظر انداز نہین کیا جاسکتا۔ امامت وخدمات شرعیہ کی انجام دہی کے لئے بھی اچھے نسب والے متقی اشخاص کو ترجیح دی گئی ہو یعنی امام کے لئے لازم کر دیا ہو کہ حسب مین رعیت سے فضل اور نسب مین اشرف ہو

نماز کی امامت کے بارہ مین جو حقیقتاً نیابت رسالت ہے فقہائے عظام کا متفقہ فتویٰ یہ ہے

الاولی بالامامۃ الاعلم بالسنۃ ثم الاقرء ثم الاورع ثم الاسن ثم الاحسن خلقا ثم الاشرف نسبا ثم الاصبح وجھا ثم الاحسن صوتا ثم الانقی ثوبا

اتقی اُسکو کہتے ہین جو حرام سے بچتا ہو مگر جو شخص شبہات حرام سے بھی پرہیز کرے وہ اورع ہے اور اُسکا درجہ اتقیٰ سے بالاتر۔ اسلئے احکام سنت کے جاننے تجوید وقرأت کی واقفیت اور قرآن مجید کے یاد رکھنے اور خدا ترسی اور اخلاق پسندیدہ مین بھی جب لوگ برابر ہون تو جو سب سے زیادہ عُمر ہو امامت کے لئے اُسکو ترجیح وفضیلت حاصل ہوگی۔ اگر سن مین بھی مساوی ہون تو جو شخص نسب مین سب سے زیادہ شریف ہو وہی امام مقرر ہوگا۔ توجیہ کی ضرورت نہین۔ اول کے فضائل محض اکتسابی ہین جو انسان کی ذات سے جدا نہین ہوسکتے۔ باقی فضائل خلقیہ پر مرجح ومقدم ہون گے یہ ہے فضائل خلقی، ان مین نسبی شرافت کے سبب سے تفوق وبرتری ملحوظ رہے گی علمائے کرام شریف النسب کو امام بنانے کی وجہ بتاتے ہین لِاحْتِرَامِہٖ وَتَعْظِیْمِہٖ یہ دعویٰ محتاج دلیل نہین کہ شریف النسب ا

شخص سب لوگون کی نظرون مین محترم اور معظم ہوتا ہے۔ اسی لئے منصب امامت جو ایک مکرم اور معزز عہدہ ہے ستعی ہر اُسکے سپرد ہونا چاہیئے تاکہ یہ امر جماعت کی تمکین و وقار کا باعث ہو۔

حضرت امام علی رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول فصل الخطاب مین مرقوم ہے کہ ہم مین سے جو کوئی ایک نیکی کرے دو نا ثواب پائے گا۔ اسیطرح جو بدی کرے اُسکو عذاب بھی دونا ہوگا۔ ہم مین سے جو کوئی خدا کی بندگی نہ کرے وہ ہم مین داخل بھی نہین ہے پس اے مخاطب جب تک تو اطاعت الٰہی کرے گا ہم اہل بیت رسول مین شمار ہوگا" کسی نے امام ہمام سے عرض کیا کہ "خدا کی قسم آپ بہترین اولاد آدم ہین" فرمایا کہ "اے شخص سوگند نکھا جو کوئی زیادہ پرہیزگار اور خدا تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کرنے والا ہے وہ مجھسے بھی بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔ خدا کی قسم کھاتا ہون کہ یہ آیت منسوخ نہین ہوئی ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کسی نے امام عالی مقام سے کہا کہ "روئے زمین پر کوئی شخص باپ دادا کے لحاظ سے آپ سے زیادہ شریف نہین ہے" فرمایا کہ "ہمارے آبا کو تو اسی تقویٰ نے شریف تر بنا دیا تھا"

سوم فضائل کے اعتبار سے ایک گروہ نے بزرگی و شرف کا مستحق صرف اُن لوگون کو سمجھا ہے جن سے جماعت انسانی کو نفع پہونچے خیر الناس من ینفع الناس بناءً علیہ مامون الرشید عباسی کا عقیدہ یہ تھا کہ بنی آدم مین سب سے بہتر و برگزیدہ صرف اہل علم و فضل ہین جنکے انبائے جنس کو لازوال منفعت و برکت پہونچتی رہتی ہے جنھون نے اپنی حیات ظاہری کو اپنے بنی نوع کے سود و بہبود کے لئے وقف کر رکھا ہے

ایک دوسری جماعت شریف ترین عوائد و فضائل و بہترین قبائل بنی فاطمہ یعنی سادات کو بتاتی ہے۔ آیت پاک الحقنا بہم ذریتہم (ہم ان کی اولاد کو بھی جنت مین) انکے ساتھ لے جا ملائینگے جزو ۲۷ سورۃ الطور ع ۱-۳ جسکے لئے نازل ہوئی ہے سید الانبیا علیہ و علی آلہ التحیۃ و الثنا کی ہی اولاد ہین۔ حدیث نبوی ان اللہ جعل ذریۃ کل نبی فی صلبہ و جعل ذریتی فی صلب علی بن ابی طالب (بیشک خدائے عزوجل نے ہر ایک نبی کی ذریت اُسکی پشت سے پیدا کی ہے درحالیکہ میری ذریت علی بن ابی طالب کی پشت سے پیدا کی) انھین کی شان مین آئی ہے۔ ستوار الحقائق

والبداہتہ اور مناقب السادات مین منقول ہے کہ بنی فاطمہ کے سوا اور کسی طبقہ کی شرافت نسبی پر اہل حق کا اجماع نہین ہے انکا فضل و شرف تمام قبائل پر مجمع علیہ اور متفقاً مسلم ہے محمد بن سیرین کہتے ہین کہ آیۂ کریمہ (وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا) [اور وہی قادر مطلق ہے جسنے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اُسکو کسی کا بیٹا بیٹی اور کسی کا داماد بہو بنایا۔ جزء ۱۹ سورۂ الفرقان ع ۵-۳] نسب و صہر[۵۵] سے مراد خود حضرت امیر علی ہین جو ابن عم نبی اور زوج فاطمہ بنت الرسول تھے محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار مین شیخ الاکبر محی الدین محمد بن عربی[۵۶] ابن عباس سے نقل فرمایا ہے کہ آیت يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (یہ جو منتین پوری کرتے ہین

ف۵۵ اہل سنت وجماعت کے یہان نسب و صہر سے مراد علیؑ و فاطمہؑ ہونے کیلئے کوئی حدیث اس ہیچمدان کی نظر سے نہین گذری مگر یہ قول متفقاً مسلمانون کی ایک جماعت یعنی اکابر مفسرین اہل تشیع کا ہے اور خازن وغیرہ نے اس کو نقل کیا ہے۔

[شیخ علاء الدین بن علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی صوفی معروف بہ خازن کو تفسیر اللباب فی معانی التنزیل کی تالیف سے چہار شنبہ دہم رمضان ۷۲۵ھ (۱۰ اگست ۱۳۲۵ء) کو فراغت ہوئی تھی۔ خود لکھتے ہین کہ امام بغوی محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود فراء شافعی متوفی ۵۱۶ھ کی تفسیر (معالم التنزیل) بہمہ وجوہ مکمل اور متصف بہ جمیع اوصاف حمیدہ تھی مگر اسکی طوالت اُسکے استفادہ کامل سے باز رکھتی تھی۔ لہذا اسکی تلخیص بعبارت کر دی گئی اور بعض فوائد مثل شرح غریب وغیرہ کے اپنی طرف سے اضافہ کر دیے بحذف اسناد احادیث کا ایراد کیا گیا۔ اسکی دو باتین قابل کرین۔ ایک مسائل فرعیہ تفسیر کی تکثیر۔ انکو محدثین حاجت اصلی سے زیادہ پاتے ہین۔ دوسرے قصص کا بدون تصحیح و تضعیف ایراد جسکی وجہ سے کتاب بڑھ گئی ہے۔ مصر مین چار جلد مین چھپی ہے۔ واضح ہے کہ خازن کے بعد شیخ تاج الدین ابو نصر عبد الوہاب بن محمد حسینی (متوفی ۸۷۵ھ) نے بھی اسی تفسیر بغوی کا اختصار کیا تھا۔]

ف۵۶ اوحد الموحدین محی الدین محمد بن علی العربی الطائی الحاتمی الاندلسی خاندان علم وجود سے تھے آپ کی سی جامعیت علوم و فضائل و کمالات والے بزرگ دنیا مین بہت کم پیدا ہوئے ہین۔ آپ کے خرقہ کی نسبت حضرت خضر تک ایک واسطہ سے پہونچتی ہے۔ شاعر بھی تھے۔ مدائح اہل طہ مین آپکے اشعار کتاب الاخبار مین موجود ہین۔ حضرت شیخ وحدت وجود کے قائل اور شہود کے طوف کرنے والے تھے۔ باوجود دوست فقیہانہ شیخ علاء الدولہ سمنانی نے فتوحات کے بہت سے

اور اُس روز سے ڈرتے ہیں جسکی مصیبت پھیلی ہوئی ہوگی۔ جزو ۲۹ سورۃ الدہر ع ۱-۹ (علی و فاطمہ کے حق میں اُتری ہے۔

ایسے شریف النسب حضرات کی تکریم و تبجیل اسلام کے اصول مساوات کے بھی منافی نہیں ہوسکتی۔ بیشبہ احکام الٰہیہ و شرعیہ خواہ عبادات سے متعلق ہوں خواہ معاملات و معاشرات سے ان کا عمل و اتباع تمام مسلمانوں پر یکساں واجب و لازم ہے۔ جسکے لئے استثناء کی کوئی صورت نہیں

حواشی میں شیخ کی بزرگی کا اقرار و اعتراف فرمایا ہے۔ اور ایہا المدقق، ایہا المقرب۔ ایہا الولی، ایہا العارف الحقانی کہکر جابجا خطاب کیا ہے۔ علاء الدولہ کی اور تصانیف میں بھی یہی حق پسندی انصاف کوشی کی کیفیت شیخ ابن عربی کی نسبت نظر آتی ہے۔ وہ رسالہ اقبالیہ میں لکھتے ہیں کہ شیخ سعد الدین حموی سے پوچھا گیا کہ شیخ محی الدین عربی کو کیسا پایا۔ فرمایا بحر مواج لا نہایۃ لہٗ۔ یافعی نے تاریخ میں شیخ عز الدین عبد السلام دمشقی وغیرہ کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں

اس معنی میں کہ ابن عربی نے حضرت حق کو وجود مطلق بتایا ہے۔ اکثر اہل ظواہر انکی خطا سمجھتے ہیں ولیس ھذا القول قادحا فی الاسلام اسی لئے ایک بڑی جماعت علمائے شام کی ان کی تکفیر و تضلیل پر مائل و مصر تھی تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا [اصطلاح صوفیہ میں شطحیات ایسے ہی اقوال کا نام ہے جو ظاہر اصطفائے اسلام اور شریعت بیضا کے موافق نہ ہوں۔ اگرچہ ایسے کلمات مستی و ذوق میں بے اختیار نکل گئے ہوں اسی لئے منصور کے دعوے انا الحق اور جنید کے لیس فی جبتی سوی اللہ کہنے اور بایزید کے سبحانی ما اعظم شانی کہنے پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ معدن المعانی میں تحریر ہے کہ مشائخ ایسے کلمات خلاف شرع کو نشہ میں ضرور کرتے ہیں]

اکابر شیعہ بھی شیخ کو بڑی عظمت و احترام سے یاد کرتے ہیں صاحب مجالس وغیرہ نے ہر جگہ "شیخ اعظم قدس اللہ سرہٗ" لکھا ہے۔

٦٣٧ھ

عرصۂ عالم میں ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ (۱۶ اگست ۱۱۶۵ء) کو قدم رکھا جوار قدس کو شب جمعہ ۲۲ ربیع الآخر (۱۶ نومبر ۱۲۳۹ء) میں رحلت فرمائی قبر ظاہر دمشق کے ایک موضع میں ہے جو صالحیہ سے موسوم و مشہور ہے۔

بعض مورخین نے سال ولادت ۵۶۱ھ ۱۱۶۶ء اور سال وفات ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء تحریر کیا ہے

تصانیف عالیہ (۱) فتوحات مکیہ (۲) فصوص الحکم (۳) رسالۃ العقیدہ (۴) کتاب الاحبار (۵) محاضرات و مسامرات وغیرہ میں شیخ نے ایک بڑی تفسیر اہل تصوف کے طریقے پر لکھی تھی جو تفسیر ابن عربی کہلاتی ہے۔ اسکی ساٹھ جلدیں تھیں اور صرف سورہ کہف تک پہونچنے پائی تھی۔ ایک دوسری تفسیر جو تفسیر صغیر کے

یکسی بزرگ یا شریف کی اولاد ان احکام کی پابندی سے معاف و بری ہوسکتی ہے۔ اسی طرح جو منہیات شرعیہ ہیں ان سے باز رہنا بھی ہر مجہول وہر معروف النسب پر لابد ہے۔ ایسے جنایات وجرائم کے لئے جو سزا مقرر ہے دونوں پر یکساں عاید ہوگی

لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ اہل بیت کبار اور آل اطہار یا بزرگان دین کی اولاد کسی خاص عزت ومحبت کی مستحق نہیں اُسکے ساتھ عوام انفار کا سا برتاؤ وسلوک کیا جائے خیال رہے

نام سے مشہور ہے آٹھ حصوں میں مفسرین کے اسلوب پر بھی تحریر فرمائی تھی

اضافہ ۔ خاک ہند نے بھی ایک محی الدین عربی پیدا کیا تھا ۔ یہ توحید وتصوف کے علمبردار بزرگ شیخ مان پانی پتی تھے جنھوں نے لوائح اور نزہت الارواح کی ضخیم شرحیں لکھی ہیں اور جنکی روحانی بارگاہ (دست گرد) تاج العارفین شیخ تاج الدین ولد زکریا اجودھنی (پاک پٹنی) کے سے نامور اور صاحب معرفت لوگ تھے مشائخ اہل ہند سے چند بزرگ اور بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے شیخ اکبر کے اقوال وارشادات کا احیاء اور ان کی تصانیف وکتب کے مطالعہ وتشریح پر اعتنائے عظیم فرمایا ہے۔

۱۔ مولانا شیخ عبدالرشید جونپوری الملقب بہ شمس الحق ۔ صاحب تخلف کتب حقائق شارح کتاب اسرار خلوت (مصنفہ شیخ اکبر) ومترجم بعض کلام شیخ (بہ ترجمہ الحکوم المربوط کے نام سے مشہور ہے)

۲۔ حضرت مولانا شیخ محب اللہ الہ آبادی مصنف رسالہ تسویہ (تصوف میں) اور شارح فصوص بزبان فارسی ۔

۳۔ مولانا نورالدین بن شیخ محمد صالح احمد آبادی ۔ صاحب الطریق الامم شرح فصوص الحکم

۴۔ شیخ محمد حسین ، کلیم جنھوں نے بارھویں صدی کے آخر میں فصوص کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا تھا

۵۔ شیخ محمد علی حزین (اصفہان نژاد، بنارس مدفن) نے بھی شیخ اکبر کے اقوال وتحریرات سے استفادہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں "انچہ را شیخ ابن عربی رحمہ اللہ ورقص اور یسی از کتاب فصوص الحکم ذکر کردہ مرا محقق ومعلوم شدہ وآخر شرحے وافی بر کلام شیخ نوشتہ ام"

شرق پسندان یورپ کی شیخ کو تکریم وتعظیم ، پروفیسر براؤن وغیرہ کا ادب واحترام مناسب موقع پر ذکر کیا جائیگا ہسپانیہ کا مشہور فاضل ، میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی زبان وادب کا استاد، علوم اسلامیہ کا ماہر ومحقق پادری آسین Rev. Miguel Asin اپنی تازہ تالیف Islam and the Divine Comedy میں لکھتا ہے کہ یورپ کا قرون وسطے کا مسلم الثبوت دانشمند رے مان لل Raymond Lull مسلمان علما، وحکما کی تحقیقات اور فلسفیانہ تخیلات سے زیادہ مستفید ومتمتع ہوا تھا۔ لل کی زبان وقلم سے جو کچھ نکلا ہے شیخ اکبر ابن عربی کی تعلیمات کا آئینہ نظر آتا ہے دانتے Dante of Florence (Italy) جو فلارنس (واقع اٹلی) کا نامور شاعر تھا اور جس کا درجہ وشہرہ باعتبار کمال وکلام یورپ میں دوسرا

کہ یہ وہی گروہ پاک ہے جسکی شان مین حق سبحانہ وتعالی ارشاد فرما چکا ہے قُل لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی اے رسول کریم اُمّت مرحومہ سے فرما دیجئے کہ مین تم سے اس تبلیغ احکام الٰہی و تعلیم اخلاق اسلامی کا کوئی عوض نہین چاہتا مگر یہ کہ تم میرے قرابت دارون سے محبت و مودت رکھنا (جزء ۲۵ سورۃ الشوری ع ۴۴)

یہ تفسیر صرف شیعون ہی کی نہین بلکہ اسکو قاضی بیضاوی نے بھی نقل کیا ہے روی انّھا لما نزلت قیل یا رسول اللہ من قرابتک ھؤلاء الذین وجبت مودتھم علینا قال علی وفاطمۃ وابناھما [صفحہ ۳ جزء خامس تفسیر انوار التنزیل مطبوعہ مصر] اور اسکے بعد کی آیت کو حضرت ابوبکر کی شان مین بتایا ہے) نواب صدیق حسن خان تشریف البشر مین لکھتے ہین کہ "جب یہ آیت اُتری قل لا اسئلکم تو حضرت سے پوچھا گیا کہ آپ کی وہ کون قرابت ہے جنکی مودّت ہم پر واجب ہے فرمایا علی وفاطمہ وابناھما"

قرآن مجید کی کوئی تفسیر احادیث پاک سے زیادہ صحیح و مستند نہین ہوسکتی۔ اسلئے جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالی کے رسالہ احیاء المیت سے دو حدیثین نقل کی جاتی ہین

اول۔ اخرج سعید بن منصور فی سننہ عن سعید بن جبیر فی قولہ تعالی قل لا

یعنی ہومر کے بعد مانا جاتا ہے۔ اسکی نسبت اسین کا دعوی ہے کہ دانتے نے ایک فلسفی متصوف کے عالم افلاک پر جانے اور سیر کرنے اور دوزخ کے احوال، مطہرہ کے احوال جنت کے تذکرے اور سیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اسلامی روایات متعلق معراج نبوی اور سیر عرش و کرسی کی ایک نقل ہے انھین تمام حالات و تخیلات کو، دانتے کی پیدایش سے پچیس سال پیشتر شیخ اکبر نے اپنی تقریر و تحریر سے نمایان کیا تھا۔ ابن عربی کی تمام ترتیبات و ترکیبات دانتے کی نظم مین جلوہ گر ہین

افادہ - رے ان لل جسکے لغوی معنی "حکیم روشن خیال" کے ہین اسپین کے ایک مشہور فلسفی کا نام تھا جو ۱۲۳۵ء مین اس جہان مین آیا اور ۱۳۱۵ء مین رخصت ہوگیا

۲ دانتے شاعر کی ولادت کا سال ۱۲۶۵ء اور وفات کا ۱۳۲۱ء ہے

۳ گروہ مخالف سے بھی ایک صاحب تصنیف قابل تذکرہ ہے۔ محمد طاہر بن محمد حسین الشیرازی النجفی القمی نے جو گیارھوین صدی ہجری کے ناموراہل علم و خبرت سے تھا ایک کتاب تحفۃ الاخیار، قصیدہ مونس الابرار

اسئالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ قال قربیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ثانی اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ فی تفاسیرھم والطبرانی فی المعجم الکبیر عن ابن عباس قال لما نزلت ھذہ الآیۃ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ قالوا یا رسول اللہ من قرابتک ھؤلاء الذین وجبت علینا مودتھم۔ قال علی وفاطمہ وولدھا

مودت قرابت اور محبت آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اور بھی حدیثیں موجود ہیں

ثالث۔ اخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ ومن یقترف حسنۃ قال المودۃ لآل محمد

رابع۔ اخرج احمد والترمذی وصححہ والنسائی والحاکم عن المطلب بن ربیعۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا یدخل قلب امرئ مسلم ایمان حتی یحبکم للہ ولقرابتی

بزرگان دین رحمہم اللہ اجمعین کے اقوال وارشادات بھی اس بارہ میں قابل عمل وتقلید ہیں امام شعرانی منن کبریٰ میں لکھتے ہیں ومما من اللہ بہ علی محبتی للشرفاء واھل البیت ولو من قبل الام فقط ولو کانوا علی غیر قدم الاستقامۃ لانھم بیقین یحبون اللہ ورسولہ ومن احب اللہ ورسولہ لا یجوز بغضہ ولا سبہ الی قولہ ولا یلزم من اقامۃ الحدود علی الشرفاء اننا نبغضھم بل اقامتنا الحد علیھم انما ھو محبۃ فیھم وتطھیر لھم

شیخ اکبر ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ذنوب اہل بیت صورتاً ذنوب ہیں حقیقتاً نہیں۔ اللہ جل شانہ نے بسابقۂ عنایت اُنکے گناہ معاف فرما دیے ہیں جسکی دلیل آیۂ تطہیر موجود ہے۔ اور ذنوب سے بڑھکر

کی شرح میں لکھی تھی۔ اس میں تصوف اور اصول تصوف اور مشائخ اکابر صوفیہ پر بنہایت زبردست حملے کئے ہیں جناب شیخ کی شان بھی اسکی گستاخی اور زبان درازی سے محفوظ نہیں رہی۔ آغاز یوں ہوتا ہے ؎

بچون دیدہ لو نشستیم بر در و دیوار   کہ چشم مردمی از اہل روزگار مدار ؎

ص۲ ص رکھتا اور عظمت کرتا تھا۔ ان کا کلام زیادہ تر فتوحات، الکنہ، المحکم المربوط، الدرۃ الفاخرۃ، مطالع النجوم وغیرہ میں میری نگاہ سے گزرا تھا۔ لیکن ان کے مقصود کی حقیقت پر سمجھنے کے بعد کو اطلاع و آگاہی ہوئی تو پھر میں نے فصوص وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا۔

ح۱ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانی کو بھی شیخ اکبر کے بعض اقوال واحوال پر اعتراض تھا۔ ابن تیمیہ نے ۷۰۴ھ (۱۳۰۴-۰۵ء) میں اکثر معاملات حاضرہ ومسائل ضروریہ و ارشادات صوفیہ کے بارہ میں ایک مطول خط شیخ القدوۃ ابو الفتح نصر المنبجی کو لکھا تھا۔ اُس میں ابن عربی اور اُن کی بعض تالیفات کی نسبت اظہار خیال کیا ہے۔ وہ خدا اور اُس کے رسول کے ساتھ مومنین کے لئے "تکشف اسرار طریق وتہتک استار" کی احتیاج کے قائل نظر نہیں آتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ابن عربی کی کتابوں کو دیکھ کر اُن کے فوائد کے متعلق میں ہمیشہ سے حسن ظن ۲۳

کوئی برج نہین ہے۔ ان سے اگر ہمکو کچھ ایذا پہونچے تو ہم پر یاد رہنا واجب ہے کہ ہم اسکو مقادیر الٰہیہ کے شبیہ مثلاً مرض وغیرہ سمجھ کر راضی رہین اور صبر کرین۔ اگر وہ ہمارا مال چھین لیین اور ہمکو ندین تو ہمکو شایان ہے کہ انکو حبس نہ کرین یا اُن کے مقدمہ کو حکام تک نہ پہونچائین۔ اسلئے کہ یہ بضعۂ رسول ہین

سادات

سلامٌ علیٰ آلِ طٰہٰ و یٰس   سلامٌ علیٰ آلِ خیرِ النبییّن

سادات کرام کے متعلق اس ہیچمیرز ہیچمدان کا عزم کچھ زیادہ لکھنے کا تھا جسکی معلومات بقدر مقدور حاصل ہی اہل البیت ادری بما فیہ مزید برآن ذخیرہ کتابی و قلمی بھی مہیا ہی یہ ناچیز متشکر نعمت بھی انھین ہادیان حق اور ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نام لیوا ہے۔ انھین کی بدولت فقر کی نعمت اور دنیا کی سلطنت ہمارا حق ہی اور ہمارے اجداد و امجاد کا ورثہ۔ ائمہ اثنا عشر مین سے سات امام اباً عن جدٍ میرے نسب مین داخل شامل ہین جد اعلیٰ علیہ وعلیٰ آلہ التحیۃ والثنا ہندوستان مین مشہد اقدس[۵۵] سے آئے تھے۔

سلامٌ علیٰ روضۃٍ حلّ فیہا   امامٌ یُباہی بہِ الملکُ والدّینُ

---

[۵۵] مشہد مقدس رضوی، نیشاپور سے دس فرسخ پر واقع ہی جو (نیشاپور) خراسان کا دار الملک اور مدینۃ العلم رہا ہی اور اپنی قدامت اور بزرگی کے لحاظ سے اس مردم خیز خطہ کا امُّ البلاد سمجھا جاتا ہی۔ ایران کے قدیم شہر یا قریۂ سناباد رستاق نام، توابع طوس کے ویرانہ پر مشہد کی بنیاد پڑی تھی۔ ہارون کے گورنر حمید بن قحطبہ نے عظیم الشان محل اور مکانات بنائے پرفضا باغ لگایا۔ ہارون نے جب اسی سرزمین پر اس عالم آب و گل کو خیرباد کہا تو اسی ایوان حمیدی کا صحن اُس کا آرام گاہ اخیر قرار پایا۔ مامون الرشید نے اس پر قبہ ہارونیہ بنوایا جب ۲۰۳ھ سنہ ۲۰۲ھ(؟) مین امام ہمام نے نزہت گاہ قدس مین قدم رکھا اور اس قطعہ خاک کو مرقد پاک کہلانے کا شرف حاصل ہوا تو مشہد قلیل مدت مین خراسان کے اعاظم بلاد سے ہوگیا حتی کہ اُسنے خود طوس کی رونق و شہرت کو منسوخ بلکہ مندرس و مطموس کردیا۔ مضجع منور کی برکت اور سادات رفیع الدرجات موسوی رضوی کے شرف قدوم و ظل عاطفت سے وہان کے باشندے اور آستان والا کے مجاور فراغ و فلاح کیساتھ بسر کرنے لگے۔ امیر سبکتگین نے اسکو ویران

اور امام ثامن ابوالحسن علی رضا ابن موسیٰ کاظم علیہما السلام

امام بحق شاہ مطلق کہ آمد — حریم درش قبلہ گاہ سلاطین
شہ کاخ عرفان گل باغ احسان — دُرِ دُرجِ امکان مہ برج تمکین
علی ابن موسیٰ رضا کز خدایش — رضا شد لقب چون رضا بودش آئین

ویران و تباہ کیا۔ یہ خرابی و بربادی کچھ مُدت تک قائم رہی۔ سلطان محمود غزنوی نے اسکی آبادی و تزئین پر کمر ہمت باندھی۔ سلطان سنجر سلجوقی کے عہد مین شرف الدین قمی نے اسکی زیب و رونق کو مزید ترقی دی۔ تاتاریون کے تباہ کن اور جوئے خون بہانے والے حملون سے پھر برباد ہوا۔ مغلون کے عہد مین پھر پانسہ ملٹا۔ ہلاکو خان کے پوتے سلطان خدا بندہ نے حتی الوسع اسکی اصلاح و تجدید کی۔ ابن بطوطہ سنہ ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) مین طوس سے گذرا تھا اپنے سفرنامہ مین عمارات و آبادی شہر کا حال لکھتا ہے۔ اُسکے بعد سے مشہد کی آبادی و تزئین کو برابر ترقی ہوتی رہی حتی کہ سلطان مرزا شاہرخ گورگانی نے سنہ ۸۱۲ھ (۱۴۰۹ء) مین یہان متعدد عمارات نئی بنوائین جن سے مشہد کی زینت و رونق حد کمال پر پہونچ گئی اور اسکی عظمت و رفعت اور دولت و ثروت کا شہرہ اطراف و اکناف مین پھیل گیا۔ سنہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) مین ازبکون نے اس پر دفعتاً حملہ کیا اور شہر مین قتل عام کر ڈالا۔ شاہ عباس حسینی موسوی نے اُن کا استیصال کیا۔ چنانچہ شاہ موصوف نے عبدالمومن خان کو اسکے خط کے جواب مین لکھا تھا ؎

بمشہد گر شاہرخ بادشاہ — بنا کرد خود مسجد و خانقاہ
بتعظیم و تکریم ہشتم امام — علی ابن موسیٰ علیہ السلام
طواف درش شد بقول رسول — برابر بہ ہفتاد حج قبول
تو کردی چنین روضہ را خراب — رسول خدا را چہ گوئی جواب
بدنیا تبہ کار و بد روزگار — بعقبیٰ سیہ نامہ و شرمسار

صفویون کے ضعف اور زوال قوت پر سنہ ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) مین نادر شاہ فتح ممالک کرتا ہوا یہان پہونچا۔ وہ قتل ہوا تو اسکا بھتیجا علی قلی خان سنہ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) مین قابض ہوا۔ افاغنہ نے محاصرہ کرکے زندی افواج کا اخراج کیا۔ کچھ عرصہ تک طوائف الملوکی رہی۔ تیرھوین صدی ہجری کی ابتدا مین قاچاریون کا علم تسلط بلند ہوا اور اُس وقت سے مشہد کی رونق و ترقی کی کیفیت تقریباً یکسان رفتار کے ساتھ قائم اور باقی ہے۔

مشہد کے تاریخی حالات تذکرۃ القلوب، زینۃ المجالس، مجالس المومنین، ہفت اقلیم، ریاض الجنۃ اور جام جم مین بہ تفصیل ملتے تھے۔ لیکن صنیع الدولہ محمد حسن خان نے اپنی تفتیش و تجسس کو انتہا تک پہونچا دیا

کے آل عترت ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ مگر یہ خیال دامنگیر ہوا کہ اُن کی شرافت و نجابت (جو عالم اسلامی میں آفتاب سے زیادہ روشن ہے) کی حقیقی و واقعی تعریف بھی کہیں اپنی خودستائی اور نیاکان گرامی

اور ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں تاریخ مشہد خراسان، کے نام سے دو ضخیم جلدیں مرتب کرکے قدر شناسان علم وادب کے نذر کیں۔

یورپ کے نامور مورخین اور سیاحین میں سے ہالوی، نورشارہ، سر جان میلکم، سکیڈ و نیل کنیر، موسیو کنولی اور موسیو فریہ نے یہاں کے حالات تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی گرانقدر و تحریر فرمائے ہیں۔ مسٹر فریزر ایک انگریز سیاح گذشتہ صدی مسیحی کے وسط میں یہاں آیا تھا۔ بعض مصالح کے اقتضا یا دنیوی ضرورتوں سے اُسنے اپنے اسلام کا اعلان بھی کر دیا تھا، جس سے ہر طبقہ و جماعت میں اُسنے رسوخ و رسائی پیدا کرکے کامل واقفیت و آگاہی حاصل کرلی تھی۔ اسی عصر میں ایک روسی عالم نیکولا خانیکوف اسطرف آیا اور معلومات و تحقیقات کا ایک قابل قدر ذخیرہ فراہم کرکے اہل عالم کو نوید بقا دے گیا

مشہد اقدس (خاص)، ایک مربع عمارت عین وسط شہر میں ہے۔ ضریح مبارک دس ذراع مربع ہوگی۔ قبہ بیس ذراع بلند ہے۔ اسکے احاطہ یا چہار دیواری میں بارہ دروازے ہیں۔ ان دروازوں پر بہت سی آیات شریفہ و احادیث کریمۂ نبویہ و قطعات نفیسہ اور اشعار عربی و فارسی لکھے ہوئے ہیں۔ بعض دروازے سونے کے پتروں سے اور بعض چاندی کے اوراق سے منڈھے ہوئے ہیں۔ نہایت روشن اور درخشان، سونے سے قبہ کی تلمیع کی گئی ہے۔ اسکی زیارت کیلئے سنہ ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں شاہ عباس اعظم نہایت خلوص عقیدت کے ساتھ دار السلطنت اصفہان سے چل کر یہاں آیا تھا اُسی کے حکم سے قبہ کی تزئین و تذہیب کی گئی جو چھ برس میں تکمیل کو پہونچی۔ اس قبہ پر بھی بہت سی عبارات عربی میں تحریر ہیں۔ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) کے زلزلہ سے جب اس عمارت کو صدمہ پہونچا تو شاہ سلیمان صفوی نے سنہ ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء) میں اسکی مرمت و درستی اور قبہ پر طلاکاری کرادی جو ابتک نظر کو خیرہ کرتی ہے۔

ضریح شریف میں متعدد طاقچے ہیں۔ سب سے پہلا اور پُرانا فولاد کا ہے۔ باقی برنجی ہیں پیتل پر گہرا سنہرا کام کیا گیا ہے۔ ان میں کثیر التعداد، بیش بہا جواہر کامل صیانت و حفاظت کے ساتھ رکھے ہیں

مشہد مبارک کے اندر مختلف مقامات میں بہت سے کتبے ہیں۔ سب عربی زبان میں ہیں۔ بعض محرابوں کے پاس خط کوفی میں ہیں بعض طویل بھی ہیں بعض خوب قلم اور اعلیٰ خطاطی کا نمونہ ہیں۔ بلحاظ قدامت دکھن سالی بعض پانچویں صدی ہجری تک کے ہیں۔ یہ نہایت سبق آموز، اور اسلام کی پاک اور مقبول تعلیمات اور رب الارض والسموات کے احکام و ارشادات کا اقتباس ہیں۔ ایک موقع پر پوری سورہ توحید نہایت خفی قلم سے سنہ ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) کی لکھی ہوئی ہے۔

محمول نہ کی جاے۔ اسی اندیشہ سے شبدیز ہمت نے قدم اور دست قدرت نے قلم روک لیا۔ اہل نظر جانتے ہین کہ وہ کون سی روایات اور واقعات ہین جو ان کے مدائح و احوال مین علمائے اعلام نے

مشہد کی عمارات کے مقابل و اطراف مین متعدد عمارات واقع ہین

(۱) دار الحفاظ، ایک بلند مربع عمارت ہے۔ اسمین کاشانی پتھر کی چوڑی چوڑی گونا گون اینٹون کا فرش ہے (شاہرخ مرزا، امیر ہرات و خراسان کی بیگم) ملکہ گوہر شاد نے اسکو تعمیر کرایا تھا۔ چند شاہان ایران اور امرا و وزرا بھی یہان راحت گزین ہین۔

(۲) دار السیادة۔ یہ مستطیل عمارت بھی اُسی درة التاج امارت کی یادگار ہے۔ زلزلہ سے اسکو بھی نقصان پہونچا تھا مگر شاہ سلیمان صفوی کے حکم سے فوراً مرمت و درستی کر دیگئی۔ آب شیرین دخنک کی ایک نہر اس عمارت کے اندر روان ہے۔ دیوارون پر اکثر اشعار فارسی مندرج ہین۔ چند کتبے قدیم ہین۔ اس عمارت کی تاسیس چھٹی صدی مین ہوئی تھی۔

(۳) قبة اللہ یار خان مختلف الالوان اور بدیع الصنائع احجار کی یہ نہایت مستحکم و منیع اور شاندار و رفیع، مشہور آفاق عمارت، وضع مین ہشت پہل ہے۔ اندرونی حصہ مین آٹھ صفین ہین۔ ائمہ اثناعشر علیہم التحیة والثنا کی تواریخ ولادت و وفات اسمین مندرج ہین۔ احادیث ماثورہ اور اشعار فارسی بھی با فراط منقوش ہین۔ دائرہ بالائی مین سورۂ جمعہ و دیگر سور قرآنی مکتوب ہین۔

(۴) مشہد مبارک کے شمال مین ایک نہایت قدیم اور وسیع و فراخ صحن، سلاطین صفویہ کی یادگار ہے۔ ایک صحن جدید، فتح علی شاہ قاجار کے عہد کا ہے۔ اس کا فرش سنگ رخام کا ہے۔ دیوار نہایت پُر تکلف اور خوشنما کاشانی پتھرون سے مستور ہے۔

(۵) گوہر شاد کے آثار باقیہ مین ایک مسجد بھی ہے۔ یہ عمارت اپنی خوبی و دلکشی، حُسن و جمال، استواری و استحکام مین نظیر نہین رکھتی۔ مختلف رنگ اور وضع کے کاشانی پتھر اسمین لگے ہین۔ قبہ بلند ہے مانند ایک اونچا چبوترہ ہر مسجد مین چار دروازے ہین۔ اسمین پہلا کتبہ اوائل شہر رجب المرجب ۸۲۱ھ (اواخر اپریل ۱۴۱۸ع) کا ہے۔ اسکے بعد جو اصلاحات یا اضافے سلاطین صفویہ و قاجاریہ کے دست کرم سے ہوے اُن کی تفصیلات سنگ رخام یا سنگ کاشان پر کندہ ہین۔

یہان کے دیگر آثار قدیمہ مین رودخانہ طوس کے کنارے ربیع بن خثیم توری کوفی مشہور تابعی کا مزار یا روضہ ہے۔ شاہ طہماسپ صفوی، عباس مرزا پسر فتح علی شاہ قاجار اور دیگر بادشاہون، وزرا اور صدور کے مقابر ہین

شاہ طہماسپ صفوی کی بنوائی ہوئی شہر کی ایک ناتمام چہار دیواری ہے اسکا محیط تقریباً ایک فرسخ

سپرد قلم نہین فرمائے ہین۔ اُن کی تحقیقات انساب و تحریر حالات کا دفتر بے پایان ہے
عباسیہ و علویہ کے معارضات و مناقشات کو نہ دیکھیئے۔ یہ تو صفحات تاریخ پر یادگار رہین گے
اور اُن کی خودستائیان اور زبان آرائیان اوراق زمانہ پر باقی۔ دربار خلفائے بغداد کا مشہور
و طلیق اللسان شاعر اور آل عباس کا ممتاز رکن عبداللہ بن معتز[۹۵] عرصہ بیکار مین آما دہ

ہوگا۔ ۱۴۱ برج ہین اور چھ دروازے۔ شہر کے وسط مین ہو کر آبادی کو نصف کرتی ہوئی ایک طویل سڑک بائیس گز چوڑی نکل گئی ہے۔ آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔

ایران کے تمام شہروں سے زیادہ مشہد مین مدارس و تعلیم گاہین ہین۔ بعض[۲] مدرسے تو اپنی شاندار عمارات اور طلبہ کی کثرت اور جمعیت کے اعتبار سے اصفہان کے مدارس سے بھی گوے سبقت لے گئے ہین مدرسہ بالا مین، سب سے پرانا ہے۔ شاہ رخ گورگانی کے عہد فرمانروائی مین ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ع) مین قائم ہوا تھا صفویون کے بابرکت زمانہ کی یادگار بھی کئی مدرسے ہین۔

سکنۂ شہر قبائل مین سے چھ بڑے اور نہایت بارسوخ و ذی اثر ہین اور دس چھوٹے۔ سرائین گیارہ اور حمام تیس سے زیادہ ہین۔ بڑے بڑے پرنالے اور نہر روزمین کے نیچے نیچے بہتے ہین

۹۵ مناقب السادات، دستور الحقائق والبدایۃ، مناقب المحبوبین، مرآۃ الاسرار، روضۃ الاسلام سیر الاقطاب، خزینۃ الاصفیاء، تذکرۃ العاشقین، اقتباس الانوار، روضۃ الشہداء، فصل الخطاب (از خواجہ محمد پارسا)، فضائل ائمہ اہل بیت (از شیخ عبدالحق محدث)، شجرۃ الانساب، اخبار الاخیار (جمال الدین محمد بکری شافعی) کتاب صفوۃ الصفوہ (لابی الفرج عبدالرحمن ابن جوزی) و رسالۃ الاصداف (از شیخ عبدالجواد شربینی) وہ کتابین ہین جن سے دنیاے اسلام کا ہر گوشہ منور و معطر ہے۔

ان کے علاوہ ابن مغازلی شافعی کی مطالب السؤل فی مناقب آل رسول، امام جلال الدین سیوطی کی احیاء المیت بفضائل اہل البیت جسمین صحاح سے اٹھاون حدیثین نقل کی ہین۔ شیخ شبلنجی عرف سید مومن کی نور الابصار ابن الخشاب کی موالید اہل البیت، حافظ جلال الدین محمد بن یوسف زرندی کی درر السمطین فی فضائل المصطفی والمرتضی والسبطین، شیخ جمال الدین طاہر بن حسین بن عبدالرحمن اہدل کی کتاب بغیۃ الطالب لمعرفۃ اولاد علی بن ابی طالب، ابن الجوزی کی منثور العقود، سید جمال الدین عطاء اللہ الدشتکی الشیرازی کی روضۃ الاحباب فی سیرۃ النبی و الآل والاصحاب، سید مرتضی حسینی بلگرامی یعنی زبیدی کی اقرار العین بذکر اولاد الحسن والحسین بالخصوص پڑھنے کے قابل ہین

مائۃ حاضرہ (چودھوین صدی) کی سادہ و مختصر تالیفات مین سے نواب صدیق حسن خان کی تشریف البشر

نحن بنی العم اولی بھا" کہہ کر علم مقابلہ بلند کرتا ہے۔ اُس کی زبان پر ایک طرف بنی العباس کے مفاخر و دعاوی ہوتے ہین تو دوسری طرف سادات فاطمی کی تخفیف و تحقیر کے نعرے

بذکر الائمۃ الاثنی عشر بھی معتمد و مستند ہے

۵۷۹ ابن المعتز، ابو العباس عبد اللہ بن المعتز بن المتوکل بن المعتصم العباسی کی شرافت نسب اور جلالت قدر، دودمان سلطنت اور خاندان خلافت مین ہونیسے روشن ہے جسکو کسب کمالات ظاہری اور حصول فوائد معنوی نے اور بھی زیب و زینت بڑی تھی۔ فن لغت، صرف و اشتقاق، نحو، معانی، بیان، عروض و قافیہ، و ترسیل خطوط و رسائل، اور تقریض اشعار، فہم تاریخ اور علم موسیقی مین یکتائے روزگار تھا۔ کتاب الاغانی مین ابو الفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ اسکے زمانہ مین فضل و ادب و شعر و حسب و شرافت و دیگر ادبیات کے لحاظ سے اہل عصر مین کوئی اُس سے تفوق و تقدم نہین رکھتا تھا۔ اسیطرح وفیات الاعیان مین قاضی ابن خلکان نے بڑی عظمت و امتیاز کے الفاظ سے اس کو اور اسکے کمالات ذاتی و اضافی کو یاد کیا ہے۔ سید صدر الدین شیرازی المعروف بہ سید علی خان عنوان کتاب انوار الربیع مین لکھتے ہین کہ علم بدیع، کو اسی عبد اللہ بن معتز نے اختراع کیا تھا، اور اس علم کا نام 'بدیع' بھی اسی نے رکھا تھا۔ ابن معتز بھی اپنی کتاب کے آغاز مین اسکا تذکرہ کرتا ہے جو سنہ ۲۷۴ھ (سنہ ۸۸۷ء) کی تالیف ہے۔ صاحب تاریخ مجالس، ابن المعتز کو شعرا مین امیر ابو فراس الحارث التغلبی پر ترجیح دیتا ہے جسکا زمانہ اس سے مؤخر ہے

مؤلف قصائد الارب من ذکر علماء النحو و الادب ابن معتز کو غزیر الفضل بارع فی الادب فائق حسن الشعر و کبیر الشعر لکھتا اور اسکے اعجازات ادبیہ مین سے

اخذت من شباب الایام	و تولی الصبا علیہ السلام
وارعوی باطلی و بان حدیث النفس منی و عفت الاحلام

کو نقل کرتا ہے صلاح الدین کتبی نے کتاب فوات الوفیات مین تحریر کیا ہے کہ ابن معتز شعبان سنہ ۲۴۹ھ (اکتوبر سنہ ۸۶۳ء) مین پیدا ہوا۔ احمد بن سعید دمشقی، ابو العباس مبرد، اور ابو العباس ثعلب سے علم ادب اور قواعد عرب کو سیکھا اور نادرۂ روزگار ہوا حتی کہ بعض اہل ادب اُسکو فصحائے جاہلین و مخضرمین اور اسلامیین سے بھی برتر بتاتے ہین صنعت موسیقی مین بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس فن مین ایک رسالہ لکھ کر عبید اللہ بن عبد اللہ بن طاہر کے پاس بھیجا تھا جسکے جواب مین عبید اللہ نے بھی ایک رسالہ لکھا اور اسمین ابن معتز کے کمال کی بے حد ستایش و ثنا لکھی۔ نامۂ دانشوران ناصری مین اس کے بعض اشعار جو دوسرون کی تخفیف یا توصیف مین ہین نقل کئے گئے ہین اور اُس بیباس گزاری

یا نا موجہ باتین وہ اپنا قصیدۂ الفیہ پڑھتا ہے

اَلا مَن لِعَینٍ وَتَسکابِھا   تَشکّی القَذیٰ وَبُکاھا بِھا

و بتا گستری کا بھی ذکر کیا ہے جو باکمال معاصرین نے ابن معتز کی کی تھی۔ ابن معتز کہا کرتا تھا کہ شعرا مین سے چار شخص یَقُولُونَ بِاَلسِنَتِہِم مَّا لَیسَ فِی قُلُوبِہِم (کہتے ہین اپنی زبان سے جو نہین انکے دل مین جزو ۲۶۔ سورۃ الفتح ع ۱۰۲) کے مصداق گذرے ہین۔ پہلا ابو العتاہیہ جو اشعار تو زہد کا کہا کرتا مگر خود جادۂ الحاد پر قدم زن تھا۔ دوسرا ابو نواس جس کی زبان تو جوانان امویٔ کی حرکات اور امیر فریفتگی کے بیان کے لئے وقف تھی۔ مگر خود بندرون سے زیادہ بدکار تھا۔ تیسرا ابو حکیم کاتب، جو معاشرت سے عجز و تفقد کی باتین بتاتا تھا مگر معاشرت کے لئے حرص و ہیجان بز نر سے بھی زیادہ رکھتا تھا چوتھا محمد بن حازم جو اپنے کلام سے صبر و قناعت کی تلقین کرتا لیکن خود کتے سے بڑھکر حریص تھا۔

ابن معتز کے بہت سے نوادر و ظرائف اوراق روزگار پر باقی ہین۔ جعفر بن قدامہ کہتا ہے کہ مین ایکدن ابن معتز کی محفل مین حاضر تھا۔ نمیری بھی وہان موجود تھا۔ جب نماز فریضہ کی بجا آوری کا وقت آیا تو نمیری نے کھڑے ہو کر کمال سرعت و خفت سے نماز ادا کر ڈالی کچھ اوراد و دعائین بھی پڑھین پھر سجدہ مین گیا اور اسکو اتنا طول دیا کہ تمام حاضرین کسل و سنگین ہو گئے۔ ابن معتز بھی اسکو تعجب و حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جب نمیری نے سجدہ سے سر اٹھایا تو ابن معتز نے اس کی نسبت یہ دو شعر پڑھے

صَلٰوتُکَ بَینَ الوَرٰی نَقرَۃٌ   کَمَا اختَلَسَ الجُرعَۃَ الوَالِغُ
وَتَسجُدُ مِن بَعدِھَا سَجدَۃً   کَمَا خُتِمَ المِزوَدُ الفَارِغُ

تیری نماز خلق کے درمیان ایسی چیز ہے جیسے کوئی کتا اطراف زبان سے سرعت کے ساتھ پانی کا گھونٹ پی لیوے۔ اور نماز پوری کرنے کے بعد تو سجدہ ایسا کرتا ہے جیسے کوئی شخص توشہ دان پر مُہر لگا دیوے۔

ابن معتز کی عمر بیس سال کی بھی نہ تھی کہ ایک روز ابو عیسی بن متوکل کے یہان قاضی علی بن محمد بن ابی الشوارب آئے اور اپنے ترددات اور خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ اسکے شوہر کی بیوفائی و بے مہری بلکہ بے دردی و جفا کاری کا شکوہ کر کے دستگیری کے خواہان ہوے۔ اعانت کا وعدہ اور ہمدردی کا جواب پا کر رخصت ہوگئے ابو عیسی نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کتنے بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایسا بزرگ شخص، ایسے فضل و شرافت والا کس ورطہ مین پھنسا ہوا ہے۔ خوشا حال اس شخص کا جسکے لڑکی نہ ہو۔ ابن معتز بولا کہ اس نادان نے اس بارہ مین کچھ عرض کیا ہے پھر لوگون کے اصرار سے یہ دو شعر پڑھے۔ ہر طرف سے تحسین و

وَنَحْنُ وَرِثْنَا ثِيَابَ النَّبِيِّ ‏ فَكَمْ تَجْذِبُوْنَ بِاَهْدَابِهَا
لَكُمْ رَحِمٌ يَا بَنِي بِنْتِهٖ ‏ وَلٰكِنْ بَنِي الْعَمِّ اَوْلٰى بِهَا
بِهٖ نَصَرَ اللّٰهُ اَهْلَ الْحِجَازِ ‏ وَاَبْرَاَهَا بَعْدَ اَوْصَابِهَا
وَيَوْمَ حُنَيْنٍ فَدَا اَعْيَتْكُمْ ‏ وَقَدْ اَبْدَتِ الْحَرْبُ عَزْبَابِهَا

افسرین ہونے لگی۔

وَبِكْرٌ قُلْتُ مَوْتِيْ قَبْلَ بَعْلٍ ‏ وَاِنْ اَثْرٰى وَعُدَّ مِنَ الصَّمِيْمِ
اَاَمْزِجُ بِاللِّئَامِ دَمِيْ وَلَحْمِيْ ‏ فَمَا عُذْرِيْ اِلَى النَّسَبِ الْكَرِيْمِ

مین نے اپنی دختر دوشیزہ سے کہا کہ ایسے شوہر کے وصال تک پہونچنے سے پہلے جو بڑا باثروت اور صاحب نسب واصالت ہو تم اس جہان سے رخصت ہو جانا۔ کیا مین اپنا خون اور گوشت ناکسون سے مخلوط کرون گا تو میرا عذر نسب کریم کے جاتے رہنے کی نسبت کیا ہو گا۔

عبداللہ بن معتز کا ایک غلام نشوان نام تھا۔ ملاحت صورت اور حلاوت سیرت مین یکتا غنا وسرود مین فتنۂ روزگار تھا۔ یہ اسکے بادۂ صحبت ووصال سے ہمیشہ سرمست رہتا۔ اتفاقاً وہ غلام مرض چیچک مین مبتلا ہوا چہرہ آبلون سے بھر گیا عبداللہ نے سنا تو نہایت قلق ہوا۔ کچھ روز بعد نشوان نے صحت پائی اور چیچک کے نشان رخسارون سے بالکل ہٹ گئے بلکہ اسکا حسن سوا ہو گیا۔ ابن معتز اسکی شان مین کہتا ہے۔

لِيْ قَمَرٌ جُدِّرَ لَمَّا اسْتَوٰى ‏ فَزَادَهٗ حُسْنًا فَزَادَتْ هُمُوْمِيْ
اَظُنُّهٗ غَنّٰى لِشَمْسِ الضُّحٰى ‏ فَنَقَّطَتْهُ طَرَبًا بِالنُّجُوْمِ

میرا چاند مرض آبلہ مین گرفتار ہو گیا تھا جب مرض کا زور کم ہوا بیماری کی شدت گھٹ گئی تو اسکی خوبصورتی اور بھی بڑھ گئی اور میرے اندوہ افزون ہو گئے۔ میرا گمان یہ ہے کہ اسنے آفتاب نیمروز کے لیے گایا تھا جسپر سورج نے مسرت وطرب سے دانہائے انجم اسکے رخ پر نثار کر دیے۔

حسب روایت نامۂ دانشوران اسی مضمون کو بہ تغیر الفاظ کسی شاعر ہندی نژاد نے ابن معتز کے کلام سے اقتباس کر کے لکھا ہے ؎

ماہ من آبلہ روی ہست ولے عیبش نیست ‏ ردی بہ آبلہ تیغے ہست کہ جوہر دارد

ابن معتز کے معاصرین اور قدر شناسون نے اسکی مدح وثنا مین نادر اشعار وقصائد لکھے ہین۔ خود ابن معتز بھی اورون کے کلام کی داد دینے مین بیحد سخی تھا۔ اسکے تذکرۂ شعرا کا ایک ایک ورق جسکی شہادت دے رہا ہے۔ سید ابوہاشم اسمٰعیل الحمیری کے ایک قصیدہ کے جو اپنی انتہا درجہ کی لفاست کی وجہ سے

قتلنا امیّۃ فی دارھا ونحن احق باسلابھا
اذا ما دنوتم تلقیتم زبوناً اقرّت بجلابھا
فمھلا بنی عمنا انھا عطیۃ رب حبانا بھا
واقسم انکم تعلمون انا بھا خیر اربابھا

مُن هَبْہ کہلاتا ہے اس نے بہت سے شعر نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ قصیدہ بہت مشہور رہے اسلیئے ان ہی اشعار پر اقتصار کرتا ہوں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا بھی انتخاب درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ہیچ چیز در عداوت با آل ابو طالب با این ابیات نیست۔"

ابن معتز مذہباً سُنّی اور امام ابو حنیفہ کا پیرو تھا۔ شیعی مورخین کا خیال ہے کہ اسکو سلسلۂ علوی بلکہ ذریت نبوی سے انحراف تھا۔ آل فاطمہ سے تنفر کرتا تھا۔ انکے مطاعن اور اپنے مفاخر میں مبالغہ کرتا چنانچہ اسکا یہی قصیدہ اسکا یہ شاہد ہے

مکتفی باللہ کے مرنے پر آل عباس میں اختلافات اور سلطنت میں بعض انقلابات پیدا ہو گئے۔ ایکسال تک برابر تخت خلافت کے لئے مناسب اشخاص کی تلاش ہوتی رہی تھی۔ بالآخر ارکان حکومت و اہل حل و عقد نے ابن معتز کو انتخاب کیا۔ اور ۱۸ ربیع الاول ۲۹۶ھ (۲ دسمبر ۹۰۸ء) کو مقتدر کو خلع (جدا) کرکے عبداللہ بن معتز کے پاس پہونچے اور اسکی بیعت کی۔ المرتضی باللہ۔ الراضی باللہ۔ الغالب باللہ۔ المتصف باللہ لقب پائے۔ عنوان مراسلت یہ ہوتا تھا "از امیر المومنین المرتضی باللہ ابی العباس عبداللہ بن معتز باللہ کذا و کذا" اُدھر مقتدر اور اُسکے تابعین و ہوا خواہوں کی جماعت قوت پا گئی جس نے ابن معتز کے مقابلہ و قتل کا تہیہ کر لیا تھا۔ ابن معتز کو مجبوراً یکہ و تنہا راہ گریز اختیار کرنا پڑی۔ بغداد میں ایک تہلکہ عظیم اور بدامنی شدید برپا ہو گئی۔ ابن معتز ایک معتمد امیر کے گھر میں پناہ گزین ہوا۔ اُسی امیر کے غلام نے مخبری کی۔ ابن معتز پکڑ لیا گیا۔ دن بھر قید رکھا گیا۔ شب کو اتنی اذیت پہونچائی گئی کہ روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ گلا گھونٹ گھونٹ کر اُس کا کام تمام کیا گیا تھا۔ لاش ایک بورے میں لپیٹ کر اُسکے اقربا کے پاس بھیجدی گئی۔ علی بن محمد بن بسام شاعر نے مرثیہ لکھا۔ یحییٰ بن علی نے بجوین کہیں۔ مرثیے کے دو شعر یاد رہگئے ہیں

لِلّٰہِ دَرُّکَ مِنْ مَیْتٍ بِمَضْیَعَۃٍ نَاهِیكَ فِی الْعِلْمِ وَالْاٰدَابِ وَالْحَسَبِ
مَا فِیْہِ لَوْ وَلَا لَوْ لَا فَتَنْقُصُہٗ وَاِنَّمَا اَدْرَکَتْہُ حِرْفَۃُ الْاَدَبِ

خدا اُس مرنے والے کو خیر دے کہ جو مراتب علمی اور آداب و حسب میں تم کو اور لوگون سے کافی ہو۔ لو اور لولا (جو کلمات شرط ہیں) اُس میں نہ تھے یعنی اگر تم کہتے کہ ایسا ہو تو ایسا ہو جاتا اور اگر ایسا نہ کرتا

۵۸ صفی الدین عبد العزیز بن سرایا الحلی ۔ ابن معتز کا جواب دینے میدان میں آتا ہے۔ اُسکی پشت پر اسیر تاج الدین آوی، نقیب النقباے اشراف عراق کا دست کرم ہوتا ہے اور اسکی زبان پر آل عباس کی ہجا و تذلیل کرنیوالے شعرا ہے ۔ ایک گستاخ بے ادب کا جواب وہ بھی کمال ربدہ ذہنی سے دیتا ہے

تو اس طرح نہ ہوتا ۔ بلکہ حرفت ادب نے اُسکو پالیا تھا ۔

ابن معتز سیاہ چہرہ گندم گون تھا۔ چہرہ خوب روشن و درخشان ۔ داڑھی میں سیاہ خضاب کرتا تھا اُس کا قول تھا البلاغة بلوغ المعنیٰ ۔

اُس کا دیوان چھپ گیا ہے ۔ اسکی بہت سی تالیفات و تصنیفات شہرت رکھتی ہیں۔ کتاب الزہر والریاض، کتاب البدیع، کتاب مکاتبات الاخوان بالشعر، کتاب الجوارح والصید، کتاب السرقات، کتاب اشعار الملوک کتاب الآداب، کتاب علی الاخیار، کتاب طبقات الشعراء ۔ کتاب الجامع فی الغنا، کتاب فیہ ارجوزۃ فی ذم الصبوح وغیرہ ۵

سخن الف قدان راہمہ عمر می توان گفت   کہ سخن روا ست چون مد بہ محل دراز کردن

۵۸ مولانا صفی الدین ابو المحاسن عبد العزیز بن سرایا ابن ابی القاسم الحلی الطنبسی سحر بیان شاعر اور فنون ادب کے کامل ماہر تھے ۔ اُن کا قصیدہ بدیعیہ مشہور ہے ملوک دیار بکر کے معاصر و متوسل تھے ۔ ان کی مدح میں بعض نفیس قصائد لکھے ہیں ۔ اُن کے دیوان سے واضح ہوتا ہے کہ انکے باپ دادا حلیہ ماردین (ملک عراق عرب) کے رئیس اور بزرگان روزگار سے تھے ۔ دیوان میں کسی جگہ اپنے باپ اور ماموں (دادا ۔ نانا) کی بزرگی اور علو شان پر افتخار کیا ہے ۔ جابجا حسب شیوہ شاعرانہ کمال بے نیازی و استغنار سے اپنی ستایش بھی فرمائی ہے ۔

شیخ مجد الدین فیروز آبادی بھی کہ اکابر متاخرین فن حدیث اور ائمہ لغت میں داخل ہیں اُنکی صحبت سے محظوظ ہوئے تھے ۔ اپنی کتاب مجموعات میں لکھتے ہیں کہ ۷۴۰ھ میں ادیب شاعر صفی الدین عبد العزیز بن سرایا الحلی سے شہر بغداد میں ملاقات ہوئی ۔ دیکھا کہ شیخ کبیر السن تھے اُن کو نظم و نثر پر قدرت تامہ حاصل تھی ۔ علوم عربیہ اور شعر سے نہایت باخبر تھے ۔ اُن کی غزل نہایت پاکیزہ و شیریں ہوتی تھی شیعی تھے حالت زار و درمندانہ تھی ۔ ہیئت البتہ خراب تھی ۔ عمامہ نہایت میلا ۔ چہرہ اور بھی قبیح اور بدنما تھا ۔ اُن کی صورت دیکھ کر کبھی کوئی شخص یہ گمان نہ کرتا کہ وہ ایسے لطیف اشعار نکالنے پر قادر ہیں جیسے صدف میں سے گوہر آبدار ۔

اُن کے دیوان میں حمد و نعت و مناقب آل اطہار میں بہت سے بے مثل قصائد موجود ہیں ۔ جن میں

الا قل لشر عباد الاله ... وطاغي قريش وكذابها
وباغي العباد وباغي العناد ... وهاجي الكرام ومغتابها
اانت تفاخر آل النبي ... وتجحدها فضل احسابها
بكم باهل المصطفى ام بهم ... فرد العداة باوصابها
اعنكم نفى الرجس ام عنهم ... لطهر النفوس والبابها
اما الرجس والخمر من دابكم ... وفرط العبادة من دابها
وقلتم ورثنا ثياب النبي ... فلم تجذبون باهدابها
وعندك لا تورث الانبياء ... فكيف حظيتم باثوابها
فكذبت نفسك في الحالتين ... ولم تعلم الشهد من صابها
اجدك يرضى بما قلته ... وما كان يوما بمرتابها
وقولك انتم بنو بنته ... ولكن بنو العم اولى بها
بنو البنت ايضا بنو عمه ... وذلك ادنى لانسابها
فدع في الخلافة فصل الخلاف ... فليست ذلولا لركابها
وما انت والفحص عن شانها ... وما قمصوك باثوابها
وما ساورتك سوى ساعة ... فما كنت اهلا لاسبابها
وكيف يخصون يوما بها ... ولم تتادب باادابها
ودع ذكر قوم رضوا بالكفاف ... وجاءوا الخلافة من بابها

اس باکمال نے انواع و اقسام کے صنائع اور اسالیب سخن کا کمال دکھایا ہے - دیوان دمشق میں ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا تھا۔

امیر تاج الدین آدمی نقیب النقباء اشراف عراق کے کہنے سے مولانا صفی نے معتز کے قصیدہ لامیہ کا یہ جواب دیا تھا۔ ان کے گمان کے موافق اہلبیت رسالت کیساتھ جو بے ادبی معتز نے کی تھی یا جو ناموجہ کلمات انکی زبان سے سرزد ہوئے تھے انکی ایراد میں ایک طولانی قصیدہ علی سبیل الارتجال کہہ ڈالا تھا۔

هم الزاهدون هم العابدون　　　　هم الساجدون بمحرابها
هم الصائمون هم القائمون　　　　هم العاملون بآدابها

سادات کی شرافت

سیادت کے معنی عربی زبان میں بزرگی و سرداری کے ہیں۔ اسی سے سیّد (فتح سین، یای مشدد، مکسور بوزن جیّد) بنا ہے جو پیشوا اور سردار و مہتر قوم کو کہتے ہیں۔ اس لفظ (سیّد) کا استعمال بتخفیف تحتانی (بروزن قید) بھی اسی معنی میں ہوتا ہے حسب قواعد صرفی یائے مشدد کی تخفیف جائز ہے۔ جیسے میّت کو بتخفیف یا میت بروزن بیت بولتے ہیں سیّد کو یائے مشدد مفتوح کے ساتھ سیَد بولنا غلط ہے سائد بھی سیّد کے ہم معنی ہے۔ سائد اور سیّد کی جمع 'سادۃ' اور جمع الجمع 'سادات' آتی ہے

اس عہد عروج و ارتقا میں جب کہ بدون پابندی کسی قانون بین الانساب الاقوام کے مسلمانوں کی اکثر قومیں پستی سے عروج و فراز کی طرف بڑھ رہی ہیں اور سادات عظام کی مردم شماری بلا سعی تولید و تخلیق محض تبادلہ ذات، کے اثر سے خودبخود افزایش پا رہی ہے۔ چند روایات و حقائق کا نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

شرف و فضل کو آل فاطمہ سے متعلق و منحصر کرنے کے بارہ میں بہت سی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ وارد ہیں وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو جزء ۴ سورۂ آل عمران ع ۱۱-۲) کی تفسیر میں سیدنا جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ نحن حبل اللہ (خدا کی رسی ہم ہیں) آیہ معظمہ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں جزء ۵ سورۃ النساء ع ۸) کی نسبت امام محمد باقر علیہ السلام نے کہا ہے کہ اَهْلُ الْبَيْتِ هُمُ النَّاسُ (لوگوں سے مراد اہل بیت ہے)

ارشاد باری عزاسمہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ہ
(جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے رحمٰن عنقریب اُنکی محبت پیدا کردے گا (جز ۱۶
سورۂ مریم ع ۶-۹) کے متعلق محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہاہے کہ لَا یَبْقٰی مُؤْمِنٌ اِلَّا وَفِیْ
قَلْبِہٖ وُدٌّ لِعَلِیٍّ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ (باقی نہ رہیگا کوئی مومن بغیر اسکے کہ اُسکے دل میں علی اور اُنکے اہلبیت
کی محبت ہو) حضرت نقاش کہتے ہیں کہ اس آیۃ کا نزول علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شان میں
ہوا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ (بے شک جو
لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے یہی لوگ بہترین خلائق ہیں (جز ۳۰ سورۃ البینۃ
ع ۱-۲۳)

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ تمام بلاد و امصار میں حقیقتاً اشراف وہی لوگ ہیں
جو اہل بیت کی اولاد و ازواج اور حسنؑ و حسینؑ و علیؑ کی اولاد ہیں، آل علی کے ساتھ شرف کی
تخصیص خاص اہل مصر کی اصطلاح و تجویز ہے۔

علی خواص فرماتے ہیں کہ شریف کا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم اپنی جان اُن پر قربان و فدا کر دیں
کیونکہ اُن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحم و دم کریم ساری و جاری ہے اور وہ آنحضرت کا
ایک پارۂ گوشت ہیں۔ بعض اہل علم صاحبان بصیرت کا ارشاد یہ ہے کہ "ہم پر شرفا کے حقوق
اگرچہ وہ نسب میں بعید ہوں، یہ ہیں کہ ہم اُن کی رضا کو اپنی ہوا پر اختیار کریں اور اُن کی تعظیم
و توقیر بجا لائیں، وہ زمین پر ہوں تو ہم سریر پر نہ بیٹھیں" امام شعرانی اپنی کتاب المنن میں
لکھتے ہیں "ادب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی شریفہ سے اُس وقت تک نکاح نہ کرے جب تک کہ
اپنے نفس سے یہ اطمینان و عہد نہ کرلے کہ اُسکے تابع حکم رہے گا۔ اُس کے اشارے پر کام کرے گا
حتی کہ اُس کی جوتیاں سیدھی کرکے رکھدے گا، جب وہ آئے تو اُسکے لئے کھڑا ہو جائے اور
اُسپر دوسری عورت نہ لائے۔ اُس پر معیشت کی تنگی نہ کرے۔ اور اگر وہ اجنبی ہو تو اُس کی
طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے و نحو ذالک"

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ "جو کوئی شرف (شریف یعنی سید ہونے) کا جھوٹا دعوے کرے تو اُس کو خوب مارنا اور ایک مدت تک قید رکھنا چاہیئے۔ یہان تک کہ توبہ کرلیوے اسلیئے کہ اسمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف ہوتا ہے۔ باین ہمہ ارشاد و موعظت جس کے نسب مین طعن کیا جاتا امام صاحب اُسکی بھی تعظیم کرتے اور کہتے کہ شاید وہ نفس الامر مین شریف ہو لیکن قول اوّل "فتویٰ" ہے اور فعل ثانی "تقویٰ"۔

میر غلام علی آزاد نے ایک کتاب سند[۱۸۵] السعادات فی حسن خاتمۃ السادات لکھی ہے۔ اسمین خصوصاً اور اپنی دیگر تصنیفات مین عموماً انھون نے سادات کے متعلق وہ تمام حالات و روایات و مباحث بالتفصیل نقل کر دئے ہین جو میر عبدالجلیل اور اُن کے دُودمان شریفیہ کی خصوصیات و مآثر قدیمہ مین داخل تھے اور جن پر اُنکے اسلاف کو وثوق اور اُنکا اساس عمل تھا

علم الانساب یعنی قبائل کے نام و نسب اور خاندانون کے پچھلے سلسلون اور بزرگون کے تعلقات کا جاننا اور یاد رکھنا اس خاندان کا آبائی ورثہ یا خاندانی علم تھا جو پُشتہا پُشت سے سینہ بسینہ چلا آتا تھا۔ میر عبدالجلیل خود بڑے ماہر اور اس فن مین کامل تھے۔ اِن کے گھرانے کی بڑی بوڑھیان بھی سادات کے بہت سے خاندانون کے متعلق خاص معلومات اور وسیع آگاہی رکھتی تھین جن کا بے تکلف حوالہ دیا جاتا اور استناد کیا جاتا تھا۔ اِن کو اپنی شرافت اور خالص سیادت پر ناز و فخر تھا۔

دُنیا پر روشن ہے کہ سادات (حسینی) کا نسب ایک طرف رسُول عرب (سید وُلد آدم) سے ملتا ہے اور دوسری طرف تاجداران ایران سے۔ بلکین آل حسین کو اپنے نسب مادری کا شرف اور ننہالی اسلاف کا علو مرتبت ثابت کرنے کے لئے سرزمین ہند سے فارس جانے کی ضرورت نہین ہے۔ وہ تجلّیان جو کوہ بے ستون اور راد کان پر نظر آتین اروَلی پہاڑ کی چوٹیون سی نگہ افروز

۱۸۵ سند السعادات طبع ہو چکی ہے بمبئی مین مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب کے یہان ملتی ہے۔

ہوسکیں گی۔ مہاراجگان اودے پور کی، جن کا لقب مہارانا چلا آتا ہے عظمت و شان ہندوستان میں مسلم ہے۔ راجپوتانہ کے تمام راجگان پر اُن کو تفوق حاصل تھا

اہل ہند پر اس خاندان کی عظمت و احترام روشن ہے اِنھوں نے بھی اپنی شرافت و شجاعت سے اپنی یکتائی اور خوبیوں کو حتی المقدور قائم رکھا۔ بادشاہان اسلام نے باوجودیکہ ان راجاؤں سے سخت مقابلے ہوئے ان کی بہادری اور حفظ ناموس کی ہمیشہ داد دی ہے۔ زمانہ سلف میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی راجہ کسی گدّی پر بیٹھتا تو پہلے دربار میواڑ میں حاضر ہوتا۔ فرماں روا رانا اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے تھوڑا سا خون نکالتا اور نئے راجہ کی پیشانی پر تلک (ٹیکا) لگا دیتا۔ مسند نشینی کی رُسوم آگے چل کر ادا ہوتیں۔

بابر اپنے واقعات میں لکھتا ہے کہ اُس (بابر) کا مقابلہ سنگھ رام (رانا سانگا) سے ہوا۔ رانا اسّی ہزار سوار، سات راجہ مہاراجہ، نو راو، ایک سو چار راول اور راوت، پانسو ہاتھی لیکر میدان میں آیا۔ سیکری (فتحپور) میں مقابلہ ہوا۔ ترکوں کے اقبال نے یاوری کی۔ رانا رن سے بھاگا۔ رانی نے زہر دیدیا، اودے سنگھ سب سے چھوٹا بیٹا گدّی پر بیٹھا۔ اس سے اکبر نے چتور اور رن تھمبور اور میرٹھ فتح کئے۔ بااین ہمہ اُودے سنگھ نے نہ اطاعت قبول کی نہ دربار میں حاضر ہوا۔ بلکہ ملک کی حفاظت اور راج کی بقا کے لئے پُرپیچ گھاٹیوں میں اُودے پور آباد کیا اور راجدھانی مقرر کی۔ کئی طرف بند باندھے، اودے ساگر جھیل بنائی۔ اسکا بیٹا پرتاب مسند پر بیٹھا۔ اس نے بھی بزرگوں کی آن بان قائم رکھی اور مغلوں کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں اکبر نے حسین قلی خاں، خان جہاں کو رانا کی مہم پر بھیجا اُسنے اودیپور لے لیا اور رانا بھاگ کر پہاڑوں میں چلا گیا۔

۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں اکبر نے بذات خود قلعہ چتور کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ تین کوس لمبا اور آدھ کوس چوڑا نہایت مستحکم و استوار تھا۔ قدرتی چشمے بہتے تھے۔ غلہ مدتوں کے لئے بافراط جمع رہتا تھا۔ اسی طرح سامان حرب و ضرب بھی۔ یہ قلعہ اس سے پہلے دوبار مسلمان فتح کر چکے تھے۔ مگر راجپوت اغیار کے قبضہ میں اپنے راج کے قدیم و متبرک مقام کو دیکھنا کب گوارا کر سکتے تھے۔ اتفاق سے رانا اُودے سنگھ کا لڑکا سکت سنگھ باپ سے بگاڑ کر کے اکبر کے یہاں چلا آیا اُس نے اکبر سے بہت سے دعدے اور قول قرار کئے مگر پھر بھاگ کر باپ کے پاس پہنچا اور اکبر کی فوجکشی کی خبر دی۔ اکبر پہنچا۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ مجبور ہو کر سرنگیں لگا دی گئیں۔ توپ اور گولے دربن چھاؤنی میں ڈھالے جاتے تھے نہایت خونریز بہادرانہ معرکہ تھا۔ ہولناک

اِن میں سے جو کوئی مسند نشین ہوتا اُس کے لئے قشقۂ صندلین راجہ اودے پور کے یہاں سے آتا تھا جسکو وہ بڑے افتخار واحترام سے اپنی پیشانی اور ماتھے پر جگہ دیتا تھا میر غلام علی آزاد (خزانۂ عامرہ صفحہ ۳۹ میں) اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ رانا ے اودے پور اپنا نسب نوشیرواں

سُرنگیں اُڑائی گئیں سوا چار مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوا" دل گفت کہ بکشاد بزودی چتور" تاریخ ہوئی۔

علاء الدین خلجی نے سوا سات مہینہ کے محاصرہ کے بعد ۳ محرم ۷۰۳ھ (۲۶ اگست ۱۳۰۳ء) کو چتور کو فتح کیا تھا۔ اِسی واقعہ کے ساتھ وہ دلچسپ افسانہ یا افسون جنون وابستہ ہے جسکو ملک شیخ محمد جائسی اور ہندی بھاشا کے دیگر باکمال شعرا نے اپنی سخن سنجی، بلندی خیال، طرز ادا اور حسن کلام سے شہرت و بقا کی سند دے رکھی ہے اور اپنی مشہور و بے نظیر مثنوی میں پدماوت یا پدمنی کی دلآویز داستان نظم فرمائی ہے۔ پدماوت کے حسن بے مثال کا ذکر ایک طوطی کی زبانی سنکر رتن سین والی چتور نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ ایک دریوزہ گرد لاابالی یا سادھو کے بھیس میں اپنے کعبۂ مقصود لنکا (جزیرہ سیلان) پہونچتا ہے۔ کامیاب ہوتا اور پدماوت کو بیاہ کر لاتا ہے۔ اِس کا شہرہ علاء الدین کے کانوں تک پہونچتا ہے تو نسیم صبا کی معرفت پیام محبت بھیجتا ہے ؎

یا من ناصبور را بش خود از وفا طلب   یا چو تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

آخر رانی کے عشق یا شوق دیدار سے مغلوب ہو کر چتور آتا ہے (تکلفات شاعرانہ و تخیلات نازک سے دور ہو کر بھی یہ قصہ پُرلطف ہے) رانی نہیں ملتی سلطان حصول مرام سے محروم رہتا ہے۔ رتن سین کو قید کر کے دہلی لے آتا ہے۔ ماہ سیما پدمنی اگر علاء الدین کے پنجہ میں پھنسنے سے بال بال بچ جاتی ہے تو اپنے جمال جہاں ستان کی بدولت راجہ دیوپال کے تعشق اور ناوک افگنی کا ہدف بنتی ہے۔ رتن سین اپنی مہر لقا لڑکی کی کرشمہ سازی و عشوہ بازی سے (جسکو مورخین دغا وحیلہ سے تعبیر کرتے ہیں) جب خلاصی پاتا ہے تو سب سے پہلے دیوپال پر حملہ کرتا اور اُس کو عشق بازی و دراندازی کا مزہ چکھاتا، شربت فنا پلاتا ہے۔ حسن و عشق کے اس معرکہ میں غیور رتن سین سخت مجروح ہوتا ہے حتیٰ کہ چتور پہنچکر اس محبوب دُنیا اور اپنی محبوب رانی سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو جاتا ہے۔ وفا پیمان اور فدائی پدمنی اپنے شیدا اور بہادر شوہر کے ساتھ ستی ہونے کے لئے چِتا میں بیٹھتی ہے۔ علاء الدین کے پیغام اُلفت کا جواب آج اُسکی زبان حال پر یہ ہوتا ہے ؎

آنکہ دائم ہوس سوختن ما می کرد   کاش می آمد و امروز تماشا می کرد

ناگہاں علاء الدین صاعقۂ برق کی طرح چتور کے دروازے پر نظر آتا ہے شہر و قلعہ کو مسخر و مفتوح کر لیتا ہے لیکن نازنین و ناز پیکر پدماوت کی جگہ ایک مشت خاکستر پاتا ہے۔

کسریٰ تک پہونچاتے ہیں جب سعد وقاصؓ نے ایران کو فتح کیا تو نوشیروان کی اولاد آوارہ ومنتشر ہوگئی۔ انھیں میں رانا کا ایک دادا بھی تھا جو ہندوستان آیا اور راجہ کے مرتبہ پر پہونچا جب شہر بانو

دربار اکبری میں لکھا ہے کہ "راجپوتوں میں یہی ایک خاندان ہے جس نے مسلماں بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی" شاید یہ جملہ لکھتے وقت مرحوم آزاد کو خیال نہ رہا ہوگا کہ اورنگ زیب کے آخر حیات تک کی رفیقہ ایک اودے پوری شاہزادی تھی جسکی خدمت گزاری ووفاشعاری کا اعتراف اُسنے دم نزع بھی کیا ہے ادب وانشائے فارسی کے اکثر قدرشناسوں نے مطبوعہ رقعات عالمگیری کو دیکھا ہوگا۔ میرے پاس بھی ایک نہایت قابل قدر قلمی مجموعہ "خدیو خدا آگاہ خلد آرام گاہ محمد اورنگ زیب عالمگیر" کے شقہ جات کا موجود ہے جو وقتاً فوقتاً شاہزادگان والا تبار اور امرائے ذوی الاقتدار' کے نام صادر وارسال ہوئے تھے۔ بادشاہ مبرور کے رسائل ورقعات اکثر مقربان حضور نے جمع کئے تھے مگر سب سے مکمّل اور صحیح نسخہ وہی ہے جو راجہ آیامل نے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں ترتیب دیا اور "دستور العمل آگہی" نام رکھا تھا۔ میرے نسخہ کے ساتھ "وصایائے اورنگ زیب بادشاہ برائے بہادر شاہ" بھی شامل ہیں۔ اسکی کتابت ۲۲ ربیع الاول ۱۲۳۴ھ (۲۰ جنوری ۱۸۱۹ء) کو ختم ہوئی تھی۔ یاد ہوگا کہ ہنگام واپسیں بادشاہ مغفور نے شاہزادہ اعظم شاہ کو تحریر فرمایا تھا "بیگم اگرچہ بظاہر ملول ست لیکن مالک دلہا خدا است کوتہ اندیشی مؤنثات جز ناکامی ثمرہ نداشت" اسی مجموعہ میں وہ شقہ خاص بھی ہے جو پانچویں شاہزادے سلطان محمد کام بخش کو خلد مکاں نے وقت مرگ لکھا تھا "حال بیگم' بیگم داند۔ اودے پوری کہ والدۂ شماست در بیماری باتمن بودہ' ارادۂ رفاقت دارد" اورنگ زیب کی اور بیگموں کو آج کوئی جانتا بھی نہیں لیکن یہ نیک نہاد ہندو نژاد ملکہ اپنے حق شناس ومنت گذار سرتاج کے دو لفظوں کی بدولت بقا ودوام کا خلعت پہنے کھڑی ہے فطرت انسانی کا اقتضا ہے کہ رخصت ہونے والا زیادہ باتیں پسند نہیں کرتا نہ کہ اورنگ زیب سا باجبروت' خود دار اور کم سخن لیکن اس بیگم کے بارہ میں احسان مند دل کی بات زبان تک آئے بغیر نہ بنی۔

ہندوستان کے دیگر والیان ریاست اور مہاراجگان والاشان کی طرح اودے پور کے مہارانا بھی بادشاہان مغلیہ کے مطیع وتابع فرماں رہے ہیں۔ شاہی مراسلات وفرامین میں وہ مطیع الاسلام لکھے جاتے تھے۔ ایک ہندو مدبر اور انشا پرداز پنڈت چندربھان متخلص بہ برہمن بادشاہ کا فرمان لیکر اودے پور گیا تھا۔ وہاں کے احوال میں جو عرائض اُس نے بھیجے ہیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ مہارانا کے حسن سلوک' نیک رویہ اور سویّت طویّت وعقیدت کی تحسین وستایش کرتا ہے۔

۱۵۹۳ موشیو ریمان عرف حاجی مصطفےٰ لکھتا ہے کہ رانا راجہ سے کسی قدر زیادہ مرتبہ وامتیاز کا خطاب ہے

دختر یزدگرد (نبیرۂ نوشیرواں) اسیر ہو کر امام حسین رضی اللہ عنہ کے حبالۂ نکاح میں آئیں
تو اُن (شاہزادی) کے بطن سے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ متولد ہوئے سادات حسینی کی
نسل امام ہمام پر منحصر ٹھہری تو ایسی صورت میں قبائل و عشائر سادات حسینی کے راجہائے اودے پور
ماموں (اخوال) ہوئے اور اس طور پر ان راجگان والاشان اور دیگر امرا و قبائل (مثلاً مرہٹہ
وغیرہ) کو جو خود کو خاندان اودے پور سے منتسب یا متوسل مانتے ہیں صلہ رحم کا حق ادا کرنا اور سیدوں

اگرچہ مخرج دونوں کلموں کا ایک ہی ہے۔

۵۹۴ قشقہ فارسی سے معرب لفظ ہے مگر اس ملک میں بہت زیادہ مستعمل سینسکرت میں تلک اور ہندی میں ٹیکا کہلاتا ہے قشقہ ایک چھوٹے سے مصفے پتھر یا مجلّے سنگ مرمر پر بھیجا جاتا ہے جو ایک کابی یا چاے کی طشتری کے برابر یا اُس سے کسی قدر بڑا ہو۔ اس میں کچھ چوب صندل ہوتی ہے اور کچھ دیسی زعفران اور کبھی چونا اور ہلدی۔ یہ چیزیں سُرمہ کی طرح باریک پیس لی جاتی ہیں اور بوقت ضرورت تھوڑا سا گلاب یا پانی ڈال کر سب کو ملا لیا جاتا ہے۔ لازم ہے کہ بھیجنے سے پہلے بھیجنے والا اسکو اپنے داہنے انگوٹھے سے مَس کرے۔ پانے والا اسکو بڑی مسرت انبساط اور ادب و احترام کے ساتھ لیتا ہے پھر اپنی انگلی کا پورا اسمیں ڈالتا اور اُس محلول مرکب یا اُس کے کسی جزو سے اپنے ماتھے پر چند لکیریں یا دھاریاں بالوں کی جڑ سے لیکر ناک کی نوک تک دراز کھینچ لیتا' یا دونوں ابروؤں کے مابین نشان لگا لیتا ہے یا صرف کان کی لو پر۔

دیہی کے پوجنے والے اکثر پوری پیشانی پر ایک بناگوش سے دوسری بناگوش تک قشقہ لگاتے ہیں' لیکن جو رام کے بھگت ہیں وہ سر کے بالوں کی جڑ سے ابرو تک لکیرین کھینچ لیتے یا نشان لگا لیتے ہیں

۵۹۵ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ سے ہیں۔ نام سعد' کنیت ابو اسحاق' باپ کا نام مالک ابی وقاص' لقب فارس الاسلام تھا۔ اپنے قبیلہ بنی زہرہ میں مقتدر و محترم اور اشراف مکہ میں معزز و ممتاز تھے۔ دنیوی وجاہت و امارت بھی حاصل تھی۔ رشتہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہوتے تھے سابقین اولین یعنی ایمان لانے والوں میں آپ ساتویں شخص تھے۔ سترہ (یا بروایت دیگر انیس ۱۹) سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس وقت سے برابر مکہ معظمہ اور بعد ہجرت مبارک مدینہ منورہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر اور باریاب رہے۔

الانف

بعد اعلان رسالت صحابۂ پاک کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن میں سے بعض کو سہیلی نے روض میں لکھا ہے خود حضرت سعد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا اُسکو میں نے پانی سے دھو

کے ساتھ مراعات و مدارات سے پیش آنا لازم ہے"۔

اس بارہ میں آزاد دہلوی بھی آزاد بلگرامی کے ہم نوا پائے جاتے ہیں اور دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ راجگان اودے پور میواڑ اپنا سلسلہ نسب نوشیروان کسریٰ سے ملاتے ہیں

پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔

آپ رواۃ حدیث اور ائمہ رجال کے طبقہ سوم میں شمار ہوتے ہیں۔ دو سو پندرہ حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ رسول مقبول روحی فداہ، کے خدمت گزاران خاص سے تھے۔ صاحب حیوٰۃ الحیوان لکھتا ہے کہ آپ نازک مواقع پر حراستؔ و وقایت نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماتے تھے حتیٰ کہ فرمان باری وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (اللہ آپ کو لوگوں کے شر) سے محفوظ رکھے گا جزو ۶ سورۃ المائدہ ع ۱۰ ۱۱) نازل ہوا اور اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔

آپ تمام غزوات اور اکثر سرایا میں شریک تھے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اسلام میں پہلا خون جو بہایا اور خدا کی راہ میں پہلا تیر جو پھینکا گیا وہ آپ ہی کے دست حق پرست سے تھا۔ آپ مع چند مخلصین مومنین کے بعض شعاب کے اندر مصروف نماز تھے۔ مشرکین نے اطلاع پائی تو ان پر عیب لگائے اور حملہ و جدال سے پیش آئے۔ حضرت سعد نے انہیں سے ایک شخص کے تیر مارا۔ اس کا سر زخمی ہو گیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں اِنِّیْ لَاَوَّلُ الْعَرَبِ رَمٰی بِسَہْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یہ واقعہ ۱ھ (۶۲۲ء) کا ہے۔

اُحد کے دن (۱۴ شوال ۳ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۲۵ء روز جمعہ کو) آپ نے کارہائے نمایاں فرمائے اس پر سرور اکرم صلعم نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَسْدِدْ رَمْیَتَہٗ وَاَجِبْ دَعْوَتَہٗ اے خدا! سعد کی تیر اندازی کو مضبوط و قوی فرما دے اور اُس کی دعا قبول کر (شرح السنۃ) دوسری مرتبہ ارشاد ہوا اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ لِسَعْدٍ اِذَا دَعَاکَ بار الٰہا تو سعد کو مستجاب الدعوات بنا (ترمذی) اس کا اثر یہ تھا کہ آپ جو دعا فرماتے مقبول ہوتی تھی۔ ان کے قبول دعا کے بہت سے واقعات سیر و احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ آپ جب امیر کوفہ تھے تو چند فتنہ پردازوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انکی جھوٹی شکایت کی۔ حضرت عمر نے اسکی تحقیق و تفتیش فرمائی۔ خلیفہ کا معتمد مسجد میں جا کر حضرت سعد کے بارہ میں دریافت کرتا پھرتا تھا ایک شخص ابو سعدہ نے غلط شہادت دی کہ سعد نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے ہیں۔ آپ بے اختیار ہو گئے اور فرمایا کہ "خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اس کو آزمائش میں ڈال" یہ دعا بارگاہ الوہیت میں قبول ہوئی اور اس شخص کا یہ مآل ہوا کہ پیرانہ سالی میں پلکیں لٹک آئی تھیں مگر بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ "مجھے سعد کی بد دعا لگ گئی ہے"۔

آزادوں کی بات کا ماننا نہ ماننا تو اہل بصیرت مورخ اور محقق اسلاف و انساب کا کام ہے۔ تذکرہ نگار کو ان تحریرات و روایات کے نقل و یکجا کر دینے سے چارہ نہیں اُس کے لئے نہ تصدیق کا موقع ہے نہ تکذیب و تغلیط کا۔ غالباً ان سب کا ماخذ اصلی ابوالفضل علامی کی تحریر ہے۔ آئین اکبری میں چیتور کے متعلق لکھا ہے "سردار بومی راپیشتر راول گفتے وازدیر بازہ رانا گویند۔ از قوم گھلوت خویشتن را از نژاد نوشیروان عادل برشمارد"۔

حضرت سعد رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب مکہ معظمہ گئے وہاں سخت بیمار اور قریب مرگ ہو گئے تو حضرت عیادت کو تشریف لائے اور تین بار دعائے صحت فرمائی۔ چنانچہ شفا پائی اور حضرت کی رحلت کے بعد چوالیس ۴۴ برس زندہ رہے۔

ترمذی نے اپنے جامع میں ایک باب مناقب سعد بن وقاص کے نام سے لکھا ہے اور روایت کی ہے کہ ایکبار رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے چبوترہ پر جلوہ افروز تھے اور شمع نبوت کے گرد اُسکے پروانے یعنی صحابۂ کرام نثار ہو رہے تھے کہ اس اثنا میں حضرت سعد تشریف لائے تو جناب رسالتمآب نے فرمایا کہ "یہ میرے ماموں ہیں بھلا تم میں سے کوئی بھی میرے ماموں کیسا اپنا ماموں دکھا سکتا ہے"؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ماجمع رسول اللہ صلعم اباہ وامہ الا لسعد۔ قال لہ یوم احد ارم فداك ابی وامی ایھا الغلام الحزور (رواہ الترمذی)

حضرت عمر کے عہد خلافت میں یزدگرد کے مقابلہ کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا آپ اُسکے سردار تھے۔ آپنے پہلے نرمی و آشتی سے کام لینا چاہا مگر جب کام نہ نکلا تو آپ لڑے اور خوب لڑے۔ محرم ۱۵ھ (فروری ۶۳۶ء) میں قادسیہ کے تینوں معرکے اور اُن کی فتح، تاریخ اسلام میں یادگار ہیں۔ پھر بابل۔ کوثی۔ بہرہ شیر۔ مدائن (پایہ تخت ایران) پر مسلمانوں کا جھنڈا بلند کیا۔ ۱۶ھ (۶۳۷ء) میں جلولاء کی لڑائی سے عراق اور ۱۷ھ میں جزیرہ کا سارا علاقہ فتح ہو گیا۔ سب سے پہلے مفتوحہ ممالک کی مردم شماری کرائی پھر بصرہ و کوفہ کو آباد کرایا۔ بعض شکایات کی بناء پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آپ گورنری کوفہ سے معزول اور آپ کے بجائے عمار بن یاسر مامور ہوئے لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت میں دوبارہ وہی خدمت پھر سپرد ہوئی۔ پہلے ۲۴ھ (۶۴۵ء) سے ۲۵ھ (۶۴۶ء) تک چند مہینے۔ پھر دوسری بار ۳۰ھ (۶۵۱ء) سے ۳۴ھ (۶۵۴ء) تک انجام دی۔ باایں ہمہ کہ حضرت عمر نے باقتضائے مصالح آپ کو ولایت کوفہ سے سبکدوش کیا تھا لیکن اُنکے دل میں آپ کا احترام اور آپ کی دیانت کا وثوق باقی تھا حتی کہ اپنی وفات سے پہلے جن چھ صحابیوں کو اپنے میں سے خلیفہ تجویز کر لینے کا اختیار دیا تھا اُن میں سعد بھی تھے لیکن آپنے خلیفہ ہونا منظور نہ فرمایا۔

ڈاکٹر ولیم ہوئی William Hoey, M. A., D. Lit. (بحوالہ تاریخ فرح بخش مولفہ محمد فیض بخش) اپنی کتاب "تذکرۂ دہلی و فیض آباد Memoirs of Delhi and Faizabad. (جلد اوّل مطبوعہ ۱۸۸۹ء) میں مرہٹوں کی اصل و نسل کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مورخین نے سنتا پسر سیواجی کے اجداد و اسلاف کی نسبت بہت کچھ لکھا اور اسکے سلسلہ نسب کا پتہ نوشیرواں تک چلایا ہے۔ رانایان اودے پور، سنتا کے رشتہ دار ہیں۔ سنتا کا پردادا اپنے بھائیوں سے بگڑ کر اودے پور سے چلا آیا تھا۔ دکھن میں بمقام قصبہ مرہٹ قیام گزین ہوا۔ اسی لئے "مرہٹہ" کہلاتا ہے"۔

اور حضرت عبدالرحمٰن کو اپنا حق دیدیا۔

حضرت عثمان کے آخر زمانۂ خلافت میں جو سازشیں اور شورشیں رونما ہوئیں اُنکی اصلاح و اندفاع میں آپنے بقدر مقدور سعی مبذول فرمائی اور ناکام رہے وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (اور خدا کا حکم ہو ہی کر رہا۔ جزو ۲۲ سورۃ الاحزاب ع ۵-۲)۔ اُنکی شہادت سے نہایت ملول و دل شکستہ ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے تھے۔ حضرت علی اور امیر معاویہ کے مناقشات و معاملات سے بھی دور دور رہے۔

۵۵ھ (۶۷۴ء) یا ۵۸ھ (۶۷۷ء) میں اپنی بانوے سال کی عمر میں موضع عقیق میں رحلت فرمائی آپ کا جنازہ (۱۰ میل کے فاصلہ پر) مدینہ منورہ لایا گیا۔ مروان بن حکم نے جو مہاجرین رضی اللہ عنہم اجمعین سے اُس وقت تنہا زندہ اور باقی تھے مسجد نبوی میں نماز پڑھائی۔ بقیع پاک میں سپرد خاک کیا۔

عمر بن سعد وقاص (آپکا بیٹا) بڑا شاعر اور مرتبہ شناس اہل بیت اطہار تھا۔ جسکے بعض اشعار قاضی نور اللہ شوستری نے فاتحہ کتاب مجالس المومنین میں نقل کئے ہیں۔

[اہل سیرت و عقیدت کو عمر بن سعد کے اوصاف و محامد میں مبالغہ و غلو کا اختیار ہے لیکن مورخ کا قلم اس الم انگیز حقیقت کے اظہار پر مجبور ہے کہ یہ ہی عمر بن سعد رے و اعمال رے کا والی تھا جسکو ابن زیاد نے امام حسین علیہ السلام کے مقابلہ و قتال کے لئے سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا جس نے وادی کربلا میں فرات کا پانی امام اور حزب و انصار امام پر بند کر دیا تھا اور تشنگی کے ساتھ ہر قسم کی اذیات روحانی و جسمانی پہونچائی تھیں اور جب یزید بن حصین ہمدانی سمجھانے گئے اور پانی کے لئے گفتگو کی تو نہ مانا نہ کچھ جواب دیا ہمدانی نے جل کر کہا هذا ماء الفرات يشرب منه الكلاب والدواب وتمنعه ابن بنت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم واولاده واهل بيته والعترة الطاهرة يموتون عطشا وقد حلت بينهم وبين الماء وتزعم انك تعرف الله ورسوله تو عمر نے سرنگوں کر لیا اور کہا کہ اے اخا ہمدان! میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہتے ہیں میں اپنے نفس کو اس قابل نہیں پاتا کہ وہ رے کی مملکت ترک کر کے غیر کے ہاتھ میں جانے دینا گوارا کرے۔ عمر بن سعد کا یہ کارنامہ بھی

ادبِ سیادت

ایک ضروری اور نازک بات خود سادات عظام کو اپنا ادب و احترام ملحوظ رکھنے کے متعلق ہے
مولانا سید قمرالدین حسینی اورنگ آبادی سادات خجندی اور اجلۂ اتقیا سے تھے ادائے فریضہ
حج کے لئے جب مکہ معظمہ پہونچے تو وہاں کے عمائد و اعیان نے اُنکی بڑی تعظیم و تکریم کی اور ضیافت

تاریخ اسلام کے اوراق پر ہمیشہ ثبت رہیگا کہ امام اور اُنکے اصحاب کے سرہائے مبارک سنان بن انس نخعی کے ہمراہ ابی نے
ابن زیاد کے پاس بھیجے تھے ۵ جامی چہ لاف می زنی از پاک دامنی ٭ بر دامن تو این ہمہ داغ شراب چیست؟

۵۶ یزدجرد ثالث پسر شہریار و نبیرہ خسرو پرویز ملکہ آرزم دخت Arzami Dakht کے عزل
کے بعد ۱۱ھ (۶۳۲ء) میں تخت نشین ہوا اسی کو اہل یونان Isdigertes III لکھتے ہیں۔ خلیفۂ
ثانی حضرت عمر بن الخطاب کا معاصر تھا اپنے اجداد کی شان میں خواہ سلسلہ پدری میں ہوں خواہ مادری میں
کوئی بے ادبانہ کلام زبان سے نکالنا خلاف آداب شرافت ہے' لیکن مورخین لکھتے ہیں اور مجھکو اُنکے
الفاظ کے نقل کر دینے سے چارہ نہیں کہ "یہ شاہزادہ جتنا بدنصیب تھا اُتنا ہی کمزور و بزدل بھی" تخت پر
نو سال رہا۔ یہ زمانہ تخت نشینی سے شروع ہو کر نہاوند کی لڑائی پر ختم ہو جاتا ہے جس نے ایران کی قسمت
کا فیصلہ کر دیا تھا جو اُسی تاریخ یعنی ۲۰ھ مطابق ۶۴۱ء سے اہل عرب کے تحت حکومت آگیا۔ اسکے
بعد یہ بادشاہ دس سال تک آوارہ و سرگرداں پھرتا رہا۔ کوئی حکومت یا اختیار کسی قسم کا نہ رکھتا تھا۔
پہلے سیستان بھاگ کر گیا پھر خراسان کو، وہاں سے مرو۔ بالآخر مرو میں ۳۱ھ (۶۵۱ء) میں قتل
کر دیا گیا۔ ساسانی خاندان کا وہ اخیر بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے فارس میں چارسو پندرہ ۴۱۵ سال تک
فرماں روائی کی۔ اِسی کے عہد کے آغاز سے ایرانی سال چلتا ہے جو آج تک اُس ملک میں مروج اور اُسکے
نام سے منسوب "سال یزدجردی" کہلاتا ہے۔ سہ شنبہ ۲۰ ربیع الاول ۱۱ھ (۱۶ جون ۶۳۲ء) یعنی
حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے آٹھ یوم بعد سے شروع ہوتا ہے۔
نیک نفس براؤن جو عجم کی ہراد کا دلدادہ اور ہر فرد کا ستائشگر تھا لکھتا ہے کہ "یزدجرد جب خراسان
کو بھاگا ہے تو اسکی قوت زائل ہو چکی تھی...... یہ یزدجرد ثالث شاہانہ اور شریفانہ نسل ساسانیاں کا خاتم
و آخر تھا۔ اُس نے ایک کم بخت خبیث کے ہاتھ سے جسکے دندان آز اسکے رخشندہ و درخشندہ جواہرات
کو دیکھ کر تیز ہو گئے تھے یکہ و تنہا مصیبت کے ساتھ جان دی۔ اس کے پاس ہی جواہر باقی رہگئے تھے
جو اس آفت رسیدہ و خستہ حال بادشاہ کے علو مرتبت اور زوال دولت کا پتہ دے رہے تھے...... یزدجرد
سوم اخیر ۶۳۲ء یا شروع ۶۳۳ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ یزدجرد اوّل کا زمانہ ۳۹۹ء سے ۴۲۰ء تک

وجہاں بیان کیں ۔ اتفاقاً وہاں کے سرداران مین سے ایک صاحب نے جو شریف مکہ کے مدار المہام
اور سید بھی تھے مولانا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اور خواہش کی کہ مولانا تقدیم فرمائین ۔ مولانا
نے منظور کیا ۔ ملے تو فرمایا کہ مین دو وجہ سے آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہون ۔ اولاً آپ
حاکم ہین اور حکم حاکم کی اطاعت لابد ہے ورنہ مستحق تقدیم خود جناب تھے ۔ مشہور ہے کہ اَلْقَادِمُ
یُزَارُ ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شوق جس طرف سے ہوتا ہے کھینچ لاتا ہے نہ کہ بالعکس ۔ ثانیاً سادات
کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو نسبتین ہین ۔ ایک خاص یعنی یہ کہ وہ حضرت صلعم کے
لبضعہ و پارہ ہین ۔ دوسری عامہ یعنی حضرت اقدس کی اُمّت محبوبہ سے ہین ۔ پس جس طرح تمامی
اُمت پر آپکے ایک پارہ کی تعظیم واجب ہے ۔ اسی طرح خود اُن پر بھی لازم ہے کہ بعض کے اُمتی
ہونے کی حیثیت سے بعض کے بضعۃ الرسول ہونے کی شان سے تعظیم کرین بلکہ ہر ایک پر
یہ بھی واجب و لازم ہو کہ خود اپنی بھی توقیر و تکریم کرے تاکہ دونون حق ادا ہو جائین ۔ مولانا نے اسی
سلسلہ مین یہ بھی بیان فرمایا کہ جب میرے بدن کا کوئی جزو مثلاً ناخن یا بال جُدا ہو جاتا ہے
تو مین اس کو کسی پاک جگہ مین دفن کر دیتا ہون لیکن اور اُمتیت کی حیثیت سے بضعیت کا احترام
کرتا ہون ۔

صاحب مرآۃ المبتدئین میر سید حسینؒ بن سید ابراہیم ملقب بہ سید السادات ۔ کے تذکرہ
مین لکھتے ہین کہ گرد و پیش خانۂ میر مردم سادات از قوم و خویشانش متوطن بودند ۔ اگر بچہ
بہان راہ می رفت تمام قد بر می خاست ۔ و اگر رضیعہ طفلے را از سادات بخدمتش می آورد
تا دعا خواندہ بر وے دمد، بر پا خاستہ دعا می دمید ۔ و میر عمر بسیار یافت تا زندہ بود حالش

تک مورخین عرب کی تحریر کے مطابق تھا ۔ عربون نے یہ شین دہلوی نامہ شاہان، سے نقل کئے ہین
یہ سب یزدجرد کو گناہگار (اہل فارس بزہ گر، اور اعراب الآثم) لکھتے ہین ... گوبنو Gobineu
کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ اہل عجم اور بعد کے فارسی مورخین آل ساسان کی فوق البشریت یعنی اُنکی الوہیت
کے قائل تھے ...“

۵۵۷ سبحۃ المرجان

۵۵۸ میر سید حسین بڑے عالی شان بزرگ تھے حضرت شیخ عبد العزیز دہلوی (مدفون خانقاہ حضرت)
کے شاگرد و مرید و داماد اور بڑے عالم متبحر تھے ۔ اُن کے سوانح نگار لکھتے ہین کہ اُن کے چہرہ پر سیادت

ہمین بود۔ و نیز در مجلس خاص و عام می فرمود کہ اولاد فاطمہ ہمہ مبشر بجنت اند۔ ہر چند مردم منع می کردند کہ سادات بسیار اند از عبادت باز خواہند ماند۔ این چنین گفتن مصلحت نیست۔ جواب می داد۔ اگر مصلحت لمی شد۔ لمی نوشتند۔ ما نوشتۂ ایشان را نقل میکنیم تا دم آخر ہمین کلمہ از زبانش جاری می شد"

میر سیّد حسین کا یہ قول کہ "حضرت فاطمہ کی تمام اولاد کی شان مین جنت کی بشارت آچکی ہے" حضرت شیخ محی الدین بن العربی کے مذہب کے موافق ہے جسکو فتوحات[۵۹] مکیہ کے انتیسوین[۲۹] باب مین بیان فرمایا ہے۔ شیخ ابن حجر مکّی نے صواعق محرقہ مین احادیث نبویہ اور علماء کے اقوال اس بارہ مین نقل کئے ہین ان شئت ذالک فاطلب ھنالک

شیخ عبدالعزیز[۶۰] دہلوی جو خانوادہائے سہروردیہ و چشتیہ کے چشم و چراغ اور تمام امراء و اعیان دولت اکبری کے مقتدا تھے بحر مواج کہلاتے، اتباع سنت سنیہ مین بالکل محو ہو چکے تھے۔ خاندان نبوّت کے ساتھ اخلاص و اعتقاد ہر شے سے زیادہ رکھتے تھے حتیٰ کہ اُن کے محلہ مین بعض اہل حرفہ بھی رہتے تھے جو اپنے کو سیّد بتاتے اور بتاتے تھے۔ شیخ صاحب جب

و نجابت کے آثار و انوار نمایان تھے۔ شیخ کو اُن کے تعلق و قرابت پر بڑا فخر تھا

۵۹ فتوحات مکّیہ۔ احکام شرعیہ کے اسرار اور حکم الٰہیہ کے دقائق کے بیان مین نہایت ضخیم اور لاجواب کتاب شیخ اکبر محی الدین محمد بن عربی کی تصنیف ہے۔ سارے عالم اسلامی مین شیخ کی شہرت ایک عارف حقیقی اور حکیم الٰہیات ہونے کی حیثیت سے چلی آتی ہے۔ مشرق پسندان فرنگ پر بھی اُن کی تحریر دلفریب کا بڑا اثر ہے۔ براؤن انجہانی نے کمال عقیدت و احترام کے ساتھ آپ کو بارہا یاد کیا اور آپ کی کثیر و کبیر الحجم تالیفات کا ذکر کیا ہے وہ آپ کو مغرب کا سب سے بڑا صوفی بتاتا ہے۔

سینار ڈان میگوئیل آسین Senor Don Miguel Asin جو ایک کیتھولک (کلیسائے روما کا پیرو) پادری اور اسپین کا مشہور عربی دان محقق و پروفیسر ہے لکھتا ہے کہ اٹلی کے غیر فانی شاعر دانتے Dante نے اپنی نظم The Divine Comedy مین دنیائے دون اور عالم معاد کی نسبت جو کچھ تخیل و تصور قائم کیا اور بتایا بھی وہ تمام تر روایات اسلامی پر مبنی اور بالخصوص حکیم ابن عربی Murcian Mystic کی تالیف "فتوحات" سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ یہ معلومات دانتے نے برونیتو لاطینی Brunetto Latini اور دیگر ذرائع سے حاصل و فراہم کی تھین

درس دینے کے لئے باہر نکلتے تو طلبہ کا ازدحام ہوتا تھا۔ اسی حالت میں اگر لوگوں میں سے کوئی خردسال کھیلتا ہوا آپ کو نظر آجاتا تھا تو درس کو بے توقف روک کر کھڑے ہوجاتے۔ وہ لڑکا جب تک کھیلتا رہتا آپ بہ ادب تمام کھڑے رہتے اور اپنے قرب سے ہٹاتے نہ تھے۔ طالب العلم نہایت تنگ آگئے تو کوچہ کے سر پر نگاہبان مقرر کر دئے تاکہ کوئی بچہ ادھر نہ آنے پائے۔ شیخ کو جب یہ خبر پہونچی تو طلبا کو زجر و تنبیہ فرمائی۔ جبتک زندہ رہے یہی کیفیت قائم رہی۔[۹۰]

ظاہر ہے کہ مختلف ذرائع و وسائل سے مختلف جماعات و طبقات بجائے خود اپنی فلاح عاقبت کی امید کرتے اور آس لگاتے ہیں کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر جس فرقہ کے پاس ہے اسی سے خوش ہے (جز ۱۸ سورۃ المومنون ع ۴۔ ۴)

رفع دخل مقتدایان ملت اور خود میر عبد الجلیل کے اسلاف کا خیال سادات کی منزلت جلیلہ اور شان مغفرت کی نسبت جو کچھ رہا ہو لیکن میر اپنے اخلاف و متوسلین کو ہمیشہ کارہائے خیر کی موعظت، امر بالمعروف و النہی عن المنکر کرتے رہتے ہیں۔ میر سید محمد کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں

"عمدہ نصیحت من بشما این ست کہ بر نماز پنج وقت مواظب باشند کہ از شخصے کہ نماز نہ کند خیر و برکت دین و دنیا مسلوب است، و ہرگاہ نماز فارق اسلام و کفر باشد اعتناء[۹۲]

حسرت و افسوس ہے کہ حال میں رسید عبد الجلیل کے کتب خانہ کی فتوحات مکیہ کا مکمل نسخہ چار جلدوں میں میرے واجب الاحترام مخدوم مولانا عبد العزیز میمن راجکوٹی کی نظر سے گذرا تھا جسکے آخر میں سید صاحب کے دستخط اُنکے قلم سے ثبت تھے۔ مالک کے انتقال کے بعد ان مجلدات کا شیرازہ بکھر گیا۔ دو جلدیں لاہور کے ایک اہل علم مسٹر محمد سلیم ایم اے کے حصہ میں آئیں جن میں دستخط مذکور موجود ہیں۔ فاضل وسیع النظر پروفیسر کی رائے ہے کہ فتوحات کا یہ نسخہ دنیا کے بہترین نسخوں میں شمار ہونا چاہیے۔

۹۰ ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں وفات پائی عموماً خطوط و صحائف پر "ذرہ ناچیز عبد العزیز" لکھا کرتے تھے۔ اسلئے تاریخ بھی "ذرہ ناچیز" قرار پائی۔ شیخ عبد القادر بدایونی نے "قطب طریقت نما" تاریخ نکالی [خیال ہے کہ شیخ عبد العزیز جنھوں نے ۹۷۵ھ میں وفات پائی تھی ایک دوسرے بزرگ تھے] آئین اکبری میں شیخ کا نام "خداوندان آئین" کے ذیل میں لیا گیا ہے

۹۱ مرآۃ المبتدئین

شان صلوٰۃ ازین جا معلوم باید کرد۔ برین بمقتضائے کریمہ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوۃِ واجب بود کہ درین باب تاکید بشما بنویسیم و در عاقبت از مداهنت درین امر بر آئیم شما ہم سعادت مند اید اطاعت امر والدین کہ بہ نص قرآنی واجب ست البتہ خواہید کرد و بر نماز پنجگانہ مواظبت خواہید نمود۔ زیادہ درین باب مبالغہ تاکجا نوشتہ شود۔

شناخت سادات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی دہلوی مناقب السادات میں لکھتے ہیں

"امارت صحت سیادت خلق محمدی است و سخاوت ہاشمی و شجاعت حیدری۔ باید کہ صحیح النسب ازین ملکات بہرہ وافی داشتہ باشد۔ و احیاناً بحکم نفس امارہ اگر مرتکب عصیانے شود آخر کار سببی زدمی دہد کہ باعث نجات اخروی می گردد"۔

قاضی صاحب بڑے نامور عالم و فاضل اور شیخ طریقت گذرے ہیں۔ مولانا محمد خواجگی دہلوی کے

۹۲ صحابہ پاک رضی اللہ عنہم اسی نماز کو کفر و اسلام میں ذریعہ تمیز اور نشان ایمان سمجھتے تھے۔ فاروق اعظم نے فرمایا ہے کہ من ضیع الصلوٰۃ فھولما سواھا اضیع" نماز سب سے بڑی اور بزرگ چیز ہے جسنے اسکو ضائع کردیا اس سے کسی عمل خیر کی توقع نہیں"۔ خاتم الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے الصَّلٰوۃُ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین (نماز دین کا ستون ہے جس نے اسکو قائم رکھا اسنے دین کو قائم رکھا اور جس نے اس کو ترک کیا اس نے دین کو منہدم کر دیا) دوسرے موقع پر ارشاد ہوا ہے حبب الی من دنیاکم ثلاث الطیب والنساء وقرۃ عینی فی الصَّلٰوۃ "حیات دنیوی میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں ایک خوشبو۔ دوسری عورتیں تیسری نماز جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ شریعت اسلامی نے لازم کیا ہے کہ نماز کی پابندی کیلئے ہدایت و تاکید سات سال کی عمر سے شروع کی جائے جو حفاظت زمان کا بچہ کو گود میں رکھنے کی مدت کے ختم کا وقت ہوتا ہے۔ دس سال کی عمر میں بھی اگر پابندی نماز نہ ہو تو زد و کوب کا حکم آیا ہے۔ زمانہ بلوغ سے مدت العمر کے لئے فرض ہوجاتی ہے۔ ادائے نماز کے لیے کوئی پہلو۔ کوئی بڑا سے بڑا موقع کوئی مناسب وقت فرو گذاشت نہیں ہونے پایا ہے۔ کلام پاک میں کتنی تاکیدات ادائے صلوٰۃ کے لئے وارد ہوئی ہیں احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کیسی کیسی خبر اور سزا بتائی گئی ہے۔ اس میں تغافل و تساہل کیا۔

اَجلّ خُلفا اور قاضی عبدالمقتدر شریحی[۵۹۶] اور سید میر اشرف[۵۹۵] سمنانی کے مایۂ ناز شاگرد تھے نحو و بلاغت
و تفسیر و تقسیم علوم اور تقسیم صنائع مین بڑی مستند کتابین لکھی ہین سلطان[۵۹۶] ابراہیم شرقی ان کا
بڑا قدر شناس اور خدمتگذار تھا۔ ملک العلما خطاب بھی اسی نے دیا تھا اس رسالہ مناقب السادات

روز محشر کہ جانگداز بود   اولین پرسش نماز بود

۵۹۳ اپنے گھر والون کو نماز کا حکم دیجئے جزء ۱۶ سورۂ طٰہٰ ع ۱۷۔ ۸

۵۹۴ ۲۵ رجب المرجب ۸۴۹ھ (۳۰ اکتوبر ۱۴۴۵ع) کو جون پور مین وفات پائی۔ ان کے حالات اخبار الاخیار
و خزینۃ الاصفیا مین ملین گے۔ انھین کی نسبت ان کے استاد شفیق قاضی عبدالمقتدر کہا کرتے تھے یاتینی
من الطلبۃ من جلدہ علم و لحمہ علم و عظمہ علم
جون پور اور سلطنت شرقیہ کے سلسلہ مین شیخ ابوالفضل آئین اکبری مین لکھتا ہے۔
دانائے ہند قاضی شہاب الدین درین روزگار نامور گردیدہ زادگاہ او دولت آباد دہلی ہست
دران مصر جامع عقلی و نقلی علوم را گردآوری کرد و بہنگام رسیدن صاحبقرانی بہمراہی استاد خود
مولانا خواجگی کہ خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلی است بجون پور آمدہ آنجا نشو و نما یافت و محسود زمانیان
گشت یشاہ مدار کہ از اولیائے ہند است و سرچشمۂ سلسلۂ مداریہ او بود و چنانچہ رسم است کہ
دانش منشان ظاہر را با دیدہ وران باطن سر گرانی باشد او نیز بمشرب خیر اندیشی تیرگی داشت۔

۵۹۵ مولانا خواجگی عالم ربانی تھے عالم رویا مین شیخ نے افواج تیموری کے حملہ کی خبر پاکر دہلی چھوڑ دی تھی اور کالپی چلے گئے تھے وہین فوت ہوئے۔

۵۹۶ قاضی عبدالمقتدر الشریحی الکندی الدہلوی بڑے عالم و فاضل گزرے ہین قاضی رکن الدین کے
بیٹے اور شیخ نصیر الدین محمود اودی دہلوی کے تلمیذ رشید اور مرید سعید تھے۔ اتباع سنت سنیہ مین اپنے اسلاف
بزرگ کے سچے پیرو تھے۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے ان کا قصیدۂ لامیہ اخبار الاخیار مین نقل کیا ہے۔ میر غلام علی
آزاد نے تسلیۃ الفواد مین انکے حالات تحریر فرمائے ہین ہندوستان کے اجل و منتخب علماء دین مین ان کا شمار ہے
۲۶ محرم مکرم ۷۹۱ھ (۲۵ جنوری ۱۳۸۹ع) کو اٹھاسی سال کی عمر مین رحلت فرمائی۔ آپ کی ضریح منور دہلی مین
حوض شمسی کے قریب ہے۔

۵۹۷ خراسان کے مشہور قصبات مین سے کسی وقت سمنان بھی ایک نفیس و مردم خیز قصبہ تھا میوہ بازار،
اور انار بالخصوص بے نظیر ہوتا تھا اہل تمیز سے زیادہ شعرا کے کلام اور تشبیہات مین کام آتا تھا۔ سمنان۔ بلدۃ من بلاد
اسی سرزمین کو ابوالمکارم شیخ علاء الدولہ (خواجہ رکن الدین احمد بن محمد بن احمد سمنانی) کے موطن و مولد
ہونے کا بھی فخر حاصل ہے شیخ کا نام ان اوراق مین کئی جگہ آیا ہے۔ اسلئے مختصراً ان کا ذکر کردینا لازم ہے
آپ کا خاندان امیر کبیر تھا۔ آپ کے چچا شیخ شرف الدین، سلطان ارغون خان کے ندیم و مقرب خاص تھے

قومس بین الدامغان و خوار الری و ذریۃ من قری نیشاپور۔ ذکرہ السمعانی علی بن محمد بن احمد ابوالقاسم السمنانی مشہور امام و فاضل اسی سے منسوب ہے

مین اپنی عقیدت اور اہل بیت نبوّت کے ساتھ محبّت کا بہ حُسن وجوہ و اسالیب بیان کیا ہے۔
باعث تصنیف یہ تھا کہ ایک صاحب سید اجمل نام سے جو سادات مین سے تھے مجلس مُلوکی مین
تقدّم و تاخّر کے سبب سے کچھ نزاع ہوگئی تو قاضی نے ایک کتاب لکھی جس مین سادات پر علماء کی

اسی تعلق سے ایام شباب مین شیخ نے بھی بادشاہی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ کچھ زمانہ تک رے کے قاضی رہے تھے۔ اسی زمانہ کی یادگار ایک بڑی تفسیر معروف بہ "تفسیر سمنانی" تیرہ جلد مین موجود ہے۔ دُنیا کے دن سے دل بیزار ہوا تو نوکری چھوڑ دی طریقت مین قدم رکھا۔ مدّت دراز تک عبادت و یاد الٰہی مین مشغول رہے۔ رُسوم صوفیہ کا احیا کیا۔ مورخین لکھتے ہین کہ جنید بغدادی کے بعد شیخ سے بڑھ کر کوئی بزرگ و متقی نہین گذرا۔ محدث بھی تھے۔ فقیہ بھی۔

شیخ کے انصاف اور تواضع و فروتنی کی یہ کیفیت تھی کہ جب مولانا نظام الدین ہروی نے شیخ کی تکفیر فرمائی اور لکھ کر بھیجا کہ "تم کافر ہو" تو مولانا کا رقعہ پڑھ کر شیخ زار زار روئے اور کہا کہ "لے نفس! مین ستر برس سے تجھ سے کہہ رہا تھا کہ تو کافر ہے۔ مگر تو باور نہین کرتا تھا!! اب بھی کچھ شبہ رہا؟ اب تو مسلمانون کے امام اور شرق و غرب کے مفتی نے تیرے کافر ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ مان لے۔ اب بھی گردن جھکا دے اور مجکو نہ ستا"

پھر یہ رباعی پڑھی ؎

نفسے ست مرا کہ غیر شیطانی نیست — وز فعل بدش ہیچ پشیمانی نیست
ایمانش ہزار بار تلقین کردم — این کافر را سر مسلمانی نیست

شیخ نے ستتر (۷۷) برس کی عمر پاکر شب جمعہ ۲۳ رجب ۷۳۶ھ (۸ مارچ ۱۳۳۶ء) کو بغداد مین وفات پائی۔ صاحب مرآۃ التفسیر نے سال وفات ۷۳۰ ہجری لکھا ہے۔

۵۹۵ اس ناچیز تذکرہ کے حواشی مین، ہندوستان کے سلاطین و اُمرا کے مفصل حالات لکھنے سے عموماً احتراز کیا گیا ہے۔ بیشتر اہل نظر اُن سے آگاہ و واقف ہین لیکن یہ سلطان (ابراہیم) اور اس کا خاندان (شرقی) ایسا نہین گزرا ہے جسکا مختصر تذکرہ کر دینے سے بھی دریغ کیا جائے

ملک سرور خواجہ سرا کو بادشاہ دہلی نے خواجہ جہان (یا بروایت ابوالفضل "خان جہان") خطاب دیا اور وزیر مطلق مقرر کیا تھا سلطان محمود جب تخت پر بیٹھا تو صوبجات شرقی کا گورنر بنا دیا۔ کچھ دن بعد وہ خود مختار اور سلطان الشرق بن گیا (۷۹۶ھ ۱۳۹۴ء) مین قنوج سے لے کر بہار تک یعنی جابہ ممالک محروسہ ہند کا نظم و نسق اُسکے عنان قدرت مین آگیا تو اُس نے "اتابک اعظم" کا لقب اختیار کیا۔ اس کا دار الحکومت جون پور تھا جس کو سلطان فیروز شاہ باربک مرزبان دہلی نے اپنے برادر عم زاد فخر الدین محمد جونان کے نام سے ۷۷۲ھ (۱۳۷۰ء) مین آباد کیا تھا۔ شہر جون پور، تاریخی نام ہے۔ یہ خاندان ایک صدی کے قریب حکمران رہا۔

فضیلت کا ذکر تھا۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ علما کی فضیلت علم کی وجہ سے ہے جو عالم میں باہر و ظاہر ہوتا ہے، سادات کی علویت کی فضیلت موہوم ہوتی ہے۔ اُس کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے بعد شاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کو خواب میں دیکھا کہ قاضی صاحب پر عتاب فرماتے اور سید اجل کے

سلطان الشرق	سولہ سال	سلطان محمود	اکیس سال چند ماہ
مبارک شاہ	اکیسال سے زائد	محمد شاہ	پانچ مہینہ
سلطان ابراہیم	چالیس برس سے کچھ زیادہ	حسین شاہ	اونیس سال
چھ کس -	ستانوے سال چند ماہ		

بادشاہان دہلی سے اِن کی مخالفت علانیہ رہی لیکن حریف قوی تھا اور زور آزمائی و مقابلہ دشوار۔ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں خواجہ جہان فوت ہوا۔ وہ بڑا دانشمند، منتظم، مدبر و منصف فرمانروا تھا۔ اُس کا پسر خواندہ اور وارث ملک قرنفل نام، مبارک شاہ کے لقب سے اورنگ نشین ہوا۔ اس کا عہد مختصر اور ناممتاز تھا۔ ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) میں اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم شاہ (برادر زادہ خضر خان) اِس کا جانشین ہوا۔ ابراہیم اور اُسکے اخلاف بڑے صاحب خیر اور مُربّی علوم و فنون اور قدر دان کمال و ہنر تھے۔ اپنے قلمرو میں بڑی بڑی مسجدیں، عظیم الشان مقبرے اور بلند و محکم قلعے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ ابراہیم کی دیرینہ آرزو ۸۱۰ھ (۱۴۰۷ء) میں برآئی۔ اس نے قنوج، سنبھل اور برن (بلند شہر) پر قبضہ کر لیا۔ دہلی پہونچنے کے قریب تھا کہ مظفر شاہ اول والی گجرات کے حملہ اور ہوشنگ شاہ فرمانروائے مالوہ کی شکست کی خبر ملی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ فتح مند مظفر کا قدم اب جون پور کی طرف بڑھنے والا ہے۔ چار ناچار اپنے مفتوحات جدیدہ سنبھل و برن کو چھوڑ کر ابراہیم اپنے دار الملک کو واپس آیا۔ ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں خضر خان کو دہلی میں اختیار کامل اور اقتدار تام حاصل ہو گیا تو ابراہیم کو اُس جانب کے خطرات اور اندیشوں سے برائے چندے اطمینان ہوا۔ ۸۳۱ھ (۱۴۲۷ء) میں وہ کالپی پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا لیکن مبارک شاہ نے مزاحمت کی (جو ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں خضر خان کا جانشین ہوا تھا)۔ اُس نے پھر ۸۳۶ھ (۱۴۳۲ء) میں حملہ آور ہونا چاہا مگر ناکام رہا۔ بنگال اور دیگر ممالک متصلہ پر بھی فوج کشی کی تھی۔ ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں ابراہیم اس جہان ناپائدار سے رخصت ہوا۔ یہ بڑا اولو العزم صاحب حوصلہ اور قدر شناس بادشاہ تھا۔ اس کا بنوایا ہوا تمام شہر جون پور میں اب تک باقی و محفوظ ہے جو ۸۱۱ھ (۱۴۰۸ء) میں مکمل ہوا تھا۔ اسی کے عہد میں مسجد دریبہ اسکے دو امیروں نے تعمیر کرائی تھی اور جھنجری مسجد بھی، جس کا کچھ حصہ اب باقی رہ گیا ہے۔ جون پور کی مسجد جامع (جس کا تاریخی نام "مسجد جامع الشرق" ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) ہے) کی تعمیر بھی اسی خاندان کے دست دریا نوال کی منت گزار ہے۔ اسکی تجویز خود ابراہیم نے کی تھی، نقشہ بھی بنا دیا تھا۔ مگر یہ شرف اسکے پوتے حسین شاہ کے مقدر میں تھا کہ دادا کے ارادے کو پورا کیا

استرضاء کی تحریص کرتے ہین علی الصباح، قاضی صاحب جیسے ہی خواب راحت سے بیدار ہوئے تو سید صاحب کی خدمت مین پہونچے۔ توبہ کی۔ اور اپنی کتاب دریا مین ڈال دی اور بلاخوف لومۃ لائم اپنی شرافت نفس و کرامت طبع سے اُس کے بجائے یہ رسالہ محامد و صفات سادات مین تالیف فرمایا۔

سادات حسینی کی شناخت کی نسبت ابوالحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کے ماننے مین دورِ حاضرہ کے فلسفی الطبع حضرات کو شاید تامل ہو یا اسکو اتفاقات و واردات ہنگامی پر محمول کرین مگر یہ ایک واقعہ ہے جسکو ایسے بڑے محقق اور نقاد مورخ نے بقائے عالم تک صفحہ ہستی پر ثبت رہنے کے لئے سپرد قلم کردیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک عورت نے شریفہ[۵۹۹] یا سیدانی ہونے کا دعوےٰ کیا۔ خلیفہ عہد متوکل علی اللہ بن معتصم نے امام زمن علی ہادی ابوالحسن نقی العسکری سے اسکی صحت و تصدیق (یا جانچ اور تشخیص) کی درخواست کی حضرت تشریف لائے اور سریر خلافت پر متوکل کے برابر بیٹھے۔ اور فرمایا کہ اس کو درندون کے سامنے ڈال دیا جائے اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ لَحْمَ اَوْلَادِ الْحُسَیْنِ عَلَی السِّبَاعِ اگر یہ واقعی سید زادی ہے تو اسکو جانورون سے گزند نہ پہونچے گا۔ یہ سُن کر عورت گھبرائی اور اپنے کذب کا اقرار کیا۔ حاشیہ نشینان بساطِ خلافت نے متوکل سے عرض کیا کہ حضرت ہی کے اس قول کا تجربہ تو کسی طرح کرلیا جائے اس مقصد سے چند درندے صحن قصر مین لاکر چھوڑ دئے گئے۔ اور امام ہمام حسن عسکری سے تشریف آوری کی خواہش کی گئی حضرت اندر آگئے تو دروازہ بند کردیا گیا۔ جانورون کے شور و غوغا سے کانون

قنوج کی جامع مسجد بھی ابراہیم کے عہد ہمایون کی باقیات صالحات سے ہے۔

۵۹۹ اٹھارہوین صدی مسیحی کا مشہور مصنف و مترجم رے مان فرانسیسی عرف حاجی مصطفےٰ در ترجمہ سیر المتاخرین جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۰۲ء حواشی شمارہ ۱۰۸ و ۲۲۰ میں لکھتا ہے کہ "سید" و "شریف" دو جداگانہ اصطلاحین ہین۔ عُرف عام مین سید کا اطلاق اُس شخص پر ہوتا ہے جس کا باپ سید یعنی حسنؑ یا حسینؑ کی نسل سے ہو، ماں خواہ کچھ ہی ہو۔ اسیطرح شریف وہ کہلاتا ہے جس کا باپ غیر سید، ہو مگر ماں سیدانی (سیدہ) ہو۔ کم از کم ہندوستان مین (آج سے ڈیڑھ صدی پیشتر)، ان کلمات کا یہی مفہوم تھا۔

پردے پھٹے جاتے تھے لیکن جس وقت امام عالی مقام نے صحن سے زینہ پر قدم رکھا تو سب کے سب آپ کے نزدیک آکر خاموش ہوگئے اور دُم ہلا ہلا کر گرد پھرنے لگے حضرت نے اپنی آستین سے اُن کو مسح فرمایا تو وہ بیٹھ گئے۔ آپ کچھ دیر تک متوکل کے پاس بیٹھ کر رخصت فرما ہوئے۔ اُترے تو اُن جانوروں کا حال اور طریق عمل اُسی طرح تھا حتیٰ کہ آپ قصر شاہی سے باہر تشریف لے گئے۔ خلیفہ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ اُس نے جائزہ عظیم پیش کیا۔ اہل دربار نے متوکل سے گزارش کیا کہ جیسا حضور کے ابن عم نے کیا ہے خود بھی تو آزمائش کریں۔ ایسی جسارت کون کرسکتا تھا؟ متوکل گھبرایا اور بولا کہ تم مجھے ہلاک کرا دینا چاہتے ہو۔ پھر حکم دیا کہ خبردار! یہ راز رہے، فاش نہ ہو۔

بعض حفاظ و رواۃ نے اس واقعہ کو سیدنا محمد جواد بن علی رضاؑ کے متعلق بتایا اور حضرت کے احوال کے ذیل میں نقل کیا ہے مگر صحیح و معتبر یہی ہے کہ یہ قصہ امام علی ابوالحسن عسکریؑ کا ہے جو آپ کے فرزند تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ متوکل کے معاصر امام محمد جوادؑ نہ تھے، بلکہ حضرت علی ہادیؑ تھے مؤلف کتاب خرائج الجرائح کا بیان ہے کہ جمیع سباع و وحوش ائمہ معصومین علیہم السلام کے رام و تابع احکام تھے۔

ساداتِ حُسینی

میر عبدالجلیل (بلکہ تمام ساداتِ حسینی) کے نسب کے متعلق چند ضروری باتیں قابل تحریر ہیں۔

جدِّ امجد یا ابوالآبا سیدنا حسین سبط علیہ السلام ہیں جو امیرالمومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے دوسرے فرزند تھے اور ائمہ اثنا عشر میں تیسرے (امام) آپ کی ولادت منتصف ماہ رمضان ۳ھ میں (۲۶ مارچ ۶۲۵ء کو) ہوئی یا بقول دیگر ۵ ماہ شعبان ۴ھ (۱۰ جنوری ۶۲۶ء) کو حضرت کے مناقب و فضائل نہ صرف ہر مسلمان جانتا ہے۔ بلکہ اکثر ممالک کے ادیان و ملل غیر کے باخبر لوگ بھی اُن سے آگاہ ہیں۔ دُنیائے اسلام میں سالِ اسلامی (ہجریہ) کے آغاز میں

کربلا کا دردناک واقعہ سنایا جاتا اور اس کے خونین منظر کا نقشہ عالم کو دکھایا جاتا ہے۔ امام حسینؑ ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ (۱۰ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء) کو بروز جمعہ چھپن ستاون سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت کے متعلق تفصیلات صحیح کتب مقاتل و شہادت میں موجود اور تقریباً ہر ایک پڑھے لکھے مسلمان کو معلوم ہیں۔ نقل و اعادہ کی حاجت نہیں۔

حسین بن علی علیہما السلام کے چھ لڑکے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان کے نام اہل سیر نے یہ بتائے ہیں۔

۱۔ علی بن حسین اکبر۔ ان کی ماں لیلیٰ بنت مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی تھیں۔ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ شہادت پائی۔

۲۔ علی بن حسین اوسط۔ جن کا لقب زین العابدین اور کنیت ابومحمد تھی۔ آپ شاہ زنان بنت کسریٰ نوشیروان کے بطن سے تھے۔

۳۔ علی بن حسین اصغر۔ میدان کربلا میں تیر لگا۔ شہید ہوئے۔

۴۔ جعفر بن حسین۔ آپکی ماں قضاعہ تھیں۔ اپنے والد ماجد کی حیات میں وفات پا گئے۔ نسل باقی نہیں رہی

۵۔ محمد بن حسین۔ نوعمری وفات حیات پدر میں پائی

۶۔ عبداللہ بن الحسین صغیر السن تھے باپ کے ہمراہ کربلا میں تھے کہ ایک تیر آکر لگا اور جام شہادت پلا یا گیا

۷۔ سکینہ۔ ان کی (اور عبداللہ دونوں کی) ماں رباب دختر امرء القیس بن عدی کلبیہ تھیں، مدینہ میں پنجشنبہ ۵ ربیع الاول سنہ ۱۱۷ھ کو وفات پائی۔ آمنہ و امینہ بھی نام تھے سکینہ ماں نے نام رکھا تھا۔

۸۔ فاطمہ۔ ان کی ماں ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبیداللہ تیمیہ تھیں

۹۔ زینب۔

جدّہ ماجدہ

حضرت شہربانو یزدجرد سوم بادشاہ اخیر ساسانیان کی دختر تھیں۔ ان کی مبارک

ذات مین تمام شاہانہ اوصاف اور شریفانہ خوبیان مجتمع تھین۔ خاندان نبوّت سے آپ کی قرابت، دونون مین سے کسی کی شان و مرتبہ سے فروتر نہ تھی۔ اسی بانوئے محترم کی بدولت سادات حسینی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ ایک ہی وقت مین اولاد رسولؐ بھی ہین اور خاندان ساسان کے احفاد (نواسے) بھی۔

قاضی القضاۃ احمد بن خلکان لکھتے ہین کہ حضرت امام زین العابدین ابن الخیرتین بھی کہلاتے تھے۔ اس لئے کہ حضرت رسول اکرم سیّد ولد آدم روحی فداہ کا قول گرامی تھا۔ اللہ تعالے من عبادہ خیرتان فخیرتہ من العرب قریش ومن العجم فارس۔

قاضی نور اللہ مجالس مین تحریر کرتے ہین۔

نظر بہمین نکتہ است کہ ایرانیان علی زین العابدین، فرزند ارجمند امام حسین را کہ از شہر بانو بود فخر العرب والعجم می گفتند، چہ نسبت او از طرف پدر بہ بزرگ ترین عرب کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) بود می رسید، و از طرف مادر بہ نجیب ترین سلاطین روئے زمین، یعنی بادشاہان عجم منتہی می گردید۔

یہ مسئلہ[۵] ہنوز غیر متفق علیہ ہے کہ آیا حضرت شہر بانو کی شادی ہوئی تھی یا نہین شیعون نے قیاس کو صدیون سے تسلیم کر رکھا ہے (کہ نکاح ہوا تھا) مصنفین متقدمین مین سے صرف امام یعقوبی اس کا حوالہ دیتے ہین جو نوین صدی مسیحی کے آخر مین ایک مشہور عربی مورخ گذرے ہین۔ وہ حضرت امام حسین کی شہادت کا تبصرہ نہایت الم انگیز الفاظ مین کرتے ہوئے اس تذکرہ کو یون ختم کرتے ہین حسینؑ کے لڑکون مین ایک تو علی اکبر تھے جو الطف[۶] مین شہید ہوئے اور کوئی اولاد

---

[۵] از تاریخ ادبیات ایران مصنفہ براؤن A Literary History of Persia, By Edward G. Brown (1909).

[۶] طف جانب و شاطی کو کہتے ہین اور اونچی زمین کو بھی۔ اور عرب کا وہ حصہ جو عراق کی مزروعہ اراضی کی سرحد پر واقع ہے۔ یہین کوفہ کے پاس ایک گاؤن کا نام بھی ہے۔ وہ جگہ جہان امام ہمام شہید ہوئے تھے طف اسلئے

نہین چھوڑی اِن کی ماں لیلےٰ بنت ابومُرہ بن عروہ بن مسعود الثقفی تھین۔ دوسرے علی اصغر جنکی والدہ حرار باسلافہ دختر یزدگرد تھین اور جن کو حسین غزالہ (ہرنی) کہا کرتے تھے۔

بعض مُصنّفین و سیرت نویسان نے شہر بانو کے علاوہ آپ کے دو لقب اور بھی لکھے ہین (۱) اَسُلافہ (۲) شاہ زنان یعنی ملکۃ النساء۔ اہل ایران آجکل عموماً شہر بانو کہتے ہین۔

جناب شہر بانو کی محبّت و عظمت نہ صرف اِن کے اہل وطن بلکہ تمام مسلمانون کے دل مین راسخ و جاگزین ہی۔ طہران کے جنوب مین تین چار میل پر ایک پہاڑ آپ کے نام سے منسوب یعنی (کوہ بی بی شہر بانو) سے موسوم ہی۔ اُس پر کوئی مرد قدم رکھ کر اُس کی بزرگی و پاکیزگی کو زائل نہین کرسکتا۔ وہی بی بیان اُنکی زیارت کرنے جاتی ہین جن کو اپنی حاجت روائی یا کاربرآری کیلئے بارگاہ خداوندی مین کسی کو شفیع لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہر بانو اُس درد خیز تعزیہ و مرثیہ کی جان (ہیروئین) ہین جو ایران کے شہرون قصبات اور بستیون مین سال بہ سال ادا کیا جاتا ہی۔ آنسو بہانے والے ماتمگُسارون اور تماشائیون کے انبوہ کثیر انکو گھیرے ہوتے ہین۔ ایک ڈراما (تعزیہ غائب شدن شہربانو) The passing of Shahrbánú کے نام سے ۱۳۱۴ھ ہجری مین طہران مین شائع ہوا تھا اسکے صفحات مین آپ یون گویا نظر آتی ہین[۵]

زنسل یزدجرد شہریارم ... زنوشروان بود اصل نزارم

دران وقتے کہ بختم کامران بود ... بدان شہرے امام اندر مکان بود

شبے رفتم بسوئے قصر بابم ... بیامد حضرت زہرا بخوابم

بگفت ای شہربانو با صد آئین ... ترا من بر حسین آرم بکابین

بگفتم من نشستہ در مداین ... حسین اندر مدینہ ہست ساکن

کہی جاتی ہی کہ وہ فرات کے متصل ایک طرف کو بہ دختکی ہے

۵۱۰۲ سنۂ آزاد شدہ ۵۱۰۳ وفات انگور

"محال است این سخن" ؛ فرمود زہرا — "حسن آید بہ سرداری درین جا
تو می گردی اسیر، اے بے قرینہ — برندت از مداین در مدینہ
بہ فرزندم حسین پیوند سازی — مرا از نسل خود خورسند سازی
ز نسلت نہ امام آید بہ دوران — کہ نبود مثل شان در دار دوران"

دُرّۃ التاج رسالت کا یہ ارشاد پورا ہوا اور جناب شہر بانو نو اماموں کی ماں ہوئیں۔

چوتھے امام سے لے کر بارھویں امام تک آپکے بطن مطہر سے ہیں۔ بہ تفصیل ذیل

(۱) سیدنا علی بن حسین ملقب بہ زین العابدین پنجشنبہ (یا جمعہ) ۱۵ شعبان ۳۸ھ (۷ جنوری ۶۵۹ء) کو بمقام مدینہ اپنے جد امجد علی بن ابی طالب کی حیات میں متولد ہوئے۔ ۱۲ محرم ۹۴ھ (۱۹ اکتوبر ۷۱۲ء) کو مسموم ہو کر بہ عمر ۵۷ سال وفات پائی۔ مدفن مدینہ منورہ، بقیع مبارک قبۂ عباس متصل قبر حسن بن علی عم خود۔ ولید بن عبد الملک نے زہر دلا دیا تھا۔

(۲) سیدنا محمد باقر بن زین العابدین۔ متولد ۳ صفر ۵۷ھ (۱۰ دسمبر ۶۷۶ء) مدینہ متوفی ۲۳ صفر ۱۱۴ھ (۲۵ اپریل ۷۳۲ء) بعمر ۵۸ سال مسموم بمقام حمیمہ نعش شریف مدینہ آئی اور جنۃ البقیع میں دفن ہوئی۔

۵۱۰ مداین، مدینہ کی جمع ہے۔ مدینہ عربی زبان میں شہر کو کہتے ہیں۔ لیکن یہاں مداین سے (Ctesiphon) یعنی ساسانیوں کا قدیم دار الملک (کلدانیہ Chaldaea کا) مراد ہے اسکی وجہ تسمیہ عرب جغرافیہ نویس یہ بتاتے ہیں کہ سات شہروں (مداین) کو ملا کر ان کی آبادی کو یکجا کر دیا گیا تھا اسکو ام البلاد و شیخ البلاد) رے Ray سے (جو طہران حال کے متصل قدیم Rhagae ہے) اور صطفان سے ممتاز رکھنا چاہئے۔

یہ مداین جو کسی وقت ارض بابل کا سب سے بڑا اور قدیم شہر تھا۔ اب ویران پڑا ہوا ہے اور شہر حلہ کے توابع دیرگنہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ویرانوں میں وہ کنواں بھی ہے جسمیں ہاروت و ماروت کا بند ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

وہ فلک پیما قصر جس میں شاہزادی نے یہ خواب دیکھا تھا "ایوان کسری" کہلاتا ہے۔ مورخ ابن اثیر جو نے کی عمارت کو بدیع المثال لکھتا اور اسکے ارتفاع و استحکام و استواری کی ستایش کرتا ہے لیکن اسکی غیر فانی شہرت دلقا اور بلا زوال عظمت کا راز نکتہ شناس و ادب آموز فلسفی کچھ اور بتاتا ہے سہ

(۳) سیدنا جعفر صادق بن محمد باقر۔ ولادت، مدینہ، ۸ رمضان سہ شنبہ قبل طلوع آفتاب ۸۰ھ (جو سال سیل الجحاف کہلاتا ہے) (۹ نومبر ۶۹۹ء) انتقال ۱۵ رجب ۱۴۸ھ (۷ ستمبر ۷۶۵ء) بعمر ۶۸ سال مسموم۔ مدفن بقیع (مذکور)

(۴) سیدنا موسیٰ کاظم بن جعفر صادق۔ ولادت سہ شنبہ قبل طلوع فجر بمقام ابوا بابین مکہ و مدینہ ۷ صفر ۱۲۸ھ (۷۴۵ء) وفات جمعہ ۲۵ رجب ۱۸۳ھ (۴ ستمبر ۷۹۹ء) بعمر ۵۵ سال مسموم۔ مدفن بغداد باب التبن، مقابر شونیزیہ۔ خارج قبہ

(۵) "جد المقبول" سیدنا علی الرضا ابن موسیٰ کاظم۔ تولد ۱۱ شوال ۱۵۱ھ (۲۶ اکتوبر ۷۶۸ء) مدینہ۔ وفات آخر صفر ۲۰۳ھ (۷ ستمبر ۸۱۸ء) یا ۹ صفر ۲۰۵ھ (۲۶ جولائی ۸۲۰ء) مسموم بعمر ۵۵ سال مدفن قریہ سناباد رستاق از اعمال طوس، خراسان، حال معروف بہ مشہد مقدس۔

(۶) سیدنا محمد جواد بن علی رضا تقی۔ ولادت ۱۹ رمضان ۱۹۵ھ (۷ جون ۸۱۱ء) مدینہ۔ وفات آخر ذی قعدہ ۲۲۰ھ (نومبر ۸۳۵ء) مدفن مقابر قریش متصل مرقد جد خود موسیٰ کاظم شہر بغداد مسموم بعمر ۲۵ سال چند ماہ۔

(۷) سیدنا علی الہادی بن محمد الجواد بن علی رضا ابو الحسن عسکری نقی۔ ولادت ۱۳ رجب ۲۱۴ھ (۷ ستمبر ۸۲۹ء) مدینہ وفات، دوشنبہ، ۲۵ جمادی الاولیٰ ۲۵۴ھ (۲۲ مئی ۸۶۸ء) بمقام سر من رائے معروف بہ عسکر مسکن خود مدفن مسموم بعمر ۴۰ سال۔

(۸) سیدنا حسن خالص بن علی الہادی بن محمد جواد۔ ولادت ۸ ربیع الثانی ۲۳۲ھ (۲ دسمبر ۸۴۶ء) مدینہ وفات سر من رائے۔ روز جمعہ ۸ ربیع الاولیٰ ۲۶۰ھ (۳ جنوری ۸۷۴ء) بقضائے الٰہی

جزائے حسن عمل بین کہ روزگار ہنوز ... خراب می نکند بارگاہ کسریٰ را

۵۱۰۵ یثرب قدیم، جب سے رسول پاک صلعم ہجرت فرما کر تشریف لے گئے تھے "مدینۃ النبی" کہلاتا ہے یا صرف "مدینہ"

۵۱۰۶ سیل جحاف۔ جس نے زمین کو کھود ڈالا اور جو کچھ پایا بہا لے گیا تھا۔

(۹) محمد بن الحسن الخالص بن علی الہادی ابوالقاسم مہدی۔ آخر ائمۂ اثنا عشر (حسب مذہب امامیہ) ولادت شب جمعہ نصف شعبان ۲۵۵ھ (۳۰ جولائی ۸۶۹ء)۔ محرم ۲۶۵ھ (۱۰ ستمبر ۸۷۸ء) کو بروز جمعہ یا ۲۶۶ھ مین (۳۰ اگست ۸۷۹ء) کو بعمر نو سال سرداب سر من رائے مین غائب ہو گئے۔ حسب روایت ابن الازرق صاحب تاریخ یافارقین آپ کی ولادت ۱۹ ربیع الاول ۲۵۸ھ (۴ فروری ۸۷۲ء) کو ہوئی تھی۔

[**اعلام**۔ ائمۂ مطہرین کی ولادت و وفات کی تاریخین عموماً مختلف فیہ ہین۔ اختلافات روایات و بیانات کو نقل کرنے کے بجائے مین نے اصح اور زیادہ معتبر تاریخون کو درج کر دیا ہے]

باز آمد۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہین کہ "چند سطر آگے چل کر وہ فقرہ آجاتا ہے جس سے ایرانیون کا تنفر حضرت عمر سے اور محبت حضرت علی سے خصوصیت کیساتھ پائی جاتی ہے۔ اور جس کا بیان نقل کر دینا بے محل اور غیر مناسب معلوم نہین ہوتا" حضرت شہربانو مدینہ منورہ مین ایک محافہ کے اندر لائی جاتی ہین جیساکہ ایک بادشاہزادی کی شایان شان تھا۔ شجاع ابن شجاع حضرت حسن انکو ساتھ لے کر آتے ہین۔ شاہزادی کی تکالیف کا دور یہین سے شروع ہو جاتا ہے" وہ فرماتی ہین ؎

ولے چون شد مدینہ منزل ما ۔۔۔ غم عالم فزون شد در دل ما
یکے گفتہ کہ این دختر کنیز است ۔۔۔ یکے گفتہ بہ شہر خود عزیز است
بمسجد مرد و زن در بام محضر ۔۔۔ مرا نزد عمر؎۱ بردند مادر
کلامے گفت کز او در خروشم ۔۔۔ بگفت این بیکسان را می فروشم؎۲
علی جدت چو بر آمد خروشان ۔۔۔ بگفتا لب ببند اے شاہ دوران
نشاید بردن ای میر و فادار ۔۔۔ بزرگان را سر عریان بہ بازار
پس از آن خواری اے نور دو عینم ۔۔۔ بہ بخشیدند بر بابت حسینم

اسی واقعہ کو امام ابوالقاسم زمخشری ربیع الابرار مین اور قاضی فقیر محمد فریدپوری جامع التواریخ مین اپنے اپنے الفاظ مین تحریر کرتے ہین کہ جب صحابہ پاک سبّی (دشمنیدے)، فارس کو عہد عمر بن الخطاب

؎۱ و ؎۲ اصل مین گستاخانہ الفاظ تھے۔ مین نے فرط ادب و احترام سے بدل دیئے ہین۔

مین آستانہ خلافت پر لے کر آئے تو ان مین یزدجرد بن شہریار بن خسرو کی تین بیٹیان بھی تھین۔ اور بندیان فروخت ہو چکین تو ان دختران یزدجرد کی نوبت آئی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کو بھی فروخت کردو حضرت علی مرتضیٰ نے ٹوکا ان بنات الملوک لایعاملن معاملۃ غیرھن من بنات السوقۃ حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر ان کا کیا کیا جائے فکیف الطریق الی العمل معھن فرمایا کہ ان کی قیمت مقرر کرا دیجئے۔ قیمت ٹھہر جائے تو جو کوئی ان کو پسند کرے لے لیوے۔" چنانچہ قیمت تشخیص ہو گئی تو خود حضرت علی نے تینون کو لے لیا۔ سب سے بڑی مہر بانو محمد بن ابی بکر صدیق کو مرحمت فرمائی (ان سے قاسم پیدا ہوے) مجھلی ماہ بانو عبداللہ بن عمر فاروق کو عنایت کی (ان سے سالم متولد ہوئے) اور چھوٹی شہر بانو حسین بن علی مرتضیٰ کو عطا کی (جن کے بطن سے امام زین العابدین تھے)۔ [یہ تینون حضرات بنو خالہ (خالہ زاد بھائی) ہین] چنانچہ ابن عمر بھی اس واقعہ کی تصدیق کرتے اور صحیح بتاتے ہین۔ کتاب الکامل مین مبرد نے اور کتاب المعارف مین ابن قتیبہ نے یہی روایت کی ہے۔

وسیلۃ السعادات سیدۃ السادات سلسلۂ کلام یون جاری فرماتی ہین ؎

حسین کردہ وصیت بزین زارہ — نہ ماندم درمیان آل اطہار
اگر ماندم اسیر خوارہ گردم — برہنہ سر بہر بازار گردم
تو چون ہستی امام و شہریارم — بدست تست مادر اختیارم
اگر گوئی روم در دست بہ جانم — صلاحم گر نمی دانی بسانم

مورخین اور علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ باوجود اتنی اولاد کے (جنکے نام جد امجد کے ذیل مین گذارش کر چکا ہون) آج روئے زمین پر حضرت حسین کا نام صرف سیدنا علی بن حسین اوسط ملقب بہ زین العابدین امام رابع سے زندہ اور انھین کے اعقاب سے باقی ہے

لوبکن علی وحیا لا نحر حسینی الا من نسلہ (زین العابدین)

مقبول ناچیز بھی حضرت زین العابدین سید الساجدین کی آل سے ہے اللھم غفراً ووفاً

علی الایمان والاسلام
حضرت زین العابدین کی کُنیت ابوالحسن و ابومحمد تھی۔ آپ کی شان میں فرزدق شاعر
کا (۴۰) شعر کا فصیح و بلیغ قصیدہ شہرۂ آفاق ہے جو اُس نے طواف بیت اللہ میں استلام (بوسہ ہی)
حجر اسود کے وقت ہشام بن عبد الملک کے طعن پر کہا تھا ؎

ھذا الذی تعرف البطحاء وطأته	والبیت یعرفه والحلُّ والحرمُ
ھذا ابن خیرِ عبادِ اللهِ کُلِّهم	ھذا التقی النقی الطّاھر العلم

آپ کی اولاد میں ذکور و اناث پندرہ نفوس تھے۔ گیارہ پسر
(۱) محمد کنیت ابی جعفر ملقب بہ باقر۔ فاطمہ ام عبداللہ بنت امام حسن کے بطن سے۔ اسلئے
ایک ہاشمی تھے دو ہاشمیین سے اور ایک عَلَوی دو علوئین سے۔

(۲) زید (شہید) } ان دونوں کی ماں اُم ولد تھین
(۳) عمر

۱۲۱ھ حضرت زید شہید کوفیوں کے وعدوں اور باتوں اور اُن کے دام فریب مین آگئے اور خلق اللہ
کو صلائے بیعت دی تھی۔ چالیس ہزار نے بیعت کی اور پھر پھر گئے، بیعت شکست کر دی۔ زید نے اس جماعت
سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا رفضتمونی اسی لئے بعض عوام گروہ شیعہ کو رافضی کہنے لگے۔ بالآخر اول
صفر ۱۲۲ھ (۶ جنوری ۷۴۰ء) کی شب مین آپ نے صرف پانچ سو رفقاء کے ساتھ خروج کیا۔ یوسف بن عمر
والی کوفہ نے مانعت کی۔ اثنائے محاربہ مین ایک تیر آپ کے آکر لگا اور درجہ شہادت پر پہونچا دیا
زید نے اپنے پدر عالی مقام امام زین العابدین سے دربارۂ خروج مشورہ کیا تھا آپ نے روکا اور فرمایا
مجھے اندیشہ ہے کہ کہین تم مقتول و مصلوب نہ ہو تم کو معلوم نہین کہ سُفیانی کے خروج سے پہلے ولد فاطمہ سے
جو کوئی خروج کرے گا قتل ہوگا،، فکان کما قال
حمیری نے کتاب الدلائل مین لکھا ہے کہ ایکبار زید بن حازم ہمراہ باقر علیہ السلام کے تھے۔ (وہ کہتے ہین کہ)
اتنے مین امام کے بھائی زید بن علی بھی وہان سے گذرے۔ امام نے زید بن حازم سے کہا کہ تم نے ان
کو دیکھا۔ یہ کوفے مین خروج کرین گے۔ لڑین گے۔ اور انکا سر گشت کرایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کر رہا
واضح رہے کہ خاندان طاہرہ نبوت مین زید نام کے کئی اور ممتاز حضرات گزرے ہین۔ ایک زید

(۴) عبد اللہ
(۵) حسن مثنی — ان سب کی ماں بھی ام ولد تھین
(۶) حسین

(۷) حسین اصغر
(۸) عبد الرحمن — ایضًا
(۹) سلیمان

(۱۰) علی۔ یہ ساری اولاد مین چھوٹے تھے — ان کی ماں ام ولد تھین

دختران
(۱۱) خدیجہ
(۱۲) فاطمہ
(۱۳) علیہ — ایضًا
(۱۴) ام کلثوم

(۱۵) گیارھوین فرزند کا نام محقق نہین ہے، اکثر مورخین خاموش ہین صاحب جامع التواریخ الاشرف لکھتے ہین۔

خاندان، نسب و اسلاف

میر عبد الجلیل نے اپنے نسب و اسلاف کے بیان مین ایک قصیدہ لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس مین اپنے شاعرانہ کمال اور علم و بلاغت کی داد دی ہے۔ اگرچہ اس کا نقل کرنا اطناب سے خالی

بن حسن جنکے باپ امام حسن تھے اور والدہ ام بشیر بنت ابی مسعود عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھین، حضرت زید متولی صدقات رسول اللہ صلعم تھے اور جن سے (اور جن کے بھائی حسن بن حسن رض سے) امام کی اولاد کا سلسلہ چلا انکا انتقال نوے سال کی عمر مین ۱۲۰ھ دستشنہ مین ہوا تھا۔ زیدی شیعہ جنکا اعتماد امامت مین نصوص پر ہے انھین کا اتباع کرتے اور بعد علی و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے امامت مین دعوت و جہاد کی رعایت کرتے ہین۔ دوسرے زید بن موسیٰ برادر عم زاد حضرت علی الرضا تھے جنھون نے مامون الرشید پر خروج کرنا چاہا تھا لیکن حضرت نے روکا اور سمجھا دیا تھا یہ بھی بڑے صاحب اولوالعزم تھے۔

نہ تھا لیکن مناسبت محل و سلسلۂ تحریر سے اس کا ترک بھی مذاق سلیم سے مستبعد نظر آیا۔ معہذا اطلاع اسمار و احوال آبا رو اجداد کے لئے یہ ایک روشن آئینہ ہے ؎

ما ئیم نخل سبز ریاض پیمبری ۔ احسان ماست بر ہمہ از سایہ گستری
نخلے کہ اصل ثابت او ختم انبیا است ۔ فرعش گذشت از سر این چرخ چنبری
آن ختم انبیا کہ بتول است دختر ش ۔ آرایش منصۂ پاکیزہ گوہری
آن دختر نبی کہ بود شوہر ش علی ۔ دریائے فیض ساقیٔ صہبا کوثری
فرزند اوست خاص آل عبا حسین ۔ فرسود در محیط شہادت شناوری
سجاد آنکہ آدم آل حسین بود ۔ ایزد نصیب دشمن او کرد ابتری
زید شہید مصحف اسرار اہلبیت ۔ پیدا است از مناقب او شان حیدری
عیسیٰ کہ شد بموتم اشبال مشتہر ۔ کردے شکار شیر ز روئے دلاوری
سید محمد آنکہ جہان را ز خلق او ۔ پیچید در دماغ نسیم معطری
سید علی کہ بر در عالم پناہ او ۔ کیوان ستادہ است بہ عنوان قنبری
سید حسین شمسۂ ایوان مکرمت ۔ روح الامین کند بر واقش کبوتری
سید علی عراقی کز فیض مقدمش ۔ خاک عراق یافتہ از عرش برتری
سید حسن کہ اختر اوج سیادت است ۔ کسب سعادت از نظرش کرد مشتری
سید علی کہ دشمن شوریدہ بخت را ۔ سازد کباب آتش خورشید محشری
شادابی بہار گلستان خلق زید ۔ می کرد در تحفظ دلہا صنوبری
سید عمر کہ سرور عالی مقام بود ۔ در بزم او ہمیشہ فلک گرم مجمری
زید سوم کہ خسرو اقلیم فقر بود ۔ کردے ز روئے آئینۂ دل سکندری
یحییٰ کہ در ریاض صفات کمال او ۔ یک شہر چشم حیرتیان کرد عبہری
سید حسین منتخب دودۂ شرف ۔ باشد چراغ انجمن افروز ہنری

داود آنکه دشمن فولاد جسم را | چون موم نرم ساخت ز دست بهادری
والا گهر ابوالفرج واسطی که شست | از آب ذوالفقار بسے نقش کافری
سید ابوالفراس که هنگام کارزار | آمد ز دست او همه کار غضنفری
ثانی ابوالفرج که بآئین جد خویش | روز نبرد شیر نیستان صفدری
سید حسین صاحب شمشیر خونچکان | با قلب دشمنان بکشش کرد خنجری
سید علی که صارم خارا شگاف او | چون ذوالفقار دم زده از فتح خیبری
جد کلان محمد صغرے که تیغ او | بر بلگرام یافته فتح مظفری
مفتوح گشت در زمن شاه التمش | تاریخ آن ز لفظ "خداداد" بشمری
در سال شش صد و چهل و پنج فوت کرد | آسوده بر بساط معلاے عبقری
شعبان و روز چاردهم ضحوه نشین | کرد از جهان بملک مقدس مسافری
باشد به بلگرام مزار مبارکش | بر مرقدش کنند ملائک مجاوری
سید عمر فروغ جبین محمدی | او راست بر سپهر شرف شان اختری
سید حسین از نظر التفات او | مینا زمردی کند و سنگ گوهری
سید نصیر آنکه بمصداق نام خود | با زمرهٔ ستم زدگان کرد یاوری
سید حسین کان سخا معدن صفا | از گوهر تن جمال شرف یافت زیوری
سالار از فروغ ضمیر منیر او | دریوزهٔ شعاع کند مهر خاوری
لطف الله آنکه قطب سپهر ولایت است | مردان راه را بخدا کرد رهبری
داود آنکه نام اوست خداداد از پدر | صاحب کرامتے ست ز تعریف ما دری
جد القبیله حضرت محمود دین پناه | کردند جن و انس به حکمش مسخری
عالیجناب سید نوح آنکه عرف او | باشد نیارهٔ سر گلستان سروری
سید حسین خلق مجسم که ذات او | خورشید شان مثل شده در ذره پروری

محمودِ در فضائلِ کسبی و موہبی | ہمتائے او نہ زادہ ز ارحامِ عنصری
عبدالطیف آنکہ ز ابنائے روزگار | ممتاز بود در عملِ فیض گستری
احمد کہ صاحبِ قلم و سیفِ قاطع است | بہرام و تیر بر درِ او کردہ چاکری
عبداللہ آن برادرِ عبدالطیف کو | احمد پسر گرفت ز لطفِ برادری
عبدالجلیل ازلیس احمدم کہ ہست | وصفے ز من فصاحتِ سحبان و انوری
آنجا کہ نغمہ زنے کلکم شود بلند | آرند سر فرو متنبی و بحتری
مقصودِ من تفنّنِ طبع است از سخن | ورنہ سزائے رتبۂ من نیست شاعری
دریائے موج خیز علومم کہ می کند | با من خطاب جوہرِ اوّل زمخشری
از دمِ العلم و عمل امتیاز داد | شانم بلند کرد دگر از تونگری
با وصفِ این فضائلِ صوری و معنوی | گویم بہ نفسِ خویش کہ از جملہ کمتری
در یک ہزار یکصد و یک کلکِ واسطی | افشاند این لآلیِ بحرِ سخنوری

سیّد محمد صغریٰ تمام ساداتِ حسینی واسطی بلگرام کے جدِ اعلیٰ تھے سلطان شمس الدین التمش کے

۵۱۱ واسط، عراق میں مابین بصرہ و کوفہ ایک شہر ہے۔ بروایت ابن خلکان اسکی بنا ۸۳ھ مطابق ۷۰۳ء میں حجّاج نے ڈالی تھی ۸۶ھ میں تعمیرات ختم ہوئیں لیکن کتاب شذور العقود جسمیں واقعات بترتیب سنین مندرج ہیں، میں مرقوم ہے کہ ۷۵ھ (۶۹۴-۹۵ء) میں آغاز اور ۷۸ھ (۶۹۷ء) میں تکملہ ہوا۔ شہر نہایت پر لطف و پُرفضا واقع ہوا ہے۔ دجلہ کے دونوں طرف آبادی ہے۔ آنے جانے کیلئے دریا پر پُل بنا ہوا ہے بہت سرسبز اور شاداب زمین ہے، غلہ اور پھل ہر قسم کے یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کا قلم دنیز واسطی مشہور ہے۔ میر عبدالجلیل اور اُن کے نواسوں کے کلام میں واسط اور قلمِ واسط کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ صاحبِ تاریخِ غیاثی لکھتا ہے کہ جب سید محمد بن سید فلاح جو ساداتِ مشعشع والیِ خوزستان سے تھا، ایک سال تک جامع کوفہ میں معتکف رہا تو اپنے مسقط الراس واسط کو یاد کرتا اور ان الفاظ میں حسرت و الم کا اظہار کرتا تھا ؎

اقلمتنا بارضِ العراقِ بواسطٍ | مدینۃِ اہلِ العلمِ والحلمِ والبرِّ

(واضح رہے کہ اقلیمِ خوزستان کو پہلے اہواز کہتے تھے آجکل محمرہ کہتے ہیں)

تعلق ملازمت سے غازیان اسلام کی فوج کے ساتھ بلگرام آئے۔ راجہ سری سے معرکہ آرا ہوکر اُس کو شکست دی قتل کیا۔ بلگرام کو فتح کرکے خود مع بعض خانہ انہائے شیوخ فرشوری وترکمانان کے یہین اقامت گزین ہوگئے۔ سلطان موصوف سے غنبر کا فرمان پایا۔ بلگرام مین اکتیس ۳۱ سال بسر کرکے ۱۴ شعبان المعظم ۶۴۵ھ کو رحلت فرمائی۔ اُس عہد سے لے کر سلطان ابراہیم بن سلطان لودی کے زمانہ تک پرگنہ بلگرام کا یہ محصول (دہ یکے) برابر قائم رہا بابر بادشاہ کے عہد مین اس کا سلسلہ شکست ہوا۔

سید محمد صغرٰے سے میر عبد الجلیل چودھوین پُشت مین تھے۔

۱۱۱۱ھ سلطان شمس الدین التمش، سلطان قطب الدین ایبک کا داماد و زر خرید تھا۔ شب خسوف مین پیدا ہوا تھا۔ اس لئے التمش نام رکھا گیا۔

ترکی زبان مین التمش فوج کے اگلے حصہ کو بھی کہتے ہین یعنی وہ جماعت جو سردار اور ہراول (سب سے آگے کی فوج) کے مابین ہو۔ یہ لفظ چھ کے عدد کے معنی مین بھی آتا ہے۔ اُس کو بھی کہتے ہین جو شب خسوف مین متولد ہو۔ شمس الدین ۶۰۷ھ (۱۲۱۱ء) مین سلطان آرام شاہ کو جو اپنے باپ قطب الدین کی جگہ تخت دہلی پر بیٹھا تھا گرفتار کرکے خود سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ پھر ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) مین تاج الدین یلدوز بادشاہ غزنی کو جو تسخیر کے ارادہ سے لاہور آیا تھا گرفتار کرکے قتل کرادیا۔ غیاث الدین حاکم بنگالہ پر فوج کشی کی، وہ بھاگا اور ملک التمش کے تصرف مین آگیا۔ ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) مین گوالیار کا عزم کیا۔ دیو مل والی قلعہ نے عاجز آکر شب مین راہ گریز اختیار کی۔ یہ قلعہ بھی ۶۳۰ھ (۱۲۳۳ء) مین فتح ہوگیا اور ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) مین اجین بھی۔ ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ (۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوا۔ اس کے عہد مین بھی بہت سے فضلائے نامور گذرے ہین۔ بادشاہ کے وزیر نظام الملک محمد بن ابو سعید کے نام پر مولانا نور الدین محمد نے کتاب جامع الحکایات لکھی تھی۔

۱۱۱۲ھ سلطان ابراہیم حسین لودی، اپنے باپ سکندر شاہ کی وفات پر آخر ۹۱۵ھ (۱۵۱۰ء) مین دار السلطنت آگرہ مین تخت پر بیٹھا۔ ہندوستان کے اکثر ممالک و قطعات اُسکے زیر نگین تھے۔ بابر کے سیل فتوحات نے جب ماوراء النہر، بخارا، کابل، لاہور و دیپالپور سے بڑھکر ۹۳۲ھ مین دہلی کا رُخ کیا تو پنجشنبہ سلخ جمادی الثانی (مطابق ۱۳ اپریل ۱۵۲۶ء) کو ابراہیم لودی اور بابر سے پانی پت کے میدان مین محاربہ عظیم شروع ہوا جمعہ ۷ ماہ رجب سال مذکور (۲۰ اپریل ۱۹۲۶ء) کو سلطان ابراہیم لودی مع اپنے مقربان اور سرداران کے مارا گیا۔ ہندوستان دودمان سلاطین افاغنہ سے نکل کر آل تیمور کے تابع فرمان ہوگیا۔ ابراہیم کے قتل کی تاریخین "ابراہیم لودی شہید شُد"

میر کے والدین

ابراہیم بن ہشام ناقل ہین کہ جب امام یازدہم حسن خالص بن علی ہادی بن محمد جواد رضی اللہ عنہم اپنے رفیق محبس عیسیٰ بن فتح کے پاس آئے تو اُس وقت عیسیٰ کی عمر ۶۵ سال سے زائد تھی پوچھا کوئی فرزند بھی ہے؟ عرض کیا "نہین"۔ فرمایا "اللّٰہم ارزقہ ولدا یکون لہ عضداً فنعم العضد الولد۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

من کان ذا عضد یدرک ظلامتہ ۔۔۔ ان الذلیل الذی لیست لہ عضد

اولاد کی نعمت اور پھر ایسی اہل وصالح فخر خاندان کی، جیسا کہ میر عبد الجلیل تھے اُس خوش نصیب باپ کے لئے مقدر تھی جس کا نام سیّد احمد تھا۔ اِن کا خاندان "بھتہ" کہلاتا تھا جو سادات ان کے جدّ اعلےٰ سیّد محمود کلان کے اعقاب مین ہین اب بھی بھتہ مشہور ہین۔ وجہ تسمیہ ایک واقعہ ہے۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہین کہ سیّد محمود کلان بن سیّد خداداد کو تسخیر جن مین ملکہ کامل حاصل تھا۔ ایک روز حاکم شہر نے اپنے آدمیون کو سیّد موصوف کے باغ سے آم لانے کو بھیجا محافظین نے روکا مگر وہ لوگ کب ماننے والے تھے زبردستی آم توڑنے شروع کئے۔ باداش عمل مین خدائے عالم وعالمیان کی قدرت بالغہ سے آسمان سے پتھر برسنے لگے۔ ان سرکش سرہنگون کے چوٹ آئی، زخمی ہوئے اور جان بچا کر بھاگے۔ حاکم سے اطلاع کی۔ یہ باغ اب بھی موجود ہے اور "بھتون کے باغ" کے نام سے مشہور ہے۔ اُسی زمانہ سے سیّد محمود ممدوح کا خاندان اور اُن کے اخلاف "بھتہ" کہلاتے ہین لیکن صاحب حدیقۃ الاقالیم قصبہ سیدن اور وہانکی سادات کے تذکرہ مین بھتہ کہلانیکی وجہ کچھ اور لکھتے ہین۔

میر سیّد احمد بڑے بیٹے سیّد عبد اللہ بن سیّد محمود اصغر کے تھے۔ در اصل میر سیّد احمد کے والد سیّد

وغیرہ نکالی گئی تھین مگر ذیل کی تاریخ جو کسی شخص قوم بقال نے کہی تھی، فی الواقع خوب ہے۔

نو سے اوپر تھا بتّیسا ۔۔۔ پانی پت مین بھارتھ دلیا
آٹھوان رجب بار شکروارا ۔۔۔ بابر جیت، براہم ہارا

عبداللطیف (برادر اعیانی سید عبداللہ کے تھے۔ سید عبداللہ کے کوئی اولاد نہ تھی اسلئے میر سید احمد کو فرزند بنالیا تھا۔ میر احمد کا نقش نگین احمد بن عبداللہ تھا۔ اسی نسبت کے ساتھ بن سے مشہور شہرت پائی۔ صاحب فضائل و حسن شمائل تھے۔ اپنی وجاہت ذاتی اور خوبی خصائل سے اقران واماثل مین ممتاز رہے۔ سید احمد عرف عام مین "مدا" اور ان کے چھوٹے بھائی سید معین الدین[۱۱۳] "مونان" کہلاتے تھے۔ دونون بھائیون نے تمام عمر ثروت وجمعیت سے گزاری۔ شہر والون مین مثل پڑگئی تھی" مداموناں سداسوناں"۔ سید احمد خط نستعلیق و شکستہ نہایت خوب لکھتے تھے اور فن سیاق (حساب) مین بھی دستگاہ قوی رکھتے تھے۔ کچھ معمول سا کر رکھا تھا کہ ہر روز بلاناغہ نماز صبح کے بعد دو ورق لکھ ڈالتے تھے۔ اس التزام سے بہت سی کتابین ان کے قلم سے نکل چکی اور مکمل ہوگئی تھین۔ بڑے مخیر اور نہایت شجیع و دلیر تھے۔ نواب مکرم خان بن نواب شیخ میر عالمگیری کی طرف سے پہلے موضع بہاسو[۱۱۴] پھر موضع داسنہ[۱۱۵] وغیرہ (توابع دہلی) کی حکومت پر مامور

۱۱۳ھ میر سید معین الدین بلگرامی، صوبہ ملتان مین جج تھے۔ شعبان ۱۱۰۳ھ (مئی ۱۶۹۲ء) مین وہین قضا کی حریم روضۂ شیخ موسیٰ جیلانی مین دفن ہوئے۔ جب میر احمد، نواب مکرم خان کی طرف سے بعض محالات تابع دہلی کے منتظم تھے تو میران کے پاس انھین مواضع کے امین تھے۔ دونون کا تدین ان کے حکام پر روشن تھا جب نواب مکرم خان ملتان کے صوبہ دار ہوئے تو ان کو وہان بلالیا تھا۔ میر عبدالجلیل ان کو "عقل مجسم" کہتے تھے۔

۱۱۴ھ بہاسو۔ یہ قصبہ تحصیل خورجہ، ضلع بلندشہر مین، بلندشہر خاص سے پچیس میل جنوب کو ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء مین چار ہزار آٹھ سو چھہتر (۴۸۷۶) تھی۔ پرتاپ سنگھ سب سے پہلا بڑگوجر، رئیس اپنا وطن چھوڑ کر یہان آیا اور اقامت گزین ہوا۔ اکبر کے عہد مین بہاسو ایک محال کا صدر مقام (یا خاص قصبہ) لکھا گیا ہے۔ اٹھارہوین صدی عیسوی کے ختم پر شاہ عالم ثانی نے بہاسو معہ چون (۵۴) دیگر مواضع کے جاگیر کے طور پر سمرو کی بیگم کو اس کی افواج کی پرورش و پرداخت کی غرض سے عطا فرمایا تھا۔ بیگم کی وفات (جو ۱۸۳۶ء مین ہوئی) کے بعد کچھ روز بقبضہ سرکار رہا۔ پھر ۱۸۵۱ء مین مراد علی خان کو جو پرتاب سنگھ کی اولاد سے تھا دیدیا گیا چنانچہ اب تک اُسکے اعقاب و اخلاف کے قبض و ملک مین چلا آتا ہے۔

۱۱۵ھ داسنہ (پرگنہ داسنہ) تحصیل غازی آباد ضلع میرٹھ مین اس شاہراہ پر واقع ہے جو میرٹھ اور ہاپوڑ سے بلندشہر و گلاوٹھی جاتی ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء مین تین ہزار نو سو بائیس (۳۹۲۲) تھی۔ اس کی رونق رو بہ زوال ہے قصبہ ویران و شکستہ حال نظر آتا ہے۔

رہے جو شہر مراد آباد (روہیل کھنڈ) مین ۴ رجمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ (۳۰ مارچ ۱۶۸۵ء) کو رحلت فرمائی۔ وہین آپ کا جسد مبارک امانتاً سپرد خاک کیا گیا چھ ماہ بعد اِن کے بھائی سید معین الدین حسب وصیّت مرحوم نعش کو وطن لے آئے اور بلگرام مین دفن کیا۔ سید غلام علی آزاد نے تاریخ وفات

اس موضع کی بُنیاد محمود غزنوی کے عہد مین راجہ سکر سین (ایک راجپوت) نے ڈالی تھی رفتہ رفتہ ترقی کر کے اچھا خاصہ قصبہ ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی عظیم لشکر کشی سے اس پر بھی آفت آئی اور اسکا قلعہ ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) مین تباہ و برباد کر ڈالا گیا۔

عہد پاستان کی یادگار شیخ آلہ دیا مخدوم شاہ ولایت کا مزار باقی ہے جسکی زیارت و آستان بوسی کیلئے کبھی دہلی سے شاہزادے اور اُمرا آیا کرتے تھے۔ اب بھی ۱۰ محرم کو یہان میلہ لگتا ہے اور شرکت عرس کا شرف دُور و نزدیک سے لوگ آکر حاصل کرتے ہین۔

داسنہ بھی منجملہ اُن قصبات و مقامات ضلع میرٹھ کے ہے جسمین عیسائیون کی جماعت نے ترقی کی ہے اور اُن کا مشن کامیابی حاصل کر رہا ہے۔

۱۱۶ یہ شہر اس وقت بنا آباد ہوا تھا ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) کے قریب رُستم خان شاہجہانی گورنر کٹھیر (جو روہیل کھنڈ کا پُرانا نام تھا) نے مراد آباد کی بُنیاد بادشاہزادۂ با دولت و اقبال مُراد بخش کے نام سے ڈالی تھی یہ وہی بد نصیب و نامراد مُراد بخش تھا جس نے کچھ زمانہ بعد عہد اورنگ زیب مین جان دی، اسیوقت سے مُراد آباد سنبھل کے بجائے صوبہ دار کا جائے قیام ہو گیا تھا۔

مراد آباد اور اسکے اطراف مین کٹھیر کی ساری سرزمین تاریخی یادگارون سے مملو و معمور ہے سنبھل جو اب اسی ضلع (مراد آباد) مین ایک بڑا قصبہ اور ایک تحصیل کا صدر رہگیا ہے۔ سب سے قدیم اور مشہور مقام ہے جسکے ساتھ مراد آباد کی تاریخ وابستہ ہے۔ اسی لئے اسکا تذکرہ لازم آیا۔ دہلی کے اخیر ہندو فرمانروا پرتھوی راج نے پہلے نو دفعہ یا دو دفعہ سید سالار اور جے چند والی قنوج سے یہان معرکہ آرائیان کی تعین۔ اِن کے علاوہ ابتدائے عہد اسلام کے اور واقعات بھی صفحات تاریخ پر مرقوم ہین۔ سنبھل ہی پہلے گورنرون کا دارالصدر رہتا، جسکے فرائض زیادہ تر سرکش کٹھیریون کی بغاوت فرو کرنے تک محدود و منحصر تھے۔ ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) مین غیاث الدین بلبن نے امروہہ پر حملہ کیا اور قتل عام کا حکم دیا۔ ۷۶۶ھ (۱۳۶۵ء) مین فیروز تغلق نے کٹھیر پر یورش کی اور وہان کے رئیس رائے کھڑگا کو جس نے ایک مُسلمان صوبہ دار کو قتل کرا دیا تھا سزا دینا چاہا۔ رائے کھڑگا بھاگ کر کمایون چلا گیا۔ سلطان نے کل ملک کو تاخت و تاراج کیا اور ملک خطاب کو وہان کا صوبہ دار بنا کر چلا آیا۔ جونپور کے نامور بادشاہ ابراہیم نے ۸۱۳ھ (۱۴۱۰ء) مین اسکو فتح کر لیا مگر وہ بھی اپنا نائب چھوڑ کر خود واپس چلا گیا جس کو ایک سال بعد محمود تغلق سلطان دہلی نے نکلوا دیا اور اپنے عامل وہان مامور کئے۔ ۸۳۵ھ (۱۴۳۱ء)

وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ (اور اُن کی اُس مین دُعائے خیر سلام ہوگی - جز۱۱ - سورۂ یونس ع ۱-۶) ۹۶۱ھ نکالی - اِن کی استعداد و کمال اور حسن کلام و زور بیان کے اظہار کیلئے دو مکتوب نقل کئے جاتے ہین پہلا انھین کے نام ہے جو اِن کے ہم عمر اور مخلص اور رابطہ والہ

مین زیر سرکردگی سلطان حسین ملوک جونپور کا پھر کچھ زمانہ کے لئے سنبھل مین تسلط ہوگیا۔ مگر ۹۰۳ھ (۱۴۹۸ء) مین سکندر لودی بادشاہ نے اِس ضلع کو پھر تخت گاہ دہلی کے تابع کرلیا اور چار سال تک سنبھل مین قیام گزین رہا - اُس زمانہ سے برابر یہ قطعۂ ملک مستقل طور پر دربار شہنشاہی کے عمل و جاگیر مین رہا

اسی مبارک دَور مین حضرت شیخ بیجو سنبھلی گذرے ہین جن کا اعاظم مشائخ ہندوستان مین شمار ہوتا ہے شیخ عبدالقادر بدایونی کے پدر بزرگوار جن کا نام نامی ملوک شاہ تھا انھین بزرگ کے مرید تھے - شیخ بیجو نے ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) مین رحلت فرمائی - میان حاتم سنبھلی بھی یہان کے مشہور اکابر مین گذرے ہین جو عہد اکبری مین مسلّم الثبوت فاضل تھے اور فقہ مین امام اعظم ثانی کہلاتے تھے -

سولھوین صدی کے وسط مین احیا مرن گورنر سنبھل نے سلطان محمد عادل کے خلاف سرکشی کی اور بادشاہی فوج کو شکست دی - سال العبد مین راجہ متر سین کٹھیر نے سنبھل پر قبضہ کرلیا اور احیا مرن نے اُس پر حملہ کیا کندرکھی مین ہولناک جنگ ہوئی - راجہ نے شکست فاحش پائی - ہمایون کے عہد مین علی قلی خان سنبھل کا گورنر تھا جس نے کٹھیریون کو جو اب تک اپنے کو با اختیار اور آزاد سمجھتے تھے دبایا اور اُن کی سرکشی و بغاوت کا استیصال کیا ۹۶۳ھ (۱۵۶۶ء) مین چند مرزایان نے جو تیمور کی نسل سے تھے بغاوت کی اور اکبر کے عاملون کو گرفتار کر کے قلعہ سنبھل مین مقید کردیا - حسین خان نے اُن پر فوج کشی کی اور یہ لوگ بھاگ کر امروہہ چلے گئے اُسنے تعاقب کیا اور دَم نہ لینے دیا - بالآخر راہ گریز تنگ ہوئی اور یہ لوگ گنگا کے اُس پار چلے گئے - شاہ جہان کی وفات اور مرکزی حکومت کے زوال کے بعد کٹھیریون نے بغاوت کی - کچھ مدت تک خود مختار رہے - مسلمان گورنر اپنا دارالصدر اُٹھا کر قنوج لے گیا - علی محمد خان روہیلہ سردار کی ترقی و عروج کو دیکھ کر گورنر مراد آباد نے اُسکے مغلوب کرنے کی کوشش کی مگر اُس مرد و مرد کے مقابلہ مین ناکام رہا - ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) کے قریب پورا ضلع علی محمد کے قبضہ مین تھا جس نے اپنی ریاست روہیلکھنڈ کے نام سے جداگانہ قائم کرلی - روہیلون کا عمل دخل ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۴ء) تک رہا یعنی جبکہ روہیلکھنڈ اودھ کے تابع ہوگیا - پھر یہ ضلع دیگر اضلاع و انقطاع کے ساتھ بذریعہ جوالگی ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) مین انگریزون کے قبضہ مین آیا - پہلے ۱۸۰۳ء و چار مین اس پر مرہٹون کے حملے ہوئے اسکے بعد ہی ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) مین مشہور لوٹیرا امیر خان باشندہ سنبھل اپنے پنڈاری سوارون کی جمعیت کے ساتھ سارے ضلع کو غارت کرتا ہوا چلا گیا -

مراد آباد کے حوالی و مضافات مین بہت سے پُرانے کھیڑے اور ٹیلے باقی ہین خاص کر تحصیل بلاری مین

روحانی، حافظ سید ضیاء اللہ نے لکھا تھا اور دوسرا اُس کا جواب (میر احمد کے قلم سے)، سید ضیاء اللہ کو میر احمد سے جو محبت و عقیدت حاصل تھی اُسکی یادگار، ایک منظوم رقعہ باقی ہے جو سید ضیاء اللہ نے عید قربان کے موقع پر جب ایک دوسرے سے دُور، اور دردِ محبت سے بے چین تھے بھیجا تھا۔

میر احمد کی شادی سید اسد اللہ عرف سید جا نہ بھتہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو نسب مین آپ کی ایک جدّی تھین اور شرافت و سیادت و مکارم اخلاق مین برابر کی شریک، میر عبد الجلیل نجیب الطرفین تھے اور عالی نسب، اور ہر اعتبار سے دُرِّ یتیم اور اپنے والدین کے تنہا عقب تھے۔

نسب کانّ علیہ من شمس الضحے ۔۔۔ نوراً ومن فلق الصباح عمودا

مافیہ الا السّید من سیّدہ ۔۔۔ حاز المکارم والتقی والجودا

جن کو ابتک کھودا اور تفحص و تفتیش نہین کیا گیا ہے۔ امروہہ و سنبھل مین کئی خوشنما اور شاندار مساجد و مزارات ہین۔ امروہہ مین ہندوؤن کے عہد کی بھی یادگارین موجود ہین۔

مُرادآباد ایک بارونق و ترقی پذیر شہر، اچھا خاصا تجارت گاہ اور کئی ریلوین کا مرکز و مجمع ہے۔ خاص شہر صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی بڑی شہرت رکھتا ہے۔ یہان برنجی برتن نہایت خوشنما اور سبک اور نفیس رنگین و سادہ اور منقش ہر وضع و نمونہ کے بنتے ہین جن کی قدر و طلب یورپ اور دیگر ممالک دور دست مین بھی ہوتی ہے۔ امروہہ کے مٹی کے ظروف نہایت اچھے اور نظر فریب و کارآمد ہر قسم کے ہوتے ہین۔ اب شیشے کے ظروف و اشیا بنانے کی صنعت بھی مرادآباد اور اُسکے حوالی مین ترقی کر رہی ہے۔

مراد آباد خاص کی مردم شماری ۱۹۲۱ء مین بیاسی ہزار چھ سو اکہتر (۸۲۶۷۱) تھی اور سنبھل کی اکتالیس ہزار پانسو پچاسی (۴۱۵۸۵)۔ مرادآباد، رام گنگا کے داہنے کنارے بلندی پر آباد ہے۔ جامع مسجد ایک قابل دید عظیم الشان عمارت ہے جو ساحل دریا پر بلند و رفیع دُور سے نظر آتی ہے۔ اِس کو رستم خان نے ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) مین تعمیر کیا تھا۔ اسی کے قریب قلعہ کا ویرانہ ہے۔ جسے اسی گورنر نے بنایا تھا۔

ک ۱۱ بڑے ذی علم اور پابند سُنّت بزرگ تھے ۱۳۴۰ھ (۲۲-۱۹۲۱ء) مین رحلت فرمائی۔ جناب سید احمد بن سید محمد، صاحب سجادہ کالپی سے غائبانہ عقیدت ہوگئی تو وفور عشق مین فرمایا کرتے تھے۔

کالپی مکہ، بلگرام یمن ۔۔۔ اے تو احمد! منم اُویس قرن

جب ملازمت اقدس نصیب ہوئی تو تصوّف کی کتابین پڑھین اور بلگرام مین ارشاد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا

۱؎ نامۂ سید ضیاء اللہ بہ سیر احمد۔

"درخرمن کائنات کردیم نگاہ   یک دانہ محبت ست وباقی ہمہ کاہ

سبحان اللہ چہ ہے آن یک دانہ، ودر جنب قیمت آن، گوہر یکدانہ کم از دانۂ خشخاش است ابوت و نبوت پناہ آدم صفی اللہ علیہ السلام در طلب این دانہ از فقدان نعمت بہشت نیندیشید وہر تعبے و شدتے کہ فراپیش آمد، بہ اختیار برکشید یعقوب علیہ السلام از شوق این دانہ بجدے دانہائے اشک ریخت کہ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ مفسر آن شد۔ صدر نشین محفل رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بعد از آنکہ استغنا بآن دانہ ہم رسانید چندان غنا حاصل کرد کہ ہر چند کوہہائے مکہ را طلا ساختہ بحضرت حضور پیدا آورد بگوشۂ چشم نہ نگریست وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ مبین این ہمت ست۔ بالجملہ ہیچ متنفسے درین عالم نیست و نبودہ و نخواہد بود کہ اثرے ازین خیال در سر نداشتہ باشد۔ مجنون بیچارہ سرگشتۂ ہمین طلب از جہان رفت۔ فرہاد مسکین نیز درین ذوق جان داد۔ زلیخا بہ قوت ہمین دانہ پسر را از کنار پدر جدا ساخت۔ وائے بر دانائے کہ از طلب این دانہ نادانانہ گذشت۔ آمدیم بر سر مدعا۔ بندہ ہر چند با مذاق طیبۂ محبان و حوصلہ ایشان آشنائی ندارد لیکن بہر حال یک گونہ لذت سماع پیدا کرد کہ باستناد آن می زیبد و ازینجاست کہ خود را خاک پائے اہل محبت می شناسد۔ اما ہیچ معلوم نشد کہ آن عزیزہ دانہ خود را کہ

ایک بار سید سیر بلگرامی کو اُن کی ماں کی سفارش میں ایک طولانی خط لکھا تھا۔ چند شعر ضیافتنا نقل کیے جاتے ہیں ؎

اے ضیافت شمردہ برخود فرض   مادرت مشت جو نیابد قرض
می خوری روز و شب بہ لیکن خشم   نوشد آب خنک، ولے از چشم
می ندانی کہ چیست خنجر و تیر   کارگر تر ز آہ مادر پیر!
مادرت را بہر قرصۂ نان   عمرو زید مرترا مہمان
دعوت اغنیا کہ محض ریاست   بارش ابر بر سر دریاست

۱۱۸؎ اور مارے غم کے اُن کی دونوں آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ جزء ۱۳۔ سورۂ یوسف ع ۱۰۔۱۳

مقسوم ازل ست مگر پیش طائرے اند اختند که چیده پرواز کرد یا براتب توسن سفر آمیختند که به گلو فروکشید کیفیت بے توجهی را فهمی که واقعی است پیدا بر نگارند که رافع خدشات باطن گردد به تقدیرے که مُخلص را از غایت حقوق دوستانه مقصر دانسته عوض نموده باشند که جائے آن دارد۔ اما چون عوض بدی به بدی در مذهب دوستی نامحمود است بلیستے که نظر بر تقاعد و تکاسل این طرف نینداخته باداے احسان از خود می شدند و به انبائے احوال بهجت اشتمال مرهون منت می ساختند مگر عهود جمی و حقوق صبا از یاد رفت ؎

ای عجب! آن عهد و آن سوگند کو وعدہاے آن لبے چون قند کو؟

گر فراق بنده از بد بندگی است چون تو با بد بد کنی، پس فرق چیست؟"

۲۔ جواب میر احمد به سید ضیاء الله

"نامۂ عنبرین شمامہ مشام یگانگی را عطر آمود بساخت. و خاطر پراگنده را به جمعیت فراهم آورد ملاز ماگرانباری کوهہاے محبت به حکمی اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[۱۲۰] معلوم است که هیاکل افلاک با چنان رفعت و سائر مکونات با آن همه عظمت در تحمل این بار چه پیچ و تاب خوردند و پشت خم گشته سر انکار باز زدند۔ و سرور انبیا صلی الله علیه وسلم بجبه آسانی برگرفت و اولیائے اُمت قدس الله اسرارهم به طفیل متابعت آن را از دانه خشخاش هم کمتر انگاشتند و بدوش نیاز برگرفته نعرهٔ هل من مزید زدند۔ لکن ما حیوان صفتان از آن دانه همین پنداشتیم که ثمره اش سهو و نسیان و برگش غفلت و عطلت است۔ الحمد لله و المنه که فریاد انا ظلمنا عذر خواه است و اشک ندامت شوئندهٔ داغ گناه ؎

بغیر از عذر تقصیر اندرین راه ندارد چارهٔ بیچاره درویش

بارے با استمداد همت عزیزان و برکت انفاس ایشان امید هست که پردهٔ غفلت و نسیان

---

۱۱۹ اور تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کیا جزء ۳۰ ۔ سورۃ الانشراح ۔ ع ۱-۱۹

۱۲۰ ہم نے ذمہ داری کو آسمانون اور زمین پر پیش کیا جزء ۲۳ سورۃ الاحزاب ع ۹-۶

از پیش این خیر اندیش بر انداختہ شود و ذرہ از عالم محبت نصیب گردد ؎

کوتاہ کنم سخن ازین بس ۔۔۔ وصل است جواب نامہ و بس "

۳۔ ذیل کا وہ منظوم رقعہ ہے جو میر سید احمد کے نام سید ضیاء اللہ نے کسی عید کے موقع پر بھیجا تھا۔

اوّل بہ کرشمہ اش سلامے ۔۔۔ وز دیدہ بہ غمزہ اش پیامے
از نالہ لجشوہ اش دعائے ۔۔۔ وز ہجر بہ وصل او ثنائے
از اشک بہ پائے او سجودے ۔۔۔ واز آہ بگوش او درودے
از گریہ بہ خندہ اش نیازے ۔۔۔ واز غم بہ نشاط او گدازے
از دست دعا بدامن او ۔۔۔ وز روح نثار بر تن او
شوقے ز نیاز من بنازش ۔۔۔ آہے ز خروش من بسازش
چون خط شریف دلبر آمد ۔۔۔ از نخل امید من بر آمد
لطفے کہ بنامہ اش نہان بود ۔۔۔ بر کشتۂ تیغ ہجر، جان بود
ہجرے کہ بود مراد دلبر ۔۔۔ از وصل ہزار بار خوشتر
چون جان برضائے دوست بستست ۔۔۔ از ہر چہ رضائے اوست ہست است
ہمت بمراد او کنم صرف ۔۔۔ شد ختم سخن نہ گر این حرف

شوقِ تحصیل

میر عبدالجلیل ایک رقعہ میں اپنے فرزند میر سید محمد کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں "برخوردارا! بحضور پدر مرحوم ہمین قدر کہ حالا شما خط و سواد دارید سید شمیم این ہمہ کہ می بینید بسعی خود و شوق مطالعۂ کتاب بہم رسانده ایم۔ مطالعۂ کتاب بسیار نافع است۔ ہر گز کتاب از خود جدا نباید کرد ان شاء اللہ استعداد تام بہم خواہد رسید"

میر عبدالجلیل کے باپ نے جس وقت انتقال کیا ہے تو میر کی عمر پچیس سال کے قریب تھی

اُن کو اعتراف اور بجا اعتراف ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے پایا۔ وہ محض اپنی قوت بازو اور سعی و شوق اور کتب بینی سے حاصل کیا تھا۔ شاید اس خاندان کی یہ خصوصیت تھی اور بزرگوں کا فیض، کہ عمر و رشد پڑھنے اور سمجھ آنے پر خود بخود علم و ہنر حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہو جاتا تھا میر صاحب بھی باایں ہمہ فضل و کمال اور فراخ دستی و علو حوصلہ کے اپنے دُرِّ یتیم (اکلوتے بیٹے) کے لئے خود کچھ نہ کر سکے تھے محض ترغیب و تشویق سے کام لیتے رہے کیونکہ وطن سے دُور اور آل و عیال سے مہجور تھے۔ میر سیّد محمد کی بدخطی یا کم سوادی جس کا یہ مہربان تذکرہ فرماتے ہین، حداثت سن کی نہین ہے۔ بلکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ میر سیّد محمد سوانح نگاری جگر پر مامور ہو چکے ہین اور پدر عالی قدر کی طلب و تاکید پر اسناد سرکاری اور جائزۂ خدمت لینے دارالسّلطنت کو جا رہے ہین۔

تحصیلِ علم

میر عبدالجلیل کی پرورش و تربیت تمام تر بلگرام مین ہوئی اور وہان کے مشہور و مقبول معلّمین سے جنکو اِن کے خاندان والون نے علمار فضلا کے نام سے یاد کیا ہے، ابتدائی کتابین یا درسیات انھون نے پڑھین۔ زیادہ تر میر سعد اللہ[۱۲۱] بلگرامی کی صحبت و تلمذ سے فیض یاب ہوئے میر طفیل[۱۲۲] محمد جن کو کمال حسن عقیدت سے اُن کے تلامذہ اور خوشہ چین اُستاد المحققین،

---

۱۲۱ سیّد سعد اللہ نقر و فضل دونون کے جامع اور اپنے جد امجد سیّد فیروز کے مُرید تھے۔ ملا فیضی ساکن امروہہ (شاگرد شیخ لیسین قنوجی)، اور مُلا عبدالرحیم قاضی مرادآباد (تلمیذ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی) سے اکتساب علوم کرکے بعد فراغ، وطن واپس آئے اور درس و تدریس مین مشغول ہو گئے۔ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہو کر احمد آباد گجرات مین گوشہ گزین ہوئے۔ مولانا نور الدین کے مدرسہ مین قیام تھا۔ اشوال ۱۱۱۹ھ (یکم جنوری ۱۷۰۸ء)، یوم پنجشنبہ کو رحلت فرمائی۔ روضہ شاہ بھیکن مبرہ شاہ عالم بخاری مین کنار لحد مین آرام فرما ہوئے۔

۱۲۲ میر طفیل محمد عربی و فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ان کا کچھ کلام سبحۃ المرجان مین عربی کا اور سرو آزاد مین فارسی کا نقل کیا گیا ہے۔ اترولی ضلع علی گڑھ کے باشندے تھے۔ ۱۰۷۳ھ (۶۳-۱۶۶۲ء) مین ولادت

کے لقب سے پکارتے ہین، ان کے شریک درس تھے۔ شعور کافی ہو جانے پر دونون بلگرام سے نکلے اور دیگر قصبات پورب مین گھوم پھر کر کچھ کتابین اور پڑھین۔ متوسطات متفرق مواضع مین تحصیل کین۔ اور آخر مین شیخ غلام نقشبند رحمۃ اللہ لکھنوی کے حلقۂ درس مین حاضر رہکر سلسلۂ تحصیل کو انتہا پر پہونچایا۔ قطب المحدثین میر سید مبارک رحمۃ اللہ بلگرامی تلمیذ خاص شیخ نور الحق

ہوئی۔ وہان سے اپنے چچا سید احسن اللہ کے ساتھ دہلی آئے اور سید حسین رسول نما سے تبرکاً کچھ پڑھ کر پھر تحصیل علم کے لیے بلگرام آئے۔ مقامی فضلاء و مشاہیر کے سوا مولوی قطب الدین شمس آبادی (باشندہ امیٹھی، ملک اودھ مقیم و مدفون شمس آباد ضلع فرخ آباد متوفی ۱۱۲۱ھ مطابق ۱۷۰۹ء) سے کتابین ختم کین۔ تیس سال کے قریب یعنی نفس آخرین تک میر عبد الجلیل کے دیوانخانہ، واقع محلہ سیدان پورہ بلگرام مین مقیم رہے کبھی کبھی بقصد سیر و سیاحت کشمیر و گجرات و دیگر مقامات و متنزہات کو ہو آتے تھے۔ احیائے علوم و مشغلہ تدریس و ہدایت مین ستر سال بلگرام مین بسر فرمائے۔ جماعت کثیر ان کی شاگرد تھی ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۶ء) مین رحلت فرمائی اور مرقد میر عبد الجلیل کے قریب باغ محمود مین جگہ پائی۔ بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔

۱۲۳ھ شیخ غلام نقشبند، علوم ظاہری و معنوی کے حامل، اور یکتائے روزگار تھے۔ شیخ المشائخ شاہ پیر محمد کے سجادہ پر ممتاز ہوئے۔ ان کی درس و تدریس سے خلق کثیر نے نفع پایا تھا۔ اکثر علمائے عصر ان کے خوان فضل و کرمت کے زلّہ ربا تھے۔ خلد منزل بہادر شاہ، شاہ عالم بن عالمگیر ان کی نہایت تعظیم و مدارات کرتا تھا۔ آپ بڑے پابند شریعت تھے۔ درویشان بے قید آپ سے اور آپ کی گرفت سے بہت بھاگتے تھے۔ رجب ۱۱۲۶ھ (جولائی ۱۷۱۴ء) مین لکھنؤ مین وفات پائی۔ چند تفاسیر و حواشی قرآن پاک اور کچھ کتابین مسئلہ وحدت وجود پر اور عروض وغیرہ مین یادگار چھوڑی ہین۔

۱۲۴ھ ان کا یہ لقب میر غلام علی آزاد نے کئی جگہ لکھا ہے۔ میر سید مبارک نے حقیقتاً نہایت اچھی زندگی بسر کی تھی۔ اصول و فروع پر نگاہ رکھتے تھے۔ احیائے سنن اور ازالۂ بدعات مین ہمیشہ مصروف رہتے۔ ان کا تقوے و طہارت ان کے علوم ظاہری و باطنی کی شان کے موافق تھا۔ بلگرام سے درسیات پڑھ کر دہلی چلے گئے تھے، وہان خواجہ عبد اللہ المشہور بہ خواجہ خورد ابن خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے مطوّل پڑھا۔ دہلی مین قیام شیخ نور الحق کے گھر پر تھا۔ انہین سے علم حدیث حاصل کیا اور سند پائی اور بقیہ عمر کلام نبوی کی خدمت مین گذار دی محدث کہلاتے تھے۔ میر سید عبد الفتاح عسکری احمد آبادی سے سلسلۂ قادریہ مین بیعت کی تھی۔ بڑے پابند سنت اور اذعان احکام شرعیہ مین نہایت سخت تھے۔ ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) مین بلگرام مین رحلت فرمائی۔

خلف الصدق شیخ عبدالحق[۱۲۵] دہلوی) سے علم حدیث کی سند پائی۔ آزاد لکھتے ہین کہ ان کو تمامی علوم عقلی و نقلی خصوصاً تفسیر و حدیث و لغت عربیہ و تاریخ عرب و عجم و موسیقی ہندوستانی اور اکثر فنون غریبہ و محاضرات مین اقتدار عظیم حاصل تھا۔ سیرت نبوی اور اسماء الرجال مین دستگاہ بے نظیر رکھتے تھے۔ خود ان کے اُستاد شیخ غلام نقشبند جو پورب کے امام العلماء سمجھے جاتے ہین ہمیشہ ان کی تعریف کرتے اور کمال قدر و احترام فرماتے تھے۔

ابتدائے حال مین میر عبدالجلیل اور میر طفیل محمد نے بارادۂ تحصیل علم مستقر الخلافۃ آگرہ[۱۲۶] کا قصد

۱۲۵؎ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ہندوستان کے اولیائے کبار سے گزرے ہین محرم ۹۵۸ھ (جنوری ۱۵۵۱ء) مین پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) مین رحلت فرمائی۔ آپ کا مقبرہ دہلی مین حوض شمسی کے کنارے واقع ہے۔ بائیس سال کی عمر مین حفظ قرآن مجید اور اکثر علوم دینی کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ عنفوان شباب مین حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ مدت دراز تک وہان مقیم رہے اور علمائے اجل و فقرائے اکمل کی صحبت رہی۔ حدیث شریف کے ساتھ آپ کو شغف خاص تھا۔ بلاد عرب مین اس کی تکمیل کی اور بعد مراجعت وطن ۵۱ سال تک اسی فن شریف کا چرچا جاری رکھا۔ آپ کی ذات مقدس سے اس ملک مین جس قدر فیض عام ہوچکا ہے۔ اسکی مثال ممالک عجم مین نہین پائی جاتی۔ تمام فنون علمیہ مین عموماً اور فن حدیث مین خصوصاً نہایت معتبر کتابین تصنیف فرمائین جنکی تعداد سو پر اور جن کی سطرون کا شمار پانچ لاکھ پر پہونچتا ہے۔ جہانگیر بادشاہ آپ سے نہایت ادب و احترام کے ساتھ دربار مین ملا تھا لکھتا ہے کہ "مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می برد مرد گرامی است صحبتش بے ذوق نیست۔"

شیخ نورالحق اس خانوادۂ علمی کے چشم و چراغ اور حضرت شیخ کے فرزند رشید تھے۔ زبدۃ التواریخ اور بہت سی کتابین آپ کی یادگار ہین۔

۱۲۶؎ شہر آگرہ سولہوین صدی عیسوی مین سلطنت مغلیہ کا دارالصدر تھا۔ کچھ زمانہ تک سترھوین صدی مین بھی رہا۔ سلاطین ماضیہ نے اپنی سلطنت و حکمرانی کی مسلسل و متوالی یادگارین یہان چھوڑی ہین سنگ سرخ کی مستحکم و فلک پیما اور سنگ مرمر کی نازک و نفیس عمارتین سارے ہندوستان مین اپنا نظیر نہین رکھتین۔ یہ شہر پہلے بیانہ کا ماتحت تھا۔ شاہان اسلام مین سب سے پیشتر سکندر لودی بادشاہ دہلی نے دریائے جمن کے ساحل چپ پر یعنی جانب مشرق اپنا محل و قلعہ بنوایا جو ۹۰۹ھ (۱۵۰۴ء) کے قریب مستقر سلطنت ہو گیا اور تمام شاہان لودی کا پائے تخت رہا۔ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) مین بابر نے ابراہیم حسین لودی پر فتح پائی تو اسکے پرانے محل پر قبضہ کیا جسکی بنیادین شہر آگرہ کی مخالف سمت کچھ زمانہ ہوا جب تک نظر آتی تھین مگر اب یہان ایک خوشنما

کیا۔ نواب فضائل خان میر منشی خلد مکان نے اُس زمانہ مین ملازمت سلطانی سے جدا ہو کر وہان گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ دونون صاحب نواب سے ملے اور اُن کی اعانت سے کچھ روز وہان اقامت گزین رہے۔ شاہ حسین خان درگاہ خلد مکان سے دیوانی سرکار لکھنو

اور بارونق آبادی قائم ہوگئی ہے۔ اس کے ایک سال بعد سنہ ۹۳۴ھ (سنہ ۱۵۲۷ء) مین بابر اور راجپوتون سے قلعہ چندیری پر ایک فیصلہ کُن عظیم جنگ ہوئی جس سے بابر کا قبضہ و تسلط مستقل ہو گیا تو اُس نے یہان کا قیام بدستور رکھا۔ سنہ ۹۳۷ھ (سنہ ۱۵۳۰ء) مین بابر نے یہین انتقال کیا۔ اس کے جانشین اور بیٹے ہمایون نے بھی پُرانے آگرہ مین بود و باش اختیار کی یہان تک کہ سنہ ۹۴۷ھ (سنہ ۱۵۴۰ء) مین اُسکو شیر شاہ کی بدولت اپنی مملکت مالوفہ سے رخصت ہونا پڑا۔ اپنے عہد کے بڑے حصہ مین اکبر نے بھی اُسی کو مستقر رکھا۔ پھر دریا کی داہنی جانب موجودہ شہر آگرہ کی بنیاد ڈالی۔ سنہ ۹۷۳ھ (سنہ ۱۵۶۶ء) مین آغاز کر کے پانچ سال مین سنگین قلعہ تعمیر کیا اور آگرہ کا نام اکبرآباد اُسیوقت سے قرار پایا۔ یہ خافی خان کی روایت ہے۔ مرزا رضا شاہجہان نامہ مین لکھتے ہین کہ یہ نام (اکبرآباد) دادا کی محبت و یادگار مین شاہجہان نے رکھا تھا۔ اُسکے عہد تک آگرہ کہلاتا تھا] چار سال بعد قصبہ فتحپور سیکری کی آبادی کی بنا شہنشاہ مذکور نے سنہ ۹۷۷ھ (سنہ ۱۵۶۹ء) مین رکھی۔ ایک تالاب بیس میل کے محیط و دَور کا اُسکے نواح و اطراف مین تعمیر کرایا جسکے شکستہ و ریختہ بند کے نشانات بعض مقامات و ویرانون مین ہنوز نمودار ہین۔ بادشاہ کا عزم فتحپور سیکری کو دار السلطنت بنانے کا مصمم ہو چکا تھا لیکن آگرہ کی عظمت اور خوبی موقع، جمنا کی روانی و مناظر اور ہر طرح کی سہولتون نے اس ارادہ کو عمل و وجود مین لانے سے باز رکھا۔ سنہ ۹۷۸ھ (سنہ ۱۵۷۰ء) سے سنہ ۱۰۰۹ھ (سنہ ۱۶۰۰ء) تک اکبر اپنی فتوحات جنوب و مشرق ہندوستان مین مصروف رہا۔ لیکن جب اُسکو سنہ ۱۰۱۰ھ (سنہ ۱۶۰۱ء) مین معرکہ آرائیون اور مہمات سے سبکدوشی ہوئی تو پھر آگرہ چلا آیا اور چار سال بعد سنہ ۱۰۱۴ھ (سنہ ۱۶۰۵ء) مین راہی مُلک بقا ہوا۔ اسکے عہد مین قلعہ کے اندر محلات کی تعمیر شروع ہوئی اور آگرہ مین جتو پور دروازہ تعمیر ہوا۔ آگرہ سے مغرب و شمال پانچ میل کے فاصلہ پر سکندرہ کا روضہ اُسی شہنشاہ عظیم الشان کی آخری آرامگاہ کا نشان دیتا ہے جس کو اسکے بیٹے جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اُس کا ایک نہایت عمدہ پھاٹک یا محرابی دروازہ سنگ سُرخ کا ہے۔ جہانگیر نے اپنے خسر اعتماد الدولہ کا مقبرہ اور چینی کا روضہ دریا کی بائین جانب بنوایا اور قلعہ کے اندر محلات کا وہ حصہ جو جہانگیر محل کہلاتا ہے تعمیر کرایا۔ سنہ ۱۰۲۹ھ (سنہ ۱۶۱۹ء) مین وہ آگرہ سے ایسا رخصت ہوا کہ پھر یہان آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ اُسکے عہد کا اختتام تھا اُسکا باقیماندہ وقت پنجاب و کابل مین بسر ہوا۔ سنہ ۱۰۳۷ھ (سنہ ۱۶۲۸ء) مین شاہجہان نے اپنی بادشاہی تخت نشینی کا اعلان یہین سے کیا اور سنہ ۱۰۴۲ھ (سنہ ۱۶۳۲ء) سے سنہ ۱۰۴۷ھ (سنہ ۱۶۳۷ء) تک خیام گزین رہا۔ اگرچہ اُس نے دار السلطنت دہلی کو قرار دیا تھا اور وہان چلا آیا تھا لیکن آگرہ اور اُس کی یاد کو گوشۂ خاطر سے محو نہ کر سکا۔ قلعہ کے اندر کی بہت سی

مامور ہو کر دکن سے اکبرآباد پہونچے۔ میر عبدالجلیل بھی شاہ حسین خان کی رفاقت مین اکبرآباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ پانچ سال یہان قیام رہا۔ خان مذکور بڑی مراعات و عنایات مبذول رکھتے تھے۔ ظاہری ترقی یہین سے شروع ہوئی اور شیخ غلام نقشبند سے تلمذ بھی اسی زمانہ مین

عمارات کی تکمیل و تزئین اسکے عہد مین ہوئی۔ موتی مسجد، جامع مسجد، اور خاص محل کا وجود دلقبا اسی کے دست دریا نوال کا منت گذار ہے۔ تاج محل جسکی نسبت تسلیم کیا جاتا ہے کہ دنیا مین عہد اسلام و اسلامیان کی تعمیرات کا بہترین اور مکمل ترین نمونہ ہے، اسی کی محبوب ملکۂ ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کی دائمی یادگار اور زوجین کے عشق و محبت اور باہمی شیفتگی کا ابد قرار مزار ہے۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) مین شاہجہان سے اسکے تیسرے بیٹے عالمگیر نے بغاوت کی اور بمقام ساموگڈھ (ضلع آگرہ) فتح پائی تو شاہجہان کو سلطنت سے معزول اور تاج و تخت سے محروم کر دیا۔ لیکن اجازت دی کہ شاہجہان اپنی شاہانہ شوکت و شان کے ساتھ قلعہ اکبرآباد مین سکونت گزین رہے۔ البتہ وہ نظربند یا مقید تھا اور سات سال کے قریب یعنی اپنی وفات تک اسی حالت اسیر و حبس مین رہا۔ اورنگزیب دارالخلافہ کو مستقل طور پر دہلی اٹھا لایا۔ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۶ء) سے آگرہ محض ایک صوبہ دار یا گورنر کا مقام رہگیا جاٹون کے اس پر متوالی و متواتر کوہ شکن حملے ہوتے رہے۔ سلطنت مغلیہ کے تنزل کے زمانہ مین آگرہ کے اکثر مواضع بڑے زبردست و حوصلہ فرسا معرکون کے نتیجے دیکھ چکے ہین اورنگزیب کی وفات پر اسکے بیٹون نے سرحد دھول پور کے متصل جاجو پر خوب جنگ آزمائی کی۔ میر عبدالجلیل کے قیام یا آمد و رفت آگرہ کا تقریباً یہی زمانہ تھا۔ ۱۱۲۴ھ کے اختتام یا ۱۱۲۵ھ کے آغاز یعنی شروع ۱۷۱۳ء مین سلطنت کی قسمت کا فیصلہ پھر سواد آگرہ مین ہوا اور فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو شکست دی اور اس عسیر التسخیر قلعہ کو فتح کیا۔ اسکی شاہ نشین و سر بفلک عمارات پر آل تیمور کا پرچم پھر لہرانے لگا۔ میر عبدالجلیل اسوقت بھی فاتح و منصور بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔

آگرہ کی سرزمین بڑی مردم خیز اور ہنر پرور رہی ہے۔ عہد اکبری کے نامور مورخ ابوالفضل اور اسکے بھائی ملک الشعرا فیضی کی یہی ولادت گاہ ہے۔ انیسوین صدی عیسوی مین اس نے انشای فارسی اور ادب اردو کے بڑے بڑے ممتاز صاحب کمال پیدا کئے۔ میر تقی میر اور شیخ ولی محمد نظیر کا خمیر اسی خاک سے تھا۔ مرزا اسداللہ خان غالب کی عمر کا ابتدائی حصہ بھی یہین گزرا تھا۔

شہر کی مردم شماری ۱۹۲۱ء مین ایک لاکھ تریسٹھ ہزار سات سو پچاس ۱۶۳۷۵۰ تھی

۱۲۷ فضائل خان، عالمگیری امرا مین سے تھے۔ بڑے ذی علم اور علم دوست تھے اہل علم کی قدر و سرپرستی

رہا۔ جب شاہ حسین خان دیوانی لکھنؤ سے معزول ہو کر دیوانی صوبہ پٹنہ[۱۲۵] پر منصوب ہوئے تو یہ بھی اُن کے ہمرکاب پٹنہ تشریف لے گئے اور اُس سرزمین مین کچھ روز جمعیت خاطر کے ساتھ گزار دئیے پھر ایک تقریب مین بلگرام آنے کا اتفاق ہوا۔ انھین ایام مین سید محمد فیض[۱۲۶] زمیندار بلگرام کو حادثہ خان عالمی کی وجہ سے درگاہ خلد مکان کی حاضری کی ضرورت پیش آئی

فرماتے تھے۔ شیخ سلیمان اصلی نام تھا اُن کے علم و بزرگی کے لحاظ سے بادشاہ نے فضائل خان خطاب دیا تھا سنہ ۱۱۰۱ھ (سنہ ۹۰-۱۶۸۹ء) مین انتقال کیا۔ دکن کی دیوانی پر بھی کبھی مامور رہے تھے

۱۲۵ صوبہ پٹنہ مسلمانون کی ابتدائے حکومت مین صوبۂ بہار کہلاتا تھا اور صوبہ کا گورنر شہر بہار مین رہتا تھا۔ شیر شاہ کی بغاوت پر پٹنہ خودمختار ہو گیا۔ اکبر نے اس کو پھر مغلوب و تابع فرمان کیا۔ اورنگ زیب نے اپنے پوتے عظیم الشان کو گورنر مقرر کر کے بھیجا تو اُس کی مناسبت سے اُسی وقت سے پٹنہ کا نام عظیم آباد پڑ گیا جو اب تک شہرت رکھتا ہے۔ ہند برطانوی کی جدید تقسیم و تشکیل مین سنہ ۱۹۱۱ء مین اس صوبہ کا نام "بہار و اڑیسہ" قرار دیا گیا اور دار الصدر بدستور پٹنہ رکھا گیا۔ یہ صوبہ جانب غرب صوبہ آگرہ سے، جانب شرق صوبہ بنگالہ سے شمال مین نیپال سے۔ اور جنوب مین چھوٹا ناگپور سے ملحق و محدود ہے۔ اورنگ زیب خلد مکان کے عہد مین صوبہ بہار مین آٹھ سرکارین اور دو سو چالیس محال تھے۔ طول ایک سو بیس کوس اور عرض ایک سو دس کوس تھا۔ بیج ناتھ ہندوؤن کا معبد اور ترہت ہندی کا دار العلم، مظفرپور، حاجی پور سارن، مونگیر، اسی صوبہ مین داخل اور شامل تھے۔

اس صوبہ مین متعدد قدیم شہر و قصبات واقع ہین۔ خود پٹنہ بہت قدیم و مشہور جگہ ہے۔ ہندوستان عتیق کا دار الصدر "پاٹلی پوترہ" یہی مقام تھا۔ اسی کو میگاستھنیس یونانیون کے عہد کا "پالی بوتھرہ" بتاتا ہے یہی عہد گپت شہنشاہون کا "کسم پورہ" تھا چینی سیاحون مین سے فاہیان سنہ ۴۰۶ء مین اور ہیون تھسانگ سنہ ۶۳۷ء مین ادھر سے گذرے اور اپنے سفرنامون مین اس سرزمین کا ذکر کرتے ہین۔ ڈالوڈورس مورخ پٹنہ کا بانی ہرقلس یا بلرام برادر کرشن کو بتاتا ہے۔ مذہب بودھ کا بھی گہوارہ تھا۔ پٹنہ، بدھ گیا، چمپارن، مظفرپور مین بودھون کے گذشتہ عروج و ترقی کے آثار اب بھی بہت سے نظر آتے ہین۔ یہ "چار ستون" اُس راستہ کا نشان دیتے ہین جو مظفرپور اور چمپارن مین ہو کر تین صدی قبل حضرت مسیح نیپال کی ترائی مین جانے کے لئے اشوک نے اختیار کیا تھا۔ وہ ستون جو لوریا نندن گڑھ کے پاس ہے اب تک بالکل مکمل اور درست ہے۔ دوسرا ابیانرہ کے نزدیک اغلباً اُسی مقام پر ہے

دکن کا عزم کیا۔ میر عبد الجلیل اور سید محمد فیض سے بڑا ربط تھا۔ اِس لئے اُن کی رفاقت مین یہ بھی دکن چلے اور اُردوئے بادشاہی مین پہونچے۔ میر ناصر علی سے میر عبد الجلیل کی ملاقات اسی سفر مین، اسی موقع پر ہوئی تھی۔ دکن پہونچتے ہی کام ٹھیک ہوگیا اور یہ بلگرام واپس آئے۔ اسی زمانہ مین خبر آئی کہ شاہ حسین نے مرشد آباد (دار الملک بنگالہ) مین انتقال کیا

جہان پرانی سلطنت وُبیالی کا دار الصدر آباد تھا۔ بودھون کے آثار تحقیقات علم الارض کے لحاظ سے گریاک، بگیم پور، ٹیٹراوان، جگدیس پور، تاتھار، اور اسلام پور قابل ذکر مقامات ہین جس جگہ نالندا کی مشہور خانقاہ تھی وہان موضع بڑا گاؤن آباد ہے۔ پرانی سلطنت مگدہ بھی اسی سرزمین پر تھی جسکی راج دھانی راجگیر تھی۔

بادشاہان تیموریہ کے عہد مین ملک بہار اکثر سلاطین و اُمرائے عظام کی جاگیر مین رہتا تھا (بادشاہ اور ولی عہد کو چھوڑ کر خاندان حقیقیہ کے تمام شاہزادے اور بھائی بند سلاطین کہلاتے تھے)

قصبہ بہار و شہر پٹنہ و سہسرام و قلعہ رہتاس گڈھ و شیر گڈھ و منیر مین عہد اسلام کی یادگارین موجود ہین حضرت شاہ ارزان (متوفی ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۳ء) کی درگاہ نہایت متبرک و مشہور ہے جس کی عظمت و زیارت ہندو اور مسلمان یکسان کرتے ہین۔ شیر شاہ کی تعمیر کردہ مسجد سب سے قدیم اور سیف خان کا مدرسہ نہایت خوش نما اور نظر فریب عمارت ہے۔

۱۷۶۳ء کا واقعہ جو پٹنہ کا قتل عام کہلاتا ہے یہین ہوا تھا ۱۷۶۴ء مین صوبجات بنگال و بہار و اڑیسہ کی دیوانی بحق ایسٹ انڈیا کمپنی اسی قطعہ زمین پر بیٹھ کر منتقل کی گئی تھی۔

مسلمانون کے عہد مین یہ خطہ مسند علم و ادب رہا ہے۔ بڑے بڑے فضلا اور سخنور اس خاک سے اُٹھے اور اسی مین مل گئے ہین۔

۱۸۶۳ء کے قریب تک انگریزی کتابین پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھین۔

عہد حاضرہ کی بہترین یادگار اور نفع رسان، مولوی خدا بخش، خان بہادر سی، آئی۔ ای کا مشرقی کتبخانہ یعنی عربی و فارسی کی قلمی کتابون کا نادر و بے مثل ذخیرہ ہے۔

انگریزی تاریخون مین سے (۱) مشرقی ہند۔ مولفہ ایم مارٹن مطبوعہ ۱۸۳۸ء اور (۲) پاٹلی پوترہ۔ مولفہ ڈاکٹر وڈیل ۱۸۹۲ء مین یہان کے حالات زیادہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ ملتے ہین۔

۱۲۹ سید محمد فیض بلگرام کے موروثی زمیندار اور خود بھی صاحب علم تھے۔ علوم متداولہ کی کتابین میر محمد اسماعیل و میر سید مبارک اور میر عبد الجلیل بلگرامی سے پڑھی تھین۔ امام ترمذی کی شمائل النبی، اور

تو میر صاحب نے تاریخ لکھی ؎

خان خورشید نسب شاہ حسین ذات او مظہر آیاتِ جلی
آن امیرے کہ در انواع شکوہ داشتہ مرتبۂ بے بدلی
گوہرِ فکر وزیران جہان پہلوئے رائے منیرش عملی
در ہزار و صد و ہشت از ہجرت کرد نہضت بہ ریاض ازلی
سالِ تاریخ خرد گفت چنین بادحشرش بہ حسین ابن علی
۱۱۰۸ھ (۹۷-۱۶۹۶ء)

شاہ حسین کی وفات کے بعد اُن کے فرزند ارجمند میر محمد رضا، جو شاہزادہ عظیم الشان (بن شاہ عالم) کے ہم زلف تھے، بنگالہ سے بہ ارادۂ آستانۂ سلطانی چلے۔ بلگرام مین وارد ہوئے اور میر عبد الجلیل کے دیوان خانہ مین کئی روز مقیم اور راحت گزین رہے۔

اس وقت تک میر عبد الجلیل کو کم و بیش شوق تحصیل علم باقی تھا۔ ملازمت سرکاری شروع نہین کی تھی سلسلۂ درس وتدریس جاری تھا۔ لہذا یہ زمانہ جبکہ میر صاحب کی عمر عزیز کے چالیس سال گذر چکے تھے اُن کا زمانۂ طالب العلمی شمار کیا گیا ہے۔

مبلغ علم

میر عبد الجلیل کو زیادہ تر عطیات غیبی نے چمکا دیا اور مبلغ علم اور استعداد کو بڑھا دیا تھا۔ سید علی معصوم[۱۳۰]

حصن حصین، کا فارسی مین ترجمہ کیا تھا۔ زمینداری کا کاروبار بڑی شان وشوکت و حتشام سے انجام دیتے تھے۔ اتفاقاً خان عالم خان حاکم شہر سے کسی بات پر بگڑ گئی اور ۲۹ رمضان ۱۱۰۳ھ (۷ رجون ۱۶۹۲ء) کو جدال وقتال کی نوبت پہونچی۔ خان عالم غالب آیا۔ سید محمد فیض کا تمام اثاث البیت غارت وتاراج ہوگیا۔ اسکے تدارک کے لئے سید محمد فیض مستعد ہوے۔ دکن یعنی عسکر عالمگیر خلد مکان کا قصد کیا میر عبد الجلیل بپاس ربط قدیم رفیق سفر تھے۔ دربار سلطانی مین پہونچ کر سارا ماجرا عرض کیا خان عالم پر عتاب اور وہ حکومت بلگرام سے معزول ہوا۔ سید فیض نے ۱۱۳۰ھ (۱۸-۱۷۱۷ء) مین وفات پائی۔

سے تعارف و ملاقات کا اتفاق جب اِن کو اورنگ[۵۱۳] آباد دکن میں ہوا، اور سابقہ پڑا، رالطبر پڑھا۔ تو سید علی نے فرمایا تھا "کہ میں نے اپنی تمام عمر میں میر عبدالجلیل کے مثل غرائب علوم کا جامع نہیں دیکھا ہے۔"

۵۱۳۔ سید علی معصوم مدنی دشتکی شیرازی حسنی الحسینی، مشاہیر ادبا و صناوید شعرا سے گذرے ہیں شیراز میں ان کا خاندان علم و فضل کا مشہور گھرانا تھا۔ شیراز کا مدرسہ منصوریہ ان کے دادا میر غیاث الدین منصور سے منسوب ہے۔

سید علی صدر الدین کے باپ سید نظام الدین احمد تھے اور دادا سید معصوم۔ معصوم سید کے ہمراہ شاہ عباس ثانی صفوی نے اپنی بہن کو زیارت حرمین محترمین کے لئے بھیجا تھا۔ ضروریات شرعی سے دونوں نے نکاح کرلیا اور بادشاہ کے خوف سے وطن چھوڑ کر مکہ معظمہ میں قیام اختیار کیا۔ میر نظام الدین وہیں پیدا ہوئے نشو و نما تعلیم و تربیت وہیں پائی۔ محمد سعید اردستانی مخاطب بہ میر جملہ وزیر نے اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے کے لئے میر نظام الدین اور ایک اور نوجوان سید سلطان کو مبلغ کثیر صرف کرکے حیدرآباد بلایا۔ عبداللہ قطب شاہ بادشاہ نے درا‌ندازی کی اور اپنی بیٹی بیاہ دی۔ بادشاہ اور وزیر سے برہمی و برافشتگی ہوگئی بالآخر زوال سلطنت کا باعث یہی واقعہ ہوا

قطب شاہ کی بیٹی سے میر نظام الدین کا کوئی فرزند نہ تھا۔ سید علی دوسری زوجہ سے تھے جن سے مکہ میں پہلی شادی ہوئی تھی۔ میر سید علی ۱۵ جمادی الاول ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئے تھے اسی لئے مدنی کہلاتے ہیں۔ باپ ان کو مکہ میں چھوڑ گئے تھے۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) کو قلعہ گلکنڈہ حیدرآباد میں داخل ہوئے اور پدر بزرگوار کا شرف قدمبوسی حاصل کیا۔ ابوالحسن جب تخت پر بیٹھا تو وہ بوجہ میر نظام الدین کی اولاد و وابستگان کا دشمن جان تھا اور تشنۂ خون۔ سید علی کی درخواست خلد مکان عالمگیر نے اُن کو اپنے حضور میں طلب کرلیا اور عنایات و نوازشیں فرمائیں۔ ڈیڑھ ہزار کے منصب پر سرفراز کیا اور خدمات جلیلہ تفویض فرمائیں، پہلے اورنگ آباد و ماہور صوبہ برار کی حکومت سپرد تھی پھر برہان پور کی دیوانی قبول کرلی تھی۔ کچھ زمانہ بعد بادشاہ عالیجاہ سے اجازت لے کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ سید علی حرمین شریفین چلے گئے۔ بعد ازاں ائمہ اطہار علیہم التحیات کی عتبات عالیات کی زیارت کی۔ مشہد مقدس ہو کر پہنچے، پھر اصفہان آئے۔ مگر سلطان حسین صفوی نے حسب توقع مدارات و التفات نہ کی۔ ناگزیر وطن اصلی شیراز کو چلے آئے اور مدرسہ منصوریہ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی۔

تصانیف فائقہ یادگار چھوڑی تھیں (۱) انوار الربیع فی انواع البدیع۔ ۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء) میں

میر صاحب کے اوصاف جلیلہ میں آزاد اور اُنکے ہم نوا حضرات بڑے اہتمام و اصرار سے لکھتے ہیں کہ ماہران فن موسیقی آپ کو اُستادِ کامل مانتے تھے۔ میر صاحب نے اپنے اس کمال، وقوف و آگاہی کو اپنی مثنویات امواج الخیال و طوطئے فرخ سیر میں ظاہر

لکھی اسکا نہایت عمدہ اور خوش خط قلمی نسخہ پبلک لائبریری الہ آباد میں محفوظ ہے (۲)۔ ریاض السالکین۔ جو صحیفۂ کاملہ کی شرح ہے (۳) حاشیۂ قاموس (۴) دیوان اشعار (۵) سلافۃ العصر فی محاسن اعیان العصر، جو شعرائے عرب کا ایک ضخیم تذکرہ ہے۔ اس کی تالیف، ربیع الثانی سنہ ۱۰۸۲ھ (سنہ ۱۶۷۱ء) کو وقت عصر ختم ہو چکی تھی اسلئے میر عبد الجلیل کا نام اس میں نہیں ملتا ہے (۶) شرح فوائد صمدیہ (۷) حدائق الندیہ۔

۱۳۶ اورنگ آباد، تاریخوں میں صوبۂ مبارک بنیاد لکھا جاتا تھا۔ اس شہر (کھرکی) کی بنیاد سنہ ۱۰۱۹ھ (سنہ ۱۶۱۰ء) میں ملک عنبر وزیر سلاطین نظام شاہی احمد نگر نے ڈالی اور فتح نگر نام رکھا تھا۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہاں افواج نظام شاہی بسرکردگی ملک عنبر اور عساکر شاہان مغلیہ سے معرکہ آرائیاں رہیں حتی کہ سنہ ۱۰۲۵ھ (سنہ ۱۶۱۶ء) میں عاجز آکر عنبر نے سپہ سالار جہانگیری کے حوالہ کر دیا۔ ملک عنبر نے سنہ ۱۰۳۵ھ (سنہ ۱۶۲۶ء) میں وفات پائی اور فرمانروایان احمد نگر کی قوت و حکومت رخصت ہو گئی۔ سنہ ۱۰۴۶ھ (سنہ ۱۶۳۷ء) میں اُن کے ممالک، سلطنت مغلیہ کے متعلق، صوبہ دکن میں شامل ہو گئے۔ سنہ ۱۰۴۷ھ (سنہ ۱۶۳۸ء) میں اورنگ زیب، دکن میں نائب السلطنت مقرر ہوا اور جب اُس نے سنہ ۱۰۶۳ھ (سنہ ۱۶۵۳ء) میں کھرکی میں سکونت اختیار کی تو اُس کا نام بدل کر اورنگ آباد رکھا۔ یہی مقام تھا جہاں سے اورنگ زیب نے اپنی اولوالعزمیوں اور ابتدائی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا اور مرہٹوں اور بادشاہان بیجاپور و گولکنڈہ کے مقابلہ میں مہمات و افواج روانہ کیں۔ سنہ ۱۰۶۸ھ (سنہ ۱۶۵۸ء) میں جب اُس نے اپنے باپ شاہجہان کو تخت سے اُتار کر نظر بند کر دیا تو چند سال بعد ہمہ تن مصروف ہو کر سلطنت ہائے اسلامی دکن کے مطیع و منقاد کرنے پر کمر باندھی۔ مرہٹوں کے ساتھ لڑائیاں شروع کیں جن میں وہ آخر وقت یعنی دم مرگ تک مصروف و مشغول رہا حتی کہ سنہ ۱۱۱۸ھ (سنہ ۱۷۰۷ء) میں احمد نگر میں وفات پائی۔ سنہ ۱۰۹۷ھ (سنہ ۱۶۸۶ء) میں بیجاپور اور سنہ ۱۰۹۸ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) میں گولکنڈہ جو سلطنت قطب شاہی کا پائے تخت تھا فتح ہو اور فتح ہونے کے ساتھ ساتھ ان دونوں سلطنتوں کا الحاق بھی ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی پیچیدگیاں اور مناقشات قائم رہے حتی کہ آصف جاہ نظام اول نے اورنگ آباد آکر اپنی مطلق العنانی و خود مختاری کا اعلان کیا۔ بعد کو حیدرآباد کو اپنا دار الصدر قرار دیا۔

شہر اورنگ آباد شمال و جنوب میں تسلسل دستار اپہاڑیوں کے سلسلہ سے محصور ہے اورنگ زیب کے عہد میں اسکی آبادی دو لاکھ نفوس سے کم نہیں بتائی جاتی۔ اطراف و جوانب کے ویرانے اور شکستہ

ثابت کیا ہی۔ فرماتے ہین کہ "استخراج دقائق علوم مین عقلاے عرب اور اُن کے متبعین دانایانِ عالم پر ترجیح لے گئے ہین، لیکن ہندوستان کے اہل موسیقی نے اس فن مین اس قدر لطائف و دقائق احتیاط کئے ہین کہ تمامی علوم کے دقائق پر راجح ہو گئے ہین۔ اس قول کی سچّائی اُسی شخص پر ظاہر ہو سکتی ہی جو اس فن مین مہارت و دستگاہ رکھتا ہو"۔ ؎

ہر کس از جلوۂ گل فہم معانی نہ کند　　شرح این دفتر نوشتہ ز بلبل بشنو

مقامات اس شہر کی عظمت رفتہ، اور گزشتہ رونق و آبادی کی شہادت دیتے ہین۔ بی بی کا مقبرہ، سنگ مرمر کا جو بالکل تاج محل کے نمونہ و قطع کا ہی، نہایت خوشنما اور دلکش ہی۔ اسکو ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) مین اورنگ زیب نے اٹھارہ لاکھ کے صرف سے اپنی ملکہ "بی بی رابعہ دورانی" کی یادگار مین تعمیر کرایا تھا۔ منارے شکستہ حال ہین بلکہ ایک تو صاعقہ برق سے گر گیا ہی۔ جدید شہر، اورنگ آباد کہنہ کے پورب واقع ہی۔ فوج کی چھاونی بچھم کو، دریاے کوم کے اُس پار ہے۔

اورنگ آباد اب سرکار ابد قرار نظام خلد اللہ سلطنتہٗ کا ایک صوبہ ہے۔ صوبہ دار (کمشنر) اور ناظم صوبہ (ڈوٹیرنل جج) و تعلقہ دار اول (کلکٹر)، و دیگر افسران محکمہ جات عدل و عمل کا مستقر ہے۔ ریل کا اسٹیشن ہی۔ ۱۹۲۱ء مین اسکی آبادی ۳۶۸۷۶ تھی۔

نہر سانی آب کا ایک سلسلہ ملک عنبر نے یہان قائم کیا تھا جسکی تکمیل اورنگ زیب نے کی۔ اگرچہ وہ اب زیادہ شکستہ حال ہی تاہم باشندگان کی تمام ضروریات کے لئے نہایت کافی مقدار مین میٹھا پانی بہم پہونچاتا ہی۔ اسکی صنعت و مخزن کو دیکھ کر بڑے بڑے فرزانگان فرنگ اور ماہران فن انجنیری دنگ رہجاتے ہین۔ ۱۸۹۲ء مین ایک جدید طریقہ آبرسانی کا جاری کیا گیا جس سے چھنا ہوا پانی چھاونی مین دیا جاتا ہے۔ قابل دید و دلچسپ مقامات شہر اور اُسکے مضافات مین بہت ہین، مثلاً اورنگ زیب کی ملکہ کا مقبرہ (جس کا ابھی ذکر ہوچکا)، جامع مسجد معمرہ ملک عنبر۔ نظام کا پُرانا محل جو پن چکی کے قریب ہے۔ قلعہ ارک جو اورنگ زیب کا محلسرا تھا۔ اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ شہر سے دو میل شمال کو اورنگ آباد کے مشہور غار ہین۔ ان کی تعداد بارہ ہے۔ یہ بودھون کے وقت کے ہین اور اُن کے زمانہ آخرین کی یادگار ہین۔ اسمین شک نہین کہ یہ نہایت دلکش و دلپسند مناظر پیش کرتے ہین۔ ان کے متعلق کتاب رپورٹ ہاے "آثار قدیمہ واقع مغربی ہند جلد سوم قابل ملاحظہ ہی۔

دولت آباد کا عظیم الشان قابل دید قلعہ بھی اورنگ آباد کے قریب ہے جو بارھوین صدی مین مسیحی

میر صاحب کے سوانح نویس اس امر کے بیان سے قاصر رہے ہین کہ اُنھون نے اس فن لطیف کو کہان سیکھا تھا اُن کے اُستاد کون تھے اور کس حد تک شہرت رکھتے تھے؟ لیکن یہ بات بھی

دیوگڈھ یا دیوگیری کہلاتا تھا۔ خلد آباد مین جو "روضہ" کہلاتا ہے اورنگ زیب خلد مکان کا مقبرہ ہے۔ قبر سادہ ہے اطراف مین سنگ مرمر کا کٹہرہ لگا ہوا ہے۔ اسی بابرکت مقام مین ملک عنبر اور ابوالحسن تانا شاہ [خاتم خاندان بادشاہان قطب شاہی جسکو اورنگ زیب نے ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) مین قید کر دیا تھا] اور آصف جاہ (مورث اعلی حضرت نظام دکن) بھی راحت گزین ہین۔ روضہ نہایت اچھی و پُر فضا جگہ، پہاڑیون پر واقع ہے اور دکن کی مشہور تفرج گاہون مین شمار ہوتا ہے۔ یہان بیس مقبرے اور چودہ سو قبرین ہین۔ میر غلام علی آزاد جنھون نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دکن مین گزارا تھا یہین مدفون ہین۔

۱۳۲ "موسیقی" یا "موسیق" سریانی زبان مین علم سرود کا نام ہے۔ لغت یونانی مین لحن کے معنی مین آتا ہے۔ مرآۃ الخیال مین اسکی ترکیب "مو" (بمعنی ہوا) اور "سیقی" (بمعنی گرہ لائی ہوئی) سے لکھی ہے۔ ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام نے بہ امتثال فرمان خداوندی اپنا عصائے مبارک پتھر پر مارا اور اُس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو منادی غیب نے ارشاد کیا کہ "یا موسیقی" یعنی لئے ہوسے! یاد کر لو جو کچھ ان چشمون کی روانی سے آواز آتی ہے۔

امام فخر الدین رازی لکھتے ہین کہ موسیقی کی ابتدا حکیم فیثاغورث نے کی جو حضرت سلیمانؑ کے شاگرد تھے۔ صاحب حدیقۃ الانوار بھی اس روایت کی تصدیق کرتا اور حکیم کے رویائے صادقہ کا پورا واقعہ نقل کرتا ہے بعض حضرت داؤدؑ سے بتاتے ہین۔

دانایان ہند کی رائے مین اس کا ماخذ "ناہید" ہے۔ وہ موسیقی کے معنی "سُر الیر" یعنی نغمۂ خداوندی بتاتے ہین اور اس کا موجد بعض کرشن جی کو اور بعض مہادیو جی کو جن کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے ۱۲۳۷ سال قبل گذرا ہے یعنی ۲۴۰۳ سنہ ہبوطی، لکھتے ہین۔

اہل تحقیق کی روایت یہ ہے کہ ققنس کسی جانور کا نام ہے جسکی آواز سے حکمائے علم موسیقی کا استخراج کیا ہے اور بارہ بروج فلکی کے مطابق بارہ ۱۲ مقام مقرر کئے اور ان مقامات کے شعبون کا شمار روز و شب کی ساعات کے موافق چوبیس قرار دیا ہے۔ ہر مقام مین دو شعبے رکھے ہین۔ ایک اُسی مقام کی پستی سے اوٹھتا ہے۔ دوسرا اُسی مقام کی بلندی سے پیدا ہوتا ہے۔ موسیقی کے بارہ مقامات کو کسی باکمال نے اس رباعی مین یکجا کر دیا ہے ؎

یاد رکھنے کے قابل ہی کہ بجائے خود بلگرام اس فن کا قدرتی مرکز یا طبعی منبع کسی وقت مانا جاتا تھا۔ آئین اکبری مین لکھا ہی کہ "بلگرام قصبہ الیست خوش ہوا بیشتر مردم آن خوش فہم وسرود دسرا۔ ودر آنجا

راست، عشاق، بوسلیک، بساز | با نوا، اصفہان، بزرگ، نواز
کوچک استاد، عراق و زنگولہ | پس حسینی و رہاوے و حجاز

ہر شعبہ چند نغمون سے مرکب ہی۔ یہ نغمات بے شمار ہین اور ہر ایک جدا جدا نام سے موسوم۔ ان کے گانے کے لئے مختلف اوقات مقرر ہین۔ زیر وبم کے واسطے جداگانہ قواعد واصول منضبط ہین۔ ہندی راگ، فارسی سے بھی قدیم تر اور زیادہ نازک ووسیع ہے۔ اہل ہند الحان وآواز کو اپنی اصطلاح مین "سُر" کہتے ہین ان کی تعداد سات ہی۔ انھین سے "سرگم" بنتا ہے۔ ان کے راگ چھ ہین اور ہر راگ کے متعلق پانچ راگنیان ہر ایک کے لئے فصل و وقت مخصوص ہین۔ مختلف اندام واشکال کے سازہائے کوچک وبزرگ حسب ضرورت وضع واختراع کئے گئے ہین جن سے گوناگون آوازین نکلتی ہین۔ ہندی وایرانی دونون راگون پر ماہرین فن نے کثیر التعداد اور قابل اعتبار کتابین لکھی ہین اور اس فن کے کمالات ولطائف اور معلومات مین برابر اضافہ کرتے رہے ہین۔ ایرانیون نے ہندوستان آکر یہان کی موسیقی کو سیکھا اور حد کمال تک پہونچایا ہے دونون کی آمیزش وترکیب سے ایک تیسری چیز نکالی ہی جو زیادہ لطف انگیز ہوگئی اور جان تازہ بخشتی ہی

تقریباً تمام السنہ یورپ مین یہی لفظ کسی قدر اختلاف املا وتلفظ کے ساتھ آتا ہے مثلاً انگریزی مین میوزک Music، فرانسیسی مین میوسیق Musique، پرشن (جرمن) مین میوزیکا Muzica ہسپانوی وپرتگالی واطالوی ولاطینی مین میوسیکا Musica، گریک یا یونانی مین میوسیکے Musikē، اور اس سے مراد وہ صنائع وفنون لئے جاتے ہین جنپر اُنکے زعم مین میوز Muse دیویان کارفرما ومجلس آرا ہوتی ہین خصوصاً علم موسیقی۔ اور وہ منظومات جو سرود وبربط پر گائے جاتے ہین اور جن کی ترکیب فن موسیقار کے اصول وضوابط پر مبنی ہو اور جو ساز وآلات پر سامعہ نواز ہون اہل یونان اسکے معنی میوز دیوی کے تعلق سے عموم فنون لطیفہ کے لیتے ہین۔ انگریز اہل لغت کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم ہی (۱) ترانہ وسرود (۲) تال میل اور سُر (۳) آواز کا تواتر جس کا نغمہ یا الاپ کانون کو خوش کردے یا بیک وقت صداؤن کا وفاق واتحاد کے ساتھ بلند ہونا۔

ایک انگریز فلسفی جان لاک (۱۶۳۲ تا ۱۷۰۴ء) کا قول ہی کہ مضراب اور مزامیر، رقص وسرود اور نغمہ وترانہ دنیا مین بہت سے لوگون کے لئے وہ کیفیت واثر رکھتے ہین جو ان کے لئے عبادت ودعا، تضرع وزاری مین مضمر وممکن ہی"

چاہیے است کہ ہر کہ چہل روز آب از و آشامد، شناسائی وحسن منظر افزاید"

ایک صاحب حال بزرگ فرماتے ہین کہ سماع (موسیقار) راحت دل اور اہل محبت کو جنبش دینے والا ہے جو بحر محبت مین شناوری کرتے ہین۔

دوسرے وسیع النظر محققین نے اسکی جامع تعریف یون کی ہے کہ "خوش آہنگی کے ساتھ آواز نکالنے یا ترنم کا فن، جو اصول اتحاد صدا، اسکے مقصودات ومتعلقات و وسائط تصدیہ باہمی پر حاوی ومنضبط ہے"

متقدمین کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ نغمات کا چھیڑنا، ہوا کو مسخر کرنا اور گرہ باندھنا ہے۔

صوفیاے کرام نغمہ وغنا سے لطف خاص اور وجد وعرفان پاتے رہے ہین۔ اُن کا ارشاد ہے کہ اَلغِنَاءُ غِذَاءُ الاَروَاح سید الطائفہ جنید بغدادی فرماتے ہین کہ "میثاق کے روز عذوبت کلام اَلَستُ بِرَبِّکُم سے ارواح کو جو لطف آیا تھا اب تک وہی باقی ہے"، سلطان نظام الدین اولیاء فرماتے تھے کہ "مینے ایک موقع پر اَلَستُ بِرَبِّکُم پوربی کی راگ مین سُنا تھا جس کا لطف ہنوز باقی ہے"

۱۳۳ مسلمانون کے عہد حکومت مین بلکہ اُن کے تسلط وفتح ہندوستان کے آغاز سے اس ملک مین بھی فن موسیقی نے بڑی ترقی کی۔ مسلمان بادشاہون نے ماہران فن اور اہل کمال کی ہمیشہ قدر دانی و سرپرستی فرمائی ہے ایسے حضرات کا حصر وشمار نہ آسان ہے نہ ممکن بہت سے ایسے دانایان فن گزرے ہین جنکو نام ونام زندہ جاوید رہین گے۔ البتہ وہ اہل موسیقی جنھون نے اپنی تغنی وترنم وآواز یا آلات سرود وساز کی بدولت شہرت وبقاپائی جن کا اکرام واحترام معاصرین وپس آیندگان نے ملحوظ رکھا، جنکے نام نامی تاریخ نگار و تذکرہ نویس نسلاً بعد نسل لکھتے اور بتاتے چلے آئے ہین ایسے اُستادان مسلم الثبوت کی فہرست یہ ہے (۱) گوپال (۲) امیر خسرو، شاعر مشہور (۳) بیجو (۴) بھانو (۵) بنڈوا (۶) بخشو (۷) لوہنگ (۸) سلطان حسین شرقی بادشاہ جون پور (۹) راجہ مان باشندہ گوالیار جو دھرپد کا موجد ہے اور جس کے زمانہ مین چار اور اہل کمال موجود تھے، یعنی (۱۰) چرجو (۱۱) بھگوان (۱۲) دھوندہی (۱۳) ڈالو (۱۴) تان سین جس نے اکبر اعظم کے عہد مین عروج وشہرہ پایا اور جسکو اُسکے آقاے سابق راجہ رام چند نامی نے بادشاہ کی خواہش سے دربار اکبری کے نذر کر دیا تھا اور جہان اسنے ۳۴ سنہ جلوس یعنی ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) مین وفات پائی (۱۵) سبحان خان (۱۶) سُر گیان خان ساکن فتح پور (۱۷) میان چند یا چاند خان (۱۸) اُس کا بھائی، سورج خان (۱۹) تان ترنگ خان پسر تان سین (۲۰) مدن رائے (۲۱) رام داس (۲۲) اُسکا لڑکا سور داس جو نابینائے مادر زاد اور شاعر اور علم اخلاق کا ماہر اور دانائے موسیقی تھا (۲۳) باز بہادر (۲۴) مونڈبا (۲۵) میان دند (۲۶) میان داؤد (۲۷) مُلّا اسحاق (۲۸) شیخ خضر (۲۹) شیخ بیجو (۳۰) حسن خان ٹینی (۳۱) سورت سین (۳۲) اُس کا بھائی لالہ بیبی (۳۳) مرزا عاقل (۳۴) میان شوری (۳۵) علامی

میر شیر علی افسوس[۱۳۴]، پروفیسر فورٹ ولیم کالج اپنی تاریخ ہندوستان موسومہ آرایش محفل[۱۳۵] مین تحریر کرتے ہین کہ "قصبۂ بلگرام مین ایک کنوان ہی۔ جو کوئی چالیس دن متصل اُس کا پانی پیئے خوب گانے لگے"، مین نہین کہہ سکتا کہ اس قول کی اصلیت کیا ہی اور افسوس کے ذرائع تحقیق و تصدیق کیا ہین۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ضعیف الاعتقادی کی باتون یا لغو خیالات اور روایات کے نقل کرنے سے اس کتاب مین معمولاً احتراز و اجتناب کیا گیا ہی۔ اس کی اشاعت نوّاب گورنر جنرل بہادر آرل آف ڈلہوزی کی منظوری و فرمان سے ہوئی تھی اور اسکی ترتیب و تالیف (سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق سنہ ۱۸۰۵ع مین) اُسوقت کے سر رشتۂ تعلیم کے اکابر و مہرہ کی ہدایت و ارشاد سے مسٹر جے سی ڈیمیس نے رپورٹ مردم شماری اور مسٹر ولیم آرڈین نے پرانے گزٹیر مطبوعہ سنہ ۱۸۷۸ع مین بھی اس روایت کو نقل کیا ہی۔

اِسی قسم کی روایت ہندوستان کے سب سے نامور اور کامل ترین گوّیا، میان تان سین کی نسبت مشہور ہے جسکو امپیریل گزٹیر نے بھی نقل کیا ہی۔ تان سین کی قبر گوالیار مین شیخ محمد غوث کے

(۳۶) میان لال یا لال خان (۳۷) نیلم پرکاش اور دوہین نواز، (۳۸) فیروز خان (۳۹) نوبت خان (۴۰) منجھو قوال، جسکے کمال اور خدا پرستی کا اکبر بڑا معتقد اور قائل تھا اور جس کی عطا و بخشش کا ایک واقعہ "دربار اکبری" مین بھی منقول ہے۔

شعرا کے بعد ہی اکبر کے دربار کے ممتاز "خنیاگرون" نے آئین اکبری مین ممتاز جگہ پائی ہی۔

۱۳۴ھ میر شیر علی افسوس، میر علی مظفر خان، داروغہ نوبت خانہ نواب قاسم خان عالی جاہ کے بیٹے، نارنول کے رہنے والے تھے سلسلۂ نسب امام ہمام جعفر صادق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ لڑکپن مین باپ کے ساتھ دہلی سے لکھنو چلے آئے تھے حسب روایت گلشن بیخار میر حیدر علی حیران، جہان آبادی سے تلمذ تھا۔ پہلے آصف الدولہ کے چچا نواب اسحاق خان کے بعد ازان مرزا جوان بخت بہادر کی سرکار مین، ملازم رہے۔ پھر مسٹر بارلو اور مسٹر گلکرسٹ، قدر شناسان علم و ہنر کے حسب الطلب، مسٹر اسکاٹ رزیڈنٹ کی تجویز سے، معقول مشاہرہ پر سنہ ۱۸۰۰ع مین کلکتہ چلے آئے۔ نو برس زندہ رہے۔ فارسی سے ریختہ مین ترجمہ کرنے کی خدمت پر مامور رہے۔ گلستان کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا تھا۔ ہندوستان کی یہ تاریخ (آرایش محفل) اردوئے مروجہ مین لکھی۔ منشی سجان رائے کھتری کی تالیف خلاصۃ التواریخ یا خلاصۃ الہند سے زیادہ تر استفادہ کیا ہے۔ کلکتہ مین سنہ ۱۲۲۱ھ (سنہ ۱۸۰۶ع) مین

مزار کے قریب واقع ہے۔ پہلے اس قبر پر املی کا ایک درخت چھایا ہوا تھا جسکی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ جو شخص اسکے پتے چبا لیتا ہے قدرتِ خدا سے اُسکی آواز نہایت رسیلی اور پیاری ہو جاتی ہے۔ ناچنے گانے والے طبقہ کے لوگ بڑی عقیدت سے اسکو کھاتے اور قدر کرتے تھے۔

اس فضل و کمال معنوی کے باوجود میر صاحب "صناعات و فنون سپاہگری مین معرکہ پرداز دن کے پیشوا اور ورزش اسلحہ و آلات حرب و ضرب مین ہنر سازون کے اُستاد" بقول میر غلام علی آزاد تھے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل مبرور کے مدحیہ قصیدہ مین فخریہ فرماتے ہین ؎

زفضل گر گزرم، تیغ و نیزہ می گیرم | کہ بر جلادت من شاہد اند این دو گوا
زذوالفقار چو برہان قاطعے دارم | بروز معرکہ فیصل نمایم این دعویٰ

شہسواری و فراست کے فن مین بھی طاق تھے گھوڑے پر خوب چڑھتے۔ اپنے بعض اعزہ کو بھی اسکے نکات و پیچ بتائے اور سکھائے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ مین ان کمالات مردانہ کی بڑی قدر تھی اور کوئی شخص اُس وقت تک کامل نہین سمجھا جاتا تھا جب تک سیف و قلم دونون کا مرد بلکہ فرد نہ ہو۔

عربی و فارسی و ترکی و ہندی چارون زبانون مین بڑی طلاقت و روانی سے گفتگو کرتے اور بے تکلف، نہایت پُرلطف شعر کہتے تھے۔

ذوق سخن میر عبدالجلیل کو بزرگان کرام کے کلام سے بڑی الفت تھی۔ مثنوی مولانا روم اکثر زیر نظر رہتی۔ خواجہ حافظ شیرازی کا کلام بہت پسند تھا۔ اکثر غزلین اور اشعار اُنکی زبان پر رہتے تھے۔ امیر خسرو کے ساتھ اِن کو بڑا شغف اور اُن کے کلام سے عشق تھا۔ اپنے قصائد و مثنویات مین

امانت حیات سپرد کی۔

۱۳۵؎ آرایش محفل کا ترجمہ میجر ہنری کورٹ Major Henry Court نے انگریزی مین کیا تھا جس کو پانیر پریس الہ آباد نے ۱۸۶۱ء مین باز دیاد حواشی و فوائد بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

اس التفات وتعلق قلبی کی جھلک دکھائی اور اپنا اور امیر کا تقابل و توازن کیا ہے جس کا انشاء اللہ محل مناسب پر بیان کیا جائے گا۔ امیر کی یہ غزل خاص کر پسند تھی، اوقات خاص مین جب لطف و سرور مین ہوتے تو اکثر پڑھا کرتے اور اپنے دوستون کو سنایا کرتے تھے یہ غزل قاضی شیخ محمد حافظ کو بھی یاد کرادی تھی جس کو قاضی صاحب بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور کیفیت و لذت پاتے تھے جسکی تعبیر زبان قال سے نہین کرسکتے تھے ؎

یار قبا چست کرد، رخش بہ میدان برید — این سر و ہر سر کہ ہست، در خم چوگان برید

غمزہ زن یار رسید، ساختہ دار یم جان — یوسف ما بازگشت مژدہ بہ کنعان برید

مست خراب مرا حاجت نقل است اگر — این جگر خام سوز را بہ نمکدان برید

نیست دل چون مرغ درخور شاہین شاہ — پارۂ مردار را بر سگ دربان برید

بر دو رخ از خون نوشت خسرو دل خستہ حال — دہ زدل ماندہ ام قصہ بہ سلطان برید

حافظہ و یادداشت

میر عبد الجلیل کے حافظۂ قوی اور زبردست یادداشت نے اُن کی استعداد وہبی و کسبی کو غایت اقصیٰ پر پہونچا دیا تھا۔ قاموس[۱۳۶] اللغات اول سے آخر تک اُن کی زبان کی نوک پر

---

۱۳۶ قاموس ایک شرح کا نام ہے جو یوسف بن رافع نے "نصاب" کی لکھی تھی، ایک دوسری کتاب اسی نام کی طب مین بھی ہے جسکو مدین بن عبد الرحمن مصری نے گیارھوین صدی مین تحریر کیا تھا۔ مگر یہان مُراد اُس مشہور کتاب سے ہے جو شیخ مجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے عربی کے علم لغت، اُسکے اصول و تاریخ اور اشتقاق کے بیان مین تالیف فرمائی ہے شیخ کا مفصل تذکرہ امام جلال الدین سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ مین کیا ہے بروایت نور الصباح و مزہر از سیوطی، شیخ کا زمانہ آٹھوین صدی ہجری مین تھا، و ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) مین پیدا ہوا اور ۸۱۶ھ (۱۴۱۴ء) مین اس عالم آب و گل سے رخصت ہو گیا۔ زبید (یمن) مین شیخ اسمٰعیل جبرتی کے مقبرہ مین پیوند خاک ہوا۔

تھی۔ اسیطرح اور بہت سی مستند اور جامع کتابین جوکسی وقت نظر سی گزری تھین پیری و انحطاط عمر مین بھی بدستور یاد تھین۔ احادیث نبوی مع اسناد و اسمار الرجال اور اشعار

حافظ ابن حجر لکھتے ہین کہ شیخ اپنا نسب شیخ ابو اسحاق شیرازی تک پہونچاتے تھے۔ جب ترقی کی اور قضائے یمن کے والی ہوگئے تو حضرت صدیق اکبر کی اولاد سے ہونے کا دعوی کیا خود کو اپنے قلم سے صدیقی لکھنے لگے۔ سریع الحفظ تھے۔ فرمایا کرتے تھے "کہ مین اسوقت تک سوتا نہین جب تک دو سو سطرین حفظ نہین کر لیتا ہون" وطن سے رحلت فرماکر پہلے واسط پہونچے پھر بغداد آئے۔ وہان سے دمشق گئے۔ جو اسوقت علوم و فنون اسلامی کا مرکز و مخزن اور اہل علم کا مرجع بنا ہوا تھا۔ حافظ ابن قیم اور تقی سبکی اور ستّو سے زائد دیگر علماء و فضلاء سے تحصیل کی پھر بعلبک اور حماة اور حلب پہونچے اور ان جہات کے مشاہیر سے سماعت کی۔ قدس مین دس برس کے قریب قیام فرمایا۔ درس دیا۔ صدر رہے۔ ان کے فضائل و محاسن دیکھ کر اکابر کی ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہوئی۔ صلاح صفدی اسی زمانہ کے تلامذہ سے تھے۔ شیخ نے وہان سے نکل کر بلاد شمال و مشرق کی سیاحت فرمائی۔ روم پہونچے ہمارے ہندوستان کی زمین نے بھی ان کے قدم چومے تھے۔ یہان سے یمن گئے۔ جمال ریمی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ملک اشرف اسمعیل نے اُن کی قدرشناسی و تعظیم کی خود سلطان نے ان کے روبرو زانوے ادب تہ کیا۔ ارکان مملکت نے بھی ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ پھر سارے یمن کے قاضی مقرر ہوئے۔ سلطان اشرف نے ان کی دختر طلعت و باہنر دختر سے شادی کی جسکے حسن و جمال کی توصیف مین مورخین نے بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ زبید کی خاک اور اہل زبید کی اخلاق و اکرام نے ان کو اپنا کرلیا اور یہ وہین کے ہو رہے۔ البتہ مکہ معظمہ کو چند بار آئے تھے۔ مدینۂ منورہ اور طائف شریف کی بھی مجاورت فرمائی تھی

خزرجی لکھتے ہین کہ جب شیخ نے ۷۹۹ھ (۱۳۹۶ء) مین مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا تو سلطان کو ایک عرضداشت لکھی جس مین اپنی کہولت و پیرانہ سالی نحافت جسم اور ضعف قوے کا اظہار کیا اور لکھا تھا کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث سامع شریفہ مین بارہا گذری ہوگی کہ سیدنا رسول اللہ نے فرمایا ہے اذا بلغ المرء ستین سنة فقد اعذر اللہ الیه جس کا سن ساٹھ برس سے متجاوز ہوجاتا ہے۔ اسکو خداے تعالیٰ ابھی معذور رکھتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ ستر سے بھی گذر چکا۔ اسّی کے قریب پہونچ رہا ہون۔ بیت رب العالمین اور زیارت سید المرسلین کا شوق و عزم بیحد بیچین کر رہا ہے۔ مجھے اجازت روانگی دیجیے۔ اسکے سوا کچھ نہین چاہتا،

شوقی الی الکعبة الغراء قد زادا ۔۔۔ واستحمل القلص الرخادة الزادا

واستاذن الملک المنعام زید علےٰ ۔۔۔ واستودع اللہ اصحابا واولادا"

و امثال چاروں زبانوں (عربی، فارسی، ترکی اور ہندی) کے اُنکے خزانہ دماغ میں اسدرجہ محفوظ تھے کہ سُننے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ تاریخ سے فطری محبت اور طبیعت کو لگاؤ تھا اس لئے بڑے بڑے واقعات اپنے سلسلۂ وقوع کے ساتھ انکو ایسے یاد تھے جیسے کہ انکے پیش نظر گذرے ہوں

سلطان اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوگیا اور طُرّہ کتاب (خطا کی پیشانی) پر لکھا کہ اس کا جواب وہی ہے جسکو صدرالجمال مصری میری زبان سے ادا کر گیا ہے "اس کے لئے نہ لب کھلتے ہیں۔ نہ زبان جنبش کرتی ہے نہ نطق یاری کرتا ہے نہ قلم چلتا ہے۔ یمن عُمیاء (نابینا) تھا۔ آپ نے منوّر فرمایا۔ روشنی پھیلائی۔ ہم آپ سے کیونکر کچھ کہہ سکتے ہیں۔ علم مُردہ ہوچکا تھا آپ کو علم ہے کہ آپ ہی کی بدولت اللہ جل شانہٗ نے اُس کو زندہ کر دیا۔ اے مجدالدین! آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خود بھی قسم کھاتا ہوں کہ اِس خدا کی دی ہوئی عمر میں سے جو کچھ باقی ہے اُس کے لئے دُنیا اور نعیم دُنیا کا چھوڑنا برداشت کر سکتا ہوں مگر یمن اور اہل یمن سے آپکی مفارقت گوارا نہیں کر سکتا" شیخ علامہ شوکانی لکھتے ہیں وفی ھذا الکلام عبرۃ للمعتبرین من افاضل السلاطین بتعظیم قدر علماء الدین۔

ان کے ہزارہا تلامذہ تھے۔ حافظ ابن حجر، مقریزی و برہان حلبی کے نام سرفہرست ہیں احمد بن محمد بن عبدالسلام نے بھی بہت سے حالات البدرالطالع من الضوء اللامع لاہل القرن التاسع میں لکھے ہیں۔

کامل ہوش وحواس اور صحت سماعت و بصارت کی حالت میں شب بستم ماہ شوال ۸۱۷ھ (۴ جنوری ۱۴۱۵ء) کو رحلت کی۔

تقی کرمانی لکھتے ہیں کہ مجدالدین نظم و نثر فارسی میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔

تصانیف کثیرہ چھوڑی ہیں۔ لغت و تفسیر و حدیث کی کتابوں کا شمار چالیس سے متجاوز ہے جسب ذیل بالتخصیص قابل ذکر ہیں۔

تفاسیر میں:
۱۔ بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز۔ دو جلدیں۔ یہ تفسیر فیروزآبادی کے نام سے بھی مشہور ہے
۲۔ الدرالنظیم المرشد الٰی مقاصد القرآن العظیم۔
۳۔ تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباس۔ چار مجلد میں۔

حدیث میں:
۱۔ فتح الباری فی شرح البخاری۔ چالیس جلد میں لکھنے کا ارادہ تھا مگر پیغام اجل نے مہلت نہ دی بیس جلد مکمل کر پائی تھیں (ابن حجر نے بھی اپنی شرح کا یہی نام رکھا ہے ممکن ہے کہ عدم آگاہی اسکا باعث ہوئی ہو)
۲۔ امتضاض السہاد فی افتراض الجہاد۔
۳۔ الاسعاد بالاصعاد الٰی درجۃ الاجتہاد۔ تین جلد میں۔
۴۔ تسہیل طریق الوصول فی الاحادیث الزائدۃ علے جامع الاصول۔

دکن میں میر صاحب کو مرزا یار علی بیگ [۱۳۰۵ھ] سوانح نگار حضور معلّٰی کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا مرزا کا معمول اور ضابطہ معین تھا کہ ہمیشہ کتاب قاموس کی تصحیح و مقابلہ کرتے رہتے تھے اور اپنے وقت کا ایک حصہ اسی شغل میں صرف فرماتے تھے۔ میر صاحب نے حاضرین محفل سے چند اشکالات

۵۔ الاحادیث الضعیفہ۔
۶۔ الدر الغالی فی الاحادیث العوالی۔
۷۔ سفر السعادہ۔

تاریخ و اخبار میں { المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ۔

نفیس و بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ صرف ایک ہی ذخیرہ پچاس ہزار مثقال سونے میں خریدا تھا۔ اس ابجد خواں علم نے جس وقت کہ اُس کو کتاب کے سیدھا رکھنے کی تمیز بھی نہ تھی بعض مبتدی طلبہ کو معارضہ کرتے سُنا تھا کہ شیخ کی زبان مستند نہیں۔ وہ محاورات میں لغزش کر جاتا اور اپنی مادری زبان (پارسی) کے تتبع و تقلید میں ایسی بات کہ جاتا ہے جس پر اعراب ہنستے ہیں۔ اسکی تائید میں میرے ہمدرس اعزاء سراپردۂ عصمت وحجاب تک لے جاتے اور مجلہ عروسی کی "اقتلی السراج" والی نقل کر ڈالتے تھے مگر آج وسعت نظر اور قدرے تحقیق کے بعد یہ باتیں افسانہ و حکایت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ بیشک شیخ شہر فیروز آباد (مضافات شیراز) کا رہنے والا تھا۔ شہر گازرون (فارس) میں پیدا ہوا مگر اُس نے ایک بیگانہ زبان میں وہ تبحر حاصل کیا کہ چھ سات سو برس سے برابر اُسکی تحقیق مُستند اور اُس کا فیصلہ معتمد مانا جاتا ہے اور دُنیائے علم و ادب میں اُسکی وہ قدر و عزت کی ہے جسکی مثال پائی نہیں جاتی۔ شیخ کی عظمت ایک دوسری حیثیت سے بھی کی جاتی ہے جسکی نسبت نامۂ دانشوران ناصری اشارہ کرتا ہے "شیخ مجد الدین فیروز آبادی شافعی کہ از اکابر متاخرین فن حدیث است"۔ امام صفدی اور ابن ہشام وغیرہما کو شیخ سے استفادہ و تلمذ پر فخر تھا۔

قاموس کا پورا نام القاموس المحیط والقابوس الوسیط الجامع لما تفرق فی کلام العرب شماطیط ہے دیباچہ نگار ناقل ہے کہ فیروز آبادی نے قاموس سے پہلے اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب فن لغت میں ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی۔ یہ لغت کی مشہور کتابوں محکم (مجھے تلاش سے نہیں ملی) اور عباب (مصنفہ الصاغانی متولد ۵۷۷ھ متوفی ۶۵۰ھ) کے بعد اس فن کی سب سے بڑی کتاب تھی۔ اسی لامع جامع کا ایجاز و اختصار کرکے قاموس دو جلدوں میں رکھی گئی۔

سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس نے خود شیخ کی قلمی تحریر دیکھی تھی جسمیں جلد اول کے نسخہ دوم پر لکھا تھا کہ اُس نسخہ کی تبئیض سے ذیحجہ ۷۶۸ھ (اگست ۱۳۶۷ء) میں شیخ نے فراغت پائی۔ شیخ کی دیگر تالیفات (فقہ جامع میں) سفر السعادۃ اور بصائر بھی ایسی ہی بلند پایہ ہیں۔

قاموس کے لفظی معنی دریائے عمیق یا جائے ژرف ترین از دریا کے ہیں۔ قاموس اللغۃ بھی واقعی ایک

قاموس کے بیان کئے۔ کوئی صاحب عقدہ کشائی نہ کرسکے۔ آخر خود میر صاحب کو اُن مقامات کو حل کرنا اور سمجھانا پڑا۔ سب نے تحسین و آفرین کی یہی ذریعہ تعارف اور سلسلہ مروت تھا جس نے مرزا یار علی بیگ کو انکی قدر شناسی پر مائل کردیا۔ وہ کمال عنایت و نوازش فرماتے تھے اور بالآخر

ایک گہرا سمندر ہے جس سے غواص و متلاشی اپنے دسترس و استعداد کے مطابق ادب و انشا کے لآلی بے بہا نکال لاتے ہیں۔ نور الدین علی بن محمد بن علیف کی اسکی مدح میں کہتا ہے۔

قد مد مجد الدین فی ایامہ من بعض ابجد علمہ قاموسا

شیخ کی محنت و کمال کی داد یگانہ و بیگانہ سب نے دی ہے لیکن مشیت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سب سے زیادہ اعتناء انھیں گہر شناسوں نے کیا ہے جنکو قدر کمال دیار اغیار سے کھینچ لائی تھی۔

(۱) محمد بن الطیب الفاسی شیخ کا شاگرد، مراقش کا رہنے والا تھا جس نے قاموس کی بڑی عالمانہ شرح سب سے پہلے لکھی

(۲) ملا علی القاری سا ہمہ گیر دہمہ داں ایک شرح "ناموس" لکھ کر اپنی جوہر شناسی کا حق ادا کرکے اہل علم پر بڑا احسان کرگیا ہے

(۳) سید مرتضیٰ زبیدی یمنی جسکا مسقط الراس ہندوستان تھا ایک مکمل شرح تاج العروس کے نام سے لکھ کر اہل ذوق کو صلائے عام دے گیا ہے۔

(۴) عاصم آفندی نے قاموس کا ترجمہ ترکی میں اور (۵) فری تاگ Freytag نے ترکی سے اپنی زبان میں کیا۔

(۶) گولیس Golius نے اس کو لاطینی زبان میں منتقل کیا اور حسب ضرورت کہیں ایجاز سے اور کہیں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔

(۷) شرق نوازان فرنگ میں سے موسیو فل جینس فرسنل M. Fulgence Fresnel اور پادری جے آر ٹی لائیڈر Rev. J. R. T. Lieder جنھوں نے اپنی عمر مصر و قاہرہ میں گزار دی تھی اسکے حافظ ہوگئے تھے۔

(۸) سب سے زیادہ قابل فخر اور مستحق ستائش مدّ القاموس ہے جو ۱۸۶۳ء میں انگلستان میں چار جلدوں میں شائع ہوئی ایڈورڈ ولیم لین Edward William Lane نے پورے بیس سال یا یوں کہئے کہ اپنی عمر عزیز اسی کی تالیف میں گزار دی تھی۔ ولایت کے ایک دولتمند و علم دوست امیر ڈیوک آف نارتھمبرلینڈ نے سرپرستی و دستگیری کی اور سرمایہ کافی بہم پہنچا دیا کہ غریب الدیار لین سات سال سے زائد مع قبیلہ و خانماں کے قاہرۃ الکبریٰ میں مقیم رہا۔ اسکے بعد سرکار برطانیہ اور وزرائے مملکت نے بھی فیاضی کی۔ ایڈورڈ اسٹینلی لین پول E. S. Lane—Poole نے جو ایڈورڈ لین کا برادر زادہ اور نسخ کا بڑا ماہر خطاط تھا عربی کا ٹائپ اختراع اور تیار کیا۔ اور یہ

میر صاحب کے کمالات صوری و معنوی گزارش کر کے علم دوست بادشاہ کی خاطر فیوض مآثر کو انکی طرف متوجہ کر دیا۔

میر عبد الجلیل کے بے مثل حافظہ کا ایک واقعہ اور نقل کیا جاتا ہے۔ نواب امیر الامرا کی مجلس میں یہ سوال درپیش تھا کہ از روے نزول قرآن کون سی آیت سب سے آخری ہے بعض نے کہا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ (اب ہم تمھارے لئے تمھارے دین کو کامل کر چکے جزء ۶۔ سورۃ المائدہ۔ع ۱۔ ۵) بعض نے کسی دوسری آیت کو بتایا لیکن میر صاحب نے فرمایا کہ حقیقتاً یہ آیات اخیر نہیں ہیں۔ آخر حقیقی تو سورۂ بقر کی دو سو اسی وین (دو صد و ہشتادم) آیۃ ہے یعنی وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (اور اُس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو ما اُسکے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا اور لوگوں پر ظلم نہ ہوگا جزء ۳ سورۃ البقرہ۔ ۶۔ ۳۸) اور تفسیر بیضاوی کی

(عربی سے انگریزی بتانے والی) جامع و مکمل لغت لندن میں دو جلدوں میں طبع ہوئی۔ ہر جلد میں دو دو حصے ہیں۔ نقل و کتابت میں شیخ ابراہیم المعروف بہ عبد الغفار الدسوقی لین کے دست و بازو تھے بقول مصنف اس کتاب پر یہ نام دونوں معنی سے صادق آتا ہے (۱) دریا کا بڑھنا یا کشش۔ حقیقتاً یہ ایک سمندر کا تموج ہے (۲) اصل قاموس کا تتمہ یا ضمیمہ جسمیں بقدر معتد بہ افزونی کی گئی ہے۔ لین کی وفات کے بعد اسٹینلی لین پول Stanley Lane—Poole نے بقیہ اجزاء و حصص کی ادارت و اشاعت کا فرض انجام دیا۔ ۱۸۹۳ء میں سب سے آخر جلد اول کا آٹھواں حصہ مطبع سے نکلا۔ مجموعاً اس کام میں پچاس سال صرف ہوئے۔ جلد دوم کی تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ مصنف نے غرائب لغات و شواذ و نوادر کو اس میں یکجا کرنا چاہا تھا مگر پورا نہ کر سکا کچھ اجزاء مرتب کر پائے تھے کہ پیغام مرگ پہنچ گیا (ایڈورڈ ولیم لین ایک اور علمی یادگار الف لیلہ کا ترجمہ چھوڑ گیا ہے جو ۱۸۳۹ء میں کیا تھا)

(۹) ان سب کے بعد اور سب سے تازہ تلاش و کاوش الجاسوس علی القاموس ہے۔ جو احمد فارس افندی الشدیاق صاحب الجوائب کی ضخیم تالیف ہے اور ۱۲۹۹ھ میں قسطنطنیہ کے مطبعۃ الجوائب سے لاجواب ٹائپ اور بڑے اہتمام سے شائع ہوئی۔ ص

۱۳۷ مرزا یار علی بیگ بڑا صاحب استعداد، خوش سلیقہ اور بارسوخ امیر تھا۔ خلد مکان اورنگ زیب کے

ص ۱۰۱۲) القول المانوس فی صفات القاموس میں مفتی محمد سعد اللہ رامپوری نے اس کتاب کی خوبیاں اور خصوصیتیں پوری تفصیل اور مکمل تحقیق کے ساتھ بیان کی ہیں۔

عبارت بھی بلفظہا پڑھ دی کہ ابن عباس؁۱۳۹ فرماتے ہیں کہ یہی نزول اخیر ہے جسکو جبریل علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ اصفہانی کہتے ہیں کہ یہ نزول وفات شریف سے ایک یوم پیشتر ہوا بعض سات دن اور بعض صرف تین ساعت؁۱۵۰ بتاتے ہیں تمامی حضار مجلس انکی اس تقریر اور یادداشت سے متحیر ہوگئے

مزاج میں بہت دخل رکھتا تھا۔ رقعات عالمگیری میں کئی جگہ بادشاہ نے اسکا نام لیا ہے۔

؁۱۳۸ ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد الفارسی البیضاوی، صاحب تفسیر مشہورہ شافعی مذہب تھے۔ موضع بیضا (وژسپیا) شیراز میں واقع ہے۔ قاضی علامہ اور امام لکھے جاتے تھے کچھ مدت تک شیراز کے قاضی یا چیف جج رہے تھے۔ تاج الدین سبکی نے طبقات الکبرےٰ میں نقل کیا ہے کہ بیضاوی جب قضائے شیراز سے مصروف و معزول ہوئے تو تبریز (طارس) چلے آئے۔ ایک مجمع فضلا میں پہنچے اور پایان مجلس بیٹھ گئے کسی نے ان کو پہچان نہیں پایا۔ مدرس نے ایک نکتہ اس خیال سے پیش کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اسکے جواب پر قادر نہ ہوگا اور احلال اشکال چاہا۔ بیضاوی نے اسکو نہایت خوبی و فصاحت سے بیان کیا بلکہ خود مقرر کی غلطی بھی بتادی۔ وزیر سلطنت اس موقع پر موجود تھا۔ وہ بیضاوی کو اٹھاکر اپنے قریب لے آیا اور ان کے احوال کی تحقیق کی۔ عرض کیا کہ بیضاوی ہوں قضائے شیراز کی طلب و سعی میں آیا ہوں وزیر نے بڑا اکرام و احترام کیا اور خلعت دیکر اسی روز رخصت کردیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مدت دراز تک وہاں مقیم اور وزیر کی دربارداری کرتے رہے۔ پھر شیخ محمد بن محمد کختائی سے سفارش و امداد چاہی شیخ جب معمول وزیر کے پاس آئے تو فرمایا کہ "یہ شخص مرد عالم و فاضل ہے امیر کے ساتھ سعیر میں اشتراک چاہتا ہے یعنی نار میں بقدر سجادہ جگہ مانگتا ہے کہ وہی مجلس حکم ہے" شیخ کے اس ارشاد سے بیضاوی ایسے متاثر ہوئے کہ منصب و رفعت دنیوی چھوڑ چھاڑ کر آخر حیات تک شیخ کے ملتزم خدمت رہے اور مرے تو انکی قبر کے پاس دفن ہوئے وفات تبریز میں ؁۶۸۵ھ (؁۱۲۸۶ء) میں پائی تھی بعض کہتے ہیں کہ ؁۶۹۱ھ (؁۱۲۹۲ء) میں۔

یہ تفسیر موسوم بہ انوار التنزیل و اسرار التاویل شیخ ہی کے اشارے سے لکھی تھی۔ یہ نہایت مستند اور بڑے پایہ کی کتاب ہے اہل نظر کا فتویٰ ہے کہ یہ تفسیر عظیم الشان غنی عن البیان ہے۔ اعراب و معانی کے متعلق اسمیں جو کچھ لکھا ہے اسکی تلخیص کشاف سے کی ہے حکمت و کلام کے بارہ میں جسقدر مرقوم ہے اسکو تفسیر کبیر سے لیا ہے اشتقاق و غوامض حقائق و لطائف اشارات کو تفسیر راغب سے استنباط کیا ہے پھر بہت سے وجوہ معقولہ و تصرفات منقولہ کا اضافہ اپنی فکر و اصابت رائے سے کیا ہے ہندوستان اور مصر کے کئی مطبعوں میں چھپی ہے۔

؁۱۳۹ حضرت عبد اللہ بن عباس کا بحر العلم خطاب اور ترجمان القرآن اور حبر الامۃ لقب تھا اعاظم صحابہ پیغمبر اور افضل اولاد عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھے حسب تحقیق قاضی نور اللہ شوستری تربیت تعلیم

میر محمد یوسف نے اپنے نانا کے اس تبحر و حفظ اسناد و تازگی علم سے متاثر ہو کر انکی شان میں فرمایا ہے

هو الامام الذی اقواله حجج ‏ ولا تفاوت اصلا فی روایته

فذاك فی الصدق مرآة بلا صدأ ‏ صان الاله صدوقا فی حکایته

خط

اوائل میں میر عبدالجلیل خط نسخ [۱۱۴۱] نہایت شیریں لکھتے تھے۔ پھر نستعلیق [۱۱۴۲ھ] سے ایک طبعی

زیر سایہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہٗ پائی تھی علم تفسیر و فقہ و حدیث و قرأت میں اُن کا علو درجت اہل خبرت و سیر میں مشہور ہے۔ صاحب استیعاب کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے اُن کی نسبت دعا فرمائی تھی اللهم علمه الحکمة و تاویل القرآن اور اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل اسلام کے متعلق آپ نے نہایت پسندیدہ علمی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کا کاشانۂ فیض طالبان علم و فقہ کا مرکز تھا۔ ارباب شوق جوق جوق آتے استفادہ و استفاضہ کرتے اور خوب سیر ہو کر جاتے اُنکے دوسرے بھائی عبیداللہ بن عباس بڑے اہل ہمت و کرم تھے۔ اُن کے مائدہ نعمت و خوان نوال سے ایک جماعت کثیر پرورش پاتی تھی "خوان احسان کشادہ و صلائے عام دادہ" انکی نسبت زبان زد خاص و عام تھا۔ ابن عباس کی ولادت شعب ابی طالب میں ہجرت سے تین سال پیشتر (۶۱۹ء) میں ہوئی اور جب رسالت پناہ نے روضۂ رضوان کا عزم فرمایا تو حضرت عبداللہ کی عمر ۱۳ سال تھی یا کچھ کم ۶۸ھ (۶۸۷ء) میں طائف شریف میں دار البقا کو رحلت کی۔ اکہتر یا بہتر سال عمر تھی۔

ادب و انشا کے بڑے شائق اور قدر شناس تھے۔ آپ کا قول ہے الشعر دیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانها۔ دوسری جگہ فرمایا ہے اذا سألتمونی عن غریب القرآن فالتمسوه فی الشعر۔

یہ حدیث حسن صحیح ترمذی میں ہے کہ نبی پاک صلعم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی۔ اذا سألت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ جب آپ کے پدر بزرگوار حضرت عباسؓ نے رحلت فرمائی تو ایک اعرابی ماتم گساری کے لئے آیا اور تعزیت میں یہ دو شعر پڑھے ؎

اصبر نکن بك صابرین فانما ‏ صبر الرعیة بعد صبر الراس

خیر من العباس اجرك بعده ‏ والله خیر منك للعباس

روش ایجاد کرلی تھی۔ یہ نہایت شیریں، دلنشیں اور پختہ تھی جس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ ذوق کتابت اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ قیام بھکر کے آخر ایام میں صحیح بخاری خود لکھ ڈالی تھی۔ مقابلہ کرنے کی فکر میں تھے کہ عزل خدمت ہو گیا

آپ بڑے ہیں صبر فرمائیے کہ ہم چھوٹے بھی صبر کریں۔ عباس کے انتقال سے آپ کو ایسی چیز مل گئی جو آپ کے لئے عباس کی ذات سے زیادہ نفع رسان ہے یعنی ثواب۔ اور عباس کو خدا مل گیا۔ جو اُن کے لئے آپ سے بہتر ہے۔

۱۴۰ ابن عباس کی یہی روایت انوار التنزیل و مدارک نے بھی نقل کی ہے اور شیخ عبد الحق دہلوی نے اپنی کتاب ماثبت بالسنتہ فی ایام السنتہ میں لکھی ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت یہ لکھتی ہے کہ اس آیت کے نزول کے گیارہ اور بروایتے سترہ روز بعد حضرت سرور کائنات مفخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے انتقال فرمایا۔ الشمامۃ العنبریۃ میں تحریر ہے کہ آیت مذکورہ کے اُترنے کے بعد حضرت صلعم اکیس دن یا اٹھارہ دن یا تین ساعت زندہ رہے تھے۔

۱۴۱ نسخ۔ چھ متعارف خطوں میں سے ایک ہے اس کو خواجہ عماد الدین یاقوت مستعصمی نے اختراع کیا تھا۔ اہل لغت نسخ کے معنی "زائل کرنا" یا کسی چیز کو اُس سے بہتر چیز دیکر رد کر دینا" بتاتے ہیں اس لئے جب خواجہ عماد نے اِس خط کو نکالا تو جتنے اور خطوط تھے اسکے سامنے منسوخ ہو گئے اور اس خط کا نام نسخ رکھا گیا ابو علی بن مُقلہ اس کے موجد مانے گئے ہیں جنھوں نے اس خط کو خط کوفی سے نقل کیا اور اپنے ادراک و شعور کے موافق اُسمیں اختراعات کیں اُن کا خط خوب تھا۔ لیکن علی بن ہلال الکاتب مشہور بہ ابن بوّاب کا یہ مرتبہ تھا کہ اُنھوں نے ابو علی کے طریقہ کی تنقیح و تہذیب کی اور اس کو بہجت و حلاوت کا جامہ پہنایا۔ تمام خوشنویس اُنکا تتبع کرتے آئے اور اُن کے منوال اور پرداز کتابت پر چلتے رہے ہیں۔ امام یافعی فرماتے ہیں کہ کتابت میں اُنکے برابر یا اُن کے نزدیک تک کوئی نہیں پہنچا۔ تاریخ مصر و قاہرہ میں لکھا ہے علی بن ھلال الامام الاستاذ ابو الحسن صاحب الخط المنسوب لفائق المعروف بہ ابن البواب کان ابوہ بوابا للبنی بویہ وقرء ھو القرآن وتفقہ وفاق اھل عصرہ فی الخط المنسوب حتیٰ شاع ذکرہ شرقا وغربا وکان ھو خادما لفخر الدولہ۔

تقدیر الٰہیہ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ملک بہاء الدولہ بن بویہ کا ایک ادنیٰ غلام قلم و کتابت کا شہنشاہ ہو جاتا ہے اور آفتاب کمال ہو کر چمکتا ہے۔ ابن بواب کی وفات جمادی الاول ۴۱۳ھ (اگست ۱۰۲۲ء) میں بتائی جاتی ہے لیکن قاضی نور اللہ شوستری ۴۲۳ھ (۱۰۳۲ء) لکھتے ہیں۔ دار السلام بغداد مدفن ہے اکثر شعرائے

شاہجہان آباد کے عزم سے نکلے۔ نوشہرہ میں جو سواد بھکر میں اُس وقت ایک موضع تھا اور اب نوشہرہ کے نام سے ایک مشہور مقام ہو گیا ہے، خیمے ڈال دیئے اور محض صحیح بخاری کی تصحیح و مقابلہ کے لئے وہاں چھ ماہ مکث و قیام فرمایا۔ بہت سے توابع و لواحق ہم رکاب تھے

معاصرین نے نہایت درد انگیز مراثی عربی میں لکھے ہیں۔

ف عربی کے بہترین اور نامآور لکھنے والوں کی فہرست میں دو یاقوت نہایت ممتاز و روشن نظر آتے ہیں۔

(۱) یاقوت الملکی۔ امین الدولہ ابو الذر یاقوت بن عبد اللہ الموصلی۔ جو سلطان ابو الفتح ملک شاہ بن سلجوق بن محمد بن ملک شاہ اکبر سلجوقی کا کاتب و خوشنویس تھا اُسی تعلق سے الملکی کہلاتا ہے۔ موصل میں ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں وفات پائی۔

(۲) یاقوت المستعصمی ابو المجد خواجہ عماد الدین یاقوت مستعصمی جس کا نام اوپر لیا گیا ہے مستعصم کا کاتب دیوان و خطاط تھا۔ ۶۹۸ھ (۱۲۹۸-۹ء) میں رہگرائے عالم جاودان ہوا۔

ص ۱۴۲ نستعلیق خط معروف ہے۔ یہ لفظ اصل میں نسخ تعلیق تھا۔ نسخ اور تعلیق دو خطوں کے نام ہیں جن سے یہ خط استخراج کیا گیا ہے۔ جب دونوں کی ترکیب سے ایک نام مقرر ہو گیا تو خائے معجمہ تخفیفاً حذف کر دی گئی۔ اِس خط نے بلاد ایران و ترکستان و کشمیر وغیرہ میں بہت عروج پایا۔ ممالک اسلامی میں امرا و سلاطین نے سرپرستی فرمائی اسکے ماہرین اور اہل کمال پر بخشش و عطا کے دریا بہا دیئے ہمارے ملک میں کوئی ایسا پرانا خاندان نہ ہوگا جسکے بزرگوں اور مورثوں نے ایک ایک حرف کے عوض ایک ایک اشرفی بلکہ نقد جان دیکر کوئی قطعہ یا وصلی نہ خریدی ہو۔ اسکا بہترین ذخیرہ تو فرنگستان میں قدرشناس نظروں اور زرپاش ہاتھوں کی معرفت منتقل ہو گیا۔ کم ہمت، پست حوصلہ اخلاف اس دولت گرانمایہ سے محروم رہگئے۔ جو کچھ باقی ہے وہ بھی رفتہ رفتہ رخصت ہو رہا ہے۔ اس خیال سے کہ کان میں پڑی ہوئی بات کبھی کام آتی ہے اس خط کے موجد اور بعض مشاہیر کاتبین کا مختصراً تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

واضع خط نستعلیق، خواجہ میر علی علوی تبریزی تھے۔ اِن کے حالات میں ایک پوری مثنوی انکے ایک شاگرد رشید مولانا سلطان علی نے لکھی ہے ؎

نسخ تعلیق اگر خفی و جلی است — واضع اصل خواجہ میر علی است
حسبش بود با علی ازلی — نسبش نیز می رسد بہ علی

ہزار ہا روپیہ صرف ہوگیا۔

اسیطرح دلائل الخیرات کا وہ نسخہ جو وظیفہ خاص مین تھا اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا تھا معمول یہ تھا کہ جب کتابت کا قصد کرتے تو پہلے ایک معین کاغذ پر حمد و صلوٰۃ لکھ لیتے پھر جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا اُسکو شروع کرتے۔ آخر عمر تک یہی عمل قائم رکھا۔ کتبخانۂ عظیم جو میر صاحب نے اپنی باقیات صالحات کے زمرہ مین چھوڑا تھا۔ اسمین کی اکثر کتابین خود اُن کے

تاکہ بودہ است عالم و آدم
ہرگز این خط نہ بودہ در عالم

وضع فرمود او ز ذہن دقیق
از خط نسخ و از خط تعلیق

نے ز کلکش از آن شکر ریز است
کاصلش از خاک پاک تبریز است

نہ کنی نفی او ز نادانی
بے ولایت نہ بودہ تا دانی

کاتبانیکہ کہنہ و نو ہند
خوشہ چینان خرمن اُویند

در جمیع خطوط بود سترگ
ز اوستادان شنودہ ام این حرف

خط پاکش چو شعر او موزون
ہست تعریف او ز حد بیرون

بُد معاصر بجمع الافضال
شیخ شیرین مقال شیخ کمال

آنکہ شعر خوش چو میوہ ہائے خجند
ہست شیرین تر از نبات و قند

ہمہ رفتند از جہان خراب
رخ نہفتند در نقاب تراب

بہر شان زانچہ خوانم و دانم
رَوَّحَ اللّٰہُ رُوحَہُم خوانم

خود مولانا سلطان علی مشہدی نے بھی اس فن کتابت کو بہت ترقی دی اور خط نستعلیق مین بقدر کمال کمال شہرت پائی۔ اپنے رسالہ منظومہ مین وہ لکھتے ہین کہ مین نے بظاہر اس فن کو استادان فن سے سیکھا ہے مگر حقیقتاً یہ رتبہ عالی محض حضرت امیر کرم اللہ وجہہ کی نظر مہر و توجہ سے حاصل ہوا ہے ؎

خواب را مختصر نمودم باز
قصہ خواب ہست و دیر و دراز

بندہ سلطان علی غلام علی است
شہرت خط او ز نام علی است

مؤلف حبیب السیر لکھتا ہے کہ یہ بڑے وجیہ صورت اور نیک سیرت تھے۔ خط نستعلیق مین ایسی مہارت تھی کہ متقدمین و متاخرین کو گرد کر دیا تھا۔ سلطان حسین مرزا کا زمانہ پایا بادشاہ کے ایما اور میر علی شیر کے التماس سے بہت سی کتابین لکھ ڈالی تھین شعر بھی کہتے تھے عمر ساٹھ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ مگر

دست وقلم کی درست و اصلاح کی ہوئی تھین ہر ایک کا مقابلہ بھی خود فرمایا تھا۔ بہت سے نسخے دست خاص سے لکھے تھے۔

کُتُب خَانہ

بُزرگان بلگرام کو خود کتابین لکھنے اور کُتُبخانہ جمع کرنے کا شوق تھا شیخ کمال فرشوری باوجود حکومت وتمول و تولیت اراضی و مدد معاش کے بدایت عمر سے نفس واپسین تک خدمت علم مین مصروف رہے۔ خط عربی نہایت جلا و شیرینی و پختگی کے ساتھ لکھتے تھے تمام درسی کتابین، صرف و نحو و منطق و حکمت و معانی و بیان و فقہ و اصول و تفسیر وغیرہا کی اپنے ہاتھ سے لکھی تھین اور ہر کتاب کو اوّل سے آخر تک خود محشّٰی کیا تھا۔ یہان تک کہ متن شرح کا محتاج اور شرح حاشیہ کی محتاج نہ رہی تھی۔ مآثر الکرام مین لکھا ہی کہ "ان کتابون کو صحائف آسمانی کا نمونہ اور الواح ربانی کا نسخہ کہہ سکتے تھے۔ اسلیے کہ تمام کتاب مین کسی جگہ بھی ایک نقطہ

ہاتھ مین قوت اور قلم کا زور باقی تھا۔ فرماتے ہین ؎

مرا عمر شصت و سہ شد، مشق و کم — ہنوز م جوان ست مشکین قلم
توانم ہنوز از خفی و جلی — نوشتن کہ العبد سلطان علی

سنہ ۹۱۹ھ (۱۵۱۳ء) مین مشہد مقدس مین وفات پائی۔

مُلّا میر علی مشہدی نے ملا زین الدین محمود کاتب اور ملا سلطان علی سے مشق کی تھی۔ جب ان کا خط مرتبہ کمال کو پہونچ گیا تو مولانا سلطان علی سے برسر دعوی و مقابلہ ہوئے۔ اہل عصر نے مولانا کی جانبداری کی۔ آخر کار اتمام حجت کے لئے میر علی نے مولانا سے اُن کے لکھے ہوئے تین قطعے لے کر تقلید ا نقل کی اور اپنے اور اُن کے قطعے لے کر مولانا کے پاس آئے۔ مولانا شناخت نہ کر سکے متحیر تھے کہ اُن کا خط کونسا ہے۔ بڑے تامل کے بعد ملا میر علی کے خط کو اُٹھالیا۔ عبید خان ازبک مع دیگر کاملین فنون اور مقتدایان حرفہ کے ان کو ہرات سے بخارا لیگیا تھا۔ بیچارے کو تمام عمر وہان رہنا پڑا۔ اسیجہ پریشان تھے اور بڑی حسرت و تمنا سے ہرات کی یاد کیا کرتے تھے ؎

طالب من ہمہ شاہان جہانند و مرا — در بخارا جگر از بہر معیشت خون شد
این بلا بر سرم از بہر خط آمد امروز — کہ خط سلسلۂ پائے من مجنون شد

غلط نہین ملتا تھا اور یہ کتابین اہل شوق و اہل علم کے صرف مین مدتون رہی تھین شیخ کمال کا
کتبخانہ اُن کے بعد بالکل برباد ہوگیا کتابین متفرق و منتشر ہوگئین۔ جسکے جو ہاتھ لگی، لے گیا۔ کچھ
بلگرام مین رہین اور کچھ اطراف و اکناف مین پہونچین کسی دردمند نے شیخ کمال کے کمال اور انکی
ذخیرۂ علم کی پریشانی و تاراج کا مرثیہ لکھا تھا ؎

دردا و حسرتا کہ زوال کمال شد — بر طالبان حیات دُو روزہ وبال شد

اسیطرح سید عبد الواحد بلگرامی جو فاضل عصر اور زاہد زادولی تھے خط نسخ نہایت شیرین لکھتے
تھے بہت سے نسخے کلام اللہ المجید کے اور بے پایان کتابین اپنے قلم سے لکھ ڈالی تھین۔

سید عبد اللہ بلگرامی، قابل تخلص، اور اسم باسمٰی تھے علوم عربی و فارسی و ہندی مین
ذی استعداد تھے اور ہفت قلم سے خط لکھتے تھے۔ سپاہگری کے فن اور استعمال آلات حرب و ضرب مین
طاق تھے۔ کاغذ کے پھول نہایت خوب تراشتے تھے۔ نواب سربلند خان کی خدمت مین رہے تھے
۱۱۳۲ھ (۲۰-۱۷۱۹ع) مین رحلت کی۔ نادر اور عمدہ کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اُن کے انتقال کے
بعد کتابین متفرق و منتشر ہوگئین اور کتبخانہ لُٹ گیا۔

میر عبد الجلیل کو کتابین جمع کرنے کا بے حد شوق تھا جو بھی لکھتے اور جہان کہین کوئی اچھی کتاب
دستیاب ہوسکتی اُس کی فکر و تلاش مین رہتے تھے۔ میر سید محمد کو لکھتے ہین کہ "برخوردارا! کتاب روضۃ السلاطین
(منتخب اشعار عربی و فارسی) اُس صندوق مین رکھی ہے جو گجرات سے گھر بھیجا گیا تھا۔ یہ کتاب کمیاب ہے
انکی نفاست کے سبب سے براہ احتیاط مین انکو ہمراہ نہین لایا تھا۔ اِسوقت اُس کتاب کی فہرست کی

ملا میر علی نے اپنا ورثہ اپنے فرزند ملا باقر کو دیا تھا۔ ملا باقر کا شاگرد خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش اکبر بادشاہ کا
تھا اہل نظر اسکے قلم کے ایک ایک حرف کو بڑی قدر سے دیکھتے اور مشہور استادون کی تحریرات کے برابر جگہ دیتے تھے۔
۱۴۳ قاضی ابوالفتح بلگرامی عرف شیخ کمال بروایت سرّ الف عثمانی ۹۱۹ھ (۱۵۱۳ع) مین پیدا ہوئے
اکبر بادشاہ کے عہد مین خدمت قضا پر ممتاز تھے۔ چوراسی سال کی عمر مین ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ع) مین رحلت فرمائی۔ ملا فیروز
عثمانی نے تاریخ وفات خود اُن کے نام "شیخ کمال" مین پائی۔

ضرورت لاحق ہے۔ کتاب کو صندوق سے نکال کر اور مخدومی میاں محمد طفیل کو دکھا کر ان سے التماس کیجئے کہ اگر فرصت ہو تو چند ورقوں پر اسکی نقل کر دیں۔ ورنہ آپ (برخوردار۔ مخاطب) خود ہی اس کی نقل احتیاط کے ساتھ کر کے اور مقابلہ کر کے اپنے خط مین ملفوف کر کے بھیج دیں کہ ضرورت شدید ہے۔ کتابون کی احتیاط کے بارہ مین کیا لکھون۔ آپ پر ظاہر ہے کہ مین کتابون کو کس قدر عزیز رکھتا ہون اور کتنی محنت و تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے۔ آپ مجھسے بھی زیادہ احتیاط سے کام لین گے اور حزم و ہوشیاری رکھین گے تاکہ کتاب بیجا نہ جانے پاسے۔ کبھی کبھی دھوپ بھی دکھادیا کرین۔ زیادہ کیا مبالغہ کیا جاسے۔ مخدومی میان محمد طفیل نے رسالہ کلمۂ طیبہ فقیر سے نقل کرنے کیلئے لیا تھا جب فارغ ہو جائے تو احتیاط کے ساتھ کتابون مین رکھدیجیئے گا۔"

ایک دوسرے خط مین اطلاع دیتے ہین:" جو کتابین آپ کیلئے بہم پہونچائی تھین۔ ان کی فہرست بھیج چکا ہون جب راستون کی طرف سے دل جمعی ہو جائیگی تو کتابین بھی بھیج دون گا آپ ان کو دیکھین گے تو بہت محظوظ ہون گے"۔

تیسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ" نصاب ترکی جو آپ نے بھیجا تھا پہونچگیا خدا سلامت رکھے۔ ایک جزو رسالۂ اذن حدیث کا جو مرحومی سیدی شیخی میر سید مبارک مغفور نے اپنے خط سے لکھ کر سند اجازت کے طور پر بندہ کو دیا تھا مین گھر پر چھوڑ آیا تھا۔ یہان اکثر اوقات مطلوب ہوتا ہے۔ لازم ہے کہ اصل (جزو) کو جو متبرک ہے اسی جگہ رہنے دیجئے۔ اسکی نقل کر کے بعد مقابلہ مجھے بھیج دیجئے۔ اس باب مین تاکید سمجھئے گا۔ اسی طرح چھوٹی بیاض مین بعض اشعار عربی لکھے ہوئے ہین۔ جو رن کنکولا کی ترکیب بھی اسمین درج ہے، تم نے اسی سے لکھ کر مجھے بھیجی تھی۔ ایک ورق پر اوزان رباعی جو محمد امین جونپوری کشمیری نے نظم کئے تھے مین نے تحریر کر دیے ہین ان کی نقل بھی درکار ہے۔ نقل کر کے اور مقابلہ کر کے بھیج دیجیے گا"۔ ...... " اختیارات بدیعی[۱۴۴] جو طب کی

۱۴۴؎ اس نام کی کئی کتابین ہین۔ ایک کتاب اختیارات احکام سعادت و نحوست کے بارے مین ہے۔ ایک اختیارات بدیعی کا ذکر محمد بن عبدالخالق بن معروف نے اپنی نفیس تالیف "کنز اللغات" مین کیا ہے

ایک کتاب ہی۔ الفاظ الادویہ، قرابادین شفائی، کون کتاب گھر پر موجود نہین ہی۔ کتاب اختیارات کو آپ اکثر زیر مطالعہ رکھین ......"

اسی رسالہ کی پھر یاد آتی ہی اور تاکید کرتے ہین کہ "مین نے اس سے پہلے آپ کو لکھا تھا کہ سند علم حدیث جو میر مرحوم میر سید مبارک رضوان اللہ علیہ نے بندہ کو دی تھی ایک چھوٹے سے جزو پر لکھی ہوئی ہی۔ اسی جزو کے ورق اخیر پر میر مسطور کا خط شریف ہی۔ مناسب ہی کہ اس جزو کو کتاب خانہ سے نکال کر نقل کر کے مقابلہ کے بعد احتیاط کے ساتھ بھیج دیجیے کہ سخت ضرورت ہی اور اصل جزو کو باحتیاط تمام گھر پر محفوظ رکھیے۔ اس باب مین اس سے زیادہ کیا مبالغہ کیا جائے"

"کتاب تہذیب[۱۴۵] الاسمار کے اوائل مین جو باب الکنی واقع ہی اسکی نقل کر کے بھیج دیجیے"

اشرف علی خان داروغہ خلعت خانہ شاہی کے یہان میر سیاہہ تبرک لے کر سیچ[۱۴۶] یا شال کے لینے کے لئے جاتے ہین وہ بھی شائق علم ہین ان سے بڑی تپاک و گرم جوشی سے ملتے ہیں

جس کو کارگیا سلطان محمود والی جیلان (۸۵۵ھ لغایت ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۴۷ء لغایت ۱۴۸۳ء) کے نام سے معنون کیا تھا میر صاحب جسکا ذکر کرتے ہین۔ وہ علی بن الحسین الانصاری مشہور بہ حاجی زین العطار کی تصنیف، ملکہ بدیع الجمال کے نام سے منسوب ہے اسمین دواؤن اور جڑی بوٹیون کے اسما (عربی و فارسی و ہندی) مع ان کے متعلق تمام ضروری اطلاعات اور طبی تحقیقات و معلومات کے مندرج ہین۔ اسکے قلمی نسخے اس ملک مین مستبدن ملتے ہین کبھی چھپی بھی تھی۔

۱۴۵ھ تہذیب الاسمار فی مرتب الحروف، فن لغت مین نہایت قابل قدر کتاب ہے۔ اسمین اسماے عربیہ فارسی مین بیان کئے گئے ہین۔ یہ مجموعہ اٹھائیس کتابون مین منقسم ہے اور ہر کتاب مین تین تین باب ہین۔ الفاظ حروف ہجا کی ترتیب کے مطابق درج کئے گئے ہین۔ اسمای حسنی یعنی نوذونہ نام پاک سے ابتدا کی ہے اور ان کو مع ان کے معانی و مطالب کے بوضاحت تحریر کیا ہے۔

اس کا مصنف محمود بن عمر بن محمود بن منصور القاضی الزنجی السنجری ثم العرفی قبیلہ شیبان کا تھا۔ اسنے بہت سی مستند اور مبسوط کتابون اور صحیح ماخذ سے استفادہ کیا تھا ۱۔ الاسامی والاسمار ۲۔ کتاب الاسامی الموسوم بالسعیدی ۳۔ کتاب البُلغہ۔ ۴۔ کنز الاسامی ۔ ۵ ترجمان القرآن ۔ ۶۔ الرضہ ۔ ۷۔ المشاہیر ۸۔ اصطلاحات المنطق ۔ ۹ غریب المصنف کا اسنے بالخصوص حوالہ دیا ہی۔ حاجی خلیفہ نے بھی اسکا ذکر کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون کی جلد ششم مین صفحہ ۲۰۳ پر کیا ہے۔

پورا دن ان کو "اپنے سامنے" دیکھتے اور لطف صحبت اٹھاتے ہین - ان کو ثعالبی کی کتاب سر الادب کی مدت سے تلاش ہے - کہین دستیاب نہین ہوتی خان موصوف کے پاس موجود ہے بے تکلف نہایت تواضع سے کتاب میر عبد الجلیل کو عنایت کر دیتے اور انکا کام بھی نکلوا دیتے ہین سید عبد الرحمن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے جو ارحمت الٰہی مین پہونچ چکے تھے - لیکن انکی کتابین اسوقت تک دستبرد و غارت سے محفوظ تھین - اُن کے کتاب خانہ مین ایک نادر کتاب تھی یعنی کسی شافعی المذہب عالم نے ہدایۂ حنفی پر حاشیہ رد اقوال ہدایہ مین لکھا تھا یہ حاشیہ میر عبد اللہ مرحوم کے یہان موجود تھا جس کا علم میر عبد الجلیل کو بھی تھا اس کا تذکرہ دلی مین کہین آگیا تھا اور میر صاحب نے سید محمد بنا کر سے سید عبد اللہ کے گھر لکھا کر بھجوا دیا تھا - اسی سلسلہ مین میر سید محمد کو

یہ کتاب اب کمیاب ہے - اسکی ایک جلد بانکے پور کے کتبخانہ مشرقیہ مین موجود ہے - مسٹر چپمن Mr. Chapman محافظ و مدیر کتب خانہ عالیہ سرکاری کلکتہ کی رائے مین "یہ ایک نادر دلچسپ اور بیش بہا قلمی نسخہ ہے" ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہین کہ "مہذب الاسماء ایک بے حد نادر و نایاب فرہنگ عربی ناموں کی ہے جسکی توضیح و تشریح محمود بن عمر الشیبانی نے فارسی زبان مین کی ہے"

۱۴۶ سرپیچ، ایک زیور مرصوع دستار یا پگڑی پر پہننے کا ہوتا تھا سونے کے مربع پتر یکجا و بہم پیوستہ کر دیے جاتے تھے اور ان مین سے ہر ایک پر بیش بہا جواہر جڑے ہوتے تھے - دستور تھا کہ دستار کے بیرونی اور سب سے نمایان حصہ پر یہ لگایا جاتا تھا اور اس کا آویزہ جواہر بن پیشانی پر لٹکتا رہتا تھا -

اسی سلسلہ مین یہ تفصیل یا تشریح بھی بے محل نہ ہوگی کہ (۱) دستار ایک نہایت باریک و لطیف تھان ململ یا مہین تنزیب کا ہوتا تھا - عرض ڈیڑھ ہاتھ کے قریب اور طول ۱۶ - ۱۷ گز سے لے کر ۳۳ - ۳۴ گز تک - اس پر پُر تکلف گلکاری بھی ہوتی تھی بلکہ رسمی اور درباری پوشاکون اور خلعتون مین اسکا زرتار اور چوب کار ہونا معمول تھا - البتہ جواہر جسمین نہین لگائے جا سکتے تھے "سرپیچ" اسی پر پیشانی کے قریب باندھ دیا جاتا تھا جو خوبی و لطافت کے ساتھ چہرہ سے پیوستہ و متصل رہتا تھا - (۲) ہندو امرا اور راجگان کی پگڑیون پر کلغی لگائی جاتی تھی - یہ بھی ایک قیمتی زیور تھا - یون سمجھیے کہ ہما یا کسی نایاب پرند کا پر مع ایک گوہر یکدانہ کے دستار مین لگا دیا جاتا تھا اسی کو تاج بھی کہتے تھے (۳) جیغہ بھی دستار پر پہنا جاتا تھا - اسکی مختلف صورتین تھین ایک، سونے کے زیور کی شکل مین - دوسری مخمل کی ایک پٹی، تین انگل چوڑی اور نو دس انگل لمبی - جس پر نہایت عمدہ سنہرا کام پھول بوٹے کا بنا ہوتا تھا - اسی پر ایک طلائی پتر جسمین قیمتی پتھر جڑے ہوتے تھے ٹانک دیا جاتا تھا تیسرا

ہدایت کرتے ہین کہ "آپ اُس تحریر کے بموجب جاکر سید عبداللہ کے کتاب خانہ کو ملاحظہ کرین جو کتاب کہ ہدایہ کے رد مین لکھی ہے لے کر روانہ کردین۔"

اپنے شوق اور اپنی ضرورتون سے زیادہ میر سید محمد کی فرمائشات، میر عبدالجلیل کو تلاش کتب مین مشغول رکھتی تھین۔ درسی کتابین خاص کر اُن کے کام کی چیز تھین اور ان کی فراہمی ورد نگی کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہتا تھا۔ میر سید محمد کو شرح مُلّا خوش خط درکار ہے باپ پر تقاضا ہے۔ یہ جواب دیتے ہین کہ "تلاش مین ہون جس وقت مل جائیگی بھیج دون گا۔ بالفعل ایک شرح مُلّا میرے پاس موجود تھی بھیجتا ہون۔ پڑھنے کے کام آئے گی"

عبرت ہے کہ بلگرام مین نہ اب وہ کتابین باقی ہین نہ وہ عمارت کہ جس مین یہ علمی خزانہ کبھی محفوظ تھا۔ ناخلف اخلاف کی ناقدری و حاجتمندی سے اکثر نادر کتابین اور اشیاء خفیہ یا علانیہ معرض بیع مین آگئین۔ قدرشناس اہل نظر ہاتھون ہاتھ لے گئے۔ حافظ حقیقی جل شانہ کی مصلحت کا اقتضا تھا کہ اُن کا بہتر حصہ خصوصاً میر کی بیشتر تصانیف و مکتوبات کتب خانہ عالیہ آصفیہ مین پہونچین جہان اُن کی صیانت و بقا کا انتظام و اطمینان ہوگیا۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (اور خدا کا حکم تو ہو کر رہتا ہے۔ جزر ۲۲ سورۃ الاحزاب ع ۵-۲)

ریشم یا زربفت کا ایک سربند، دو ہاتھ سے لے کر ڈھائی ہاتھ تک لمبا۔ یہ پگڑی کے سامنے والے رُخ پر ایک معین طرز سے لگایا جاتا تھا۔ یہ بالا بند بھی کہلاتا تھا۔

۱۴۷ ابومنصور عبدالملک بن محمد بن اسماعیل ثعالبی نیشاپوری، ۳۵۰ھ (۹۶۱ء) مین نیشاپور مین پیدا ہوا ۴۲۹ھ (۱۰۳۸ء) مین وہین پیوند خاک ہوگیا۔ خاندانی پیشہ ثعالب (روباہ) کی کھالون کی خیاطت تھی اسی مناسبت سے ثعالبی مشہور رہے۔ بڑا عالم لغت، ادیب و فاضل اور فصیح و بلیغ شاعر تھا۔ ابوبکر خوارزمی کا شاگرد تھا استاد کا یہ قول اکثر نقل کیا کرتا تھا کہ یمن کے لئے مخلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ عراق کے واسطے سواد اور خراسان کے لئے رستاق۔ وفیات الاعیان مین اس کا مبسوط ترجمہ موجود ہے۔ تصانیف کثیرہ چھوڑی تھین تذکرۂ یتیمۃ الدہر۔ فقہ اللغۃ۔ النہایۃ فی التعریض والکنایہ۔ لطائف المعارف۔ مونس الوحید۔ سحر البلاغۃ کتاب فرائد القلائد۔ من غاب عنہ المطرب۔ نظم و نثر کا نہایت عمدہ مجموعہ ہے۔ احاسن المحاسن (محاضرات مین) اور برد الاکباد (ادب مین)، نہایت خوب ہین۔

معمولات وعقائد

میر عبد الجلیل کا طریقہ نہایت صفائی و راستبازی کا تھا۔ طاعت خدا و آگاہی دوام سے کسی وقت فارغ نہ رہتے تمکین و وقار بدرجۂ غایت رکھتے تھے ۔ باوصف تعلقات ظاہری اور خدمات بادشاہی اختیار کرنے کے دقائق امانت و دیانت سے کوئی دقیقہ سرمو فرو گذاشت نہین ہونے پاتا تھا ؎

زہد و ورع بخدمت سلطان نقیض نیست ۔ دل را بحق بہ بند و میان را بچاکری

ارباب استحقاق کی ہمیشہ خبر رکھتے اُن کو نہایت اخفا اور احتیاط کے ساتھ دیتے وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (اور اگر اسکو چھپاؤ اور حاجتمندون کو دو تو یہ تمھارے حق مین زیادہ بہتر ہے جزو ۳ سورۂ بقرہ ع ۵-۳۷) پر عمل فرماتے تھے ۔ ادائے فرائض و سُنن کے بعد سب سے بڑا شغل مطالعۂ کتاب کا تھا جمعہ کے دن نماز صبح کے بعد سے استوا کے قبل تک دلائل الخیرات کا ختم کرتے تھے اس کے اندر کوئی بات نہ کرتے ۔ دلائل الخیرات کا وہ نسخہ جو وظیفۂ خاص تھا اپنی قلم سے لکھا تھا قریب استوا غسل فرماتے جمعہ کیلئے مسنون ہے پھر متوجہ مسجد ہو جاتے ۔ ماہ مبارک رمضان مین بلبیت الخلا کو ہر روز نہ جاتے ۔ سفر و حضر مین نماز تراویح ترک نہ ہوتی ۔

عبادات مین ان کا طریقہ محدثین کا تھا ۔ قول احوط ہمیشہ اختیار فرماتے اور اُس پر عمل کرتے مثلاً وضو کرتے وقت پاؤن کا مسح و غسل دونون کرتے تھے میر سید محمد نے انکے آثار بابرکات مین نقل کیا ہے کہ میر صاحب ایک روز وضو کر رہے تھے پاؤن کا مسح بھی کیا اور غسل بھی ۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان دونون طریقون کو جمع کرنے کی آخر وجہ کیا ہے ؟ آپ کو میرے اس خطرہ قلب سے آگاہی ہو گئی وضو سے فارغ ہو کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ محی الدین عربی نے فتوحات مکیہ مین ایسا ہی لکھا ہے اور یہ

ش۱۴۸ا سر الادب نہایت کمیاب ہے ۔ صاحب تقصاء الادب نے تصنیفات ثعالبی کے ذیل مین اسکا بھی نام لیا ہے فقہ اللغۃ کا جزو ثانی مسمی بسر العربیہ ہے جو فقہ اللغۃ کے تمام مصری مطبوعہ نسخون کے ساتھ ملحق ہے ۔

یہ عبارت بلفظہا پڑھدی ظاہر الآیۃ المسح والغسل وصولہا الخبر والجمہور اولیٰ (میر غلام علی آزاد نے یہ فقرہ ید بیضا مین نقل کیا ہے۔ جامع تذکرہ، مقبول ستہام، نے فتوحات کے متعدد مطبوعہ و مخطوطہ نسخے دیکھے اُن مین تحریر ہے فالمسح ظاہر الکتاب والغسل بالسنۃ ویحتمل الآیۃ بالعدول عن الظاہر۔]

میر صاحب کی یہ روش خود اُنکے اور اُنکے متوسلین واہل عقیدت کے نزدیک، یا بجائے خود کیسی ہی پسندیدہ و مستحسن ہو، لیکن فقیہانہ نظر سے اس کو راست و قرین صواب ماننے مین کلام ہے۔ آج کہ مسلمانون کی ایک ممتاز جماعت، اہل حدیث، متبع سُنّت، یا غیر مقلّد ہونے کی حیثیت سے خود اجتہاد کرنے اور استنباط مسائل شرعیہ کی دعویدار ہے، یہ طرز عمل چند اں مستہجن نہ سمجھا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ڈھائی سو برس پیشتر کسی امام کی تقلید کا اقرار کرنے والے کو تلفیق، یا اسکے ارشاد اور اتباع احکام سے سرمُو تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا، ورنہ یار و اغیار کو طعن و تعریض کا موقع ملتا ہوگا جیسا کہ قاضی نور اللہ شوستری مجالس المؤمنین مین "صوفیہ صافیہ اور تصوف کی بحث" مین لکھتے ہین "مخفی نماند اینکہ اکابر این طائفہ رفیعہ گاہی گویند الصُّوفِیُّ مَنْ لَا مَذْهَبَ لَهٗ وگاہ می گویند کہ عمل بہ احوط مذہب می کنیم۔ فی الحقیقۃ گریز است از التزام یکی از مذاہب اہل سُنّت، و احتراز از تصریح بانقیاد مذہب شیعہ از روئے تقیہ۔ ولہذا نیز گفتہ اند کہ صوفی کہ اظہار مذہب کند ملامت کردنی، بلکہ لائق سیلی و گردنی است، یا آنکہ نزد کسے کہ عارف بتفاصیل مذہب باشد عبارت اخیرہ صریح است در اتباع مذہب امامیہ۔ زیرا کہ احوط مذاہب عند الاستقرار مذہب این فرقہ ناجیہ است"

اغلباً ایسی ہی روایات و اعمال کی بنا، اور اقوال احوط کے اختیار کرنے سے میر عبد الجلیل کے دیکھنے اور جاننے والون کو اُن کے عقائد کی طرف سے اشتباہ ہوتا ہوگا۔ عنقریب مذکور آئے گا کہ ایک جماعت اُن کو تفضیلی بتاتی تھی۔

میر صاحب کا طرز معاشرت نہایت سادہ اور درویشانہ تھا۔ اظہار تقدس سے نفرت کرتے اور اپنی تعظیم و تکریم سے منع فرماتے تھے۔ باایں ہمہ سادہ روی و سادہ دلی وہ اُمرا سے مساویانہ وضع

ملتے، اُن کی مہمانداری و مدارات بڑی عالی ہمتی، حوصلہ اور صرفِ وافر سے کرتے تھے۔

اتقا و خوفِ خدا

سید حسین[۱۴۹]، امتیاز خان متخلص بہ خالص صفاہانی ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) مین ہندوستان سے عازم ولایت ہوا جب سیوستان پہونچا تو خدا یار خان مرزبان سندھ نے اُس کو قتل کرا دیا۔ اور اُسکے لاکھون روپیہ کے مال و اسباب کو غصب کر لیا۔ میر عبدالجلیل کو پیام بھیجا کہ جس طور پر یہ واقعہ ہوا ہی اس طور پر اس کی خبر سوانح بادشاہی مین درج نہ کرین۔ اسی کے ساتھ ایک ہزار اشرفیان طلائی جن کے چودہ ہزار روپیے رائج الوقت ہوتے تھے نذر بھیجین۔ میر صاحب نے اِن کے لینے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "عنایت الٰہی سے مجھے بھی کچھ ثروت حاصل ہے۔ محتاج نہین ہون۔ اگر یہ خبر واقعی سپرد قلم نہ کرون گا تو رب العزت، تعالیٰ شانہٗ کے حضور مین کل کیا جواب دونگا"

میر صاحب کی اس بے نیازی و استغنا کو دیکھ کر آزاد نے یہ شعر لکھا تھا ؎

بحرٌ غنیٌ عن الاصداف لؤلؤہٗ   ونفسُ همته العلیا تربّیه

[موتی کے پرورش کے لئے دریا صدف کا محتاج ہی لیکن یہ دریا سیپی کا حاجتمند نہین۔ احتیاج کے وصف ہی سے احتراز کرتا ہی حاصل یہ ہی کہ وہ جب کسی کی پرورش کرنا چاہتا ہی تو اُس کی پرورش کے لئے دوسرے کی اعانت کی حاجت نہین رکھتا]

بیعت

میر عبدالجلیل کے مناقب جلیلہ مین اُنکی بیعت بھی داخل ہی۔ اپنے طالع بیدار کی برکت سے شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کو خواب مین دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر بیعت[۱۵۰] کی منقبت مین ایک

۱۴۹ھ عالمگیر کے زمانہ مین ہندوستان آیا تھا۔ کچھ عرصہ تک صوبہ دار گجرات بھی رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قاسم علیخان نواب بنگال اسی کا پوتا تھا۔

۱۵۰ھ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کو بھی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی رویت اور بیعت کا شرف حاصل

قصیدہ لکھا اور اس موہبت عالیہ کا شکرادا کیا کچھ زمانہ بعد اسکو اور بڑھا دیا اور امیر المومنین و امام المتقین علیہ السلام کے مرثیہ کے نام سے نامزد کر دیا ؎

دیدہ خونبار و چشم گریان است — صبر بے تاب، سینہ بریان است
اشک چون سیل موج در موج است — آہ چون برق، آتش افشان است
گل گریبان دریدہ در ماتم — بلبل از نوحہ مرثیہ خوان است
زین مصیبت برنگ چاک الف — سرو، در سینہ گلستان است
قمری از سوز میکند کو کو — نمدگردنش نمایان است
لالہ زین غم کشید ساغر خون — سنبل از تاب غصہ پیچان است
نرگس از غم نگاہ باختہ است — تکیہ اش بر عصا چو عمیان است
سینہ ریش است بسکہ تاج خروس — لخت دل بر سرش پریشان است
صور محشر دمیدہ عباسی — کوہ صبر و ثبات لرزان است
زین مصیبت بنفشہ غمگین است — جامۂ نیل شاہد آن است
سوسن از نالہ شد کبود زبین — از تف سوز سینہ عطشان است
این ہمہ زردی رخ صد برگ — اثر شعلہ ہائے پنہان است
ہمہ تن دیدہ گشتہ است فلک — انجم از وے جو اشک ریزان است
باد بے تاب و خاک مدہوش است — آتش آشفتہ آب نالان است
جامۂ صبر بر تن ہر یک — چاک گردیدہ تا بدامان است
ہائے ہائے است ہر طرف در گوش — ماتم سخت شاہ مردان است

ہوا تھا۔ آنجناب نے تو یہ بھی تذکرہ فرمایا تھا کہ ہمارے یعنی صحابہ کرام کے زمانہ مین وصول الی اللہ کے تین طریقے مسلوک و معمول تھے۔ دو تو موقوف ہو گئے یعنی صلوۃ و تلاوت قرآن۔ تیسرا ذکر ہے جو ابتک باقی ہے۔ اس طریق مین بہت سی مباحات داخل ہو گئی ہین۔ اسکے بعد تلاوت و صلوۃ کو القا فرمایا ۱۱ھ سر آنا د ۱۲ھ بیضیا

ابن ملجم شقیٔ ہر دو جہان | آنکہ استاد حزب[۱۵۳] شیطان است
زخم بر تارک مبارک زد | اثرش در دل محبان است
چون نہ گردد خراب خانۂ صبر | خون این زخم سیل نہان است
رمضان بود روز نوزدہم | کاندران روز زخم عدوان[۱۵۴] است
روز ثالث ز زخم بیست و یکم | رفت گلگشت باغ رضوان است
چہلم سال ہجر این ماتم | شیون افزائے درد ہجران است
مرقد انورش عزی[۱۵۵] گردید | رشک جنت عزی[۱۵۶] کوفان است
زین مصیبت کہ طامۂ کبریٰ[۱۵۷] است | زلزلہ در چہار ارکان است
کعبہ زین غم سیاہ پوش شدہ است | اشک زمزم بعین طوفان است
سلک خونین سرشک من زین غم | سبحۂ دانہائے مرجان است
تا کنم شانہ زلف ماتم را | جگرم چاک چاک احزان است
دل خونین، درون سینۂ من | گرہ لعل در بدخشان است
دیدہ شد ابر تیرہ زین ماتم | رگ خونابہ ریز مژگان است
وائے ویلا، ہزار وا ویلا | زین مصیبت کہ بر دل و جان است
ماتم مرتضیٰ، علیّ ولی، | آنکہ جنبش ظہیر ایمان است
اسد اللہ سرور غالب | ذات پاکش نظیر قرآن است

۱۵۳ حزب۔ تابعین کی جماعت ۱۵۴ عدوان۔ کسی پر ظلم و ستم کرنا
۱۵۵ عزی بعین معجمہ کے ساتھ عنی کے وزن پر مشہد نجف اشرف کا نام ہے جو کوفہ کی پشت پر ایک بلند جگہ ہے۔ مشہد عزی اسلئے کہتے ہیں کہ اسکے حوالی میں دو گنبد تھے جو مالک و عقیل، ندیمان حذیمہ بن ابرش کی قبروں پر بنائے گئے تھے اور عزیین کہلاتے تھے دعزی آلودہ کرنے کو کہتے ہیں یہی مشہد عزوی بھی کہلاتا ہے۔ اس مقام کے حالات و فضائل میں سید رضی الدین علی بن طاؤس نے ایک مستقل کتاب فرحۃ الغری فی فضل ساکن الغری لکھی ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے بھی مجالس المؤمنین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ۱۵۶ کوفان۔ کوفہ کا نام ہے ۱۵۷ طامہ کبریٰ۔ قیامت

حجت الله در زمین و زمان / از خدا بهر خلق برهان است
متحد با نبی در انفسنا / این توحّد نه جای ابنان است
وحدت لحم و دم چنان باشد / این عجب اتحاد باشان است
با نبی، نسبت نیابت او / هم چو هارون و پور عمران است
غیر او کز نبی اخوت یافت / این شرف را کدام شایان است
آنچه گفتم ز روی تحقیق است / کاین همه در حدیث و قرآن است
گر ز قرآن دلیل می خواهی / سورهٔ پاک آل عمران است
در حدیث بخاری و مسلم / خصم را نیز جای اذعان[158] است
او بکس، کس باو، نمی ماند / در کمالش، کمال حیران است
جز نبوت، هر آنچه فرض کنند / همه در اوست، آنچه شایان است
کرده خود را فدای پیغمبر / عاشق، الحق فدای جانان است
دست او مظهر ید الله است / کشتن عمرو و مرحب آسان است؟
درِ خیبر، بزور بازو کند / این جلادت نه حد انسان است
ذات او منتهای سلسله است / سرِ سلسله فراوان است
هر که صرف فنای فی الشیخ است / محو او شد که پیر پیران است
مصطفیٰ کعبه، مرتضیٰ در اوست / کعبه را از ره در، اتیان[159] است
اهل بیت اند هم چو کشتی نوح / ذات او زان مشابه سکان است
بهر سُکّان[160] کشتی، این سُکان[161] / در حوادث امان ز طوفان است
حب او جنت است و گردد کار / بغض او دوزخ است و نیران است

[158] اذعان فروتنی کرنا۔ گردن جھکا دینا۔ [159] اتیان ۔ آنا [160] سُکّان بسین مضموم و کاف مشدد ساکن کی جمع ۔ باشندگان [161] سُکان ۔ کسی شخص یا چیز کا پیچھا۔ دنبالہ کشتی

غیرِ مؤمن[۵۶۲] ندارد او را دوست — در منافق ظہورِ شنآن[۵۶۳] است

ہست در مسلم این حدیث صحیح — کہ ز صحت محلِ ایقان[۵۶۴] است

دین پناہا، تفضّل آگاہا — دلِ پاک تو شمعِ عرفان است

کے ثنائے تو حدّ ہمچو منے است — زانکہ بیرون ز حدِّ امکان است

عرضِ اظہارِ بندگی خود است — بندگی شیوۂ غلامان است

من غلام و مرید و فرزندم — مہرِ دل سخت شوقِ جنبان است

مدعی گر دلیل می خواہد — ذکر آبا بہ نصِّ قرآن[۵۶۵] است

کردہ ام بیعتِ تو در رؤیا — این سعادت ز فضلِ رحمان است

دست ما را گرفتہ بکرم — می شناسم کہ این چہ احسان است

من و این رتبہ از کجا لیکن — مور پروردۂ سلیمان است

دست عبد الجلیل و داؤ تو — التماسش نجات و غفران است

با سخن ہر کہ آشنا باشد — پیشِ او این قصیدہ آسان است

ایک دوسرے موقع پر میر نے شیخ سعدی شیرازی کے ایک مشہور شعر کی تضمین کر کے آدم اولیا حضرت علی مرتضیٰ کی منقبت میں یہ قطعہ نظم فرمایا تھا ؎

ابن ملجم چو بر شہِ مردان — از سرِ کینہ زخم زد کاری

۵۶۲ اس کا حوالہ یہ ہے عن زربن حبیش قال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ والذی فلق الحبۃ و برا النسمۃ انہ تعھد النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم الی انہ لا یحبنی الا مؤمن ولا یبغضنی الا منافق ایک راوی ہے جن کا نام زربن حبیش ہے منقول ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ قسم ہے اُس خدا کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا ہے۔ ضرور آپ نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا اس امر کا، کہ مجھکو سوائے مومن کے کوئی دوست نہ رکھے گا اور منافق کے سوا کوئی دشمنی نہ کرے گا

۵۶۳ شنآن۔ بفتحہ مد ہمزہ۔ دشمن رکھنا ۵۶۴۔ ایقان۔ بالکسر یقین کرنا۔ بےگمان ہو جانا ۵۶۵ نص قرآنی سے اس آیۂ کریمہ کی طرف اشارہ ہے فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا (تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

تپش زخم شعلہ زد بر دل — تشنگی ریخت رنگ بسیاری
شربتی ساختہ ز مشک و گلاب — تا نشاند حرارت ساری
شاہ گیتی پناہ از سر لطف — گفت با خادمان درباری
کہ ازین جام جرعہ بخشید — بہر آن بحر نوش خونخواری
این ملجم چو شربتش دادند — کرد ابا از سر زیان کاری
تا مگر زخم سودۂ الماس — نزند نشتر دل افگاری
زین ابا شاہ صورت و معنی — کرد از بحر لب گہر باری
من نخوردیم جرعہ از کوثر — تا نہ دادیم من بہ آن ناری
"واسطی" چون شنید این قصہ — خواند این بیت از طلبگاری
دوستان را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمنان نظر داری

میر عبدالجلیل نے بعض مدارج معنوی اور آداب ظاہری شیخ غلام نقش بند لکھنوی کی معرفت بھی طے کر لئے تھے طرائق متعارفہ و سلاسل متداولہ میں سے، پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس خاندان و خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ جو بزرگ خود حضرت امام الاولیا و سید الاتقیا سے بلا واسطۂ دیگرے شرف توصل[516] رکھتا ہو وہ کسی اویزد روش یا ہادی متاخر سے وسیلہ و نسبت کیوں رکھے گا۔ شیخ غلام نقش بند کا مسلک نقشبندی تھا۔ انکے پدر محترم شیخ عطاء اللہ نے اُن کا نام غلام نقش بند خود حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کی اشارت روحانی سے رکھا تھا۔ شیخ جلیل القدر عالم اور صاحب تفاسیر و تصانیف کثیرہ تھے۔ احکام شرعیہ کے حفظ و نگہداشت میں کمال مصروف رہتے اور باقتضائے الحب للہ والبغض للہ جب کسی متنفس سے کوئی نا ملائم فعل سرزد ہو جاتا تو سخت رنجیدہ ہو جاتے پھر جب وہ توبہ کر لیتا تو اُس پر پہلے سے زیادہ مہربان اور شفیق ہو جاتے تھے۔ ایک جگہہ آزاد[517] لکھتے ہیں کہ میر عبدالجلیل عالم بیداری کے لحاظ سے "اویسی"[518] تھے

ذکر میں لگ جاتے تھے۔ اسیطرح بلکہ اُس سے بڑھکر خدا کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ الجزء ۲ سورۃ البقرۃ ع ۲۵-۹)
[516] توصل: بہ وصل جستن بلطف۔ [517] مآثر الکرام۔ [518] خواجہ اویس قرنی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غائبانہ ایمان لائے مگر لیکن مادر صالحہ کی پیرانہ سالی کی وجہ سے اُن کو چھوڑ کر نہ جا سکے۔ والدہ ماجدہ کے احوال کا تفقد علیٰ تعظیم شریعت غرا تھا

سید یٰسین حموی سے جو صاحب سجادہ غوث صمدانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے تھے میر صاحب نے غائبانہ بیعت حاصل کی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ میر صاحب اہل حدیث کا مسلک رکھتے تھے اور اتباع سنت سنیہ میں شغف و توغل فرماتے۔ قرینہ کہتا ہے کہ اُن کی بیعت بیعت مسنونہ تھی للتمسک بحبل التقویٰ بیعت مروجہ پیری مریدی کی نہ رہی ہوگی۔

بہرحال انھیں قدسی تعلیمات اور پاک اتباعات کا نتیجہ تھا کہ میر عبدالجلیل تزکیہ قلب و تصفیہ باطن و تقدس ذات و جلائل صفات میں یگانۂ زمانہ ہوئے۔ اگر اِن کی کمر سلطان مجازی کی خدمتگذاری کیلئے بندھی ہوئی تھی تو ان کا دل شہنشاہ حقیقی کی یاد و فرمان برداری میں مشغول تھا؎

مردِ حق اندر عین دنیاداری از دنیا بری است ملک در دست سلیمان نیست اندر انگشتری است

صحبت والا پر فائز نہ ہوسکے۔ بالکل غربت اور مسکنت کی زندگی بسر فرماتے تھے۔ دن میں شتربانی کرتے۔ اُسکے مزدوری کو صرف معیشت فرماتے۔ ماں کو نفقہ دیتے حضرت خاتم المرسلین نے آپ کو "نفس الرحمٰن" اور "خیر التابعین" فرمایا ہے۔ سید حیدر بن علی الآملی، کتاب منبع الانوار میں تحریر کرتے ہیں هو الذی وصفه رسول الله صلعم بالولاية وقال انی لاجد نفس الرحمن من جانب الیمن وقال ایضا وهو سید التابعین۔ سید محمد نوربخش شیعی نے شجرۃ الاولیا میں بھی متعدد احادیث آپکے فضائل میں نقل کی ہیں۔ سرور دوعالم نے بہت سے جلیل القدر صحابہ کے سامنے آپکی مدح فرمائی تھی موت نے جب ماں کا سایہ سر سے اٹھایا تو دولہانہ دیتا مانہ دیا نہ جیب میں ہو پیچھے اُس وقت ایک گلیم شتری زیب تن تھی سر و پا برہنہ تھے دونوں جہان کی دولت و تونگری اُسی فرسودہ کمبل کے نیچے پوشیدہ تھی آستانۂ رسالت سے یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ حسب وصیت رسول اللہ صلعم خرقۂ مبارک حضرت عمر و حضرت علی نے حضرت اویس کے حوالہ کیا حبیب السیر میں لکھا ہے کہ حضرت اویس بڑے عابد و زاہد تھے۔ ساری شب جاگتے اور کہتے کہ هذه لیلة الرکوع (یہ رکوع کی رات ہے) اور ساری رات ایک ہی رکوع میں گزار دیتے۔ دوسری شب میں فرماتے هذه لیلة السجود (آج سجدہ کی رات ہے) اور ایک سجدہ میں صبح کر دیتے۔ لوگوں سے اختلاط نہ فرماتے۔ کوئی شخص ملاقات کیلئے آتا تو فرماتے کہ "کیا تمکو خدا سے بھی کچھ کام ہے یا نہیں؟ اگر خدا سے کام ہے تو مجھسے کیا مطلب! اور اگر تمکو خدا سے کچھ مطلب نہیں ہے تو مجھے تم سے کیا کام!"

حضرت علی و امیر معاویہ کے معرکہ میں، ۸ شوال ۳۷ھ (۲۹ مارچ ۶۵۸ء) کو شہید ہوئے لیکن محمد فاضل اکبرآبادی صاحب مخبر الواصلین یوم وفات بالاتفاق، ۸ شوال ۳۹ھ روز جمعہ بتاتے اور لکھتے ہیں کہ ایک جماعت کو انکی شہادت سے انکار ہے۔

انکی کرامات کثیر ہیں۔ مرنے سے پہلے یہ کیفیت تھی کہ پرانے چیتھڑے اِدھر اُدھر سے فراہم کر کے ستر عورت کر لیتے تھے۔ لیکن غسل کیوقت ان کے کپڑوں میں ایک اچھا خاصہ کفن نکلا جسمیں تکفین کی گئی۔ ان کی قبر بھی خود بخود تیار ملی یعنی ایک بڑے پتھر میں لحد کھدی ہوئی پائی گئی جسمیں یہ مدفون ہوئے۔

۱۲۹ه فضلاء الارب میں ذکر علماء النحو و الادب میں مولانا ذوالفقار احمد لکھتے ہیں کہ سید مرتضیٰ محدث بلگرامی بھی خانوادہ قادریہ میں سید یٰسین حموی کے مرید تھے۔ خود مولانا کو بھی اسی سلسلہ مبارکہ حمویہ کی سند سید محمد نجیب ابو البرکات جیلانی بن سید مرتضیٰ نقیب سادۃ الاشراف (بہ حماۃ) بن سید محمد نجیب بن سید محمد سعدی ازہری جیلانی مفتی حماۃ، بن سید عمر بن سید شریف یٰسین، بن سید عبدالرزاق سے حاصل تھی۔ میر عبدالجلیل اور سید مرتضیٰ کے اختلاف اعمار دازمنہ قیاس ہوتا ہے کہ دونوں کے مخدوم سلسلہ ہم نسب و ہمنام رہے ہونگے مگر میر کے پیر سید کے مرشد سے ضرور پہلے گذرے ہیں یہ سلسلہ ہمت سے نہایت مقبول اور مرجع صلحا چلا آتا ہے۔ سید یٰسین حسنی حسینی نعیمی حماۃ ملک شام میں ایک مشہور شہر ہے۔ ۱۳۰ه کسی بزرگ سے غیبت میں فیض حاصل کر کے مدارج سلوک کا طے کرنا۔

اہل طریقت کی اصطلاح میں بیعت طریقہ اویسیہ کہلاتا ہے اور حقیقتاً کسی شیخ کی روح سے استفاضہ حصول اجازت بیعت اور ایسی اجازت کسی دوسرے کو مرید اور داخل سلسلہ کرنا درست و جائز ہے لیکن دفع فتنہ و فساد کی مصلحت سے اکابر صوفیہ صافیہ ایسی اجازت سے مستفید ہو کر سلسلہ جاری کرنے اور صاحب ارشاد بن جانے سے منع فرماتے ہیں۔

اہل بیت نبوی

میر عبدالجلیل کی "عقیدت" اور "حب اہل بیت" کے بیان سے پہلے اہل بیت کی تعریف ضروری و مناسب معلوم ہوتی ہے۔

اہل بیت کے لغوی معنی کیا ہین؟ اہل بفتح الف وسکون ھا سزاواری عقل و سمجھ حاصل کرنا۔ کدخدا ہونا۔ نیز گھر کے لوگ۔ اہل بمعنی صاحب، اور بمعنی مفرد و جمع دونون آتا ہے۔ بیت کے معنی خانہ و سرا کے ہین۔

ان سے مراد کون حضرات ہین؟

انکی ایک عام تعریف تو یہ بتائی جاتی ہے کہ اہل بیت اطہار، وہ برگزیدہ طبقہ ہے جس پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ درود بھیجنے کا حکم صیغہ تعلیم صلوۃ مین صادر ہوا ہے اور جن کے ذکر خیر کے بغیر صلوۃ وسلام بھیجنے (تصلیہ و تسلیم) کے بارہ مین امر نبوت کا امتثال متحقق نہین ہوتا۔ مگر ابھی یہ تعمیم یا تعریف مزید تخصیص و توضیح کی محتاج ہے۔

امام فخرالدین رازی لکھتے ہین کہ "اہل علم مین اس بارہ مین اختلاف ہے کہ آیا اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہین (جیسا کہ ابن عباس و عکرمہ و مقاتل کا قول ہے) یا فاطمہ و حسنین و مرتضی علیہم السلام (جس کی روایت ابوسعید خدری اور ایک جماعت تابعین مثل مجاہد و قتادہ کے فرماتے ہین)۔

ابن حاتم کی روایت یہ ہے کہ جب آیہ پاک اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا اتری تو ابن عباس بازارون مین پکار پکار کر کہتے پھرتے تھے کہ یہ آیت آنحضرت کی بی بیون کے بارہ مین نازل ہوئی ہے۔ عن ابن عباس انہ کان ینادی فی السوق ان قولہ تعالی انما یرید اللہ الخ نزلت فی لنساء النبی۔

زید بن ارقم کہتے ہین کہ اہل بیت وہ ہین جنپر صدقہ حرام ہے۔ پھر آل علی و آل عقیل و آل جعفر و آل عباس۔

قسطلانی فرماتے ہین کہ اولی یہی ہے کہ مراد اہل بیت سے اولاد و ازواج و حسن و حسین و علی ہین

رازی و زمخشری تسلیم کرتے ہین کہ آل سے مراد علی و فاطمہ و حسنین ہین۔ یہی کلیہ اہل بیت کی نسبت بھی صادق آتا ہے۔

آیت پاک انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ باعتقاد بعض فرق امت مرحومہ علی و فاطمہ و حسنین کی شان مین نازل ہوئی ہے اور رسول مقبول نے اس آیت کے نزول کے وقت انھین چارون کو اپنے کسائے پاک مین چھپا لیا تھا اور فرمایا تھا اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ فَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا۔ اے بار الٰہ یہ میرے اہل بیت ہین پس ان سے رجس (چرک و پلیدی) کو دور کر اور سب کو خوب پاک فرمادے۔

وفد نجران کی داستان مباہلہ مین خدائے تعالیٰ شانہ نے فرمایا قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَکُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ قف ثُمَّ نَبْتَھِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ۝ کہو کہ (اچھا میدان مین) آؤ۔ (ادھر) ہم اپنے بیٹون کو بلائین اور (ادھر) تم اپنے بیٹون کو (بلاؤ) اور (نیز) ہم اپنی عورتون کو بلائین اور تم اپنی عورتون کو (بلاؤ) اور ہم اپنے تئین (بھی شریک کرین) اور تم (بھی) اپنے تئین (شریک کرو) پھر ہم (سب ملکر خدا کی بارگاہ مین) گڑگڑائین اور جھوٹون پر خدا کی لعنت کرین۔ (جز ۳ سورۂ آل عمران ع ۶-۱۴) اہل سیر و تاریخ متفق ہین کہ انھین چارون بزرگون کو مباہلہ کے لئے ہمراہ رکھا تھا۔ اسی لئے صحابہ کی ایک جماعت متفق ہے کہ اہل بیت سے مراد یہی چارون ہین۔ (یہ روایت مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے کی ہے)

خازن کی لباب التاویل اور دیگر تفاسیر مین مرقوم ہے کہ حضرت نے حسین کو گود مین لے لیا تھا۔ حسن کا ہاتھ پکڑا تھا۔ فاطمہ زہرا آپ کے عقب مین تھین اور علی مرتضیٰ فاطمہ کے پیچھے۔ یہی اربعہ متناسبہ "اہل کساء" بھی کہلاتے ہین کیونکہ ان نفوس قدسی کو زیر گلیم لے کر فرمایا تھا اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ

خود عائشہ صدیقہ سے خطیب نے یہ روایت کی ہے اور مسلم نے بھی لکھا ہے۔

اس روایت کو ابن ابی شیبہ اور ترمذی حسن بتاتے اور ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی اور حاکم صحیح مانتے ہیں کہ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو حضرت جب نماز فجر کو نکلتے اور فاطمہ کے گھر سے گزرتے تو فرماتے تھے اَلصَّلٰوۃَ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ ابن مردویہ ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ چالیس صبحوں تک اسی طرح فاطمہ کے گھر سے گزرتے اور فرماتے رہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

رہے ان حضرات کے فضائل۔ حق سبحانہ وتعالےٰ ان کی شان عمومی میں فرماتا ہے فَبَشِّرْ عِبَادِيَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ہمارے ان بندوں کو خوش خبری سناؤ جو (ہمارے) کلام کو کان لگا کر سنتے اور اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے (نیک) ہدایت دی ہے اور یہی تو عقل (سلیم بھی) رکھتے ہیں۔ (جزء ۲۳ سورۃ الزمر ع ۲-۱۶)۔

سادات کے اجداد و اسلاف کون تھے یہی اہل بیت، اور انکی اولاد امجاد جو ائمہ معصومین کہلاتے ہیں۔ اکابر شیعہ کا قول ہے اور بالکل بجا ہے کہ "اسی جماعت نے شرائع اور احکام دین کو ینابیع (سرچشمہ ہاے) علم اور مصابیح (چراغان) حکمت اور معادن (کانہاے) عصمت سے حاصل کیا۔ ان کے مناقب و مفاخر اور علم و زہد و عصمت میں کتابیں لکھی گئی ہیں"۔ متقدمین علمائے اہل سنت بھی ان کے مدارج و عظمت کے پہچاننے اور احترام و بزرگی کے ماننے میں پیش پیش ہیں۔ انکی مصنفات و مؤلفات اس بارہ خاص میں تعداد کثیر تک پہونچی ہیں اور بڑے پایہ کی کتابیں ہیں جیسے غایۃ السؤل فی مناقب آل الرسول (از ابن مغازلی شافعی) کتاب ابوبکر بن محمد بن مومن شیرازی۔ جس میں مؤلف نے بارہ تفسیروں سے استخراج کیا ہے۔ کتاب موفق بن احمد مکی۔ نور الابصار، تالیف سید شبلنجی عرف سید مومن۔ محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار للشیخ الاکبر محی الدین محمد بن عربی۔ الکنز المدفون والفلک المشحون للسیوطی۔ اعلام الورٰی

مولفہ ابو علی فضل بن حسن طبرسی شیعی فصول المہمہ فی معرفۃ الائمہ للشیخ نورالدین بن علی بن محمد بن الصباغ المالکی المکی الھاشمی۔ کتاب الدلائل للحمیری۔ اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفے وفضائل اہل بیتہ الطاہرین للشیخ محمد الصبان۔

صوفیہ صافیہ مین سے ایک جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر عصر و زمانہ مین قطب الاولیا صرف اہل بیت سے ہوتے ہین۔ اس لئیے کہ امام حسن علیہ السلام نے محض ابتغاءً لوجہ اللہ اپنے نفس نفیس کا خلع کر کے خلافت ظاہرہ سے نزول فرمایا تھا۔ اسلئیے اللہ جل شانہ نے حسن اور اُنکے اہل بیت کو اس امارت ظاہری کے عوض مین خلافت باطنی عطا فرمائی۔

نواب صدیق حسن خان اپنے رسالہ تشریف البشر بذکر الائمۃ الاثنے عشر مین لکھتے ہین کہ یہی اہل بیت کُلاًّ یا بعضاً جملہ سادات بنی فاطمہ ساکنان ربع مسکون کے اصل اصول ہین۔ تمام شرفائے عرب وعجم کا نسب الحسین پر منتہی ہوتا ہے اور جو مناقب وفضائل اہل بیت رسالت کے احادیث مرفوعہ صحیحہ مین آئے ہین رُوز بعث ونشر تک شرفا و سادات اس عموم مین اُس وقت تک داخل و شریک رہین گے جب تک کہ طریقہ توحید و اتباع سُنت پر قائم رہین اور بدعات مکفرہ ومضلہ مین گرفتار و مبتلا نہ ہو جائین عموم کی شرط اس لئیے لگادی ہے کہ جو فضائل بعض اعیان اہل بیت کے ساتھ مختص ہین وہ البتہ انھین اشخاص معین کے ساتھ ہین۔

مناقب وفضائل

اہل بیت پاک مُسلّم ائمہ امت محمدیہ ہین اور بخود نص قرآن مجید کے موافق تمام آلایش ظاہر و باطن سے منزہ۔ ان کی شان مین خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (اے پیغمبر کے گھر والو خدا کو بس یہی منظور ہے کہ تم سے ہر طرح کی گندگی کو دور کرے اور تمکو ایسا پاک صاف بنائے جیساکہ صاف پاک بنانیکا

حق ہے۔ جز ۲۲۔ سورۃ الاحزاب۔ ع ۴۔۱)

مُسند امام احمد بن حنبل میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا نجوم دستارے آسمان والوں کی امان ہیں جب نجوم برطرف ہو جائیں تو آسمان معدوم ہو جائے گا اور میرے اہل بیت اہل زمین کی امان ہیں جب یہ فنا ہو جائیں گے تو زمین والے بھی برطرف ہو جائیں گے۔"

حدیث نبوی میں رفعاً آیا ہے اور صحابہ پاک میں سے چند اسکے راوی ہیں کہ فرمایا نبی برحق صلعم نے مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجی ومن تخلف عنھا غرق وھلک میرے اہل بیت مثل کشتی نوح کے ہیں جس نے انکی متابعت کی، نجات پاگیا، اور جس نے مخالفت کی ڈوبا اور ہلاک ہوا۔ اسی کی نسبت امام احمد لکھتے ہیں کہ ابوذر کے الفاظ یہ ہیں الا ان مثل اھل بیتی فیکم مثل سفینۃ نوح الخ ابوذر اُسوقت خانہ کعبہ کا دروازہ پکڑے ہوئے کھڑے تھے جسوقت یہ روایت کر رہے تھے۔

امام ترمذی زید بن ارقم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبول صلعم نے فرمایا انی تارک فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی ۔ احدھما اعظم من الاخر ۔ کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض ۔ وعترتی اھل بیتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھا ۔ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں تم جب تک انکو میرے بعد تھامے رہوگے کبھی راستہ سے نہ بھٹکو گے۔ انہیں کی ایک ایک چیز دوسری سے زیادہ عظمت والی ہے (۱) خدا کی کتاب۔ وہ ایک رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک بڑھا دی گئی ہے اور (۲) میری اولاد جو میرے اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہونگے جب تک کہ وہ مجھسے حوض (کوثر) پر نہ مل لینگے۔ (مسلمانو!) بس دیکھنا کہ تم میرے پیچھے ان سے کیسے پیش آتے ہو۔

امام حنبل سعد سے روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا کہ "اے میری امت! دو بڑی چیزیں تمھارے درمیان چھوڑتا ہوں اگر انکو پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ایک خدا کی کتاب جو ایک ریسمان ہے آسمان سے لٹکی ہوئی اور دوسری میرے اہل بیت وعترت"

شرف نبوت مین ابوسعید نے حضرت عبدالعزیز سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
انا واھل بیتی شجرۃ فی الجنتہ واغصانھا فی الدنیا فمن تمسک بھا اتخذ الی اللہ سبیلا
مین اور میرے اہل بیت جنت کا ایک درخت ہین جسکی شاخین دنیا مین پھیلی ہوئی ہین۔
ان شاخون کو جو کوئی تھام لیتا ہے وہ خدا کی طرف پھونچنے کی راہ پا جاتا ہے۔
زید بن ارقم سے ایک اور روایت حافظ جمال الدین محمد یوسف زرندی نے نقل کی ہے۔
کہ جب جناب رسالت مآب حجۃ الوداع کے لئے تشریف لائے تو مسلمانون سے خطاب فرمایا۔
انی فرطکم علی الحوض وانکم تبعی وانکم توشکون ان تردوا علی الحوض فاسئلکم من ثقلی کیف
خلفتمونی فیھا۔ بیشک مین تمھارا پہلے سے بھیجا ہوا نفع حوض کوثر پر ہون اور تم میرے بعد اور میرے
پیچھے رہوگے اور تم ضرور حوض کوثر پر مجھسے ملوگے تو اسوقت مین تم سے اپنی دونون بھاری چیزون
کی نسبت پوچھون گا کہ تمنے انکے ساتھ میرے پیچھے کیا کیا؟ مہاجرین رضی اللہ عنہم نے دریافت
کیا کہ وہ دونون بھاری چیزین کیا ہین؟ ارشاد ہوا کہ الاکبر منھما کتاب اللہ سبب طرفہ
بید اللہ وطرفہ بایدیکم فتمسکوا بہ والاصغر عترتی فمن استقبل قبلتی واجاب دعوتی
فلیستوص بھم خیرا۔ ان دونون مین سے بڑی چیز تو خدا کی کتاب ہے۔ وہ ایک سبب (رسی)
ہے جسکا ایک کنارہ خدا کے ہاتھ مین ہے اور دوسرا کنارہ تمھارے ہاتھون مین۔ تم انکو پکڑے رہو
اور چھوٹی چیز میری عترت (اولاد) ہے تو جو شخص میرے قبلے کی طرف رخ کرے اور میری دعوت
اسلام پر اجابت و قبول کرے اسکو لازم ہے کہ انکے لئے بھلائی کی وصیت قبول کرے۔
عمران بن حصین روایت کرتے ہین کہ سرور دو عالم نے فرمایا سألت ربی ان لا یدخل النار
احدا من اھل بیتی فاعطانی ذالک مین نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ میرے اہل
بیت مین سے کسی کو دوزخ مین داخل نہ کرے۔ تو خدا نے مجھے اس دعا کی قبولیت دیدی۔
امام فخرالدین رازی فرماتے ہین کہ اہل بیت رسالت پانچ چیزون مین حضرت نبوت کے
برابر ہین۔ ایک تشہد مین حضرت پر درود بھیجتے ہین۔ دوسرے سلام مین۔ تیسرے طہارت و پاکیزگی

ہیں۔ چوتھے تحریم صدقہ[۱] میں۔ پانچویں، وجوب محبت میں۔ لیکن خیال رہے کہ ہر حال میں توحید وابلاغ رسالت کا مقر ہونا لازم ولابد ہے۔ اسی لئے حاکم نے بہ اسناد صحیح یہ لفظ بتائے ہیں کہ حضرت نے فرمایا وعدنی ربی فی اھل بیتی من اقر منھم بالتوحید ولی بالبلاغ ان لا یعذبھم]۔

اختصاص

یہ حدیث تمامی صحاح ستہ میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا رحم اللہ علیاً۔ اللھم ادر الحق معہ حیثما دار خدا علی پر رحمت کرے۔ بار الٰہا حق کو علی کے ساتھ پھرا جہاں کہیں وہ پھریں۔

احمد بن موثر سے یہ حدیث مروی ہے الحق مع علی وعلی مع الحق۔ لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔ حق علی کے ساتھ ہے اور علی حق کے ساتھ۔ اور ہرگز جدا نہ ہونگے جب تک حوض کے نزدیک میرے پاس وارد نہ ہوں۔

---

[۱] صدقہ کا مال، لوگوں کا چرک ومیل ہے۔ شرفا پر اُسکا لینا حرام ہے اُسکے عوض اِنکے لئے خمس، خمس فئی اور غنیمت سے مقرر ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔ بنی ہاشم وبنی مطلب دونوں پر صدقہ حرام بتلاتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک صرف بنی ہاشم پر تحریم صدقہ کا قصر کرتے ہیں۔ اکثر علمائے احناف وشوافع وحنابلہ کا مذہب ہے کہ بنی ہاشم کو صدقۂ نفل کا دینا روا ودرست ہے۔ ایک روایت سے امام مالک کے نزدیک بھی اسکا جواز پایا جاتا ہے لیکن دوسری روایت کے مطابق صدقۂ فرض کا لینا درست ہے نہ صدقہ تطوع کا۔ اسمیں زیادہ ذلت ہے۔ راجح و مختار یہ ہے کہ بنی ہاشم پر بھی زکوۃ مفروضہ کا لینا مطلقاً حرام ہے۔ خواہ خمس ملے یا نہ ملے۔ بلکہ اُنکے موالی پر بھی زکوۃ کا لینا منع ہے۔ اور تقوی یہ ہے کہ صدقۂ تطوع بھی نہ لیں۔

شرعاً لوٹ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو کفار سے لڑکر ہاتھ آجائے اُسکو غنیمت کہتے ہیں۔ اور دوسری وہ جو بے لڑے ہاتھ لگے اُسکو اصطلاح میں فئے کہتے ہیں جسکا ترجمہ آجکل کی زبان میں مفت کیا جاتا ہے۔

احمد بن حنبل اپنی مسند مین جابرؓ سے روایت کرتے ہین کہ پیغمبر نے علی سے کہا کہ "اے علی! مین اور تم ایک درخت سے خلق ہوئے ہو۔ مین اُس درخت کی اصل (جڑ) ہون۔ اور تم فرع (شاخ) ہو۔ حسن و حسین اُس درخت کی شاخین ہین۔ پس جو کوئی اُن شاخون سے کسی شاخ مین لٹک جائے گا۔ ہمیشہ بہشت مین رہے گا۔"

مسلم نے اپنی صحیح مین دو مواضع پر زید بن ارقم سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ پیغمبر صلعم نے مکہ و مدینہ کے درمیان خطبہ کیا اور اُس خطبہ مین فرمایا کہ "اے لوگو! نزدیک ہے کہ میرے پروردگار کا رسول (فرستادہ) میرے پاس آئے اور مین اُسکو اجابت کرون۔ پس تمھارے درمیان دو چیز ودیعت چھوڑتا ہون۔ دو بڑی چیزین۔ ایک خدا کی کتاب۔ دوسرے اپنے اہل بیت کو۔ اور سفارش کرتا ہون تم سے اپنے اہل بیت کے حق مین۔"

جار اللہ زمخشری نے باسناد مختلفہ اس روایت کو نقل کیا ہے کہ حضرت صلعم نے فرمایا کہ "فاطمہ سرور دل ہے اُسکے دونون بیٹے میرے دل کا میوہ، اور اُسکا شوہر میری آنکھ کا نور۔"

مفسرین عظام لکھتے ہین کہ جب آیت پاک قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کے وہ کون اقربا ہین جنکی مودت ہم پر لازم ہے تو فرمایا کہ علی و فاطمہ و ابناھما (علی اور فاطمہ اور اُنکے دونون بیٹے)۔

جنکے اور جنکے بزرگون کی نسبت مخالف و موافق نے مدائح و محامد مین اتفاق رکھا ہے انکی متابعت و محبت مسلمانون پر واجب ہے اور اُن سے بغض و کینہ رکھنا بہ تحریم غلیظ حرام ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور جسکی تصریح بیہقی و بغوی نے فرمادی ہے۔ شافعی نے اسپر ان الفاظ مین تنصیص کی ہے ؎

یا اھل بیت رسول اللہ حبکم	فرض من اللہ فی القرآن انزلہ
یکفیکم من عظیم الفخر انکم	من لم یصل علیکم لاصلوٰۃ لہ

ترمذی میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا اللہ کو دوست رکھو کیونکہ وہ ہر صبح تم کو اپنی نعمت دیتا ہے اور اللہ کی وجہ سے مجھے دوست رکھو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت کو دوست رکھو قال رسول اللہ صلعم احبوا اللہ لما یغذ وکم من نعمۃ و احبونی بحب اللہ واحبوا اھل بیتی بحبی۔

• بخاری میں عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا ارقبوا محمدا فی اھل بیتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام و بزرگی انکے اہل بیت کے حق میں کرو۔

حُب اہل بیت

میر عبدالجلیل کو تولائے اہل بیت اظہار میں بڑا شغف تھا۔ انکے حسن عقیدت کی جھلک انکے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مثنوی طوطے فرخ سیر کے خاتمہ میں "خداوندگنہ بخش ترحم آفرین" سے نجابہ وا ستغفار فرماتے اور لکھتے ہیں ؎

باعزاز رسول رحمت آثار — بہ آل طیب و اصحاب اخیار
خصوص آن پنجتن نور سرھن — کہ حُب شان بود سرمایۂ من
کہ در محشر چو دست و پا کنم گم — ترحم کن بہ حال ما ترحم

سادات کے فضائل میں انھوں نے متعدد رباعیاں لکھی ہیں۔ انکے انداز تحریر سے پایا جاتا ہے بلکہ ایک رقعہ میں اپنے فرزند رشید سے صاف طور پر اظہار بھی کر دیا تھا کہ اگر سادات کی منقبت سرائی سے خود اپنے ترفع شان اور نجابت و سیادت کے اظہار اور مباہات و افتخار پر محمول کئے جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ بہت لکھتے اور کیا کچھ نہ لکھتے ؎

(۱)

اولاد علی خلاصۂ ابرار اند — چون والد خویش محرم اسرار اند

تحلیل مواد فاسد کفر کنند | در منفعت مزاج دین جدوارند

دوسرا شعر ید بیضا مین یون نقل کیا ہے ؎

ذالیشان باشد مزاج اسلام قوی | در تقویت دین متین جدوارند

یہی رباعی کسی قدر تغیر عبارت کے ساتھ شیخ حزین اصفہانی اور والہ داغستانی نے میر عسکری[۱۷۲] قمی کے نام سے لکھی ہے ؎

سبطین کز انبیا فزون مقدارند | چون والد خویش محرم اسرارند

باشد ز امیشان عزاج اسلام قوی | در تقویت دین نبی جدوارند

۱۷۲؎ ملک قمی، میر عسکری نام، بڑا فصیح و بلیغ شاعر تھا۔ ملک الکلام بھی کہلاتا ہے شاعری کا شوق بچپن سے دامنگیر تھا۔ پہلے قم سے کاشان آکر مشق سخن کی پھر قزوین گیا اور چار سال قیام کیا۔ رمضان ۹۸۷ھ (نومبر ۱۵۷۹ء) مین ہندوستان آیا۔ سلاطین دکن نے بڑی قدر شناسی کی۔ مرتضی نظام شاہ دیوانہ والی احمد نگر اور اُسکے بعد برہان شاہ نے انعام واکرام سے مالامال کردیا۔ پھر بیجاپور، ابراہیم عادل شاہ کے دربار مین چلا گیا۔ جس نے بڑی رعایات وعنایات فرمائین۔ وہین ملا ظہوری کا جوہر قابلیت واستعداد دیکھ کر اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کردی۔ شیخ فیضی جب اکبر کی طرف سے برہان شاہ والی احمد نگر کے یہان سفیر ہو کر گیا تھا تو اپنے عریضہ مین بادشاہ کو لکھا تھا کہ "در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد، صافی مشرب اند۔ ودر شعر رتبۂ عالی دارند۔ یکے ملا ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط می کند وہمیشہ مژہ ترسے دارد۔ دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است۔ ودر مکارم اخلاق تمام۔ عزیمت آستان بوس دارد" تاریخ عالم آرائے عباسی مین لکھا ہے کہ ملک قمی نے ظہوری ترشیزی کی شرکت واتفاق سے کتاب "نورس" نوہزار شعر کی عادل شاہ کے نام پر لکھی تھی اور نوہزار ہون بالمناصفہ صلہ پایا تھا۔ خان آرزو لکھتا ہے کہ قمی وظہوری نے مخزن کے برابر ایک کتاب تصنیف کی اور اُسکے عوض مین ایک شتر کا بار سونا عادل شاہ نے دیا۔ جب اکبر بادشاہ کی فوجون نے قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا تو ملک قمی نے وہان سے نکلکر شاہزادہ شاہ مراد اور نواب سپہ سالار عبدالرحیم خان خانخانان کی آستان بوسی کی۔ ہر ایک کی مدح مین قصائد غرا لکھے اور انعامات پائے۔ ملازمت کے لئے ہر چند اُس سے اصرار ہوا مگر قبول ومنظور نہ کیا۔ ایک ضخیم کلیات کئی مثنویان یادگار چھوڑی ہین۔ بروایت ناظم تبریزی ۱۰۲۴ھ مین وفات پائی لیکن کلیم سال وفات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) بتاتا اور "بگفتا اُوستاد سخن بود" سے تاریخ نکالتا ہے۔

میر غلام علی آزاد، خزانۂ عامرہ مین لکھتے ہین کہ میر عبد الجلیل نے یہ رباعی "عشرہ دہم بعد الف" مین کھی تھی اور سنہ ۱۱۰۱ھ (سنہ ۱۶۸۸-۹ء) کے بعد عشرہ رابع مین انتقال کیا۔ واله کہتا ہے کہ میر عسکری نے سنہ ۱۱۰۱ھ (سنہ ۱۶۸۸-۹ء) کے بعد عشرہ سادس مین وفات پائی تو ظاہر ہے کہ میر عسکری کا زمانہ میر عبد الجلیل کے زمانہ سے خصوصاً اس رباعی کے نظم کرنے کے اعتبار سے بہت متاخر ہے[۱۵۱] لہذا میر عبد الجلیل کی عبارت کی ترجیح نقاد سخن پر ظاہر ہے ؎

(۲)

از بہر محبت علی ہستی ماست گلچینی این بھار تردستی ماست
دل ساغر و مہر ساقی کوثر، مے از میکدۂ غدیر خم مستی ماست

(۳)

گویند کہ پنج است بنائے اسلام غافل شدہ از معنی این حرف عوام
یعنی از حب پنج تن در دنیا گردید بنائے دین اسلام تمام

(۴)

از دوستی پنج تن اے معنی سنج در ہر دو جہان از تو رود آفت و رنج
زان داد خدا بدست تو پنج انگشت تا دامن پنج تن بگیری زین پنج

(۵)

تا مرقد پاک تو خراسان شدہ است این خطہ بہ از روضۂ رضوان شدہ است
معلوم شد اکنون کہ خراسان زچہ رو منسوب بہ آفتاب تابان شدہ است

منقبت آل پاک مین اور بہت سا کلام ہے لیکن پانچ کے عدد کی رعایت سے یہ پانچ رباعیان نقل کر دی گئین۔

۱۵۱ یہ صریحاً غلط ہے۔ میر عسکری کا زمانہ میر عبد الجلیل سے بہت پیشتر تھا۔ سنین کی یہ غلطی خواہ والہ کی ہو یا خود میر غلام علی نے دی ہے۔

اس بحث کی نسبت کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو جناب عایشہ صدیقہؓ پر فضیلت تھی اپنے عقیدے کو ظاہر کرتے ہین [۱۷۴] ؎

وی کسے گفت عایشہ در فضل — بہتر از بنت سید البشر است

مصرعے در جواب او خوانم — رشتہ دیگر، رگ جگر دگر است

یہ حسین ثنائی کے مصرع کی تضمین ہے۔ اُسکا شعر یہ تھا ؎

لذت سوختن ز شمع مپرس — رشتہ دیگر، رگ جگر دگر است

میر عبدالجلیل کے اہل وطن بلکہ بعض اہل عشیرت کو اس تفضیل [۱۷۵] و ثنا خوانی مین خلوص و عقیدت کا نہین، بلکہ جاہ طلبی و زمانہ پرستی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ معترضین اسکو اپنے مربی و سرپرست شیعہ امرا کے تملق اور خوش کرنے اور اپنا رنگ جمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے یہ عاجز جامع اوراق ان ایرادات کی تائید یا تردید کے لیے کوئی مواد فراہم نہین پاتا۔ میر عبدالجلیل نے عالم رویا مین خود حضرت سید الاولیا کرم اللہ وجہہ کا دامن پکڑا تھا اور ظاہر مین شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نقش قدم پر چلے تھے اور اُنکی صحبت و ارشادات سے فیض و برکت حاصل کی تھی۔ میر کا اصلی مسلک یا طریق تصوف تو معلوم نہین (اغلباً قادری تھے) مگر شیخ اسم بامسمی اور پکے نقشبندی تھے۔ اس خاندان کا سلسلہ حضرت [۱۷۶] ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے چلتا ہے۔ وہان یہ معارضات

---

[۱۷۴] الفرع النامی من الاصل السامی۔ سید صدیق حسن خان۔ صفحہ ۱۵۵۔

[۱۷۵] تفضیل ایک شخص کو دوسرے سے زیادہ برگزیدہ جاننے۔ اور ترجیح دینے۔ اور بزرگ تر بتانے کو کہتے ہین۔ اہل سنت وجماعت مین ایک فرقہ تفضیلی بھی ہے جو اگرچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ بلا فصل نہین کہتے بلکہ خلیفہ چہارم مانتے ہین۔ مگر اوصاف و فضائل مین اُنکو خلفائے ثلثہ اولین سے افضل و بزرگ تر بتاتے ہین۔

[۱۷۶] حضرت ابوبکر صدیق اکابر و عمایدِ قریش سے تھے۔ نام نامی عبداللہ بن عثمان بن ابی عامر تھا۔ ابن ابی قحافہ کنیت تھی۔ حضرت رسول مقبول علیہ الصلوۃ والسلام کے نسب سے آپ کا نسب مرہ بن کعب پر جا کر مل جاتا ہے۔ آپ کا لقب صدیق (نہایت سچ بولنے والے اور ہر ایک کی بات کو بالکل سچ مان لینے والے)

کہان۔ اُس طریقہ سنیہ کے اکابر ومشایخ کے اقوال وارشادات تو کچھ اور ہین۔
شیخ فاضل دولت شاہ سمرقندی، صاحب تذکرۂ مشہورہ ایسے تنگ نظر لوگون پر تعجب کرتے اور لکھتے ہین کہ ہر شخص جسکو عالم معنی سے ذرا بھی آگاہی ہے اپنے کو رد و قبول سے دور رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اُسکو فضولی کے لئے پیدا نہین کیا گیا ہے۔ خاصکر اصحاب رسول صلعم کے

اسوجہ سے قرار پایا کہ حضرت صلعم کی نبوت اور معراج پر سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے تھے۔ آپ کی صاحبزادی عایشہ صدیقہؓ رسول پاک کے حبالۂ نکاح مین تھین۔ حضرت صلعم نے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ (۷ رجون سنہ ۶۳۲ء) کو وفات پائی۔ ثقیفہ بنی ساعدہ مین مہاجرین وانصار نے مشورہ وصلاح کرکے بالاتفاق حضرت ابوبکر سے بیعت کی، اور اپنا امام قرار دیا اور خلیفہ رسول اللہ کہکر خطاب کیا۔ مسند خلافت پر آپ کو بٹھایا۔ ابوبکر نے کچھ دن بعد ممالک عراق وعجم کی تسخیر کے لئے خالد کو، ریاست حیرہ کے لئے مثنیٰ بن حارث کو، شام کے لئے ابو عبیدہ بن الجراح کو روانہ کیا۔ مورخین لکھتے ہین کہ جس روز دمشق فتح ہوا ہے اُسی دن ابوبکر صدیق نے اس جہان سے انتقال فرمایا۔ آپ کی وفات ہجرت کے تیرہوین سال ۲۲ جمادی الآخر (۲۳ اگست سنہ ۶۳۴ء) کو ترسٹھ سال تین ماہ نو یوم کی عمر مین ہوئی۔ مدت خلافت دو سال پانچ ماہ تھی۔ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرُبَتْ عَلٰی اَحَدٍ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ اَفْضَلُ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ حدیث پاک آپ کی شان مین ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ مین اسی حدیث کی طرف تلمیح کی ہے ؎

چہ گفت آن خداوند تنزیل وحی — خداوند امر و خداوند نہی
کہ خورشید بعد از رسولان مہ — نتابید بر کس ز بوبکر بہ

[یہ وہی فردوسی ہے جسکو یورپ فارسی کا ہومر Homer مانتا ہے اور وہی شاہنامہ جسکو ابن الاثیر فارسی کا قرآن بتاتا ہے]

دوسری حدیث طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے روایت کی ہے انہ لم یکن نبی الا ولہ خلیل من امتہ وان خلیلی ابوبکر بن ابی قحافہ۔ وان اللہ اتخذ صاحبکم خلیلا۔ صدیق اکبر کے مناقب وخصوصیات مین سے تھا کہ آپ نے نبی صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ سے اپنے لیے کبھی کسی شے کا سوال نہین کیا حتی کہ دعا کا بھی۔ آپ بھی اُسی جماعت صحابہ سے تھے جس نے آنحضرت سے بیعت اس بات پر کی تھی کہ باہم کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگین گے۔ اور اس عہد کو یہان تک نباہ دیا کہ سوار ہونے کی حالت مین بھی اگر کسی کا کوڑا گر جاتا یا ہاتھ سے مہار شتر چھوٹ جاتی تو اُسکے اٹھا دینے کے لئے دوسرے سے کبھی نہ کہتا۔

قبول ورد کے لئے۔ ہر ایک کو بزرگ و فاضل جاننا اور حق و راستی پر سمجھنا، یہی شریعت ہے۔ ورنہ طریقت کفر ہو جاتی ہے۔"

حضرت عطار[۱۵۰] نے اس بارہ مین خوب فرمایا ہے ؎

اپنے معاصر شرفاے عرب مین علم و فضل اور شعر گوئی مین کسی سے کم نہ تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار قدس مین رونق بخش ہونے پر جو منظوم مرثیہ کہا تھا آج تک اہل سخن کی زبان پر ہے۔ اسیطرح آپ کی مشہور مناجات، جسکو اہل اللہ اور اہل دل اور اہل درد ہر صبح پڑھتے اور استجابت دعا و بخوے کا لطف پاتے ہین۔

۱۵۰ شیخ فریدالدین عطار، محمد بن ابراہیم نام، کدکن اعمال (ضلع) نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ابتدا مین اپنا آبائی پیشہ عطاری کیا کرتے تھے۔ ایک دن کوئی درویش انکے یہان آیا اور کوئی چیز مانگی۔ یہ نہایت مشغول تھے ملتفت نہ ہو سکے۔ درویش نے کہا کہ "بابا اسقدر خواہش و تعلق کے ساتھ آپ کیونکر مرینگے"! انھون نے جواب دیا کہ "جس طرح تم مروگے" درویش نے کہا کہ "خواجہ صاحب آپ میرا ساتھ نہ دے سکین گے"! اسیوقت لکڑی کا پیالہ جو ہاتھ مین تھا درویش نے سر کے نیچے رکھ کر لا الہ کہہ کر جان دیدی۔ عطار اس واقعہ کو دیکھ کر دوکان سے اٹھ کھڑے ہوے اور جس نے جو مانگا دے ڈالا۔ وطن مین بزمانہ طفولیت قطب عالم قطب الدین حیدر کے مرید ہو چکے تھے۔ کئی سال شیخ رکن الدین کاف کے ہمراہ رہے۔ پھر زیارت بیت اللہ کے لئے گئے۔ وہان بہت سے بزرگون کی زیارت کی۔ واپسی پر فخر الشہدا شیخ مجدالدین بغدادی کی خدمت مین حاضر ہو کر خرقہ ارادت پہنا۔ ملا جامی نفحات الانس مین لکھتے ہین کہ مولانا جلال الدین رومی قبۃ الاسلام بلخ سے جاتے ہوے جب نیشاپور سے گزرے تو شیخ کی صحبت مین بھی حاضر ہوے وہ زمانہ شیخ کے کبرسن کا تھا۔ آپ نے اپنی تصنیف اسرار نامہ کا ایک نسخہ مولانا کو دیا جسکو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے اور معارف و حقائق کے بیان کرنے مین شیخ کی اقتدا کرتے۔ آپ کے فضل اور عظمت شان کے تمام معاصرین و متاخرین، مشائخ و علما، سب معترف ہین۔ سلطان سنجر کے عہد مین شعبان سنہ ۵۱۳ھ (نومبر سنہ ۱۱۱۹ء) مین پیدا ہوے۔ انتیس سال نیشاپور مین رہے اور پچاسی برس شہر شادیاخ مین۔ نیشاپور کے قتل عام مین ۱۰ جمادی الثانی سنہ ۶۲۷ھ (۲۶ اپریل سنہ ۱۲۳۰ء) کو ایک مغل کے ہاتھ سے شہید ہوے۔ ایک سو چودہ برس کی عمر تھی۔ ایک ضعیف روایت سے سال وفات ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف عظیم ہے! شیخ کی تالیفات کثیر ہین۔ منظوم رسالون کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے۔ ایک دیوان کبیر الحجم، متعدد مثنویان اور ایک تذکرۃ الاولیا یادگار چھوڑا ہے۔ منطق الطیر، الٰہی نامہ، اسرار نامہ، مظہر العجائب، حیدری نامہ، مختار نامہ، جامع رباعیات، زیادہ شہرت رکھتے ہین۔

الا اے در تعصب جانت رفتہ — گناہ خلق در دیوانت رفتہ
مشو از الٰہی۔ پر زرق و پر مکر — گرفتار علی ماندی و بو بکر
گھے، این یک بود نزد تو مقبول — گھے، آن یک بود از کار معزول
گر این بہتر، ور آن بہتر ترا چہ — کہ تو چون حلقہ بر در، ترا چہ
یقین دانم کہ فردا پیش حلقہ — یکے کردند ہفتاد و دو فرقہ
چو یک دم زین تخیل می نہ رستی — ندانم تا خدا را کے پرستی
گر فتم گر ہمہ زشت ار نکو بند — چو نیکو بنگری جویاے او بند
الٰہی نفس سرکش را زبون کن — فضولی از دل جملہ برون کن
دل ما را بخود مشغول گردان — تعصب جوے را معزول گردان

مولانا کمال غیاث[۱] شیرازی نہایت دانشمند، مورخ، حکیم شیوہ اور خوش طبع تھے۔

مولانا کاتبی محمد بن عبد اللہ نیشاپوری صاحب مثنوی مجمع البحرین نے ایک قصیدہ ردیف گل مین لکھا ہے جسمین حضرت عطار کی شان مین لکھتے ہین ؎

ہم چو عطار از گلستان نشاپورم ولے — خار صحرائے نشاپورم من و عطار گل

[۱] شیراز مین یہ نام کسی وقت بہت مقبول تھا۔ نوین صدی مین مولانا غیاث نے اور دسوین مین امیر غیاث الدین (منصور پسر امیر صدر الدین) نے زیادہ شہرت پائی لیکن دونون کے مزاج و طبائع مین تباین و اختلاف شدید تھا۔ امیر نے ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) مین وفات پائی۔ انکا ایک ذکی و ذہین شاگرد حکیم فتح اللہ شیرازی ہندوستان آیا تھا۔ پہلے سلطان علی عادل شاہ والی بیجاپور کا متوسل و وکیل اور اُسکے بعد شہنشاہ اکبر کا معتمد و ندیم ہوگیا تھا۔ امیر جتنے بڑے ذی علم و حافظ احادیث و حامل علوم شرعیہ تھے اتنے ہی دیندار اور پابند احکام دینیہ بھی تھے۔ احتیاج در دو قدح سے دریغ نہ فرماتے۔ چودہ سال کی عمر مین علامۂ محقق جلال الدین محمد دوانی سے مناظرہ کا داعیہ پیدا ہوا تھا۔ حجۃ الکلام مین حجۃ الاسلام امام غزالی کے بعض اقوال کی تردید کی ہے محاکمات صدر الدین محمد شیرازی و جلال الدین محمد دوانی کی شرح تحریر کی ہے استاد البشر لقب تھا۔ اخلاق منصوری آپکی یادگار ہے۔

شاعری کے پہلوان اور فارسی زبان کے معرکہ گیر مانے گئے ہین۔ خاندان طیبین وطاہرین کے مناقب مین قصائد غرا لکھے ہین مگر منصف مزاج اور بعض ابنائے جنس کے خلاف تعصب وتشیع سے پاک تھے ہمیشہ اعتدال مرعی رکھتے۔ ایک مرتبہ شاہزادہ[۱] ابراہیم سلطان گورگان نے پوچھا کہ "مولانا کس مذہب کے متابعین وپیرو زیادہ اچھے اور بزرگ ہین" جواب دیا کہ "ہر قوم وہر مذہب کے صلحاء"

مولانا غیاث باہمہ علم وحکمت کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے صلح وآشتی ومیانہ روی اُنکا شیوہ عالی تھا۔ مورخین اُن کے تدین کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے ہین لکھتے ہین کہ نماز وعبادات کے چندان پابند نہ تھے۔ اُنکے معتقدات پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ مولانا نے تمام عمر نہایت آزادہ روی اور آزاد خیالی کے ساتھ گذاردی کبھی کسی سرکاری خدمت کا بار سر پر اپنا گوارا نہ کیا۔ امیر منصور مدت دراز تک بادشاہ کی صدارت پر مامور رہے تھے۔ امیر نے بہت سی تصانیف رائقہ یادگار چھوڑی ہین۔ مولانا کے علمی کارنامون پر مستوری وگمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے ؂

یادش بخیر وہ دل ناکام ونامراد اس طرح کچھ گیا کہ پتا بھی کہیں نہیں

[۱] امیر تیمور صاحبقران کا پوتا۔ مرزا شاہرخ کا منجھلا بیٹا تھا مرزا نے اپنی زندگی مین رفع شر اور حفظ امن کے لئے اپنی مملکت اپنے بیٹون مین تقسیم کردی تھی۔ شاہزادہ ابراہیم سلطان گورگان کو پہلے بلخ وطخارستان کی حکومت تا حدود کابل وبدخشان سپرد کی تھی بعد ازان ولایت شیراز پر مامور کیا تھا۔ یہ ایک ذی علم وعلم دوست شاہزادہ تھا۔ اُسکے دربار مین علماء وحکماء وشعراء کا مجمع رہتا علمی بحثین ہوتین دلچسپ صحبتین رہتی تھین۔ اہل تاریخ لکھتے ہین کہ ان تینون بھائیون (الغ بیگ، بایسنغر، اور ابراہیم سلطان) کے دور مین ھرات وسمرقند وماوراء النہر دار العلم والعمل بنے ہوئے تھے۔ ان شاہزادون کے باہمی لطائف ومکاتبات دنیائے علم مین یادگار بتائے جاتے ہین۔

ابراہیم نے اپنے باپ مرزا شاہرخ کی حیات اور اپنی جوانی مین ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) مین شیراز مین وفات پائی۔ مرزا عبداللہ اُسکا فرزند سمرقند مین دادا کے تخت پر بیٹھا تھا۔

گورگان ترکی زبان مین داماد کو کہتے ہین۔ چغتا خان کے سلسلۂ قرابت مین جو شخص دامادی کا شرف پا جاتا تھا اوسکو یہ خطاب ملتا تھا۔ تیمور خود بھی اُسی نسل سے تھا اور پھر بادشاہ وقت کی لڑکی سے شادی کی تھی اسلئے گورگان کہلاتا تھا اُسکے بعد یہ لقب اُسکی اولاد مین بھی چلا آیا۔

استاد اسعد میہنی ۵۱۳ھ جو فحول علماء سے تھا سلطان محمد ۵۱۱ھ بن ملک شاہ کی مجلس میں افضل العلماء

۵۱۳ھ ابوالفتح اسعد بن ابی نصر بن ابی الفضل المیہنی الفقیہ الشافعی الملقب بہ مجد الدین [میہنی بکسر میم وسکون یاء وفتح ھا۔ دیہ آخر نون۔ میہنہ سے منسوب ہے جو بروایت ابن خلکان خابران کا ایک قریہ ہے اور خابران مابین سرخس وابی ورد کے اقلیم خراسان میں ایک ناحیہ ہے] استاذ اسعد فقہ اور دیگر علوم وفنون متداولہ میں نامور امام گذرے ہیں۔ انکی تعلیقات مشہور ہیں۔ فقہ مرو میں حاصل کی تھی۔ پھر غزنہ چلے آئے وہاں بڑی شہرت پائی، انکے علم وتبحر کی خوب اشاعت ہوئی۔ غزی نے بھی انکی مدح کی ہے۔ پھر بغداد آگئے وہاں کے مدرسہ نظامیہ کی تدریس دوبارا انکے سپرد ہوئی۔ پہلے سنہ ۵۰۷ھ (سنہ ۱۱۱۴ء) میں۔ جس سے ۱۸ رشعبان سنہ ۵۱۳ھ (۱۵ رنومبر سنہ ۱۱۱۹ء) کو سبکدوش کردیے گئے۔ دوسری بار شعبان سنہ ۵۱۷ھ (اکتوبر سنہ ۱۱۲۳ء) میں مقرر ہوے۔ اسی سال ذیقعدہ (جنوری سنہ ۱۱۲۴ء) میں عسکر (من محلات نیشاپور) چلے آئے مدرسہ میں دوسرا استاد مقرر ہوگیا۔ عسکر میں انکے گرد ازدحام عام رہتا تھا خلق کثیر انکے علم وفضل سے فائدہ اٹھاتی۔ ان کی تقریر وتحریر ومناظرات سے متمتع ہوتی تھی۔ حافظ ابوسعد سمعانی نے اپنی کتاب الذیل (تاریخ خطیب) میں انکو بڑی عزت سے یاد کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود سلجوقی کی طرف سے مرو میں سفیر مقرر ہوکر آئے تھے۔ پھر بغداد سے ہمدان کو ایلچی بنا کر بھیجے گئے۔ ہمدان میں سنہ ۵۲۷ھ (سنہ ۱۱۳۳ء) میں وفات پائی۔ سمعانی لکھتے ہیں کہ مجھسے ابوبکر محمد بن علی بن عمر خطیب نے روایت کی تھی اور انسے کسی فقیہ اہل قزوین نے کہا تھا جو پایان عمر میں اسعد کی خدمت وتیمار ہمدان میں کرتا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ موت کا وقت جب قریب آیا تو میں بھی استاد کے پاس انکے گھر پر موجود تھا۔ استاد نے ہم سب کو دور ہٹا دیا ہم لوگ باہر چلے آے مگر دروازے سے لگے کھڑے رہے اور سننے لگے۔ امام اپنے چہرے پر طمانچے مارتے اور کہتے تھے "یا حسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ"۔ خوب روتے تھے اور منہ پیٹتے تھے اور بار بار یہی کہتے تھے۔ حتی کہ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔

انھیں اسعد میہنی کے تلامذہ (یعنی مدرسہ نظامیہ کے طلبہ) میں شیخ العراق امام ابوالنجیب عبدالقاہر ضیاء الدین سہروردی تھے۔

۵۱۱ھ ابوشجاع محمد بن ملک شاہ بن الپ ارسلان ملقب بہ غیاث الدین۔ جب ملک شاہ نے ۱۶ رشوال سنہ ۴۸۵ھ (۲۰ نومبر سنہ ۱۰۹۲ء) کو وفات پائی تو اس کی مملکت اسکے تینوں بیٹوں (۱) برکیاروق (۲) سنجر (۳) محمد میں منقسم ہوگئی۔ محمد اور سنجر ایک ماں سے تھے۔ تاہم تعلقات کشیدہ رہتے۔ جب محمد وبرکیاروق میں اختلاف پیدا ہوا تو محمد اور سنجر بغداد آے۔ امام مستظہر باللہ نے انپر نوازش وعنایت فرمائی۔ محمد نے امیر المومنین سے درخواست کی

کہ میرے اور میرے بھائی سنجر کے لئے اجلاس کیا جائے۔ التماس منظور ہوا خلیفہ نے قبۃ التاج مین دربار کیا۔ تمام ارباب مراتب اور اتباع حاضر ہوے۔ امیرالمومنین نے ایک سُدّہ (سرادطاق) پر نشست فرمائی۔ سیف الدولہ صدقہ بن مزید صاحب الحلہ (لارڈ چیمبرلین) تخت کی داہنی جانب کھڑا ہوا اُسکی دوش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک تھی۔ سر پر عمامہ اور ہاتھون مین قضیب (عصا) محمد کو حسب عادتِ سلاطین سات پارچہ کا خلعت پہنایا گیا۔ طوق اور تاج مرحمت ہوا۔ سوارین (کنگن) پہنائے گئے۔ خلیفہ نے خود عَلم (لوار) عنایت کیا۔ دو تلوارین زیب گلو کین۔ پانچ گھوڑے مع ساز و یراق کے مرحمت فرمائے۔ سنجر کو بھی اسی طرح خلعت پہنایا گیا جیسا کہ اُس زمانہ مین دستور تھا جامع بغداد مین محمد کے نام کا خطبۂ سلطنت پڑھا گیا۔ برکیاروق کا خطبہ چھوڑا دیا گیا۔ محمد بن عبدالملک ہمدانی اپنی تاریخ مین لکھتے ہین کہ یہ واقعہ ۴۹۵ھ (۱۱۰۲ء) کا ہے۔ مگر صاحب تاریخ سلجوقیہ کا بیان یہ ہے کہ سلطان محمد کا خطبہ بغداد مین ۱۷ ذیحجہ ۴۹۲ھ (۵ نومبر ۱۰۹۹ء) کو پڑھا گیا تھا۔ بقول ہمدانی عجیب اتفاق یہ ہوا تھا کہ جسوقت جامع قصر بغداد کا خطیب سلطان برکیاروق کے لئے دعا مانگنے اور اُسکا نام لینے کو ہوا تو خود بخود اُسکی زبان سے سلطان محمد کا نام اور اُسکے لئے دعا نکلی۔ برکیاروق کے خیر خواہون نے اُس پر آفت ڈہائی۔ وہ معزول ہوا مگر اُس کی جگہ پر اُسکا بیٹا مقرر کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمد کے خطبہ مین صرف چند روز کی تاخیر ہوئی تھی اُسکے حق مین یہی فال نیک تھی۔ اس کے بعد کے واقعات برکیاروق اور محمد شاہ کی جنگ آزمائی اور محمد شاہ کا ۔۔۔ ے مین شکست پانا تاریخون مین بالتفصیل مرقوم ہین۔

سلطان محمد ملوک سلجوقیہ مین بڑا امر د اور نامور گزرا ہے۔ بہت سے آثار جمیلہ اور سیرۂ حسنہ اور معدلت شاملہ یادگار چھوڑی ہین۔ فقرا اور ایتام کے ساتھ بڑی نیکی کرتا تھا۔ طوائف ملحدہ سے ہمیشہ برسر جنگ و پرخاش رہتا۔ امور رعیت پر نگاہ رکھتا۔ ابوالبرکات بن المستوفی نے تاریخ اربل مین اُسکا ذکر کیا ہے اور ایک مخاطبہ (ایڈریس یا بیان) جو امام ابوحامد غزالی نے سلطان محمد بن ملک شاہ سے کیا تھا اُسکو بھی نقل کر دیا ہے۔ برکیاروق کی وفات پر محمد شاہ سلطنت کا مالک مستقل ہو گیا اور دنیا کو عام فائدہ پہونچانے اور نام نیک حاصل کرنے لگا۔ بیمار زیادہ عرصہ تک رہا۔ پنجشنبہ ۲۴ ذیحجہ ۵۲۱ھ (یکم جنوری ۱۱۲۸ء) کو شہر اصفہان مین وفات پائی ۳۷ سال چار ماہ چھ یوم عمر تھی۔ اصبہان مین مدرسہ عظیمہ مین دفن ہوا جو طائفہ حنفیہ کے لئے وقف تھا اور جسکے برابر کوئی کالج دارالسلطنت میں نہ تھا۔ محمد شاہ جب اپنی زندگی سے ناامید ہوا تو اپنے لڑکے محمود کو بلایا اور بوسہ دیا۔ دونون خوب روئے۔ باپ نے بیٹے کو حکم دیا کہ جاؤ۔ تخت شاہی پر جلوس کرو۔ اُسنے ناس پر

نظر ڈالو"۔ بیٹے نے باپ سے عرض کیا کہ آجکا دن بہ طریق نجوم مبارک نہیں ہے"۔ بولا کہ "ہاں سچ ہے۔ لیکن باپ کے لئے نحس اور سلطنت کے لئے مبارک ہے"۔ چنانچہ محمود گیا۔ تخت نشست فرمائی۔ تاج اور سوارین (کنگن) پہنے۔ ملوک سلجوقیہ میں سے کسی نے اتنا سامان، ذخائر، اصناف اموال اور دواب وغیرہ سے نہیں چھوڑا جتنا اس نے چھوڑا تھا امام مقتفی لامر اللہ نے فاطمہ دختر سلطان محمد مذکور سے ۵۳۱ھ (۱۱۳۶ء) میں شادی کی تھی قبول نکاح کا وکیل وزیر شرف الدین ابو القاسم علی بن طراد زینبی تھا۔ لڑکی کا بھائی مسعود بھی مجلس عقد میں موجود تھا۔ فاطمہ بنت سلطان محمد شوہر کے یہاں ۵۳۴ھ (۱۱۳۹ء) میں لائی گئی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ لڑکی نہایت تعلیم یافتہ تھی خوب لکھی پڑھی اور نہایت صائب رائے رکھتی تھی۔ وہ موضع جو درگاہ خاتون کے نام سے معروف ہے اُسکا سکونت گاہ تھا۔ شنبہ ۲۲ ربیع الآخر ۵۴۲ھ (۲۰ ستمبر ۱۱۴۷ء) کو وفات پائی۔ رصافہ (بغداد) میں دفن ہوئی۔

۹۱۰۲ حجۃ الاسلام محمد زین الدین محمد بن محمد بن احمد الغزالی الطوسی۔ آپ کی کنیت ابو حامد تھی۔ غزالہ یا غزّالہ (غزال) کے رہنے والے تھے جو اعمال طوس میں ایک قریہ ہے۔ وہیں ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں پیدا ہوئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ غزال رسیاں فروش کو کہتے ہیں وہ اپنی مادر معظمہ کا تیار کیا ہوا سوت بازار میں لے جاکر فروخت کرتے تھے اسلئے یہی نام قرار پاگیا۔ ابتداءً احمد رازکانی سے طوس میں تعلیم پائی۔ پھر نیشاپور میں امام الحرمین ابو المعالی جوینی سے تکمیل تحصیل علوم فرمائی۔ جب نظام الملک وزیر سے ملاقات ہوگئی تو اُس نے بڑی قدر شناسی اور رعایت و تعظیم کی اسکے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلا کا مجمع رہتا تھا آپ اُن سے مباحثہ و مناظرہ کرتے اور سب پر غالب رہتے۔ کچھ دن بعد نظامیہ بغداد کی تدریس آپ کے سپرد ہوگئی۔ جمادی الاول ۴۸۴ھ (جولائی ۱۰۹۱ء) میں وہاں تشریف لے گئے۔ ذیقعدہ ۴۸۸ھ (نومبر ۱۰۹۵ء) میں تعلقات دنیوی کو خیرباد کہا دنیا سے انقطاع کرلیا۔ حج کو چلے گئے۔ لوٹے تو سیدھے شام میں آئے۔ دمشق میں بود و باش اختیار کی اور جامع غربی کے ایک زاویہ میں پڑھنے پڑھانے لگے۔ پھر بیت المقدس چلے گئے۔ وہاں سے مصر گئے۔ اسکندریہ میں مقیم رہے۔ پھر بلاد مغرب کا رخ کیا۔ امیر یوسف بن تاشفین صاحب مراکش سے ملنے جا رہے تھے۔ راہ میں اُسکے مرنے کی اطلاع پائی تو اپنے وطن طوس چلے آئے۔ اور خلوت گزین ہو گئے۔ احیاء علوم الدین جسکو ابن خلکان "نہایت نفیس و جمیل" کتابوں میں شمار کرتا ہے و کیمیائے سعادت، یاقوت التاویل فی تفسیر التنزیل (چالیس جلدیں) موسوم بہ تفسیر جواہر القرآن، عقائد غزالی، تہافۃ الفلاسفہ، رسالہ علم لدنی، میزان عمل، بدایۃ الہدایۃ، مشکوۃ الانوار، کتاب الوسیط و البسیط و الوجیز، المنخول، الباب المنتحل فی علم الجدل، محک النظر، المنقذ عن الضلالہ وغیرہ ننانوے کتابیں درس عہد عزلت و خلوت کی یادگار ہیں

پیروہون اور شرعیات مین مذہب قرآن کا مجمبر نہ حنیفہ[۱۵۳] کا کچھ حق ہے اور نہ شافعی[۱۵۴] کا کوئی حصہ۔

مستصفیٰ کے (اصول فقہ مین) لکھنے سے ۶ر محرم ۵۰۳ھ کو فراغت پائی۔

گوشۂ عزلت سے نکل کر نظامیہ نشاپور مین درس دینے لگے کچھ دن بعد اسکو بھی ترک کر دیا اور اپنے وطن طوس کو چلے آئے۔ یہان صوفیون کے لیے خانقاہ درست کرائی اور طالبان علم کے واسطے مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اپنے اوقات عزیز تمام تر وظائف خیر و ختم قرآن اور صحبت ارباب قلوب اور تدریس علوم مین صرف فرماتے۔ فقیہ شافعی تھے۔ مفتیان احناف کی ایک جماعت آپ کے خلاف تھی جو قتل کے فتوے دیا کرتی مگر آپ کو کبھی ضرر و گزند نہ پہونچا سکی۔ اہل تصوف لکھتے ہین کہ آپ نے ستر علوم پڑھے تھے مگر کسی سے کشود کار نہ ہوسکا لاچار صوفیہ سے رجوع کیا۔ زہد و عبادت اختیار کی اور فائز المرام ہوے۔ اِن کی عام روش یہی ہے کہ شرعی باتون کو صوفیون کی باتون سے مخلوط کر کے بیان کرتے ہین۔

شاعر بھی بڑے پایہ کے تھے۔ حافظ ابوسعد سمعانی نے اپنی کتاب الذیل مین اِنکے کلام کا کچھ نمونہ دکھایا ہے آپ دوشنبہ کی صبح ۱۴ر جمادی الآخر ۵۰۵ھ (۱۸ر دسمبر ۱۱۱۱ء) کو بمقام طابران (جو طوس کا ایک قصبہ ہے) جوار رحمت حق مین شامل ہوے۔ اور ظاہر (بیرون قصبہ) مین دفن۔ ابوالمظفر محمد ابیوردی مشہور شاعر نے مرثیہ لکھا۔

اِنکے بھائی امام احمد غزالی بھی بڑے عالی مرتبت محقق و عالم تھے۔ بعض اوقات دونون بھائیون مین مناظرہ و مباحثہ ہو جاتا تھا۔ امام صاحب کے تلمیذ رشید محمد بن ابی القاسم طوسی تھے۔ جنھون نے اپنے وحید عصر استاد کے بہت سے حالات رسالہ محاکمات مین تحریر کئے ہین۔ مرزبان نامہ کے باب سوم مین کچھ احوال مرقوم ہین مستشرقین یورپ مین سے براؤن نے اپنی مشہور تاریخ ادبیات ایران مین آپ کو کئی جگہ بڑی عظمت وادب سے یاد کیا ہے۔ ترکی ترجمہ سے دیکھ اے ہومس H. A. Homes نے کیمیائے سعادت کا انگریزی مین ترجمہ کیا اور وہ الفاظ اِن کی شان مین لکھے ہین جنکو کوئی اور بڑے سے بڑا عقیدتمند بھی نہ لکھ سکے گا۔ البتہ ڈیٹرسی Dieterici مخالفانہ روش رکھتا اور اپنی کتاب فلسفۃ الاعراب (مطبوعہ لیپزگ ۱۸۶۵ء) مین ایراد و تعنّت کرتا ہے۔ جرمن کے ایک وسیع النظر عالم نے آپ کی تصانیف پر تین سو صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے۔

[۱۵۳] ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطا بن ماہ کوفی۔ گو اگرچہ فقہاے بلاد کے تذکرون مین علماے رجال و اصحاب سیر نے نعمان کو ذیل مین شمار کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نام کا انتشار آپ کے علم کا اشتہار آپ کے حکم کا نفاذ کوفہ سے اختصاص نہین رکھتا۔ آپ کی فقاہت و افتاء کا آوازہ و شہرہ چار دانگ عالم

استاد اسعد نے کہا کہ "یہ بات تو ٹھیک نہیں" غزالی نے کہا کہ "اے بیچارے! اگر تجکو علم الیقین سے شمہ

پر محیط ہے۔ جو ربع مسکون کے ثلث اہل سنت بلکہ نصف کے قریب مذہب حنفی (از جملہ مذاہب اربعہ عامہ سے ہے) اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انقلابات حال و دستور جمہوریت سے پیشتر ممالک روم (ترکی) میں لازم و مقرر تھا کہ سلاطین آل عثمان و صدر اعظم اور قاضی القضاۃ (شیخ الاسلام) ابو حنیفہ کے مذہب کے متبع ہوں۔ ائمہ مجتہدین و فقہاء میں آپ اسبق و اقدم تھے۔ امام اعظم کہلاتے ہیں۔ نعمان اصلی نام تھا سلسلۂ نسب نوشیروان تک پہونچتا ہے۔ دادا زمرہ کفار سے تھے۔ لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ مدت تک قبیلہ بنی تیم اللہ بن ثعلبہ میں کسی کے یہاں غلامی میں بسر کی۔ جب آزاد ہوئے تو قبول اسلام کی سعادت نصیب ہوئی جناب ثابت آپ کے والد ماجد اُس وقت عالم وجود میں آئے۔

اہل سنت تذکرہ نگاروں کا قول و عقیدہ ہے کہ اُس مولود کو آستان مبارک علی بن ابی طالب امیر المومنین پر لے گئے۔ حضرت نے ثابت اور اُنکی اولاد کے حق میں دعاے خیر فرمائی۔ چالیس سال سے عمر متجاوز تھی کہ صلب ثابت سے سنہ (سنہ ۶۹۹ء) میں کوفہ میں نعمان (ابو حنیفہ) نے اس عالم میں قدم رکھا رشد کا زمانہ ہوا تو خزازوں (ریشم دوزوں) کی جماعت میں داخل ہو کر داد و ستد کرکے بسر کرنے لگے۔ ایک رات عالم واقعہ میں دیکھا کہ خوابگاہ مطہر حضرت خاتم الانبیاؐ سے کفن نکال رہا ہوں۔ گھبرا کر خواب راحت سے بیدار ہوئے۔ سراسیمگی دہراس غالب تھا۔ مشہور معبر ابوبکر محمد بن سیرین کے پاس آدمی بھیجا اور قصۂ شب گزارش کیا۔ تعبیر کی خواہش کی۔ جواب ملا کہ خواب دیکھنے والے کو اتنا علم مرحمت ہوگا کہ وہ تمامی مردمان زمانہ اور علماے عصر سے بڑھ جائے گا۔ داعیۂ شوق تحصیل اُسیوقت سے روز بروز بڑھنے لگا اور اکتساب معارف و اقتباس معانی میں جد و جہد کرنے لگے۔ ایک گروہ تابعین کی صحبت سے بھی فائض ہوئے تھے۔ منجملہ ۱ عطاء بن ابی رباح ۲ ابو اسحق سبیعی ۳ محارب بن دثار ۴ ہیثم بن حبیب ۵ ہشام بن عروہ ۶ محمد بن منکدر ۷ نافع مولیٰ عبد اللہ بن عمر ۸ سماک بن حرب ۹ ابو عمار ابراہیم نخعی (تابعی) مقامات حدیث اور مراتب معالم دین انھیں بزرگوں کی خدمت میں طے کئے۔ مبانی علم فقہ کو حماد بن ابی سلیمان سے پختہ و مشید کیا۔ عام و خاص ذرائع سے ثابت ہوا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو حضرت امام ہمام جعفر بن محمد الصادق سے بھی تلمذ حاصل تھا۔ جسکا تذکرہ حافظ ابن حجر مکی نے صواعق میں کیا ہے اور علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں۔ بعض تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کی صحبت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ صاحب مطالع العلوم و مجمع الفنون لکھتا ہے کہ امام ابو حنیفہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (سنہ ۱۲۸ھ

پھر بھی آگاہی ہوتی تو یہ نہ کہتا کہ تم خطا کرتے ہو۔ مگر تو تو قید ظاہر مین پڑ گیا اور معذور ہے اگر تیرے

بغایت ۱۲۰ھ) کے شاگرد تھے۔ یہ قرین قیاس نہین کیونکہ امام ابوحنیفہ کی وفات کے وقت امام موسیٰ کاظم کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔ مولانا شبلی سیرۃ النعمان مین فرماتے ہین کہ حضرت کو امام باقر علیہ السلام سے تلمذ تھا۔ باعتبار تناسب عمر تین یہ روایت قابل قبول ہے (انکا سال ولادت ۵۷ و وفات ۱۱۷ھ) زیادہ اجماع امام جعفر صادق علیہ السلام کی شاگردی پر ہے جنکا زمانہ ۸۰ھ یا ۸۳ھ سے ۱۴۸ھ تک تھا۔

آپ کے علم وفضل کا یہ مرتبہ تھا کہ امام شافعیؒ جو مذاہب چہارگانہ مین سے ایک کے سردار و پیشوا ہین فرماتے ہین کہ "قبائل علما اور شعوب فضلا کو فنون کمالات کے پانچ شعبون مین پانچ شخصون کا عیال سمجھنا چاہیے جنسے انھون نے فوائد و فضائل حاصل کئے ہین۔ (۱) علم فقہ مین ابوحنیفہ کے فضل کے ریزہ خوار ہین۔ عیال فی الفقہ۔ (۲) صنائع شعریہ مین زہیر بن ابی سلمےٰ کے انعام کے پروردہ (۳) مغازی کے جاننے مین محمد بن اسحٰق سے نعمت اندوز (۴) فن نحو مین عطایائے کسائی سے بہرہ مند اور (۵) تفسیر کی شان مین مقاتل بن سلیمان کے جیرہ خوار ہۓ

مالک بن انس اصبحیؒ سے جو خود ائمہ اربعہ سے ہین پوچھا گیا کہ "جب آپ کو ابوحنیفہ سے صحبت و یکجائی کا اتفاق ہوا تو آپ نے اُنکے علم وفضل کو کس درجہ پر پایا؟" فرمایا کہ مین نے اُنکے قیاس و استدلال کی یہ قوت دیکھی کہ اگر مین کبھی اُنسے چاہتا کہ وہ اپنے دلائل و براہین سے کسی سُتون کو سُونے کا ثابت کر دین تو باوصف اسکے کہ حس بصر اور قوت نظر اسکے خلاف حکم دے رہی ہو وہ اُسکے ثابت کر دینے پر قادر تھے۔"

یحییٰ بن معین کہتے ہین کہ "چند شخصون کی بدولت علوم اس مرتبہ کمال پر پہونچے ہین یا یون کہئے کہ اُنھین کے ساتھ انکا انتصار و انحصار ہو گیا ہے۔ سچ ہے کہ قرأت حمزہ کی قرأت ہے اور فقہ ابوحنیفہ کی فقہ۔ اور اس بارہ مین تقریباً سب ہی مجھسے متفق الرائے ہین۔"

جعفر بن ربیع کہتے ہین کہ "مین پانچ سال تک ابوحنیفہ کے جوار (ہمسائگی) مین رہا ہون۔ وہ اتنا چپ رہتے تھے کہ مین نے کسی شخص کو خاموشی مین اُنکے برابر نہین دیکھا۔ لیکن جب نشر فضائل کے لئے مونھہ کھولتے تھے تو اتنے علوم اُنکی زبان و دھن سے بکھرنے لگتے تھے کہ کمالات کا سیل جاری ہو جاتا تھا۔"

عبداللہ بن مبارک ان کی مدح مین لکھتے ہین ؎

لَقَدْ زَانَ الْبِلَادَ وَمَنْ عَلَيْهَا ... إِمَامُ الْمُسْلِمِيْنَ أَبُوْ حَنِيْفَةْ
بِآثَارٍ وَفِقْهٍ فِيْ حَدِيْثٍ ... كَآيَاتِ الزَّبُوْرِ عَلَى الصَّحِيْفَةْ

باحکام

پڑھاپے اور مُقتدیٰ کی حرمت نہ ہوتی تو مین بحث واستدلال کرکے تجکو راہ تحقیق دکھادیتا۔"

فما بالمغربین

فَمَا اِنْ بِالْعِرَاقِ لَهٗ نَظِیْرٌ وَلَا بِالْمَشْرِقَیْنِ وَلَا بِکُوْفَہ

[ابوحنیفہ نے جو مسلمانون کے پیشوا ہین زیور آثار اور حلیہ احادیث سے صفحات بلاد اور اہل بلاد کو ایسی زینت دیدی ہے جیسی کہ آیات آسمانی نے اوراق قرآنی کو۔ اُنکی نظیر نہ تو عراق مین ہے نہ مشرقین مین۔ اور نہ کوفہ مین]

تذکرۃ الاولیا مین لکھا ہے کہ فضیل عیاض، ابراہیم ادہم، داؤد طائی، بشر حافی وغیرہم آپ کے تلامذہ سے تھے۔

قاضی احمد بن خلکان اربلی اور امام یافعی لکھتے ہین کہ ابوحنیفہ تمام کمالات سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ البتہ علوم عربیہ مین ان کا رتبہ چندان بلند نہ تھا۔ ان کی باتین کبھی کبھی لحن، (بولنے مین خطا کر جانا یا اعراب مین غلطی کرنا) اور غلط آمیختہ ہو جاتی تھین جس کی تمثیل وتائید مین اباعمرو بن علاء المقری النحوی کے استفتا اور آپ کے جواب کو نقل کیا ہے۔ اس بارہ مین ایک گروہ نے اعتذار اور بجا اعتذار کیا ہے کہ ابوحنیفہ کوفہ کے باشندے تھے۔ لامحالہ اُنکی بات چیت مین کوفیین کا طرز تکلم اور انداز او انمایان رہنا چاہیے تھا۔ اہل کوفہ تو اسماء ستہ کو تینون حالتون مین الف کے ساتھ پڑھتے ہین۔ جیساکہ قول مشہور ہے ؎

اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا قَدْ بَلَغَا فِی الْمَجْدِ غَایَتَاهَا

دمیری شافعی نے ابن شبرمہ سے حکایت کی ہے کہ مین ابوحنیفہ کے ساتھ مدینہ طیبہ مین عتبہ عالیہ جعفر بن محمد الصادق پر مشرف حضوری ہوا۔ عرض کیا کہ "میرا رفیق فضلاے عصر اور فقہاے عراق سے ہے"۔ فرمایا "مین سمجھتا ہون یہ وہی صاحب ہین جو احکام آلٰہیہ مین اپنی رائے پر اعتماد کرتے اور نوامیس (قواعد و دستور) خداوندی مین قیاس سے کام لیتے ہین۔ کیا یہی نعمان بن ثابت ہین؟" ابن شبرمہ کہتا ہے کہ مجکو اُسوقت تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انکا نام نعمان ہے۔ ابوحنیفہ نے آنحضرت کی تصدیق کی اور عرض کیا "اَصْلَحَکَ اللّٰهُ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ ہان! مین وہی شخص ہون"۔ فرمایا "نعمان! خدا کے غضب سے ڈرتے رہنا۔ معاملات شرعیہ مین اپنی ناتمام عقل پر کبھی تکیہ نہ کرنا۔ دین الٰہی مین قیاس کو مستند نہ سمجھنا۔ سب سے پہلے جس نے قیاسات کا طریق اختیار کیا، ابلیس تھا۔ جب پروردگار عز اسمہ نے اُسکو آدم علی نبینا وعلیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو وہ بولا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (مین تو اُس سے بہتر ہون۔ الجزء الثامن سورۃ الاعراف ع ۲-۹) اسلئے کہ میرے مادہ کو آگ سے جو ایک عنصر لطیف اور جوہر درخشندہ ہے تونے پیدا کیا اور آدم کا خمیر مٹی سے بنایا ہے جو خود تاریک و تیرہ ہے (خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ مجکو تونے آگ سے بنایا اور اُسکو بنایا خاک سے) اے ابوحنیفہ! شیطان رجیم نے سجدہ کے بارے مین اپنی عقل ورائے پر قیاس کرکے نافرمانی کی، اور ورطہ ضلالت

میں گرا۔ عذاب ابدی مین گرفتار رہے گا" پھر فرمایا کہ "اچھا اپنے سر اور تن بدن کے حال کو تو خوب جانتے ہوگے جو احکام مین قیاس لگاتے ہو" کہا نہین، مین نہیں جانتا" پھر دریافت فرمایا کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ کہ حق تعالی نے آنکھ مین شوری، کان مین تلخی، ناک میں مخاط (آب بینی) دونون لبون کے مابین شیرینی کیون پیدا کی ہے" کہا مین نہین جانتا" فرمایا کہ "حق تعالی نے اپنے حکمت بالغہ کے اقتضاء سے دونون آنکھون کو چربی سے خلق فرمایا اور اُس مین آب شور رکھا تاکہ مخلوق پر اپنی نعمتون مین زیادت وافر ولی بخشے۔ اور وہ نمکین رطوبات دونون دیدون کو انحلال و گداز (پگھلنے) سے باز رکھین۔ کان مین تلخی اس لئے بنائی تاکہ اپنی مخلوق پر ایک نعمت کا اور اضافہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چھوٹے چھوٹے جاندار کان کے اندر سے راہ پاکر دماغ کو اپنی غذا بنا لیتے اور بہت تھوڑے سے وقت میں اُسکو نابود کر دیتے۔ دونون نتھنون (منخرین) مین پانی اسلئے پیدا کیا کہ قابل تمدد و درازی رہے اور اُس مجرے سے دم خوب حرکت اور اچھی طرح صعود و نزول کرے اور اُس پانی کی رطوبت سے بینی (ناک) کا مزاج بھی صحت پر قائم رہے، اچھی بری بو کی تمیز کر سکے۔ دونون ہونٹھون کے مابین آب شیرین پیدا کیا تاکہ اُسکی مخلوق کھانے پینے کی لذت پائے۔" پھر پوچھا وہ کونسا کلمہ ہے جسکا اول کفر اور آخر ایمان ہے" کہا کہ "مین نہین جانتا" فرمایا وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ کہنے والا اگر لا الٰہ کہکر ساکت ہو جائے تو وجود واجب سے انکار ٹھہرے گا، جو کفر صریح ہے" اور اگر کلمہ الا اللہ کو بھی منضم کرے (کھ ڈالے) تو معبود برحق کا اثبات ہو گا جو ایمان محض ہے۔" پھر فرمایا کہ "اے ابو حنیفہ حق تعالی شانہ نے قتل نفس اور زنا کو حرام فرمایا ہے لیکن یہ تو بتائے کہ خدا کے نزدیک قتل نفس بڑا گناہ ہے یا زنا" کہا کہ "قتل نفس" فرمایا تو بمقتضائے قیاس یہ ہی ضرور ہے کہ اسکا ثابت کرنا بھی عظیم تر قرار پائے۔ حالانکہ یہ بات نہین ہے۔ حق تعالی نے قتل کے ثابت کرنے کے لئے دو شاہدان عادل کی شہادت مقرر فرمائی ہے اور زنا کے لئے چار گواہون کا اعتبار رکھا ہے! کہئے۔ کہ حکم الٰہی کے ساتھ قیاس کیونکر چل سکتا ہے؟" فرمایا کہ "نماز و روزہ مین سے حق تعالی کے نزدیک کون زیادہ بزرگ و افضل ہے؟" کہا کہ نماز" فرمایا تو حائض پر صوم کی قضا کیون واجب ہوئی۔ مگر نماز کی نہیں؟"

ان دونون بزرگون کے معارضات شیعون کے یہان مختلف طریقون سے احتجاج طبرسی، و مجلسی، و علل الشرائع وغیرہ مین مرقوم ہین۔ جنکے نقل کرنے سے اہل سنت و جماعت مورخین نے ادباً

ہونا چاہیئے اور بدرجہ کمال ہونا چاہیئے اور اُسکا اظہار بھی سراً وعلانیۃً۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا مشرب تھا ۵

واحتراماً گریز واحتراز کیا ہے۔

صاحب درر الاصداف لکھتا ہے کہ امام ہمام جعفر علیہ السلام نے امام ابو حنیفہ سے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دین مین قیاس کرتے ہو اور سب سے پہلے جس نے قیاس کیا، ابلیس تھا۔ ابو حنیفہ نے کہا انما اقیس فیما لا اجد فیہ نصاً۔

کتاب المصائد والمطارد مین کشاجم نے بھی امام جعفر اور حضرت ابو حنیفہ کی گفتگو کو نقل کیا ہے۔

قاضی القضاۃ احمد بن خلکان نے محمود سبکتگین کے تذکرہ مین امام الحرمین کی کتاب مغیث الخلق سے نقل کیا ہے کہ سلطان محمود ابتداے حال مین مذہب حنفی کا پیرو تھا۔ لیکن وہ علم حدیث کو زیادہ دوست رکھتا تھا۔ ہمیشہ اُس کی مجلس مین احادیث کا دَور ہوتا جن کی تفسیر خود کرتا اور تحقیق بھی کرتا جاتا تھا جب مذہب شافعی کو اُن سے زیادہ موافق پایا تو دونون فریق کے فقہا کا مناظرہ و مباحثہ کرا کے امام شافعی کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اس سلسلہ مین قفال مروزی کا پہلے شافعی طریق پر بہ کمال خشوع و خضوع با ہمہ ارکان و آداب نماز پڑھنا پھر ایک مضحکانہ و سفیہانہ روش پر نماز ادا کر کے اُسکو حنفیت سے منسوب کرنا اور ایک حکیم نصرانی کا دونون مذہبون کی کتابین دیکھ کر شافعیت کے حق مین فیصلہ کرنا کتب سیر و تراجم مین مذکور ہے۔

امام ابو حنیفہ بڑے عابد و مرتاض تھے۔ بروایت نامۂ دانشوران ناصری و اکثر مورخین سلف (جسکے باور کرنے سے بعض سیرت نگاران حال کو انکار ہے) چالیس برس تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔ آپ ہر رات دو رکعت مین پورا کلام اللہ پڑھ لیتے تھے۔ تاریکی شب کے ساتھ انکے گریۂ و زاری کی آواز بلند ہو جاتی۔ ہمسایون کو انپر رحم آتا۔ آپ نے زخارف دنیوی سے ہمیشہ اعراض کیا۔ محمد بن شجاع کہتا ہے کہ منصور عباسی نے ابو حنیفہ سے کہا تھا کہ فلان روز آپ کی خدمت مین دس ہزار درہم پہونچینگے آپ نے اُنکے قبول کرنے سے اُسی وقت انکار فرمایا۔ جب روز معہود آیا تو اداے فریضہ کے بعد گھر مین آکر آپ اور کپڑون مین لپٹ کر بیٹھ رہے۔ کسی سے بات بھی نہ کی۔ جب حسن بن قحطبہ طائی فرستادۂ شاہی آیا اور چاہا کہ خلیفہ نے جو کچھ پیشکش بھیجا ہے اُسکو حوالہ کرے تو آپ نے گفتگو بھی نہ کی۔ اصحاب نے کہہ دیا کہ حضرت کی عادت و خو یہی ہے اور اشارہ کر دیا کہ اُس مال کو زنبیل جو مین مین

یا راکبا قف بالمحصب من منی | واھتف بساکن خیفھا والناھض
سحرا اذا فاض الحجیج الی منی | فیضا کملتطم الفرات الفائض
ان کان رفضا حب آل محمد | فلیشھد الثقلان انی رافض

بحرکر کے مکان کے فلان گوشہ مین رکھ دو۔ چنانچہ امانت گزار وہان رکھ کر چلا گیا۔ امام نے اسپر اصلا التفات نہ فرمایا اور وہ مال ایک مدت دراز تک اُسی جگہ پڑا رہا۔

امام کو برادران دین کے ساتھ بڑی الفت تھی حسن معاشرت اور اپنی سیرت پسندیدہ سے کام لیتے اور ہر ایک کی کاربرآری وانجاح مرام مین مخلصانہ سعی فرماتے۔ اہل تاریخ نے جس کی تائید مین بہت سے واقعات نقل کیے ہین۔

باایں ہمہ اوصاف جیسا کہ اہل کمال وفضل ہمیشہ محسود رہتے آئے ہین آپ کے بھی مخالف ومعاند تھے۔ منصور عباسی کا حاجب ربیع اور ابوالعباس طوسی ان مین پیش پیش تھے۔ بارگاہ خسروی مین ان لوگون نے طرح طرح سے آپ کی سعایت وبدگوئی کی لیکن اس شہسوار میدان مناظرہ ودانش کے ہاتھ سے ناکامی ومخذولی اُٹھائی۔ امام کے ایک پُرانے دوست حماد عجرد شاعر کی معاصرانہ چشمک اور رقیبانہ چوٹ کا لطف اُٹھانا ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی دیکھی جائے۔

آپ کو منصب قضا پر مقرر کرنے کے لئے خلفا نے ہمیشہ اصرار بلکہ شدید اصرار کیا۔ لیکن آپ برابر انکار فرماتے رہے۔ پہلے مروان الحمار بن محمد آخر ملوک بنی امیہ کے عہد مین یزید بن عمرو بن ہبیرہ فزاری والی عراق نے امام صاحب کو کوفہ کی قضا پر منصوب کرنے کے لئے بُلایا لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا۔ یزید بن عمرو اس بارہ مین جس قدر مبالغہ وضد کرتا تھا آپ کا گریز و امتناع بڑھتا جاتا تھا حتے کہ دس دن کے اندر ایک روز دس تازیانے بھی آپ کے لگائے گئے۔ تاہم آپ کو اپنے احتراز وانکار پر بدستور اصرار رہا۔ اور یزید بن عمرو مجبور ہوکر دستکش ہو گیا۔ یہی خواہش ابوجعفر منصور خلیفہ دوم عباسی کی طرف سے بھی قایم رہی۔ ربیع بن حاجب نے آپ کے اور منصور کے ضد واصرار کی کیفیت ومنازعت بہ تفصیل بیان کی ہے۔ جب منصور نے بغداد کی بنیاد ڈال کر اُسکو آباد کرنا اور کوفہ سے ہٹا کر دارالخلافہ وہان قرار دینا چاہا تو اینٹ اور روڑے کا شمار آپ کے ذمہ کیا گیا۔ آپ نے نے (ذرع کل) کا ایک پیمانہ بنا لیا اور جس قدر سامان آتا گیا اُسی کے اندازے سے معلوم کرتے گئے یہ طریقہ شمار آپ ہی کا اختراع ہے۔ آپ سے پیشتر کسی کا ذہن وہان تک نہین پھونچا تھا۔ جب شرقی بغداد کی تعمیر و رونق وہی یہ ولی عہد سلطنت مہدی کو توجہ ہوئی تو اُس نے ایک عظیم الشان مسجد وہان بنائی

پھر ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

لو ان المرتضیٰ ابدیٰ محلہ | لصار الناس طرا سجد اللہ
کفی فی فضل مولانا علیؑ | وقوع الشک فیہ انہ اللہ

"مسجد رصافہ" نام رکھا۔ امام ابوحنیفہ کو بلایا اور جانب رصافہ کی قضا پیش کی۔ آپ نے انکار فرمایا مہدی نے کہا "قبول نہ کرو گے تو تازیانہ قہر سے سبق دیا جائیگا" ناچار منظور کر لیا۔ دو روز مجلس قضا میں نشست فرمائی۔ کوئی فریادی نہیں آیا تیسرے دن ایک صفار (کاسہ گر روئین) آیا۔ امام نے معاملہ کو سُننے اور فریقین کے بیان و عذر کو سماعت فرمانے کے بعد زر دعوی اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ دو روز بعد بیمار ہوئے۔ اپنے فرزند حمّادؒ کو بلا کر وصیتیں کیں اور فرمایا کہ میری وفات کے بعد یہ بدرۃ (تھیلی) لے جا کر حسن بن قحطبہ کو دے دینا اور کہنا کہ تمھاری یہ امانت ابوحنیفہ کے پاس تھی [اسکا ذکر اوپر آچکا ہے] چھٹے دن بعد دنیائے دنی سے رخصت ہوئے۔ حماد نے وصیت کی تعمیل کی اور مال لے جا کر حسن کے سپرد کیا۔ حسن نے کہا کہ "خدا ابوحنیفہ پر رحمت کرے جو اپنے دین میں اتنے بخیل تھے۔"

امام کی کیفیت وفات اور ماہ و سال میں مورخین کا اختلاف ہے۔ بعض روز سہ شنبہ ہم شعبان (۵ ستمبر) اور اکثر ۱۴ رجب ۱۵۰ھ (۱۴ اگست ۷۶۷ء) لکھتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ جس روز ابوحنیفہ نے دوسرے عالم میں قدم رکھا تھا اُسی روز امام شافعی بطن مادر سے برآمد ہوئے تھے۔ ابن الاعرابی محمد بن زیاد الکوفی نے خود تغلب سے کہا تھا کہ ابوحنیفہ نے جب سرائے باقی کا رُخ فرمایا ہے اُسی شب میں میں نے دار فانی میں قدم رکھا تھا۔ مروج الذہب میں امام مسعودی لکھتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے سجدۂ نماز میں رحلت کی ستر سال کی عمر تھی۔ صاحب تذکرۃ الاولیا ناقل ہے کہ بیابان عمر میں ابوالمنصور کے حکم سے محبوس تھے اُسی حالت قید میں وفات پائی۔ تاریخ یافعی میں تحریر ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ بن امام حسین رضی اللہ عنہم سے امام ابوحنیفہ کو اتفاق تھا اور منصور سے اختلاف۔ اُس نے زہر دلا دیا تھا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ آپ کو ملکۃ الزمان خیزران (زوجہ مہدی کنیز مہدی بن جعفر منصور۔ مادر خلیفہ ہادی و ہارون) کے مقبرہ کی شرقی جانب سپرد خاک کیا گیا۔ پھر ۴۵۹ھ (۱۰۶۶ء) میں شرف الملک ابوسعد محمد بن منصور الخوارزمی نے کہ سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی (محاسب اعلیٰ) تھا، بغداد جدید میں مرقد ابوحنیفہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک بلند و عالی روضہ اور اُس پر قبہ تعمیر کیا۔ اُسکے پہلو میں مدرسہ بنایا تاکہ آپ کے متبعین و پیرو وہاں سکونت و قیام کر سکیں، آرام پائیں۔ جب تعمیر ختم ہوئی تو اس مشہد و مدرسہ

امام ابوبکر بیہقی نے ایک کتاب مناقب شافعی میں تالیف کی ہے اُس میں امام صاحب کے یہ شعر بھی نقل کئے ہیں ؎

کے دیکھنے کے لئے اعیان واکابر کی ایک جماعت کے ساتھ، وہاں پہونچا۔ شریف ابوجعفر مسعود جو بیاضی شاعر کے نام سے معروف ہے۔ اتفاقاً آگیا اور یہ شعر پڑھے ؎

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْعِلْمَ کَانَ مُبَدَّدًا — فَجَمَعَهٗ هٰذَا الْمُغَیَّبُ فِی اللَّحْدِ
کَذٰلِكَ کَانَتْ هٰذِهِ الْاَرْضُ مَیْتَةً — فَاَنْشَرَهَا فَضْلُ الْعَمِیْدِ اَبِیْ سَعْدِ

"کچھ جانتے ہو کہ علوم کا شیرازہ متفرق و برہم تھا انواع فضائل منتشر و پراگندہ تھے۔ لیکن اس ہمت ور نے جو اس وقت گور میں ہے ان سب کو منتظم و مجتمع کیا۔ اسی طرح یہ زمین بھی اراضیات مردہ میں شمار ہوتی تھی، ابوسعد کے وجود با جود سے آباد و معمور ہو گئی"۔

ابوسعد کو یہ دونوں شعر بہت پسند آئے اور انعام فراوان دیا۔ بعض تواریخ میں نظر سے گزرا ہے کہ مشہد ابوحنیفہ کا بانی سلطان الپ ارسلان (۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ) پدر ملک شاہ سلجوقی تھا۔ ان اقوال میں بایکدگر چنداں منافات و تعارض نہیں۔ ممکن ہے کہ خود سلطان بانی ہو اور ابوسعد منتظم و مہتمم۔ زمانہ کا دستور ہے کہ کارکنان سلطنت منصرم و نگران امور ہوتے ہیں اور شہرت بادشاہوں کے نام سے ہوتی ہے۔

۱۸۴؎ امام محمد بن ادریس شافعی قرشی کی کنیت ابوعبداللہ تھی ائمہ اربعہ مجتہدین سے ہیں۔ اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں غزہ میں ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں پیدا ہوا۔ دو سال کا بچہ تھا کہ مجھے مکہ معظمہ میں لے آئے۔ میری ماں ازد (ایک یمنی قبیلہ) سے تھی "غزہ (جہاں حضرت ہاشم جد نبی صلعم کی قبر ہے) بیت المقدس سے تین منزل ہے۔ دوسری روایت خود سیدنا امام سے یہ ہے کہ میں عسقلان میں پیدا ہوا۔ عسقلان غزہ سے تین فرسخ ہے۔" دونوں مقام فلسطین (شام) میں ہیں۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ جس روز امام اعظم ابوحنیفہ ۱۵۰ھ میں داخل جوار قدس ہوئے ہیں اُسی روز امام شافعی نے اس عالم آب و گل میں قدم رکھا تھا۔

حسن بن محمد الزعفرانی لکھتے ہیں کہ امام شافعی نے اٹھاون سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ کی وفات مامون عباسی کے عہد خلافت میں سلخ رجب ۲۰۴ھ (۲۰ جنوری ۸۲۰ء) کو بروز جمعہ چون برس کی عمر میں ہوئی۔ مصر کے قرافۂ صغریٰ میں غربی الخندق کے مقابہ قریش میں دفن ہوئے۔

آپ عبدالمطلب (جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد سے تھے۔ اسی مناسبت سے آپ امام المطلبی بھی کہلاتے ہیں دوسرا لقب "عارف باللہ" ہے۔ شافعی منسوب بہ شافعہ ہے جو آپ کے اجداد میں تھے۔

اذا فی مجلس تذکر علیاً — وسبطیه وفاطمة الزکیه
یقول تجاوزوا یا قوم ھذا — فھذا من حدیث الرافضیه
برئت الی المھیمن من اناس — یرون الرفض حب الفاطمیه

امام شافعی نے یمن میں طالبعلمی کی۔ فنون شعر ونحو وغریب کو وہاں سیکھا۔ چودہ برس کے تھے کہ مدینہ طیبہ میں امام مالک بن انس کی خدمت میں پہونچے آٹھ ماہ رہے اور احادیث کو یاد کیا۔ وہاں کے مشائخ اور جلّہ فقہا اور حفاظ و رواۃ کی زیارت کی اور استفادہ و استفاضہ فرمایا۔ عراق میں حضرت محمد بن الحسنؒ کے پاس دو سال رہے اور پھر مدینہ منورہ چلے آئے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ سید المسلمین ابوداؤد کے حضور میں پہونچے۔ موطا صرف نوشب میں یاد کرلیا تھا۔

دانائی و فراست میں یگانۂ زمانہ تھے۔ ایک واقعہ مفتاح التواریخ میں مذکور ہے "امام احمد حنبل کے مذہب کے مطابق جو شخص عمداً نماز ترک کرے گا فر ہوجاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوتا لیکن اُسپر عذاب کیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے امام احمد سے پوچھا کہ جب کسی نے نماز ادا نہ کی تو کافر ہوگیا۔ پھر کیا کرے کہ مسلمان ہوجائے فرمایا کہ نماز پڑھے۔ شافعی نے پوچھا کہ کافر کی نماز کیونکر درست ہوگی؟ امام حنبل خاموش رہ گئے" امام احمد فرماتے تھے کہ "علم کے لئے شافعی کا وجود ایسا ہے جیسے دنیا کے لئے آفتاب کا یا انسان کے واسطے صحت کا"

اسحق بن راہویہ کا امام شافعی سے مناظرہ یادگار ہے۔ جسکو حاکم نے اپنی تاریخ نیشاپور میں اور رازی نے کتاب "مناقب الشافعی" میں تحریر کیا ہے۔ طویل ہے۔ ان مختصر حواشی میں نقل کرنے کی گنجائش کہاں۔

ایک دلچسپ سبق البتہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ جس روز شافعی امام مالک بن انس کے یہاں مدینہ پہونچے اور مالک نے شافعی کے ناصیۂ اقبال سے صلاح و سداد کے آثار نمایاں پائے تو اپنا مہمان بنایا اور خود کھانا لے کر آئے اور انکے سامنے رکھا۔ غلام آفتابہ لیکر بڑھا تاکہ ضیف عزیز کے ہاتھ دھلائے۔ مالک نے ٹوکا اور فرمایا کہ اے خدا کے بندے کھانا شروع کرنے سے پہلے میزبان کے ہاتھ دھولانا چاہیئے اور بعد طعام مہمان کے۔ ہونہار طالبعلم نے وجہ دریافت کی۔ استاد محترم نے فرمایا کہ میزبان نے مہمان کو بلایا ہے اسلئے اُسکو خود پہلے ہاتھ دھونا چاہیئے تاکہ مہمان کو حیا یا لحاظ دامنگیر نہ ہو۔ بعد طعام مہمان کے ہاتھ پہلے دھولانے میں مصلحت یہ ہے کہ میزبان سب سے آخر رہے اور تمام مہمان میزبان کے ہاتھ دھونے تک دستکش نہ ہوں۔

اہل بیت اطہار سے بڑی محبت تھی۔ منقبت میں بہت سے اشعار لکھے ہیں جن سے خلوص و عقیدت ٹپک رہی ہے بڑے شاعر تھے۔ تصانیف کی تعداد ایک سو چالیس تک پہونچی ہے۔ جن میں مختصر و مطول

احتراز کی چیز مناقشہ و منافسہ ہے۔اس سے اجتناب لازم ہے۔عارف روم قدس سرہ
اسی کے لئے سرزنش فرماتے ہین ؎

بر سرِ حق کے بر تو گردد منجلی
تو گرفتار ابو بکر و علی

ہر قسم کی کتابین داخل ہین۔تفصیل معجم الادبا مین ملے گی بعض کتابین سات سات جلد کی ہین۔

شہاب مولانا جلال الدین محمد البلخی الصدیقی الرومی،صاحب مثنوی مولوی رومی آپ کی ولادت قبۃ الاسلام شہر بلخ مین ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ (۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء) کو ہوئی۔پانچ سال کی عمر مین الہامات غیبی ہونے لگے اور اشراقات منورسے آپ کو بہرہ مند کر دیا۔اتفاقاً یہ عالم تھا کہ چھ سال کے سن مین تین چار دن بعد ایک روز افطار کرتے تھے۔آخر کار اس فقر و مسکنت نے دولت عرفان سے مالامال کر دیا اور اکابر اہل ذوق و وجدان مین داخل۔آپ کے والد مولانا بہاء الدین ولد نے جو بڑے عالم و عارف تھے جب ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) مین رحلت فرمائی تو سلطان علاء الدین سلجوقی نے مع تمام امرو عمائد ملک و روسار بلاد و امصار کے مجتمع ہو کر مولانا جلال الدین کو باپ کی جگہ پر بٹھادیا۔مولانا بہاء الدین کے خلیفہ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے۔مولانا جلال الدین انھین سید برہان الدین کے مرید تھے۔نو سال انکی خدمت مین بسر کئے۔انکی وفات کے پانچ سال بعد شیخ شمس الدین محمد تبریزی کی صحبت مین پھونچے۔جب حضرت شمس بھی راہی ملک بقا ہوئے تو انھون نے شیخ فریدون صلاح الدین زرکوب کی ملازمت اختیار کی اور انکے بعد اپنے رفیق و مرید خاص حسام الدین چلپی قونی کے ساتھ اپنی عمر کاٹ دی اور اس مرتبہ پر پہونچا دیا جو معلوم و مشہور ہے۔زیارت مکہ معظمہ کے سفر مین شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کا شرف صحبت بھی حاصل ہو گیا تھا۔شیخ مرحوم اسوقت شیخ ہرم تھے اور مولانا طفل و صغیر السن۔

علوم ظاہری و باطنی مین وحید عصر و یگانہ دہر تھے۔آپ کے حلقہ درس مین چار سو طالبعلم جمع ہوتے اور ہر ایک اپنے ذوق و استعداد کے بقدر آپ سے استفاضۂ فیض کرتا۔شیخ علاء الدولہ سمنانی رسالہ اقبالیہ مین لکھتے ہین کہ باوجود ان تمام مراتب و مدارج اور قبولیت عام کے حالت یہ تھی کہ حضرت مولوی اپنے خادم سے ہمیشہ سوال کرتے کہ ہمارے گھر مین کوئی چیز موجود تو نہین ہے۔اگر وہ کہہ دیتا کہ خیر ہے کچھ نہین ہے تو نہایت خوش اور منبسط ہو جاتے اور شکر کرتے کہ الحمد للہ ہمارا گھر پیغمبر اور اہل بیت کے گھرون سے مشابہ ہے اور اگر جواب ملتا کہ اسباب مطبخ مہیا ہے تو منفعل ہوتے اور فرماتے کہ اس گھر سے خانہ فرعون کی سی بو آتی ہے۔"مرحبا بشعار الصالحین"۔

مولانائے روم پر منحصر نہیں خود انھیں اکابر اسلام و ائمہ کرام علیہم السلام کے آثار و ارشادات کو دیکھ لیجئے۔

شیخ نورالدین بن علی بن محمد بن الصباغ المالکی المکی (متوفی ۸۵۵ھ) نے فصول مہمہ میں اولاد ائمہ کے احوال تحریر فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے حضور میں اہل عراق سے بعض اشخاص آئے اور خلفائے ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کے حق میں کچھ کہنے لگے حضرت سنتے رہے جب وہ لوگ کہہ چکے تو دریافت فرمایا کہ تم کون لوگ ہو۔ کیا مہاجرین اولین سے ہو جن کی شان میں الَّذِینَ اُخْرِجُوا مِن دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ (جو اپنے گھر اور مال سے بیدخل کر دیئے گئے۔ خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلبگاری میں لگے ہیں اور خدا اور اسکے رسول کی مدد کو کھڑے ہو جاتے ہیں یہی تو سچے ہیں۔ جز ۲۸ سورۃ الحشر ع ۴-۱) آیا ہے؟ کہا کہ "نہیں" پھر پوچھا کیا تم وہ لوگ ہو۔ الَّذِینَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِیمَانَ مِن قَبْلِهِمْ یُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُونَ فِی صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوتُوا وَیُؤْثِرُونَ عَلٰٓی اَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (وہ مال) انکا بھی حق ہے کہ ان سے پہلے مدینے میں رہتے اور اسلام

سلطان اباقا آن معروف القاخان ولد ارشد ہلاکو خان بادشاہ ایران کے عہد میں اڑسٹھ ۶۹ سال کی عمر میں وقت غروب آفتاب ۵ رجمادی الآخرہ ۶۷۲ھ (۱۶ ردسمبر ۱۲۷۳ء) کو وفات پائی۔ نور اللہ مرقدہ تاریخ رحلت ہے۔ مرقد مبارک اپنی خانقاہ واقع شہر قونیہ ملک روم میں ہے آپ کے انتقال کے بعد آپ کے خلف الصدق بہاء الدین محمد معروف بہ سلطان ولد جانشین ہوئے۔ کتاب ولد نامہ انکی یادگار ہے۔

مولانا کے حالات، تواریخ ہفت اقلیم، خلاصۃ المناقب و مرآۃ الخیالی و مجالس المومنین، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی اور رسالہ فریدون سپہ سالار میں مذکور ہیں۔

مولانا نے اپنے آثار شریفہ میں ایک دیوان تیس ۳۰ ہزار شعر کا اور مشہور مثنوی سینتالیس ۴۷ ہزار شعر کی چھوڑی ہے۔ درویشان روم کا متعارف فرقہ مولوی، نام آپ ہی سے منسوب ہے۔

مین داخل ہو چکے ہین جو اُنکی طرف ہجرت کر کے آتا ہے اُس سے محبت کرنے لگتے ہین اور مال (مہاجرین) کو جو دیا جاتا ہے اُسکی وجہ سے یہ اپنے دل مین کوئی طلب نہین پاتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیون نہ ہو اپنے سے مقدم رکھتے ہین۔ (جزو ۲۸ سورۃ الحشر ع ۲-۱) جن کی نسبت نازل ہوا ہے"۔

عرض کیا "ہم مین بھی نہین" فرمایا "تو پھر کیا تم وہ لوگ نہین ہو جو احد الفریقین (ان مین سے کوئی فریق بھی) ہونے سے بیزار ہین۔ مین گواہی دیتا ہون کہ تم لوگ اس فرمان خداوندی کے مصداق نہین ہو وَالَّذِیْنَ جَاءُ وْا مِنْ بَعْدِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا [اور اُنکا ہے جو مہاجرین اولین کے بعد آئے، دعائین مانگا کرتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیون کے گناہ معاف کر جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہین اور ایسا کر کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہین اُن کی طرف سے ہمارے دلون مین کسی طرح کا کینہ نہ آنے پائے (جزو ۲۸۔ سورۃ الحشر ع ۲۰۵)] ہٹو۔ میرے پاس سے چلے جاؤ"۔

شریف ابو نمی نے مفتی الحرمین محب طبری رح سے کہا کہ تم نے ابو بکر کو علی پر باوجود اُنکی مسلمہ غزارت علمی و قرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیون مقدم رکھا۔ جواب دیا کہ "مین نے خود اپنی رائے سے ابو بکر کو مقدم نہین کیا اور نہ اس بارہ مین مجکو اختیار ہے تمھارے جد امجد رسول اکرم نے فرمایا ہے سدوا کل خوختہ فی المسجد الا خوختہ ابی بکر اور فرمایا تھا مروا ابا بکر فلیصل بالناس یہ حدیثین ہم تک بسند صحیح پہونچی ہین۔ یہ بھی یاد ہے کہ جب آنحضرت نے جوار قدس کا قصد فرمایا تو صحابہ نے کہا تھا من رضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لدیننا رضیناہ لدنیانا"۔

ابو الفرج عبد الرحمان بن علی الجوزی کتاب صفوۃ الصفوۃ مین عروہ بن عبد اللہ سے نقل کرتے ہین کہ مین نے سیدنا محمد باقر بن زین العابدین سے حلیہ سیف کی نسبت دریافت کیا۔ فرمایا کر کچھ باس نہین ہے۔ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار کو محلے کیا تھا" مین نے ٹوکا۔ آپ بھی صدیق کہتے ہین؟

جست فرما کر رو بہ قبلہ ہو گئے اور کہا نعم الصدیق۔ نعم الصدیق فمن لم یقل الصدیق فلا صدق اللہ لہ قولا فی الدنیا ولا فی الآخرۃ

شعرانی فرماتے ہیں ... ان انو اجب علینا ان نحب اصحاب رسول اللہ صلعم تبعا لحب رسول اللہ صلعم ونحب اولادھم لکن اللہ لحب رسول اللہ صلعم لا بحکم الطبع ونقدم اولاد فاطمہ علی اولاد ابی بکر الصدیق کما کان ابو بکر یقدمھم علی اولادہ عملاً بحدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من اہلہ وولدہ والناس

ایک جلیل القدر صحابی ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں کہ "اگر میرے پاس ابو بکرؓ و عمرؓ و علیؓ کسی کام کے لئے آتے تو میں پہلے علیؓ کا کام کر دیتا تھا۔ اس لئے کہ ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے قرب ہے۔ اور اگر میں آسمان سے زمین پر گروں تو یہ مجھکو زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں علیؓ کو ان پر مقدم کروں"۔

خود حضرت ابو بکرؓ فرمایا کرتے تھے صلۃ قرابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احب الی من صلۃ قرابتی

سرور دو عالم صلعم کی یہ حدیث ابو سعید خدری نے مرفوعاً روایت کی ہے لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی لاتخذت ابا بکر خلیلا۔ اور جو متفق علیہ ہے۔

علامہ حسین الجسر صاحب حمیدیہ جو آئمہ حاضرہ میں تمام ممالک روم و شام میں علوم دینیہ و عقلیہ کے استاذ کامل تسلیم کئے گئے ہیں فرماتے ہیں ؎

من طالع التاریخ مع انہ | لم یتمسک باعتقاد سلیم
اصبح شیعیا۔ والا فقل | یخرج عن نہج الھدی المستقیم

اسی ذیل میں سید رشید رضا منشی المنار جنکے علم و فضل اور تفقہ و تدین کا سکہ عربی دان اور عربی خوان طبقوں میں مدت سے چل رہا ہے لکھتے ہیں۔ کہ "اہل ہوا اور وہ لوگ جن کو حقیقت اسلام اور اسکی نشاۃ سے آگاہی نہیں ہے اور جن کا علم محض چند مؤرخین کے اقوال پر منحصر اور مستنبط ہے

اس بارہ مین مضطرب ہین۔ وہ گروہ جو صحیح کو ضعیف سے اور حق کو باطل سے تمیز کرسکتا ہی محض حفاظ محدثین کا ہے جماعۃ اوّل کے لوگ علم اور خبرت کی کمی کی وجہ سے، کوئی تو نواصب و خوارج کی طرف مائل ہوجاتے ہین اور کوئی غلاۃ شیعہ کو ترجیح دیتے ہین۔ اکثر ممالک اسلامی مین مذاہب سُنّت کے پیرو زیادہ پائے جاتے ہین جن کو تعظیم "آل بیت" مین غلو ہے۔ باین ہمہ بعض ناصبی بھی ہین جو بنی اُمیہ کو علویین پر فضیلت دیتے ہین اور جن کا زعم یہ ہے کہ بنی اُمیہ نے اسلام کو عزت دی اور دین کو قائم کیا تھا۔ حالانکہ اہل تحقیق کا فتوےٰ ہی کہ انکے زمانہ مین جو اکثر امصار و بلاد مین مسلمانون کو فتح ہوئی اور جو ان کی حسنات عظیمہ مین شمار کی جاتی ہے اسکے لئے یہ خاندان کسی تحسین و آفرین کا مستحق نہین ہے۔ اسلام کی طبیعت اسی کی مقتضی تھی، جو اصلاح اور نوع بشر کو بچانے اور راہ راست پر لانے کے لئے آیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے سوائے ان مین ایک فرمانروا بھی ایسا نہین گزرا جسنے کوئی عمل محض اقامۃ دین کی نیّت و خاطر سے کیا ہو۔"

حُسن سُلوک

میر عبد الجلیل نے اپنے نامور و بلند ہمت اجداد کی میراث حسنہ مین حصہ وافر پایا تھا۔ بلگرام مین اُن کا دیوان خانہ[1] مطبخ علماء و مشائخ اور طلباء و درویشون کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا صادر و وارد خانہ بے تکلف سمجھ کر آتے اور اُن کے خوان کرم سے مستفیض ہوتے تھے یہی

۱۹۲۶ء اس دیوان خانہ کی شان و شوکت اور رونق و زینت دیکھنے والی آنکھین ابھی بہت سی موجود ہین اگرچہ یہ پاکیزہ عمارت صفحۂ زمین پر باقی نہین ہی پہلے میر عبد الجلیل کے آبائی مکانات سکونت غیر آباد ہو کر رفتہ رفتہ مسمار و منہدم ہوتے رہے۔ سامان عمارت فروخت ہوتا گیا خالی زمین پر نشانات موجود تھی زراعت نے ان کو بھی مٹا دیا۔ بالآخر دیوانخانہ بھی میر صاحب کے اعقاب کے زیر سے معرض بیع مین آگیا جب تک ایک بنئے کے قبضہ مین رہا وہ سامان تجارت رکھتا اور غلہ اور آٹو بھرتا رہا۔ گردش لیل و نہار سے یہ حالت بھی قائم نہ رہی نہ دیوان خانہ قائم رہا۔ ایک تغافل کیش مقتدر مسلمان نے خرید کیا۔ عمارت کھود ڈالی اینٹین فروخت کرلین اب اس زمین پر مینا کو بویا جاتا ہے اور جلیل بلگرامی کی رُوح جلال رومی کی زبان سے نواسنج ہے ؎

متبرک مقام تھا جہاں تیس سال تک میر طفیل محمد نے شریعت و طریقت کا سبق دیا تھا اور مدتہائے دراز تک علم و فضل کی شمع جہاں روشن رہی تھی۔ سلطان ابو سعید اور سید سلطان مقصود بزرگان کالپی، بلگرام آتے تو یہیں قیام فرماتے تھے۔ حاجی صفت اللہ خیرآبادی جب ۱۱۳۲ھ (۲۰-۱۷۱۹ء) میں بلگرام آئے تو خود تکلیف فرمائی اور دیوان خانہ میں آکر میر عبدالجلیل سے ملاقات کی تھی۔ شاہزادہ عظیم الشان کا ہمزلف میر محمد رضا اسی میں فروکش ہوا تھا۔

ضعفا و غربا کی لڑکیاں جن کے والدین کو تزویج کی استطاعت نہ ہوتی اُن کی حیثیت و درجے کے فراخور نقد و جنس سے سامان کرا کے کدخدا کرادی جاتی تھیں۔ میر محمد یوسف اسی دست عطا اور نوال عام کی ستائش میں فرماتے ہیں ؎

یا للامام الذی جلت مناقبه   اجد بنیان مجد دارس الرسم

اعطاه رب الوری فی الکف توسعة   وزاده بسطة فی العلم والجسم

دارالخلافہ میں جہاں میر صاحب کا قیام خود مسافرانہ اور محض بے اطمینانی کا تھا انکے ملاذ نعمت پر اُن کے اہل وطن[۱] اور اہل حاجت کا ہجوم رہتا اور یہ باہمہ پریشانی و بے سروسامانی بقدر وسعت و استطاعت ہر ایک کی خدمت کرتے۔ سندھ میں تو ان کو مقابلتاً ہر قسم کی آسایش اور فراغت خاطر میسر تھی۔ وہاں مہمانی و میزبانی، خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ کیسے فروگذاشت ہو سکتا تھا۔ اُمرائے عالیشان بھی اُدہر سے گذرتے تو اُن کی دعوت و ضیافت اُن کی شان و مرتبت کے موافق کی جاتی تھی۔ جب سلطان اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معزالدین بن شاہ عالم کو صوبہ داری ملتان[۲] پر مامور کیا

بعد از وفات تربت ما در زمین مجوے   در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

[۱] اُس زمانہ میں اہل بلگرام کی ہر طرف قدر تھی جن ایام میں کہ میر صاحب بوجہ بیکاری یا بسلسلہ عہدہ داری شاہجہان آباد میں مقیم تھے۔ اُن کے بعض اہل وطن تلاش معاش میں دہلی ہو پہنچے۔ حق وطن اور قرابت کے لحاظ سے میر سید محمد نے بھی اپنے والد کو لکھ دیا تھا اور سعی و سفارش کی التجا کی تھی۔ میر صاحب جواباً لکھتے ہیں کہ "صاحبزادے! یہ تو خود ہی خوش نصیب و طالع مند تھے۔ جیسے ہی پہونچے میر جملہ کی سرکار میں نوکر ہو گئے۔ پہونچھ

توحسن علی خان کو بمرکاب جانے کی دستوری دی۔ اتفاق سے موافقت مزاج نہ ہوئی اور حسن علی لاہور کو آزردہ خاطر لوٹے۔ اُس زمانہ مین میر عبدالجلیل کا قیام بھکر و سیوستان مین تھا حسن علی خان نے جب نواحی بھکر سے ہو کر لاہور جانے کا قصد کیا تو میر صاحب نے اُن کے

کو ۔۔۔ ۔۱۲ تاریخ کو نوکری مل گئی ۔سید یار علی اور سید محمد باقر کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار اور سید امام علی کو ایکسو چالیس روپیہ درماہہ کی"

۵۱۸۵ ملتان ۔عہد عالمگیر مین ایک صوبہ تھا ۔ ایک سرکار تھی۔ یہان کے خشتی قلعہ کا صاحب خلاصۃ التواریخ اور دیگر جغرافیہ نگاران نے خاص طور پر ذکر کیا ہے ۔مرور زمانہ سے اب وہ ایک قسمت ڈکسٹرکٹ کا صدر مقام رکھیا ہے جس کا کمشنر موسم گرما مین فورٹ منرو مین رہتا ہے۔

خاص شہر کی آبادی ۱۹۰۱ء مین ۸۷۳۹۴ تھی جو ۱۹۲۱ء مین ۸۴۸۰۶ رہ گئی

اس قطعہ ملک مین جنگل وبیابان زیادہ ہین قدرتاً جانوران وحوش وچرند مثلاً نیل گائے اور ہرن زیادہ ہوتے ہین ۔آم بھی اچھا ہوتا ہے۔

ملتان کی خاک اور گرمی ضرب المثل ہوگئی ہے ۔موسم گرما عرصہ تک رہتا ہے ۔حرارت مین ملتان جیکب آباد سے صرف ایک یا دو دقیقہ کم ہے ۔ایسی شدید گرمی سارے ہندوستان مین کسی مقام پر نہین پڑتی مجموعی طور پر آب وہوا ایسی خراب نہین ہے جیسی شہرت پاگئی ہے ۔پنجاب کے دیگر مقامات کی طرح یہان کی شب بھی خوشگوار ہوتی ہے۔

ملتان کی قدامت ہنود بہت بتاتے ہین ۔مشہور سیاح اور مورخین مین سے ہیکاٹیس **Hecataeus** ہیروڈوٹس **Herodotus** اور ٹالمی **Ptolemy** کے سفرنامون مین اور سکندر مقدونی کے حملہ ومحاربات کے سلسلہ مین ملتان کا نام بھی آتا ہے ۔دسوین صدی مسیحی یعنی ۹۱۵-۱۶ء ۳۰۳ھ) مین مشہور جغرافیہ نویس مسعودی بغدادی اس طرف سے گزرا تھا لکھتا ہے کہ ملتان مین ایک لاکھ بیس ہزار پور وسے ہین۔

ساتوین صدی عیسوی مین ملتان بادشاہی سندھ کے ایک اہم صوبہ کا دارالصدر تھا ۔یہان کا عہدہ دار راجہ نہ رائے کہلاتا تھا۔ ۶۳۱ء مین اس کا خاتمہ ہوا ۶۴۱ء مین برہمنون کے عہد مین مشہور بودھ زائر ہیون تسانگ چینی کا یہان بھی گذر ہوا تھا ۔ ۹۴ھ مطابق ۷۱۲ء مین اہل عرب بڑھتے ہوئے یہانتک

ساتھ نہایت پسندیدہ سلوک اور شاہان شان برتاو کیا تھا سادات کیساتھ رسم و ربط کی ابتدا یہین سے ہوئی

مواسات و غمخواری

اہل وطن سے کوئی دہلی آتا تو سلسلہ ملازمت ہوجانے تک اُس کا خرچ روزمرہ اور مہمانداری بلکہ دوا و معالجہ بھی میر عبدالجلیل کے ذمہ ہوتا۔ ایک خط مین میر سید محمد کو لکھتے ہین کہ "میر کرم اللہ دہلی آئے ہین اُن کی داہنی آنکھ مین بیس دن سے درد ہے نہ رات مین آرام ملتا ہے نہ دن مین آنکھ

چلے آئے اور محمد بن قاسم ثقفی نے خلفائے اسلام کے نام پر حکومت قائم کی تین صدی تک ملتان اسلام اور اہل اسلام کا مضبوط اور محفوظ مورچہ بنا رہا حتے کہ غزنوی خاندان ہندستان پر حملہ آور ہوا سنہ [illegible]ھ (سنہ ۸۵۰ء) مین دریائے سندھ کا نشیبی وادی یعقوب بن لیث کے قبضہ مین تھا۔ بعدازان یہان دو آزاد سلطنتین قائم ہوگئین ایک منصورہ مین، دوسری ملتان مین سنہ ۳۷۰ھ (سنہ ۹۸۰ء) مین قرامطہ نے ملتان پر قبضہ کرکے افاغنہ لودی کے حوالہ کردیا سنہ ۳۹۶ھ (سنہ ۱۰۰۶ء) مین محمود غزنوی قابض ہوا۔ تین صدی مابعد یعنی منگولیون کے دستبرد و حملہ تک ملتان کی تاریخ صاف و پاک نظر آتی ہے سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) مین پورے امن و خیر کے ساتھ بابر کا تسلط ہوگیا اور باوجود متعدد شبخون اور جدال و قتال کے کچھ مدت تک قائم رہا۔ بہرحال ملتان اُسی وقت سے دہلی کے تحت مین ہوگیا سنہ ۶۵۵ھ (سنہ ۱۲۵۷ء) مین افواج مغول نے یہان جو خون بہادی ہوتی مگر حضرت شیخ بہاءالدین زکریا معروف بہ بہاءالحق مشہور ولی و مخدوم نے خون بہا دے کر ملتان کو بچالیا اور کشت و خون کرنے والون کو ٹالا۔

سلاطین جغتائیہ کے عہد مین ملتان برابر مصئون و مامون رہا۔ اُس زمانہ مین اس صوبہ ملتان مین کل جنوبی و مغربی پنجاب داخل تھا کبھی کبھی سندھ بھی شامل کرلیا جاتا تھا۔ جب مغلون کی قوت رو بہ زوال تھی تب بھی ملتان اُن کے تابع فرمان بنا رہا۔ سنہ ۱۱۶۲ھ (سنہ ۱۷۴۸ء) مین ملتان کے قریب میر منون، صوبہ دار پنجاب کے نائب کوڑامل اور شاہ نواز سے معرکہ ہوا۔ شاہ نواز کو یہ صوبہ محمد شاہ نے عنایت کیا تھا۔ کوڑامل نے شکست پائی۔ احمد شاہ دُرانی کے وقت سے ملتان بادشاہان کابل کے زیرنگین ہوگیا۔ اخیر انقلاب سنہ ۱۸۴۹ء کا نتیجہ سرکار انگریزی کی حکومت و فرمانروائی تھی۔

ملتان سے ساحل بحر، یا کراچی کا فاصلہ ۵۷۶ میل ہے۔ شہر پناہ قائم ہے

یہان کے مقامات مقدسہ مین مزارات مخدوم بہاؤالدین زکریا (متوفی ۷ صفر سنہ ۶۶۵ھ) قلعہ پر، شیخ صدرالدین مخدوم (متوفی سنہ ۷۰۹ھ)، شیخ رکن الدین قریشی (قلعہ پر) اور سید زین العابدین پدر سلطان سرور کے مشہور ہین اورنگ زیب کی تعمیر کردہ جامع مسجد کا موقع وہ بتایا جاتا ہے جہان کبھی سورج کا مندر تھا۔ یہ مسجد سکھون کے عہد مین

کھلتی ہی جب کھلی تو معلوم ہوا کہ آنکھ مین پردۂ رقیق جو مانڈہ کہلاتا ہے پڑگیا ہی جو بینائی مین حائل ہے ۔ بائین آنکھ مین زخم کے سبب سے ضعف بصر تھا ۔ یہ اسکے علاوہ ہوا سخت درد و تکلیف ہے علاج کرتے ہین حق سبحانہ شفا دے ۔ بندہ کے ہاتھ سے جو کچھ خدمت ہوسکتی ہی بجالاتا ہون برخوردار یہان سُنا ہے کہ شیخ عبدالجلیل دُسعانی کے پاس آنکھ کے مانڈہ کا علاج نہایت نہایت مجرب ہے لازم ہے کہ مانڈہ کے علاج کی گولیان اگر اُنکے پاس موجود ہون تو لے کر بہ احتیاط چھوٹی ڈبی مین رکھکر بھیجدیجئے ۔ اور اگر موجود نہ ہون تو اُس پر جو کچھ خرچ پڑے اپنے پاس سے خرچ کرکے گولیان تیار کراکے جلد بھیجدیجئے ۔"

سفارش

امین الدولہ نے جو حضور بادشاہی کا وقایع خوان تھا امیر الامرا سید حسین علی خان کی غیبت مین امیر الامرا کے خلاف کچھ عمل کیا تھا جب دکن سے امیر دار الخلافہ واپس آیا تو امین کو اس تقصیر کی پاداش دینا چاہی ۔ ایک روز امین امیر کے دربار مین حاضر ہوا ۔ دروازے سے نکلتے ہی میر عبدالجلیل سامنے موجود تھے ۔ میر نے امیر سے عرض کیا کہ رسول اللہ صلعم نے انصار[۱] اور ذریت انصار کے حق مین دُعا کی اور اُن کی مراعات کے لئے وصیتین فرمائی ہین اور ارشاد کیا ہے کہ تجاوزوا عن

بارود خانہ بنادی گئی تھی جو نذر آتش ہوگئی ۔

تجارت کا سلسلہ کابل و قندہار سے قائم ہی ۔ قالین بافی و چینی کا کام خوب ہوتا ہی ۔

۵۲۹ انصار یعنی یاری دہندگان جمع نصیر ۔ یاری گر مثل شرف و اشراف ۔ عرف عام مین مسلمانون کا وہ مبارک طبقہ کہلاتا ہی جس نے مدینہ طیبہ مین رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قدوم و میزبانی کا شرف حاصل کیا تھا انصار کے اسلام لانے کا آغاز سالہ یازدہم نبوت مین ہوا ۔ اللہ اللہ ۔ ایک وہ وقت تھا کہ نوع انسانی کا سب سے بڑا مُصلح اور خدا کے برتر کا سچا پیغامبر کاشانۂ رحمت سے نکلتا اور مختلف موسم مین مختلف قبائل و عشائر کی تلاش مین اُنکے آثار و نقش قدم پر چل کر اُن کے منازل و مقامات پر عکاظ و مجنہ و ذی المجاز مین پہونچتا اور ندائے عام دیتا کہ من یو دینی من ینصرنی حتی ابلغ رسالۃ ربی ولہ الجنۃ ۔ اس صلائے رحمت پر لبیک کہنے والا اور سوال نصرت پر ناصر بننے والا کوئی نہ ہوتا ۔ حتے کہ انصار سے بالانفراد سوال کرنے کے بعد بتمام تبلیغ

سیئاتہم یعنی ان مین کے گنہگار سے درگزر کرو - آپ دتواب، اولاد رسول ہین اور امین الدولہ انصار کی اولاد سے - اپنے جد بزرگوار کی اقتدا کیجئے اور امین کا قصور معاف فرمائیے - امیر الامرا نے فوراً غضب وعتاب سے درگزر کیا اور معاف فرما کر امین الدولہ پر بڑی مہربانی و نوازش کی اُسوقت تک

کے لئے یہی سوال قبیلہ قبیلہ سے کیا جاتا گُم گشتگان وادی ضلالت اس کا جواب اقبال و اقرار سے نہین بلکہ عُجب وانکار سے دیتے اور کہتے کہ قوماک اعلم بک ابتلاء وآزمائش کا یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو سحاب کرم نے رشحہ افشانی کی اور خداوند جل وعلا نے اپنے سچے دین کا اظہار فرمانا چاہا تو اُس پیکر قدسی کو اُن لوگون کی طرف بھیجا جو قیلہ (ایک عورت) کی اولاد، اوس وخزرج کہلاتے تھے - سب سے پہلے بزرگان خزرج نے دعوت اسلام قبول کی اور خدا کے راستہ پر آگئے - پھر رفتہ رفتہ اوس . اور بنو عبد الاشہل تو مرد وعورت سب نے ایک ہی دن شرف اسلام حاصل کیا تھا - مدینہ منورہ مین انصار نے رسول اقدس کے نزول اور زمانہ قیام مین اسلام اور پیغمبر اسلام کی خدمت کی سعادت حاصل کی -

انصار احرار نے اپنی راستبازی وہمقامت اور خلوص وصادق محبت کا جائزہ بڑے نازک موقعون پر دیا ہے - ادیان وامم کی کسی تاریخ مین "عقد مواخات" کی دوسری مثال نہین پائی جاتی - انصار ومہاجرین مین جب برادرانہ قائم کیا گیا اور ایک ایک انصاری کے حصہ مین ایک ایک مہاجر بھائی دیا گیا تو اپنی جائداد اپنے مال ومتاع اپنے سرمایہ، اپنے مساکن، غرض ہر نوع وہر قسم کی مملوکات ومعاملات مین انصار نے مہاجرین کو اپنا بھائی اور برابر کا شریک بنالیا - ہر چیز بالمناصفہ تقسیم کرکے حوالہ کردی - حتے کہ اگر کسی کی دو بیبیان تھین تو اُن مین سے بہتر کو طلاق دیدی اور اپنے برادر مہاجر سے خود اُس کا نکاح کر دیا مختصر یہ کہ اپنے کو اور اپنے فرزند وزن کو ہر طرح رسولؐ اور رفیقان رسول برحق پر نثار کر دیا ؎

مل گیا دل سے یکایک ترے سوفار کا رنگ ورنہ بیگانے سے برسون مین لہو ملتا ہے

یہ اسی باحمیت وسیر چشم گروہ کا کارنامہ تھا کہ جب سرور عالم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی نضیر کے غنائم تقسیم فرمانے لگے تو انصار مین سے صرف تین حضرات کا حصہ نکالا جو فی الواقع صاحبت مند اور مسکین تھے - باقی جماعت سے ارشاد ہوا کہ اگر غنیمت مین مہاجرین کے ساتھ حصہ لینا منظور ہے تو اپنے اثاثہ و سرمایہ واراضی مین برادر مہاجر کو شریک وسہیم بنا لیجئے آدھا آدھا بانٹ دیجئے - دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے مملوکات پر بدستور قبضہ وتصرف تنہا رکھئے اور اموال غنیمت سے دست برداری کیجئے - انصار نے عرض کیا کہ ہم کو سب منظور رہے - ہم بانٹ بھی دینگے اور غنیمت سے حصہ بھی نہ لین گے - مال غنیمت ہمارے برادران مہاجرین کو دیدیا جائے - اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ

میر عبدالجلیل کی امین الدولہ سے شناسائی بھی نہ تھی۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ انصار کی اولاد سے ہے۔ چونکہ میر کا طریقہ محدثین کا تھا اسلئے ہمیشہ پیروی سنت نبوی میں کوشش کرتے اور اپنے پر انصار کی شفاعت لازم سمجھتے تھے۔

مجربات

میر عبدالجلیل کے مجرب نسخہ جات کی تعداد زیادہ نہ تھی لیکن جس قدر نسخے تھے اُن پر اُنکو اعتماد کامل حاصل تھا۔ ان میں پہلا نمبر جوہرن کنکولاد کا تھا جسکو اکثر امراض میں خود استعمال کرتے اور اپنے تمام متوسلین کو اُسکے کھانے کے لئے تاکید کرتے رہتے تھے خانہ داری کی ضروریات کے متعلق ایک چھوٹی سی بیاض (نوٹ بک) بلگرام میں رکھتے تھے اُس میں اِس کا نسخہ رہتا اور

مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ قف (اور (وہ مال جو بے لڑے ہاتھ آیا ہے) اُن کا بھی حق) ہے کہ (مہاجرین نے کبھی ہجرت نہیں کی تھی اور وہ) اُن سے پہلے مدینے میں رہتے اور اسلام میں داخل ہو چکے ہیں جو اُن کی طرف ہجرت کر کے آتا ہے اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور (مال غنیمت میں سے) مہاجرین کو جو کچھ بھی دے) دیا جائے اُس کی وجہ سے یہ اپنے دل میں (تنگی) کوئی طلب نہیں پاتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (مہاجرین بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔ الجزء ۲۸ سورۃ الحشر ع ۱-۲]

مسجد نبوی کی تعمیر میں ایک طرف وہ پیکر نورانی اینٹ پتھر کے ڈھونے میں مصروف تھا دوسری طرف خادمان ملت حقہ کی نصرت کے لئے یہ دعا زبان پر تھی۔ اللھم لاخیر الاخیر الاخرۃ فانصر الانصار والمھاجرۃ۔ عبداللہ بن رواحہ انصاری نے تبرکاً و تیمناً اس دعا کو نظم بھی کر دیا ہے ؎

اللھم ان الاجر اجر الآخرۃ	فارحم الانصار والمھاجرہ
اے خدا اجر تو بس آخرت کا اجر ہے	اسلئے تو انصار و مہاجرین پر رحم فرما

صحیحین میں یہ حدیث شریف وارد ہے آیۃ الایمان حب الانصار (انصار کی محبت کمال ایمان کی نشانی ہے) دوسرے موقع پر یہ ارشاد اقدس ہوا تھا کہ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَءًا مِّنَ الْاَنْصَارِ (ہجرت کا شرف اگر مجھے حاصل نہ ہو جاتا تو میں بھی انصار میں سے ایک شخص ہوتا) آنحضرت صلعم مہاجرین کے طبقہ عالیہ سے تھے

اور اسکے مطابق چورن تیار کیا جاتا تھا۔

فرجام نے میر عبد الجلیل کو اُن کی حلیلہ جلیلہ کی علالت کی خبر دی ہو کہ کھانسی اور تپ عارضی کبھی کبھی ہو جاتی ہے تو ہدایت فرماتے ہین کہ "چورن[۱۹۰] کنکولا د اس عارضہ کیلئے خوب ہے اور نافع۔ نسخہ بیاض خانگی ہین موجود ہے۔ سید محمد خود جانتے ہین بنوالین اور کھلائین۔ انشاءاللہ موافق ہو گا۔"

رُسوم و تقریبات

کان چھیدنے کی رسم و خوشی جو اب بہت کم بلکہ تقریباً متروک ہو گئی ہے میر عبد الجلیل کے زمانہ ہین بہت مانی اور منائی جاتی تھی۔

میر صاحب دہلی ہین تھے بعرصہ سے سفر وطن کا تھیا کر رہے تھے اور جلد سے جلد اُن کا بلگرام پہونچ جانا یقینی اور قطعی تھا۔ البتہ دربار کے تعلقات اور دستورات کی طوالت سے تعین ماہ نہین کر سکتے تھے۔ عزیزان وطن کی متواتر طلب اور اپنی مجبوری پر لکھتے ہین "اگر ساعت شادی ہمشیرہ سید غلام علی اس قسم کی ہے جس مین وہان کی عورتون کی اصطلاح کے بموجب تقدیم و تاخیر نہین ہوسکتی تو مبارک ہو۔ شادی سے فارغ ہو جائے۔ فقیر بھی جسوقت یہان کے کامون سے فراغت پا جائے گا، وہان پہونچ کر طرفین کو مبارک باد کہدے گا۔"

یہ تقریب میر صاحب کی عدم موجودگی مین ہو جاتی ہے تو فرماتے ہین کہ "انجادم شادی کنیہ

تاہم انصار کی قدر و منزلت مہاجرین سے کم نہ فرماتے تھے۔

صحاح مین بہ ذیل معجزات شریفیہ آیا ہے کہ رسول اکرم صلعم نے انصار سے فرمایا تھا کہ میرے بعد لوگ تم پر اورون کو ترجیح دین گے چنانچہ جناب معاویہ کے زمانہ مین ایسا ہی ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و رضاهم عنا۔

۱۹۰ کنکولاد مین الف دال اضافی یا ترکیبی ہو۔ کنکول بھاشا اور مرہٹی کا نام ہو۔ اُردو مین کباب چینی عربی و فارسی مین کبابہ کہتے ہین دیگر دیسی زبانون مین 'کاپو چینی' اور 'ستیل چینی' انگریزی مین Cubebs یا piper cubeba کہلاتا ہو۔ چورن کا نسخہ قدیم و معروف ہے۔ جزو غالب کنکول ہو۔ اطبا و اسکے خواص و فوائد

بوالدہ وہمشیرہ شما مبارک باشد وادائے قرض سودی بما ہمایون باد۔ انشاء اللہ ادا نمودہ خواہد شد۔"

شادی کنیہ کے متعلق اورینٹل مسلینی مطبوعہ ۱۸۹۰ء کا جامع لکھتا ہے کہ یہ رسم کان چھیدنے کی پانچ سال سے لے کر نو سال تک کی عمر مین ادا کر دی جاتی تھی۔

یاد رہے کہ ابھی کچھ زمانہ پیشتر میر سید محمد کی شادی کا قرض جو میر صاحب کے ذمہ ہو گیا تھا سالہائے دراز کے بعد ادا ہو پایا تھا۔

اسی طرح تمام خاندانی مراسم اور پرانے دستورون کی پابندی ضروری اور لابد سمجھتے تھے۔

قرض

قرض کا بار ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس خاندان پر بنا رہتا تھا۔ روزمرہ کے اخراجات کی وجہ سے، قصباتی شرفا کی برادر نوازی اور کنبہ پروری کی بدولت، شادی و غمی و تقریبات کے غیر معمولی مصارف کے سبب سے، مقروض و پریشان رہتے تھے۔ سود مین کثیر رقم ہر سال نکل جاتی تھی اور میر عبدالجلیل اور ان کے اعزہ اُس کو بے تکلف برداشت کر لینے کے عادی ہو گئے تھے۔ میر غلام علی کی بہن کی، کان چھیدنے کی تقریب ہوئی۔ یہ سرپرست اور بزرگ خاندان تھے اور ہر قسم کے مصارف کے ادا کرنے کے ذمہ دار۔ اطلاع پانے پر لکھتے ہین کہ شادی کُنیہ کا انجام ہو جانا تمھاری والدہ اور تمھاری بہن کو مبارک ہو۔ سُودی قرضہ کا ادا کرنا ہمکو مبارک ہو۔ انشاء اللہ ادا کر دیا جائیگا۔"

میر سید محمد کی شادی مین بھی قرض ہو گیا تھا جب ادا ہو گیا اور میر سید محمد کے خط محررہ ۱۹ ار رمضان المبارک ۱۱۵۱ھ (عالمگیر) سے اس کی اطلاع پردیس مین ملی تو فرمایا کہ "آپ کی شادی کے قرضہ سے خلاصی کی خوشخبری سُنکر شکر بجا لایا۔ اب معلوم ہوا کہ خدا کے فضل سے اس مُہم عظیم سے فراغت حاصل ہو گئی "

کثیر لکھتے، اور اسکو مقوی دل بشتہی، دافع گندہ دہنی و بلغم و ریاح، نیز امراض چشم مین مفید بتاتے ہین۔

ایک اور خط مین بھی یہی مذکور ہے "گھنشیام تیواری کا قرضہ جو ادا کردیا نہایت خوب ہوا۔ اُس کا سود ہر روز بڑھتا جاتا تھا - باقی بالائی قرض کے لیے جس کی تعداد تین سو روپیہ ہوگی آپنے لکھا ہے - وہ بھی خدا نے چاہا تو ادا ہو جائے گا - لیکن ہر کام ایک وقت اور ایک ہنگام پر منحصر ہے اس زمانہ مین کہ اُردوئے مُعلّے کے دریائے قُلزم مین پڑ گیا ہون اور ہر روز خرچ مبلغ درپیش رہتا ہے - یہ کام جلد صورت پذیر نہین ہو سکتا -"

بیٹا باپ کے اور باپ، بیٹے کے دیکھنے کے لئے بے چین اور سخت مشتاق ہین - باپ مجبور ہے - مدت ہوئی داخل لشکر شاہی ہو چکا ہے لیکن دربار سے اپنے معاملات کے سُلجھانے مین ہنوز قاصر و ناکام رہا ہے - ایک نوکر بیمار ہے - دوسرا تن تنہا میر عبد الجلیل کی خدمتگذاری کر رہا ہے - اسلئے اُس کو جُدا کرنا اور بیٹے کے بُلالانے کیلئے وطن بھیجنا دشوار ہے - اس تمام پریشانی اور بے سروسامانی مین بھی اطمینان دلایا جاتا ہے کہ " اپنے قرض کی نسبت جو لکھا ہے تمھارا قرض میرے ذمہ ہے انشاءاللہ آپ کی تحریر کے مطابق عمل کیا جائیگا خاطر جمع رکھئے گا۔"

صِلہ

اگرچہ میر عبد الجلیل کا کلام (شعری) تمام تر مدائح مین واقع ہوا ہے لیکن اُنھون نے سوائے ایک موقع کے مدة العمر کسی ممدوح سے کبھی کوئی صلہ لینا گوارا نہین کیا - وہ مستثنیٰ موقع یہ تھا کہ ایک بار یہ رُباعی لکھ کر سلطان اورنگ زیب کی نظر سے گذاری ؎

کسرےٰ[۱۹۱] کہ بہ عدل بود عالم پرور | بے جرم آویخت پائے زنجیر زدر
ذاتت بکمال عدل تجویز نہ کرد | آویختن سلسلہ ہم در کشور

[۱۹۱] کسرے (معرب خسرو) نوشیروان عادل بادشاہ فارس کا لقب تھا جس نے زنجیر عدل ایجاد کی تھی - اسی کی تقلید مملکت ہند مین شہنشاہ جہانگیر نے کی - ایک زنجیر دار الخلافت آگرہ مین بھی نصب کی تھی - اسکی نسبت وہ اپنے تزک مین لکھتا ہے کہ طلائے خالص سے بنائی گئی تھی - تیس گز لمبی تھی - چار من پختہ ہندوستانی

سلطان نے قدر افزائی فرما کر دکن کے طلائی سکہ کے (جو ہُون کہلاتا تھا) چار خریطے (توڑے) شہزادہ کام بخش کے حوالہ کئے اور شہزادہ نے مخلص خان میر بخشی کے ہاتھ میر صاحب کے پاس بھیج دئے۔ میر صاحب کے معتقدین لکھتے ہین کہ میر کا تمام عمر مین ایک بار یہ صلہ لے لینا امیر خسرو کے ساتھ استکمال تشابہ کی راہ سے تھا۔ اس لئے کہ امیر بھی سلاطین و اُمرا سے صلہ قبول نہ فرماتے تھے اور جس کا اپنی تصانیف مین بھی ذکر کیا ہے۔ صرف ایک بار سُلطان قطب الدین خلجی نے امیر کو کتاب نہ سپہر کے جائزہ مین بقدر وزن جُثّہ فیل کے سونا عطا کیا تھا۔

وزن تھا۔ کڑیان ساٹھ تھین۔ زنجیر کا ایک کنارہ قلعہ کے بُرج (نشیمن شاہی) سے لٹکا دیا گیا تھا اور دوسرا، کنارہ دریا کے قریب زمین سے وابستہ ہوتا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ اگر عدالت ہائے سرکاری کے حکام انفصال قضایا مین طرفداری یا فصل خصومات و نصفت گستری مین تاخیر کرین تو ستم رسیدہ فریق خود حاضر ہو کر زنجیر کو ہلا دے۔ کڑیون کی جُنبش سے صدا بلند ہو کر شہنشاہ معدلت پناہ کو آگاہ کر دے گی کہ ساحۂ دولت و اقبال تک اپنا مظلمہ و استغاثہ پہونچانے کے لئے ایک فریادی چشم براہ ہے۔

۱۹۲ ہُون (جنوبی ہندوستان یعنی دکن کا دینار یا طلائی سکہ تھا۔ مسلمان اہل لغت اس کو ہُن لفظ ہندی اور راجہ اچپت رائے کو اس کا واضع بتاتے ہین۔ یہی تامل زبان مین ورہاؤ اور یورپی السنہ مین پیگوڈا کہلاتا ہے۔ دو صدی سے اسی نام (پیگوڈا) سے مشہور ہے۔ تین روپیہ سے لے کر ساڑھے تین روپیہ یا چار روپیے قیمت تک کا ہوتا تھا۔ اسکی مسطح (چپٹی) سمت تین چھوٹے چھوٹے نشان نصف درازی تک ہوتے تھے چندان ہموار و خوشنما نہین ہوتا تھا۔ محدّب سمت اس پر چھوٹے چھوٹے نقاط ہوتے تھے۔ مونٹگومری مارٹن لکھتا ہے کہ "اسکی صورت بالکل (اٹھارہوین صدی کے) آستین کے گول بوتام کی طرح ہوتی تھی۔ مورخین اسکا واضع راجہ اچپت رائے کو لکھتے ہین"۔

۱۹۳ امیر خسرو (ابو الحسن بن سیف الدین دہلوی کا شہرہ اور کمال میرے تعارف سے بے نیاز ہے) ایک زبردست صوفی اور عدیم النظیر ادیب و شاعر کی حیثیت سے ان کو ہندوستان کا حرف شناس بچہ بھی جانتا ہے۔ آپ کی ولادت ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) مین ہوئی تھی۔ رمضان ۷۲۵ھ (ستمبر ۱۳۲۵ء) مین وفات پائی۔ آپ کی تصانیف بہت ہین اور بہت مشہور ہین۔ خالق باری، پندنامہ، تحفۃ الصغر، سکندرنامہ، قران السعدین، عشقیہ، دولرانی خضر خان، و تغلق نامہ وغیرہ۔

باوجودیکہ امیرالامرا سید حسین علی خان کے ساتھ ایسے گہرے اور مخلصانہ و بے تکلفانہ تعلقات تھے لیکن جب ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) مین قلعہ آگرہ فتح ہوا اور شاہزادہ نیکوسیر کی افواج کو شکست ہوئی تو اسکی تہنیت مین میر عبدالجلیل نے قصیدۂ غرا لکھہ کر پیش کیا۔ نواب نے پانچہزار روپیہ نقد اور خلعت[۱۹۵] و اسپ دینا چاہا لیکن میر نے اپنے ضابطہ و معمول کے موافق قبول نہ فرمایا۔

---

۱۹۴ نہ سپہر، امیر خسرو نے قطب الدین خلجی کے نام پر ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) مین لکھی تھی۔ نو باب ہین اور ہر باب جداگانہ بحر مین ہے۔ اسی مناسبت سے "نہ سپہر" نام رکھا ہے۔ امیر کی عمر اسوقت پینسٹھ (۶۵) سال کی تھی اسکے ہدیہ و سپاس گذاری مین ع مرا عمر کز شصت بالا گزشت۔ مین اسی کا اشارہ ہے۔ یہ مثنوی مطبع یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ مین نہایت خوب و پر تکلف چھپی ہے

۱۹۵ خلعت (بالکسر) اصلاً، وہ سلا ہوا کپڑا جو بدن سے اُتار کر کسی کو پہنایا جائے۔ عرفاً وہ اعزازی پوشاک جو ملوک و اُمرا کسی شخص کو عطا فرمائین۔

خلعت مختلف مواقع پر مختلف حیثیت سے عطا ہوتا تھا

(۱) عموماً اپنے سے کم کو بہ نظر اکرام،

(۲) کسی عہدہ پر ماموری و تقرر کے وقت،

(۳) بدستور قائم و بحال رہنے کے صلہ و مخلد مین،

(۴) جلیل القدر اُمرا کی طرف سے اپنے ممتاز مہمانون اور آنیوالون کو بھی پیش یا ارسال کیا جاتا تھا خلعت مین اکثر جامۂ نادوختہ و نا تیار دیا جاتا تھا بعض اوقات اسلحہ و زیورات و دیگر اشیائے بیش بہا بھی اضافہ کردیئے جاتے تھے مگر ایسی حالت مین کوئی پارچہ پوشیدنی اس مین نہین ہوتا تھا۔ عمامہ و شال ان عطایا مین ضرور شامل ہوتے تھے اور سلاح و اسپ و فیل تو مکمل خلعت کے جزو لازم تھے۔

رائے رایان آنند رام مخلص لکھتا ہے کہ خلعت کے تین درجے تھے۔

پہلا۔ چھ پارچہ کا۔ مقررہ تین پارچون کے سوا، سرپیچ اور بالابند اور نیمہ آستین یہ ہفت ہزاریان کیلئے مخصوص تھا

دوسرا۔ پانچ پارچہ کا۔ نیمہ آستین ندارد۔ یہ پنجہزاری کو ملتا تھا۔

تیسرا۔ تین پارچہ کا معمولی۔

بادشاہان تیموریہ کے آخر عہد تک یہی معمول قائم رہا۔ ان کے دربار سے کبھی خلعت تیار اور سلے ہوئے کپڑون کا

اسی طرح نواب آصف جاہ نظام الملک نے بھی اپنے قصیدۂ مدحیہ اور غزل فرمایشی کے صلہ مین پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ مرحمت فرمانا چاہا تھا جس کو میر نے منظور نہین کیا۔ یہ دونون قصیدے مع ان دونون اُمرائے عالی شان کے حالات اور میر صاحب کے تعلقات کے اپنے اپنے محل پر نقل کئے جائین گے۔

معاش و خدمت

اس خاندان مین کوئی مستقل ذریعۂ معاش و بسر اوقات باقی نرہا تھا۔ وہ معافیات[۱۹۶] و التمغا[۱۹۷]

دیا جاتا تھا جیسے جامہ وقبا کا۔ اور کبھی بے سلے ہوئے سادہ پارچون کا۔ ہر صورت مین دستار یا چیرہ رنگین دبہاردار) اور پٹکا ضرور دیا جاتا تھا۔

وہ خلعت جس مین سر سے پانون تک سارا جسم چھپ جائے سر پا کہلاتا تھا۔ زیادہ رتبہ والون کیلئے ایک اور لباس زاید بالاپوش کے طور پر اور اس پر ایک جُبّہ مستزاد ہوتا تھا۔ یہ جُبّہ کسی قدر چھوٹا ہوتا تھا اور اسکی آستینین بھی چھوٹی ہوتی تھین سر پا یا خلعت مین جُبّہ ملا کر پانچ یا چھ پارچے ہوتے تھے۔ ایک تھان ہلکی کمخواب یا زربفت کا لمبے پاے جامہ کے لئے اضافہ کیا جاتا تھا۔ مگر زبان سے اس کا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ تمام پارچے ململ کے ہوتے تھے۔ اسی پر سنہرا اور روپہلا کام اور ریشم سے گلکاری نہایت نفیس اور پرتکلف ہوتی تھی۔

مغلون کے آخر زمانہ مین خلعت عموماً تین پارچہ کا دیا جاتا تھا چار پارچون کا خاص خاص موقعون پر امتیاز کے لئے عطا ہوتا تھا مگر ہر حالت مین کپڑے بیش قیمت دیئے جاتے تھے۔

خلعت کی ایک صورت اور بھی تھی "ماتمی"۔ یہ ہمیشہ ململ کا ہوتا تھا سیاہ یا سبز رنگا ہوا۔ عطا ہوتے وقت فوراً پہن لیا جاتا تھا۔ مگر لازم تھا کہ دوسرے دن (ایک دن بعد) اُتار دیا جائے۔

عطائے خلعت کا رواج مسلمانون مین بہت پرانا ہے۔ خلافت بنی عباس کی تاریخون مین اس کا ذکر مختلف نامون سے پایا جاتا ہے۔ رشید، اعزاز و اکرام کے طور پر ثیاب فاخرہ بھیجتا تھا۔ منصور، جوائز حسنہ کے علاوہ، کسوۂ سینہ، دیکر رخصت کرتا تھا۔

[۱۹۶] معافی۔ کے لفظی معنے عفو کنندہ کے ہین لیکن اصطلاحاً وہ اراضی مراد ہے جس کی جمع

جو سید محمد صغرے اور اُن کی اولاد کے لئے سلاطین دہلی نے عطا کی تھین کچھ توضبط ا ور کچھ پُشتہا پشت کی توریث و تقسیم سے کالمعدوم ہو چکی تھین۔ زمینداری کی قدر نہ تھی۔ آبائی پیشہ عرصہ دراز سے ملازمت چلا آتا تھا۔ غرض معاش سے فارغ البالی کبھی نہین رہی۔

میر عبدالجلیل کو باوجود اُن کے کمال علم کے، قلت اسباب معیشت و کثرت اہل و عیال نے مطمئن و متوکل بیٹھنے نہ دیا۔ تینتیس ۳۳ سال کی عمر مین میر سید محمد فیض زمیندار بلگرام کے ساتھ سنہ ۱۱۰۴ھ (۹۳-۱۶۹۲ء) مین گھر سے باہر نکلے۔ دکن پہونچے اور بے نیل مرام واپس آئے۔ سید محمد فیض کی دادرسی ہوگئی مگر یہ ناکام رہے۔ سات برس بعد وہی جاذبہ پھر دامنگیر ہوا۔ شاہزادہ عظیم الشان کا ہمزلف میر محمد رضا جو شاہ حسین خان کا بیٹا تھا بنگالہ سے بہ ارادۂ حاضری آستان خلد مکان چلا بلگرام پہونچا اور میر عبدالجلیل کا مہمان ہوا۔ یہ بھی اُس کے ساتھ سنہ ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) مین دوبارہ عازم دکن ہوے۔ اس مرتبہ یکہ و تنہا نکلے تھے۔ چند انفار و خدام کے سوا کوئی ہم وطن رفیق نہ تھا ارادہ کرلیا تھا کہ بغیر فوز مراد و حصول مطلوب واپس وطن نہ ہون گے۔ چنانچہ طے منازل و قطع مراحل کے بعد اسلام پوری[۱۹۸] عُرف برہاپوری توابع بیجاپور مین پہونچے اور عالمگیر خلد مکان کے

(مالگذاری) سرکار سے معاف ہو۔ کوئی جائداد جو بطور وظیفہ عطا کی گئی ہو

۱۹۷ؔ التمغا۔ ترکی مین آل المعنی سرخ، بادشاہ کی مُہر کو کہتے ہین۔ زمانہ قدیم مین بادشاہ کی مُہر ہمیشہ شنجرف سے کیجاتی تھی۔ آل التمغا۔ زمین و جاگیر کا نسلاً بعد نسل بخشدینا ہے۔ اسی لئے بعض محققین نے یہان لفظ آل' عربی کا مانا ہے۔ جسکے معنی فرزندان و اہل خانہ و پیروان کے ہین تمغا بھی ترکی مین نشان و مُہر کو کہتے ہین۔ نیز اُس محصول اور باج کو جو ممالک غیر سے آئی ہوئی اجناس و اشیا پر داخلہ سرحد اور گھاٹون اور بندر ون پر لیا جاتا ہے اور ادائگی کی مُہر لگادی جاتی ہے۔ سند عطا۔ فرمان سلطانی۔

۱۹۸ؔ اب یہ دونون نام بہت بدل گئے ہین۔ یہ مقام اُردو مین "اسلام پور" کہلاتا ہے اور ضلع ستارہ مین والو تعلقہ کا صدر مقام ہے۔ ستارہ خاص سے فاصلہ اٹھائیس ۲۸ میل ہوگا۔ انشاے جلیل مین اس کو "برہ پُر عُرف اسلام پور" لکھا ہے۔

قصبہ کے دونون حصے ایک دوسرے سے جدا ہین۔ اسلام پور کو مسلمانون نے مسلمانون سے آباد

لشکر مین داخل ہوے۔ یہ بادشاہ جیسا مردم شناس اور قدردان اہل ہنر تھا اسکی مثال تاریخ مین کم ملے گی۔ مرزا یار علی بیگ سوانح نگار حضور بادشاہی نے نہایت قدرشناسی اور تکریم کی اور ملازمت سلطانی مین پہونچا دیا۔ ان کی تاریخ فتح ستارہ سے ان کی قابلیت و ذکا کا سکہ جم چکا تھا۔ بادشاہ نے منصب شایستہ اور ایک بڑی جاگیر محال سانڈی پور مین دلگرام کے

کیا تھا۔ اُدھر دن ہندون کا محلہ اور قدیم تر ہے۔ اسی مین شمبھو بابا گوسٹی کی زیارت گاہ ہے۔ یہ ذات کے پارچہ باف بڑے عابد و مرتاض تھے۔ ان سے خوارق عادات و غرائب افعال سرزد ہوتے تھے۔ اب بھی وہان میلہ لگتا ہے۔

میونسپلٹی بھی قائم ہے سنہ ۱۹۰۱ء مین مردم شماری بارہ ہزار کے قریب تھی لیکن بیس برس بعد سات ہزار نو سو سولہ رہ گئی جس مین مسلمانون کا شمار صرف سات سو ستاسی تھا۔

۵۱۹۹ Royal Intelligencer مسلمانون کے نظام مملکت مین فرمانروا کی آگاہی اور باخبری کے لئے یہ سررشتہ نہایت کارآمد تھا اس صیغہ مین اعلےٰ سے ادنیٰ تک جو کارکن مقرر کیے جاتے تھے وہ کامل دیانت دار، راستباز اور لایق اعتماد ہوتے تھے۔ ان کا تقرر بالراس حضور شاہی سے ہوتا تھا۔ یہ وقائع نگار تمام بڑے بڑے مقامات، شہرون، لشکرون، سپہ گاہون اور صوبون مین مامور رہتے تھے اور شب و روز کے ضروری واقعات قلمبند کرکے دربار شاہی مین بھیجدیتے تھے۔ یہ لوگ آزاد منش اور آزادہ رو ہوتے تھے کسی مقامی افسر یا عہدہ دار کے ماتحت نہین۔ اسلئے بلا کسی خوف و اندیشہ کے ملک و رعایا کے حالات لکھتے رہتے تھے۔ ممالک دوردست کے حکام اور والی ان کی راست نگاری اور صداقت کوشی سے خائف رہتے رعایا و برایا کے ستانے کی جرأت، اور احکام شاہی کی تفتیش نہ کرتے تھے۔ خود اُن کی زندگی بھی خوف و خطر سے محفوظ نہین تھی۔ کوئی بداطوار و ظالم کیش جب اپنے کسی فعل یا جریمہ کو چھپانا چاہتا تو ان کو لالچ بھی دیتا اور جان کی دھمکی بھی۔ غرض جو خدمات پہلے پہل مسٹر عبدالجلیل کو سپرد ہوئی تھین نہایت ذمہ داری اور جوابدہی کی تھین جنکی انجام دہی آسان نہ تھی۔ اسی سلسلہ مین یہ بھی لکھنے کے قابل بات ہے کہ وقائع نویس سوانح نویس سوانح نگار تقریباً ایک ہی نوع کی خدمات اور یکسان اہمیت و وقعت رکھتے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ واقعہ نویس کی اطلاعین شایع کردی جاتی تھین اور اور دن کی مخفی رہتی تھین بجز اسکے کہ مصالح ملکی ان کی اشاعت و توزیع کے مقتضی ہون، یا مرور ایام کے بعد۔

قریب) مرحمت فرمائی اور بخشی گری[۵۲۰] و وقائع نگاری[۵۲۰] گجرات[۵۲۰] شاہ دولا[۵۲۰] (ملک پنجاب) کی خدمت[۵۲۰]

تنہ ۵۲۰ صاحب مفتاح التواریخ کا بیان ہے کہ "عالمگیر بادشاہ او را منصب شائستہ عطا فرمود بعد چندے خدمت بخشی گری و وقائع نگاری گجرات شاہ دولا مرحمت ساخت"۔

لنہ ۵۲۰ صفی پور (واقع ضلع اوناؤ صوبہ اودھ) کا پرانا نام سائی پور ہے کسی زمانہ مین ان اطراف مین برہمنون کا قبضہ تھا اور راجہ سائی سوکل نے اس مقام کو آباد کیا تھا جب حضرت شاہ صفی مخدوم کا آرامگاہ قرار پایا تو فیض انتساب سے اس قصبہ کا نام صفی پور ہوگیا ۔ تاہم پرانا نام باقی اور بہت شہرت رکھتا ہے۔

جون پور جاتے ہوئے جب مولانا شاہ اکرم مورث وجد اعلیٰ شاہ صفی علیہما الرحمہ اس طرف سے گزرے تو برہمنون نے اُن کو ستایا اور تنگ کیا ۔ اس کی پاداش کے لئے شاہ ابراہیم شرقی نے ایک لشکر جرار بسرکردگی شاہ اکرم موصوف و راؤ بھیکن راؤ کایستھ بخشی فوج بھیجا ۔ سائی سوکل اور اُس کا آقا اودگر سین راجہ اودگو لڑائی مین کام آئے اور مسلمانوں مین سے بہار الدین پسر علاء الدین شہید ہوئے ۔ اُن کا مزار بروایت سرکاری گزیٹیر اب تک بوسہ گاہ خلائق ہے اور ہندو اور مسلمان یکسان ادب و احترام کرتے ہین۔

سائی پور کا تذکرہ آئین اکبری مین بھی ہے ۔ یہ پرگنہ اُس وقت سرکار لکھنؤ صوبہ اودہ سے متعلق اور چندیلون کے تصرف مین تھا ۔ چالیس سوار ایک ہزار پیادہ فوج رہتی تھی ۔ قابل زراعت رقبہ ۳۹۰۸۳ بگیہ تھا جن پر ۲۶۲۵۳۸۸ دام تشخیص تھے ۔ یہی انتظام اور تشخیص عہد اورنگ زیب تک قائم رہی ۔ موجودہ رقبہ انگریزی حساب سے ۸۴۴۵۱ ۔ ایکڑ یعنی ۱۳۲ میل مربع ہے اس مین ۱۳۵ مواضع ہین۔

قصبہ صفی پور کی آبادی ۱۹۲۱ء مین چھہ ہزار اکیاون تھی تحصیل صفی پور اور تھانہ کا مستقر ہے

کنہ ۵۲۰ انگریز مورخین نے اسکا ترجمہ (**Pay Master and News Writer**) کیا ہے

۵۳۰ منہ قصبہ گجرات صوبۂ پنجاب مین ضلع و تحصیل کا صدر مقام ہے ۔ دریائے چناب یہان سے پانچ میل جنوب پر رواں ہے ریل کا اسٹیشن بھی ہے ۔ موجودہ آبادی بائیس ۲۲ ہزار ہے ۔ مقامی روایات سے پایا جاتا ہے کہ اس قصبکی بنیاد اودنا گری کے نام سے بچن پال ایک راجپوت نے آج سے ڈھائی ہزار سال پیشتر رکھی تھی اسکے بعد سنہ ۱۲۰ء مین رانی گجران نے جو راجہ رسالو مشہور فرمانروائے سیال کوٹ کی بہو تھی از سرنو آباد کیا پھر تیسری بار اسکی بنیاد علی خان نے رکھی ممکن ہے کہ یہ وہی اللہ خانہ بادشاہ رہا ہو جسکو بروایت ڈاکٹر اشٹائین بحوالہ راج ترنگنی مابین سنہ ۲۷۰ھ (سنہ ۸۸۳ء) و سنہ ۲۹۰ھ (سنہ ۹۰۲ء) کے شنکر درمن والی کشمیر نے

ممتاز و مامور کیا۔ میر صاحب نے بکمال امتنان اس سرفرازی و تعین خدمت کی تاریخ لکھی ؎

مرا از جناب خلافت عطا شد ۔۔۔ ز روئے کرم خدمت عیش افزا
خرد گفت تاریخ تفویض خدمت ۔۔۔ سوانح نگاری گجرات زیبا
(۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء))

شکست دی اور شہر کو درہم و برہم کر ڈالا تھا۔

موجودہ شہر اسی پرانے موقع پر آباد ہے جہاں دو شہر یکے بعد دیگرے بسے رہے ہیں۔ سر الیگزنڈر کننگھم کا گمان ہے کہ اسی کے دوسرے شہر کو منگولیوں (توارنیوں) نے ۷۰۳ھ (۱۳۰۳ء) میں بعہد علاء الدین خلجی اپنے حملوں سے تباہ کر دیا تھا۔ پھر دو سو برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد شیر شاہ نے بھی قطعات متصلہ و قرب و جوار پر نظر عنایت ڈالی اور توجہ فرمائی۔ موجودہ شہر کی تاسیس اغلباً اکبر بادشاہ کے زمانہ میں ہوئی اور اگرچہ اسکی ہر طرف جاٹوں کی آبادی و جمعیت تھی لیکن اس کی محافظ فوج سب سے پہلے گوجروں کی متعین ہوئی اور اسی مناسبت سے "گجرات اکبر آباد" نام رکھا گیا۔ مغلوں کے بعد یہ مقام مقرب خان حاکم راول پنڈی کے قبضہ میں پچیس سال تک رہا۔ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۵ء) میں سکھوں کے اور ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں انگریزوں کے تصرف میں آگیا۔

کشمیر سے تجارت اور میوہ جات خشک وغیرہ کی درآمد کے اعتبار سے میر عبد الجلیل کے زمانہ تک گجرات ایک قابل لحاظ مقام تھا۔ یہاں کے موروثی قانون گویان کے خاندان میں انتظامات مالی کے جو رجسٹر یا کاغذات موجود ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ گجرات ایک سرکار یا ضلع کا دار الصدر تھا۔ جس میں ۲۵۹۲ دیہات شامل تھے اور جس کی مالگذاری سولہ لاکھ تھی۔ اکبر بادشاہ نے ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں سعید عبد القاسم کو گجرات بطور "تیول" یعنی بشروط بخدمت و امداد بوقت جنگ دیا تھا۔

میر عبد الجلیل ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۱ء) سے ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) تک گجرات میں بخشی و وقائع نویس رہے تھے۔

خاص قصبہ اور اسکے قرب و جوار کے مقامات میں عہد مغلیہ کی بہت سی یادگاریں ابتک باقی ہیں۔ اکبر کا بنوایا ہوا ایک قلعہ مع ایک حمام کے وسط شہر میں ہے پیر شاہ دولہ رح کی درگاہ قصبہ کے شمال میں ہے اور شہر کا وہ حصہ اور دروازہ آپ ہی کے نام نامی سے موسوم اور مشہور ہے۔

جہانگیر و شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانہ میں گجرات (یا چھوٹی گجرات) ایک مشہور ولی اللہ پیر شاہ دولا دریائی کا مسکن و قیام گاہ تھا۔ اسی وجہ سے ان بزرگ کے نام نامی کے ساتھ شہرت و نسبت پا گیا۔ میر غلام علی نے سرو آزاد میں شاہ دولا لکھا ہے مگر تحقیق اور صحیح یہی ہے کہ آپ شاہ دولہ یا دولت تھے، شاہان لودی کے پوتے۔ آپ کی فتوحات غیبی اور بے اندازہ مصارف کی نسبت عجیب و غریب

بعد حصول خدمت دسجحہ سال مذکور مین دکن سے سیدھے بلگرام تشریف لائے اور وہان سے محرم سنہ ۱۱۳۰ھ (جون ۱۷۱۸ء) مین گجرات کی طرف روانہ ہوئے۔ میر طفیل محمد کو اپنے ہمراہ چلنے کی تکلیف دی۔ انھون نے میر سید مبارک محدث سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ آپنے پہلے تامل کیا پھر اجازت دیدی۔ اُن کی معیّت مین میر عبد الجلیل غرہ ربیع الاول سنہ ۱۱۳۰ھ (۲۷ جولائی ۱۷۱۸ء) کو وارد گجرات ہوئے اور اپنی خدمات کا جائزہ لیا۔ چار برس کے قریب اُن دونون خدمتون کو نہایت دیانت و استقلال کے ساتھ انجام دیا۔

اقوال منقول ہین۔ مگر اس قدر اہل تاریخ کو بھی تسلیم ہے کہ آپ کے مریدین اور معتقدین سے نذر و نیاز مین زر و مال کثیر آتا تھا اور وہ سب شہر اور اطراف شہر کی زیب و زینت مین صرف ہوتا تھا۔ مزید برآن پرانے کھنڈرون کے متعلق بھی آپ کو علم و وقوف حاصل تھا۔ جہان سے آپ مصالح (مسالہ) اور سنگ و خشت نکلوا لیتے اور اس سے نہایت مضبوط اور کارآمد رفاہ عام کے کام تیار کراتے تھے۔ گجرات کے متصل ایک تیز رو نالہ پر آپنے ایک شاندار محرابی رہگذر (معبر) بنوایا تھا جو اب تک محفوظ اور اچھی حالت مین ہے۔ آپ نے بہت سے پل ندی نالون پر گجرات و سیالکوٹ و گوجرانوالہ کے علاقون مین بنوائے تھے۔ تالاب کھدوائے۔ مساجد تعمیر کرائی تھین سنہ ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۶ء) مین رحلت فرمائی۔ آپکے سجادہ نشین اور خلیفہ بھون شاہ نے آپ کا مزار سنہ ۱۱۳۲ھ (۱۷۱۹ء) مین تعمیر کرایا۔ سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۶ء) مین فرش کو بلند کرکے از سر نو بنوایا گیا۔ پھر سنہ ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) مین اُس کی مکمل اور بخوبی مرمت ہو گئی۔

"شاہ دولہ کے چوہے" "آپ کی کرامات جاریہ مین شمار ہوتے ہین۔ پنجاب مین ان کا دخل اور وجود ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ یہ گاڑیون کے ساتھ ساتھ بازارون مین گھومتے پھرتے دیکھے جاتے ہین۔ اگر بچہ ہے تو کسی آدمی کی گود مین نظر آئے گا۔ ان کا سر چھوٹا اور گول، کان لمبے لمبے شکل و صورت چوہے کی سی ہوتی ہے۔ قریب آکر تھپکیان دیتے اور ایک انداز سے مسکرا کر مسکوک ابیض کے لئے ہاتھ بڑھا دیتے ہین۔ مانگنے کھانے کی یہ روش و طریقے ان کو ان کے مالک سکھاتے ہین جو ان بے شعور و بے زبان، انسان نما جانورون کو اپنا ذریعہ معاش بناتے ہین۔ امپریل گزٹیر لکھتا ہے کہ اس درگاہ کی شہرت سارے صوبہ مین بلکہ باہر بھی بہت دور دور تک ہے۔ یہ مقام خلاف سرشت انسانی یا مسخ شدہ آدمیون کی ایک تعداد کثیر کا مسکن و مرجع ہے جنکے سر چپٹے اور عقل ضعیف ہوتی ہے۔ "یہ شاہ دولا کے چوہے کو دور و دراز مقامات اور مسافت بعیدہ سے لائے جاتے ہین۔ خود والدین اپنی اولاد کو اس مامن حالی اور اسکے احول کے مناسب حال بنانے کیلئے اپنے بچونکے سر دبا دیتے ہین

عزل خدمت و باز تقرر

واقعۂ معزولی ۱۱۱۶ھ مین پیش آیا اور اسی سال ماہ جمادی الاول دسمبر ۱۷۰۴ء مین میر صاحب بلگرام واپس آ گئے۔ کسی سانحہ نگار نے وجہ عزل نہین لکھی کہ آیا معزولی کسی الزام پر مبنی تھی یا اُن اسباب پر جن کو موجودہ ملکی و سیاسی اصطلاحات مین "بغرض نفع سرکار" یا "انتظاماً" کہا جاتا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ کسی جرم یا خطا کا تعلق اس حکم سے نہ تھا۔ کیونکہ مرزا یار علی بیگ نے اس مرتبہ بھی غائبانہ قدردانی کی اور اُسی سال ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۵ء) پھر متعدد خدمات یعنی بخشی گری و وقائع نگاری و سوانح نویسی سرکار بھکر و سرکار سیوستان (ملک سندھ) کی بارگاہ خلد مکان سے ان کے متعلق کرائے

۵۲۰۵ بکر یا بھکر دریائے انڈس (سندھ) مین ایک قلعہ بند جزیرہ (ضلع سکھر، ملک سندھ، صوبہ بمبئی) مین مابین شہر سکھر و روہری کے واقع ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین مردم شماری ۲ ۸۰۶ تھی مگر روز بروز کم ہوتی جاتی اور ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔

بھکر ایک سفید پتھر کی پہاڑی پر آباد ہے جو شکل مین بیضاوی، آٹھ سو گز لمبی اور تین سو گز چوڑی اور تقریباً پچیس فٹ بلند ہوگی۔ دریائے جنیل جو بھکر کو سکھر کے ساحل سے جدا کرتا ہے سو گز سے زیادہ چوڑا نہ ہوگا بلکہ جب طغیانی پر نہین ہوتا تو وسط مین صرف پندرہ فیٹ عمیق رہجاتا ہے۔ لیکن شرقی چینل جو اسکو روہری سے علٰحدہ کرتا ہے بہت زیادہ چوڑا ہے یعنی جب دریا اپنے سب سے کم وسعت و عرض مین آجاتا ہے تو قریب چار سو گز کے چوڑا اور وسط مین ساٹھ گز گہرا رہجاتا ہے۔ سرکاری تار برقی کی لائن جو روہری سے سکھر کو جاتی ہے جزیرہ بھکر مین ہو کر دریا کو عبور کرتی ہے۔ ریلوے اُس پُل پر ہو کر جو زیادہ چوڑی شاخ پر بنایا گیا ہے گزرتی ہے یہ لانسڈون برج **Lansdowne Bridge** جو بھکر ہو کر انڈس کو عبور کرتا ہے سنہ ۱۸۸۹ء مین اُنتیس لاکھ سے زائد صرف سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا سب سے بڑا چشمہ یا محراب جو مابین بھکر اور روہری کے ہے آٹھ سو تینتیس فیٹ کا ہوگا۔ بھکر سے کسی قدر شمال کو ایک چھوٹا سا جزیرہ "خواجہ خضر" یا "جند (زندہ) پیر" کے نام کا ہے۔ درمیان مین ایک تنگ آبنائے ہے جس پر بہ آسانی گزار ہو سکتا ہے۔ اس جزیرہ مین ایک نہایت متبرک مزار ہے بھکر کے جنوب مین ایک جزیرہ ہے جو "سادہ بیلا" کہلاتا ہے اور برگ و بار و سبزہ و گل سے ڈھکا ہوا ہے اس مین بہت سے متبرک مقامات اور معابد ہین۔ تقریباً پورے جزیرہ بھکر پر قلعہ پھیلا ہے۔ دیوارین

اور سندِ سلطانی حاصل کرکے ایک قاصد اجیر کے ہاتھ روانہ بگرام کی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے دو خدمتون کے عوض چند خدمات آپکے لئے حاصل کی ہین بہتر ہے کہ سفر دکن کی زحمت نہ اُٹھایئے بلکہ وہین سے براہ راست مستقرِ خدمت کو تشریف لے جایئے"۔ اُسی سند کی ایک نقل

دوہری ہین جنمین سے لیکر پینتیس ۳۵ فٹ تک بلند ہونگی بہت سے بُرج ہین۔ یہ جزوًا پختہ اور جزوًا خام اینٹ سے بنائے گئے ہین اور مُدوّخدار یا تیر کش ہین جنمین راہ گریز رکھی جاتی ہے۔ اسمین دو پھاٹک ہین ایک مشرق مین روہڑی کی جانب، دوسرا غرب مین سکھر کے رُخ۔ دریا سے قلعہ کا نظارہ نہایت دلکش اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب اسکی دیوارین مرمت طلب ہوگئی ہین۔ آئین اکبری مین لکھا ہے "سرکار بھکر، پرگنہ بھکر قلعہ مستحکم دارد" دوسرے موقع پر یہ تحریر ہے کہ "بھکر گزین دژ ہست و آن را درکہن نامہا منصورہ نوشتہ۔ ہر ششش دریا یکتا ئی گزیدہ از تہ او گذرد۔ دو حصہ از جانب جنوب قلعہ دیک بخش از شمال"۔

اگلے زمانہ مین اپنے موقع اور جگہہ کی تنہائی کی وجہ سے بھکر ایک زبردست حصن اور اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ اسکی تاریخ بہت سے مسلسل نزاعات اور پیہم مجادلات کا نشان دیتی ہے۔ سنہ ۷۲۷ھ (سنہ ۱۳۲۷ع) مین جب سندھ سلطنت دہلی کا ایک جزو تھا تو بھکر ایک مشہور، اہم اور قابل لحاظ و توجہ مقام شمار ہوتا تھا جسکے سلطان محمد بن تغلق کو نہایت معتمد اور معتبر سردار اسکی حکمرانی کے لئے بھیجنا پڑے تھے۔ شاہان سما کے عہد مین اس قلعہ پر چند بار نقل و دخل ہوا، کبھی اُن کا قبضہ ہوجاتا اور کبھی سلاطین دہلی کا رہتا۔ شاہ بیگ ارغون کے زمانہ مین بھکر کی قلعہ بندی و تحصین ازسرنو بالتقریباً کُل کی گئی۔ قلعہ اَلور کو توڑکر اس کا تمام سامان قلعہ بھکر کی تعمیر و درستی کے کام مین لایا گیا۔ سنہ ۹۸۱ھ (سنہ ۱۵۷۳ع) مین جلال الدین اکبر نے اس قلعہ کو فتح کیا اور سنہ ۹۸۲ھ (سنہ ۱۵۷۴ع) مین یہ مقام کیشو خان کے حوالہ کردیا گیا تھا جو شاہنشاہ اکبر کا ملازم تھا۔ سنہ ۱۱۴۹ھ (سنہ ۱۷۳۶ع) مین یہ قلعہ کلہوڑہ سلاطین کے قبضہ مین آیا اور کچھ دن بعد افاغنہ کے ہاتھ مین۔ افاغنہ کے قبضہ سے خیرپور کے میر صاحب نے چھینا تھا۔ میر صاحبان سے لڑکر انگریزون نے سنہ ۱۸۴۳ع مین فتح کیا۔

بھکر صوبہ ملتان مین ایک سرکار تھی۔ یہان اکبر بادشاہ نے سکّہ مسی کی ٹکسال قائم کی تھی۔ یہان کے دام اب نہایت نایاب ہین۔ صرف عجائب خانہ کلکتہ مین ایک موجود ہے۔ معموراً دام اکبری کا نقشہ یہ ہوتا تھا، وزن مین تولہ بھر، مربع جیسے دلی کا پیسا۔ ایک طرف معمولی شان سے بادشاہ کا نام۔ دوسری طرف نہایت خوش قلم خط ثلث مین "دام"۔ روپیے کے چالیس دام تانبے کے قرار دے گئے تھے۔ مقامی حالات کی نسبت ابو الفضل لکھتا ہے کہ "باران کم شود و میوہ گزین"۔

بھکر مین سرکار برطانیہ کا سلاح خانہ بھی مہم افغانستان و جنگ سندھ کے زمانہ مین رہا ہے

۳۰۶ سیوستان اب سہوان یا ایک ولی اللہ کا آرامگاہ اور مرجع خلائق ہونے کے سبب سے

دوسرے قاصد کی معرفت بھکر وسیوستان بھی بھیج دی - وہان کی رعایا اور اہل علاقہ کو میر عبدالجلیل کے تقرر اور خدمات پر سرفراز ہونے کا اعلام واعلان کرادیا۔ اتفاقاً میرزا صاحب کا قاصد جو میر کے پاس بلگرام سند لئے جاتا تھا اثنائے راہ مین مارا گیا جب میعاد کو بہت زمانہ گزر گیا اور ان کو اسکی اطلاع پہونچی تو مثنے سند مرتب کراکے پھر بلگرام بھیج دی۔

سُہوان شریف" کہلاتا ہے - صاحب جامع التواریخ نے سہوان کو سیوہان لکھا ہے۔ سہوان صوبہ بمبئی ملک سندھ مین ایک جدید قائم شدہ ضلع لارکانہ مین ایک حصہ ضلع کا صدر مقام ہے جسمین تعلقہ جات دادو وجوہی دسہوان شامل ہین قصبہ سہوان شمالی ومغربی ریلوے کا اسٹیشن اور اس شاہراہ پر واقع ہے جو کوٹری سے شکارپور کو لارکانہ ہوکر جاتی ہے - کوٹری سے شمال ومغرب مین ۸۴ میل پر اور لارکانہ کے جنوبی ومغربی گوشہ مین ۹۵ میل پر ہوگا۔ اس کی بلندی سطح بحر سے اکیسوتیرہ فیٹ ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے شمار کے مطابق یہان سواپانچ ہزار نفوس کی آبادی تھی لیکن جیساکہ تمام پرانے مسلمان قصبات کی حالت ہے سنہ ۱۹۲۱ء مین صرف چارہزار چارسو تیئیس (۴۴۲۳) رہ گئی۔

دریائے سندھ کسی وقت اس قصبہ کے قریب بہتا تھا اب بالکل علیحدہ اور دور ہوگیا ہے سہوان سے چند میل دکن کی جانب لکّی (لکھی) پہاڑیان بچبار کی ختم ہوجاتی ہین جس سے اس تعلقہ اور قصبہ کی ایک خاص ہیئت بنگئی ہے مسلمان باشندے زیادہ تر مچھلی کے شکار مین مصروف رہتے ہین اور ہندو تجارت مین - یہان کے باشندگان کی ایک بڑی جماعت پیشہ ور گداگرون کی ہے جنکی بسر اوقات محض ان زائرین ومعتقدین کی نذر ونیاز سے ہوتی ہے جو مخدوم پیر لعل شاہ باز کی درگاہ پر گذرتی ہین۔

ان بزرگ کا مقبرہ مربع ہے جو اور عمارات سے گھرا ہوا ہے - اسکے اوپر گنبد اور قندیل ہے ۷۵۷ھ (سنہ ۱۳۵۶ء) مین تعمیر ہوا تھا۔ اس مین خوشنما مینا کار کھپرے اور نہایت نفیس عربی کتبے لگے ہین مرزا جانی بیگ حکمران ٹھٹھہ نے جو ترخان خاندان کا مایۂ افتخار تھا حضرت مخدوم کی یادگار مین ایک رفیع الشان گنبد تعمیر کرایا - تیاری وتکمیل کی نوبت سنہ ۱۰۴۹ھ (سنہ ۱۶۳۹ء) مین پہونچی - تال پور کے میر صاحب کرم علی خان نے پھاٹک اور کٹہرہ پر چاندی کے پتر چڑھوائے اور گنبد پر چاندی کے کنگرے لگوائے۔

مولانا غیاث الدین محمد اپنی مشہور کتاب اللغات مین لکھتے ہین کہ "لال شہباز" صاحب کمال درویش تھے - اکثر قلندر ان کے ساتھ اعتقاد تمام رکھتے اور بھنگ پیتے وقت ان کو یاد کرلیتے ہین"۔

مخدوم کی نسبت میر غلام علی آزاد مآثر الکرام مین خود اپنا تجربہ اور عالم رویا کا مشاہدہ نقل کرتے ہین نیز یہ کہ نام نامی عثمان تھا۔ مرند (تبریز کے ایک قریہ) کے رہنے والے تھے - اپنے ملک مین بابا ابراہیم

اِس مژدہ تقرر کے پہونچنے پر میر صاحب جمادی الاول سنہ ۱۱۷۱ھ (اگست سنہ ۱۷۵۷ء) مین راہگرائے ملک سندھ ہوئے ۲۴ر رجب سنہ ۱۱۷۱ھ (۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۷۵۷ء) کو سواد بھکر مین ان کے قدم پہونچے اور اپنی مسند خدمت پر متمکن ہوئے میر عبدالجلیل سالہا سال تک دیانت و امانت کے ساتھ ان عہدون کا کام انجام دیتے رہے خود بھکر مین نشست اختیار کی۔ اپنے داماد سید محمد اشرف کو

مرید شیخ جمال مجرد کے مرید ہوئے تھے۔ ہندوستان آئے تو شیخ فرید گنج شکر شیخ الاسلام ناصر الدین زکریا اور شیخ صدرالدین عارف کی خدمت مین رہکر فیض اتم پایا۔ قطب دین اور بارہ سید بھی کہلاتے تھے نسب شریف تیرہ واسطہ سے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے۔ شاہجہان نامہ و تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) مین آپکے حالات تفصیلاً مرقوم ہین۔ مولانا محبعلی تتوی اور صاحب تذکرہ مشائخ ہند نے بھی نقل کئے ہین۔ ۲۱ر شعبان معظم سنہ ۶۳ھ (۲۰ر فروری سنہ ۱۲۷۵ء) کو وفات پائی۔

یہان کی ایک درگاہ اور قابل ذکر ہے۔ یہ شیخ جمعہ علیہ الرحمہ کا روضہ ہے جو برلب دریائے سندھ واقع ہے۔

صناوید سلف مین سہوان کا مشہور قلعہ ہے جس کی تاسیس و تعمیر اسکندر مقدونی سے منسوب ہے یہ ایک انسی یا نوّے فیٹ بلند مصنوعی ٹیلہ ہے جسکے اوپر پہونچکر طول ڈیڑھ ہزار اور عرض آٹھ سو قدم پایا جاتا ہے۔ اب تک شکستہ و منہدم دیوارون سے گھرا ہوا ہے۔ اسکے اندر ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن اور ٹھیکرے منتشر و متفرق پڑے ہین۔ ٹیلہ بظاہر دست صنعت کی کاریگری نظر آتا ہے بہت سے برجون اور منارون کے نشانات نمایان ہین حصار و قلعہ نہایت بے مرمت ہو رہا ہے۔ قلعہ کے نیچے عیسائیون کا پرانا گورستان ہے جس مین چند قبرین اور تاریخین انیسوین صدی مسیحی کے آغاز کی پائی جاتی ہین۔ درحقیقت سہوان ایک نہایت قدیم جگہ ہے۔ روایات سے پایا جاتا ہے کہ قصبہ کا وجود اُس وقت بھی تھا جبکہ سنہ ۹۳ھ (سنہ ۷۱۱ء) مین سندھ پر مسلمانون کا پہلا حملہ محمد بن قاسم ثقفی کے زیر قیادت ہوا۔ یہ وہی مقام خیال کیا جاتا ہے جو نیرون کوٹ کی فتح کے بعد اُن کے قبضہ مین آیا تھا نیرون کوٹ اب حیدرآباد کہلاتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ مغربی کا بھی سنہ ۷۳۴ھ (سنہ ۱۳۳۳ء) مین ان اطراف سے گذر ہوا تھا۔

باہر جانے والی اشیائے تجارت مین گیہون اور چاول ہے۔ مقامی تجارت خاص کر کپڑے اور غلہ کی ہے۔ دستکاری مین دریان، موٹے کپڑے اور ظروف سفالین داخل ہین۔ مُہر کندہ کرنے کا ہنر جس کا رواج پہلے بہت زیادہ تھا، اب تقریباً نابود ہو گیا ہے۔ سندھ کے اور مقامات کی طرح سہوان مین بھی موسم گرما بہت سخت گزرتا ہے۔ سالانہ بارش کا اوسط چھ دو پانچ کے مابین ہے۔ ان اطراف مین مسلمانون کی آبادی پچاسی فیصد ہے اور چورانوے فیصد اشخاص سندھی زبان بولتے ہین

سیوستان مین نائب مقرر کر کے بھیج دیا جب محمد اشرف کو وطن آنے کی رخصت دی تو سید کرم اللہ اپنے برادر عم زاد کو نیابت سیوستان کے لئے روانہ کیا۔ سید کرم اللہ بڑے ذی علم اور ذی ہوش بزرگ تھے۔ ایک زمانہ تک بڑی نیکنامی و خوش انتظامی کے ساتھ بخشی گری و سوانح نگاری سرکار سیوستان کا کام ان کی نیابت مین کرتے رہے۔ انھون نے اپنے اعمال کے بہت سے نشانات اور اچھے اچھے کام یادگار چھوڑے تھے۔ درگاہ شیخ جمعہ کے متصل، برلب دریاے سندھ، حویلی سوانح نگاری کے پہلو مین، ایک رفیع الشان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔

عہد اورنگ زیب عالمگیر مین سیوستان کی سرکار صوبہ ٹھٹھہ (برہمن آباد) مین داخل تھی آئین اکبری مین تحریر ہے کہ "حویلی سیوستان قلعہ مستحکم دارد"..... "نزدیک سہوان بزرگ کولا لمبیت درانداز دو روزہ راہ آن را منچور گویند بر فراز آب زمینہا ساختہ بر آن ماہی گیران زندگی بسر برند" اُس وقت سیوی یا سیہوان (سرکار) صوبہ ملتان کے متعلق تھا۔

۱۸۷۶ء سنہ ۱۸۷۶ء مین جو گزیٹیر محکمہ سرکار انگریزی مرتب و طبع کیا گیا تھا اور جس کو ماضی بعید کے قریب کی تاریخ کہنا چاہیے اس مقام کی نسبت لکھتا ہے۔

"قصبہ بھکر دریاے سندھ کے داہنے ساحل پر ایک شور زار میدان مین دریا سے نصف میل کے فاصلہ پر آباد ہے۔ پہاڑیون کا ایک سلسلہ حائل ہے جو شرق سے چلا آتا ہے۔ اسوقت یہ مقام نہایت خستہ و تباہ حال ہو رہا ہے ہر جگہ ویرانے اور ہر طرف کھنڈر نظر آتے ہین۔ البتہ کسی زمانہ مین بہت آباد اور بڑی جگہ رہی ہوگی۔ بہت سے مقابر، مساجد، برج اور منارے مع اپنی چینی کے تکلفات اور گلکاریون کے دکھائی پڑتے ہین اور میدان بھر مین پھیلے ہوئے ہین اور اسکی سابقہ عظمت و شان کا اظہار کرتے ہین۔ دریا کے کنارے کچھ زراعت بھی ہوتی ہے جسکے ساحل پر کھجور و خرما کے درخت برابر چلے گئے ہین اور نہایت خوشنما اور نظر فریب معلوم ہوتے ہین۔ آگے چل کر یعنی خشکی کے اندر بڑھ کر سارا ملک نہایت ویران اور شور زار بیابان ہے کہین کہین خار دار جنگل وغیرہ سے گھرا ہوا ہے۔

دریاے سندھ کی رفتار بھکر کے پاس فی گھنٹہ تین میل اور بہتر گز کی ہوگی۔

سردی مین انتہا کی سردی ہوتی ہے یعنی جنوری مین چوالیس ۴۴ درجہ پر پارہ پہونچ جاتا ہے گرمی مین گرمی بھی شدت کی پڑتی ہے۔"

خُلد مکان کی رحلت کے بعد اُن کو کوئی دشواری پیش نہین آئی۔ اُن کی قدر و منزلت تمام شاہزادگان اور ارکان سلطنت کے نقش خاطر ہو رہی تھی اپنے طبقات اور علاقہ ہاے خدمت مین وہ نہایت عزیز و مقبول ہو رہے تھے بھکّر سے نقل و حرکت کرنے کے بغیر زمانہ محمد شاہ بادشاہ تک، ہر عہد مین ارکان سریر خلافت استقلال خدمت کی سند ان کو روانہ کر دیتے تھے لیکن میر صاحب کی رنج کی تحریرات سے پایا جاتا ہے کہ انقلابات پیہم اور اہل دربار کی سازشون اور خفیہ و علانیہ ریشہ دوانیون سے اُن کو کسی وقت اطمینان و دلجمعی نصیب نہین ہوئی۔ اُن کے کان ہر وقت آستان خلافت کے اخبار پر لگے رہتے تھے۔ انکی بے اطمینانی و انتشار کا عکس اُن کے متوسلین اور اہل وطن پر بھی پڑتا تھا اور اُن کو بھی ہر وقت ان کے تعلقات و ملازمت کی جانب سے تشویش رہتی تھی۔ میر سید محمد کو ایک خط مین لکھتے ہین کہ برخوردار۔! بعد بند کردینے تمام خطوط اور ختم کردینے اس خط کے بائیس روز مین حضور پُر نور سے یہ خبر بھکّر پہونچی ہے کہ جو صاحب ' اشفاق الرسول نامی پیشتر سوانح نگار بھکّر کے تھے اور اس زمانہ مین پھر اسی خدمت کے متلاشی اور خواہان تھے بفضل الٰہی اس خدمت سے موقوف رہے۔ سوانح نگاری سہرند پر سفر ہو گئے ہین۔ بارے اس خبر سے فی الجملہ

حضرت خواجہ سید عبداللہ حسینی بھکری اور اُن کے والد خواجہ سید اسداللہ المعروف بہ سُلطان گُنج نشین بھکری کے انتساب و توطن سے اس خطہ کو شرف و برکت حاصل ہے۔ ہندو بھی بھکر کو معظم و قابل ادب مقام مانتے ہین۔ مولانا ظہیر الدین بکری یہان کے مشاہیر علماء سے تھے۔
شیخ ابوالفضل لکھتا ہے: "میان سیوی و بھکر بزرگ دشتے است، بہنگام تابستان سہ ماہ سموم وزد"... "خربزہ در بھکر و آن نواحی غیر از چلہ زمستان فراوان باشد"
مشہور افریقی سیاح ابن بطوطہ یہان ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) مین وارد ہوا تھا۔
۵۲۰ سید کرم اللہ، سواد سیال کوٹ مین ۲ محرم الحرام ۱۱۳۴ھ (۱۲ اکتوبر ۱۷۲۱ء) کو شہید ہوے اور حضرت امام الحق کی درگاہ مین فرش دروازہ کے متصل مدفون ہین۔ میر عبدالجلیل کے بڑے سمدھی یعنی سید عنایت اللہ کے باپ تھے۔ سندھ مین بہت سی نیک یادگارین چھوڑی تھین۔

اطمینانِ خاطر ہوگیا ہے لیکن اس دَور کی خدمات پر مطلقاً اعتماد نہیں ہے"۔
عارف لبیدؓ نے اسی حقیقت یعنی دنیا کی ناپائداری کے راز کو اپنی زبان میں آشکار کر دیا ہے۔

الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل وکل نعیمٍ لا محالۃ زائل

۵۲۰ قصبہ سرہند تحصیل فتح گڈھ یا سرہند، نظامت امرگڈھ، ریاست پٹیالہ ملک پنجاب میں واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن ہے۔ آبادی ۱۹۰۱ء میں ساڑھے پانچہزار نفوس کی تھی جو ۱۹۲۱ء میں چار ہزار چونسٹھ رہ گئی۔ سرہند کا املا حال کی ایجاد ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ 'سر' اور 'ہند' (سرہندوستان) سے مرکب ہے۔ یہ نام غالباً اس مقام کی خوبی اور موقع کی مناسبت کے لحاظ سے قرار دیا گیا ہوگا۔ عہد اسلام کے مورخین اسکو سِہرِنْد (بکسر سین مہملہ وسکون ہا و کسرہ 'را' و سکون نون و دال مہملہ) لکھتے اور پرانے جغرافیائی طریق اظہار پر اس شہر کا موقع مابین دہلی و لاہور شارع اعظم پر تحریر کرتے ہیں۔ اہل ہند اس کا تلفظ سَہرِنْد کرتے اور سہرند کے معنی "شیر کے جنگل" کے بتاتے ہیں۔ ایک روایت سے پایا جاتا ہے کہ اس کا بانی ساہر راؤ فرمانروائے لاہور تھا جو کرشن جی سے ایک سو چھیاسٹھ ویں (۱۶۶) پشت میں تھا۔ ابوالقاسم فرشتہ کا خیال ہے کہ یہی جگہ قلمرو جے پال کی شرقی حد تھی جو اُدہند کا برہمن بادشاہ تھا۔ مگر بعض مورخین نے اسی کو بھٹنڈا یا تبرہند سمجھا ہے۔ سلمانوں کی فتح کے بعد یہ دہلی کا ایک جزو ہوگیا تھا۔ سلطان رضیہ بنت شمس الدین التمش کے عہد میں ملک التونیہ والی سرہند نے بغاوت کی۔ ملکہ اُسکے مقابلہ کیلئے خود گئی۔ اُمرا نے غداری اور کافر نعمتی کی۔ ملک التونیہ سے مل گئے۔ امیر جمال الدین یاقوت حبشی (سالار لشکر رضیہ) کو مار ڈالا اور ملکہ کو گرفتار کرکے قلعہ سرہند میں قید کر دیا۔ اُسنے مجبورانہ ملک التونیہ سے نکاح کر لیا۔ کچھ زمانہ بعد فیروزشاہ ثالث نے اپنے مرشد جلال الدین بخاری کے ارشاد سے اسکی بنیاد از سرنو ڈالی۔ قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام فیروزآباد رکھا ۷۶۲ھ (۱۳۶۱ء) میں وہ ایک جدید سرکار (ضلع) کا صدر مقام ہوگیا جو پرانے 'شق' (ٹکڑے) سمانہ کو تقسیم کرکے بنائی گئی تھی۔ فیروزشاہ نے ایک نہر بھی کھدوائی تھی۔ یہ نہر اب بھی ہے جو قصبہ کے قریب سے گذرتی ہے۔ سرہند ہمیشہ ایک مضبوط اور اہم مقام سلطنت دہلی میں رہا ہے۔ ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں خضر خاں نے جو دہلی کا سب سے پہلا فرمانروا خاندان سادات سے تھا اپنے بیٹے "ملک الشرق" ملک مبارک کو فیروزپور و سرہند کا گورنر اور ملک سدھو نادرہ کو اُسکا نائب مقرر کیا۔ ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) میں ملک سدھو کو طغان رئیس اور دوسرے ترکوں نے قتل کر ڈالا لیکن زیرک خان گورنر سمانہ نے

عمل مکرر و بحالی خدمات

۱۱۲۹ھ عہد فرخ سیر بادشاہ مین نیرنگی قدرت الٰہی سے ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔ پرگنہ جھوئی اعمال (ضلع) بھکّر مین مصری کے ریزے جو چھوٹے چھوٹے اولون (ژالۂ خرد) کے برابر تھے ابر سے برسے ۔ اس حلاوۂ غیبی کے نزول سے ایک عالم کے کام و زبان شیرین ہو گئے سانحہ نادر و غریب تھا میر صاحب نے یہ رُباعی لکھ کر فرد وقائع مین مندرج و معروض کر کے بارگاہ شہنشاہی کو روانہ کر دی ہے

دوسرے سال اس بغاوت کا استیصال کر دیا ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) مین خضر خان نے سرہند مین سارنگ خان باغی کو شکست دی ۔ سرہند اُس وقت ملک سُلطان شاہ لودی کی گورنری کے تحت تھا ۔ یہی مقام ہے جہان ملک بہلول لُودی نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) مین سلطان کا خطاب اختیار کیا تھا ۔ سلاطین مغلیہ کی دولت مین سرہند نہایت سرسبز اور بارونق شہرون مین شمار ہوتا تھا اور "بلدۂ معظمہ" بارھوین صدی ہجری کے وسط تک لکھا جاتا تھا ۔ اسمین تین سو ساٹھ مساجد ، مقابر اور سرائین تھین ۔ چاہات تھے ۔ ریلوے اسٹیشن سے ایک میل چل کر اس کے کھنڈر شروع ہو جاتے اور کئی میل تک چلے جاتے ہین عہد اورنگ زیب عالمگیر مین صوبہ دہلی کے متعلق ایک سرکار تھا ۔ صاحب آئین اکبری لکھتا ہے "سہرند از نامور شہرہا ۔ دباغ حافظ رخنہ نشاط افزائے نظارگیان ۔ سرکار ۔ قلعہ دارد از خشت پختہ"

اسی قصبہ مین ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) مین بازید خان گورنر سرہند نے بابا فتح سنگھ اور زور آور سنگھ پسران گورو گوبند سنگھ کو دیوار مین اینٹون سے زندہ چنوا دیا تھا ۔ اُسی زمانہ سے یہ جگہ آج تک سکھون کی نظر مین مقہور و ملعون ہے اور "گُرو مار سرہند" سے موسوم ۔ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) مین بندا بیراگی نے سرہند پر تاخت کی اور بازید خان کو قتل کر ڈالا ۔ احمد شاہ دُرانی نے ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۹ء) مین زین خان کو صوبہ دار سرہند مقرر کیا مگر جمادی الاول ۱۱۷۷ھ (دسمبر ۱۷۶۳ء) مین سکھون نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور زین خان کو ایک موضع متصلہ منہیر مین قتل کر ڈالا ۔ پھر یہ شہر اور ملحقہ علاقہ راجہ الاسنگھ کے قبضہ مین آگیا ۔ قدیم ترین عمارات مین دو نفیس دو برُجے مقبرے ہین جو مرشد و مرید کے کہے جاتے ہین اور وضع و قطع سے چودھوین صدی عیسوی کی تعمیر معلوم ہوتے ہین ۔ بہلول لُودی کی لڑکی کا مقبرہ (جو ۹۰۳ھ مطابق ۱۴۹۷ء مین فوت ہوئی تھی) اب بھی موجود ہے ۔ شہر کے قریب ایک نہایت محترم و مقدس

فرخ سیر آن شہنشۂ بابرکات — چرخ از ادب او شدہ شیرین حرکات

در سندِ زمین عہدِ عشرت مہدش — بارید سحاب، ریزۂ قند و نبات

میر جملہ سمرقندی اُس زمانہ میں تمام مہمات سلطنت کے راتق وفاتق تھے حضور معلّٰے کے سوانح بھی انھیں کے متعلق تھے (بالآخر جمیع ممالک ہندوستان کے صدر الصدور ہو گئے تھے)، بمجرد ملاحظہ فرد وقائع بغیر اسکے کہ تحقیق و تفتیش کا حکم دیتے، خلاف واقع پر محمول کر کے میر جملہ نے اوائل ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں میر عبدالجلیل کو معزول کر دیا۔ میر صاحب نے

گورستان میں شاہ زمان، فرمانروائے کابل بھی دفن ہے

مسلمانانِ عالم کی نگاہ میں سرہند کی عظمت و حرمت اُس فرد فرید کی جائے ولادت اور اُس کا آخری راحت گاہ ہونے کی وجہ سے ہے جو علوم صوری و معنوی کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکا تھا اور جس نے حقائق و معارف الٰہیہ کے راز یگانہ و بیگانہ کے لئے آفتاب سے زیادہ روشن کر دیئے تھے۔ میری مراد مولانا شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد فاروقی رحمہما اللہ مجدد الف ثانی کی ذات اقدس سے ہے۔ اولیا اللہ میں حضرت شیخ فرید ثانی اور حضرت شیخ محمد معصوم کابلی اور علماء میں مولانا عبدالقادر سرہندی اور شعرا میں شیخ ناصر علی نے بھی اپنے مولد و موطن (سرہند) کا نام خوب روشن کیا۔

سرہند کے مفصل حالات خلیفہ محمد حسین کی دلچسپ تاریخ پٹیالہ (مطبوعہ ۱۸۷۸ء) اور مسٹر ایچیسن اے رنڈ کے گزٹیر ریاست ہائے پھولکیان (مطبوعہ ۱۹۰۸ء) میں مرقوم ہیں

۵۲۱ جتوئی، کے واقعہ کی طرح آج اُس کا موقع بھی محتاج تحقیق ہو گیا ہے۔ سرو آزاد (مطبوعہ رفاہ عام لاہور ۱۹۱۳ء) میں پرگنہ جتوئی از اعمال بھکر، لکھا ہے۔ مآثر الکرام (مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء) میں پرگنہ جتوئی از توابع سرکار بھکر، اور مفتاح التواریخ (مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۸۶۷ء) میں پرگنہ جتوئے از اعمال بھکر،

ہندوستان کے مکمل و ضخیم گزٹیر کے دیکھنے سے اس اقلیم میں جتوئی، نام کا کوئی پرگنہ پایا نہیں جاتا اگر کسی غیر معروف یا غیر معین قطعہ یعنی محض منسوب بہ جتوئی پرگنہ سے مراد ہو تو دو ڈھائی صدیوں کے عظیم انقلابات و تغیرات کے بعد وثوق کے ساتھ اب اُسکی حد بندی و تعیین دشوار ہے۔

جتوئی اگر صحیح مانا جائے تو اسکی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) جتوئی۔ بلوچیوں کا ایک خیل فرقہ

مستعجلانہ بھکر سے دار الخلافہ شاہجہان آباد[۲۱۲] کی جانب نقل و حرکت فرمائی۔ ۱۰؍رجب سنہ ۳ ج
فرخ شاہی (۲۸ دسمبر ۱۱۲۶ع) کو وہان پہونچے۔ اپنے لڑکے کو لکھتے ہین کہ "شد آمد[۲۱۳] این راہ دور و دراز کہ
در عرض چہار ماہ طے نمودہ شد تا کجا نویسد مفصل از زبانی پانڈے چنتا من واضح خواہد شد"
اس زمانہ مین دہلی کا قیام روح فرسا و جان گسل تھا۔ یہان کے گران مصارف اور کثیر اخراجات
سے سخت پریشانی کا سامنا رہا تاہم تسلّی دیتے ہین کہ "احوال قلت و گرانی شہر دہلی[۲۱۴] یقین کہ شنیدہ باشند"

حیدر آباد سندھ مین ہی جسکی بود و باش کا صدر مقام دارا پور، شکارپور سے بیس میل پورب کو ہے۔ اس علاقہ مین اعلیٰ درجہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ ذرائع آبپاشی متعدد ہین۔ یہ لوگ ریاست خیرپور و ضلع سکھر و سرحد سندھ بالائی تک پھیلے ہوئے ہین (۲) ایک موضع جتوئی تحصیل علی پور ضلع مظفر گڑھ صوبہ پنجاب مین ہے۔ اسکی بنیاد بابر بادشاہ کے عہد مین میر بجار خان نے ڈالی تھی۔ اصل مقام تو دریاے سندھ نے غرق و نابود کر دیا مگر اسی نام سے آبادی دوسری جگہ قایم ہے۔ یہ قصبہ کچھ روز تک ریاست بہاولپور کے متعلق رہا تھا پھر سکھون نے چھین لیا موقع پاکر جتوئی کے باشندون نے بغاوت کی اور بڑی دلیری و ہمت سے کام لیا۔ اس کو "شہر جتوئی" بھی لکھتے اور بولتے ہین۔

ایک تیسری صورت اور ہو سکتی ہے یعنی 'جوہی' جو سیوان کے متصل بلکہ مضافات سکھر مین، ضلع لاڑکانہ ملک سندھ مین ایک تعلقہ ہے۔ اس مین مسلمانون کی آبادی بہت زیادہ ہے اور یہان کی اراضی مین بہت سی قومین پائی جاتی ہین۔ بارش حسب حال ہو تو ایک ہی تخم ریزی سے جوار کی تین فصلین متواتر پیدا اور تیار ہوتی ہین۔

زیادہ صحیح اور قابل استناد جتوئی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ میر سید محمد نے اپنے پدر بزرگوار کے "عنایت نامہ سیزدہم" کے ذیل مین تحریر کیا ہے اور جسکو انگریزی مترجم نے Pergunnah of Jey-too-ee in Sircar Bukhir لکھا ہے۔ یہی جتوئی ہے جو بروایت آئین اکبری سرکار بھکر مین ایک پرگنہ تھا۔

[۲۱۵] قاضی عبد اللہ تورانی (فرخ سیر کا اُستاد) پہلے جہانگیر نگر ڈھاکہ کی قضا پر مامور تھا۔ فرخ سیر نے اسکو خانخانان میر جملہ کا منصب و خطاب دے کر اپنا ہمدم و ہمراز بنا لیا تھا۔ پھر صوبہ دار بہار بنا دیا گیا۔ سادات بارہہ کی ملالت و ناخوشی کے باعث پایہ تخت کو چھوڑ کر کچھ روز لاہور جا کر رہا تھا۔ محمد شاہ کے جلوس کے پہلے سال مین صدر الصدور مقرر ہوا۔ اسی سنہ جلوس یعنی ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ع) مین انتقال کیا۔ صدارت کل یا صدر الصدور کا عہدہ سلاطین اسلام کے زمانہ مین نہایت معزز و با اختیار تھا۔ جملہ امور دینی و اوقاف خیر اور جاگیرات مذہبی کا انصرام و انتظام اسی کی خدمات مین داخل تھا۔ وظائف خیر و انقطاعات و اراضی مدد معاش کے معاملات اور سادات و مشائخ اور فقرا و علما و فضلا کے تقاضا یا اسی کی معرفت فیصل ہوتے تھے۔

بے جگری (بے جاگیری ؟) و بے کاری موجب تشویش خاطر گردیدہ حق سبحانہ بہ فضل خود آسان گرداند ۔"

میر شیر علی افسوس اپنی کتاب آرائش محفل میں لکھتے ہیں کہ " تب میر مذکور خبر مسطور کی صداقت کے لئے وہاں کے قاضی مفتی بلکہ اکثر اشراف و ثقات کی مہروں سے ایک محضر کروا کر حضور میں لے آیا اور مورد الطاف ہو کر اسی خدمت پر پھر سرفراز ہوا ۔" محضر کا تیار کرانا اور اس کی ضرورت قرین قیاس ہے ۔ لیکن اس واقعہ کو نہ تو میر عبد الجلیل اپنے خطوط و حالات میں لکھتے ہیں نہ آزاد اور دیگر تذکرہ نویس اس کا کچھ حوالہ دیتے ہیں ان سب کی تحریرات کا ملخص تو یہی ہے کہ امیر الامرا سید حسین علی خان کی سعی و وساطت سے میر عبد الجلیل پھر اپنی خدمات پر بحال ہو گئے جسکی کسی قدر تفصیل نواب نامدار کے حالات و تعلقات کے ضمن میں ملے گی ۔ میر کا دعوے تو یہ ہے کہ

میر جملہ بڑا شاعر، صاحب دیوان تھا ۔

ص۲۱۲ دہلی کو بارھویں مرتبہ ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۹ء) میں شاہجہان نے از سر نو آباد کیا اور شاہجہان آباد نام رکھا تھا قلعہ کی بنیاد ۱۰۴۸ھ میں (۱۲ اپریل ۱۶۳۹ء کو) ڈالی گئی ساٹھ لاکھ روپیہ کے صرف سے قلعہ اور دیگر عمارات کی تعمیر ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں ختم ہوئی میر یحیی شاعر نے تاریخ لکھی ع شد شاہجہان آباد از شاہجہان آباد

ص۲۱۳ ۱۸۴۰ء کا پرانا گزیٹیر لکھتا ہے کہ بھکر کا قلعہ بند جزیرہ دریائے انڈس (سندھ) کے وسط میں واقع ہے ۔ سطح بحر (سمندر) سے اسکی بلندی تقریباً دو سو فٹ ہو گی پرانا راستہ فیروز پور ہو کر جانے کا تھا جسکی مسافت چار سو چالیس میل رہی ہو گی ۔ راستہ ستلج اور انڈس کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے ہو کر جاتا تھا ۔ یہ ایک پتلی سی گردن زمین کی ہے جو ان دونوں دریاؤں کے بیچ میں چلی گئی ہے اور صحرائے اعظم میں داخل ہے ۔ یہ حصہ کم سرسبز زمین کا ہے اور وہ بھی صحرا سے تین میل سے لے کر تیس میل کی چوڑائی میں ہو گا اوسطاً دس میل کے قریب مان لیجے لیکن بہت سے مقامات پر صحرا بالکل دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ آجاتا ہے اور اکثر قصبات و دیہات کو تباہ کر ڈالتا ہے ۔

اس کا مقابلہ زمانہ حال کی سہولتوں سے کیا ہو سکتا ہے اب ذرائع سفر متعدد اور نہایت آسان ہیں

پروانگی بحالی آمد چون الشان (امیر الامرا) و قطب الملک و بادشاہ بحال کردند دیگر جائے دم زدن نماند۔ باآن کہ بندہ ہرگز استدعائے بحالی این خدمت نہ کردہ بود امابر قسمت خود راضی باید ماشاء اللہ کان۔

میر صاحب نے شیخ محمد رضا بھکری کو اپنی نیابت پر مقرر فرمایا اور سوانح نگاری کی سند اُن کے پاس بھیج دی وہ اُس وقت بخشی و وقائع نگار بھکر کے تھے۔ بعد کو دفتر سوانح حضور سے معلوم ہوا کہ ماہ جمادی الاول ۱۱۳۲ھ میں بھکر و سیوستان میں میر صاحب کا عمل ہو گیا اور وہان کے سوانح کا "نلوہ" (پیکٹ) میر صاحب کی مُہر ثبت ہو کر حضور پُر نور میں پہونچا کچھ زمانہ بعد میر نے اپنے دوسرے داماد سید محمد نوح (پدر آزاد) کو بھکر و سیوستان روانہ کیا۔ وہ وہان سات سال تک نائب رہے۔

میر عبدالجلیل سندھ کے قیام و تعلق سے ہمیشہ پریشان و دل برداشتہ رہے۔ اپنے اعزہ و اہل وطن سے برابر شکایت ناسازی آب و ہوا کرتے اور لکھتے رہتے تھے کہ "راہ بنہایت دُور و دراز از خانہ تا سواد بھکر بہمہ جا

(۱) دریائے سندھ (۲) بہت سی پختہ سڑکین (۳) نارتھ ویسٹرن ریلوے (۴) حیدر آباد جودھپور کی لائن، جو سرحد کو جودھپور بیکانیر ریلوے سے ملاتی ہے اور اس طرح سندھ، راجپوتانہ و شرقی و وسطی ہندوستان و گجرات سے ملجاتا ہے۔

میر عبدالجلیل کے وقت مین بھی ہرکارے اور پیادے دہلی سے بھکر بائیس روز مین پہونچ جاتے تھے

۱۲۱۴ھ دہلی کی آبادی و بربادی کی طرح دہلی کی قحطون کی تاریخ بھی دلچسپ و طویل ہے۔ سب سے بڑا اور پہلا قحط جس کا تذکرہ حالات ماضیہ کے سلسلہ مین کیا جاتا ہے ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) مین بعہد محمد تغلق پڑا تھا جب آدمی کو آدمی کھاجاتا تھا اسکے بعد ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) مین شاہجہان کے وقت مین واقع ہوا پھر ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۱ء) مین جو اورنگ زیب کا ابتدائی زمانہ تھا یہ قحط بھی سخت تھا محمد شاہ کے وقت مین ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) مین قحط پڑا۔ آفت پر آفت یہ آئی کہ اسکے بعد ہی نادر شاہ کا حملہ ہوا پھر ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) اور ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء و ۱۷۸۵ء) مین قحط پڑے۔ انگریزون کی عملداری مین سب سے پہلے ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) مین قحط پڑا اسکے بعد کے قحط و خشک سالیان تقریباً اکثر اہل علم و خبرت کو معلوم ہین۔

میر عبدالجلیل جس (۱۱۲۸ھ والی) مصیبت و تکلیف کا ذکر کرتے ہین ظاہر ہے کہ اس گرانی نے بھی اس زمانہ کی سیاسیات و تجارت و اخلاق ملکیہ و باشندگان کی صحت و عافیت پر کتنا خراب اثر ڈالا ہوگا۔ یہ وہی گرانی تھی جسکے قبل و بعد کی فراوانی و فلاح کے اعداد و اخبار قلم زرین سے لکھے گئے ہین۔ شہنشاہ اکبر کے عہد مین آٹا روپیہ کا پانچ من اور گھی سوا دو روپیہ من فروخت ہوتا تھا اور ایک شخص کے اوقات بسر کرنے کیلئے صرف پانچ آنہ ماہوار کافی تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہد کے کاغذات سے پایا جاتا ہے کہ گھی چھ روپیہ فی من بکتا تھا اور گندم فی روپیہ ۳۹ سیر نخود ایک من انتیس سیر۔

در راہ خوف۔ ومن ہم از بودن اینجا نامحظوظ و دل کندہ، شب و روز درین فکر کہ بجمعیت از اینجا برآیم"

سنہ ۱۱۲۶ھ (سنہ ۱۷۱۴ء) یعنی اوائل عہد محمد فرخ سیر مین میر عبدالجلیل بھکر سے دہلی تشریف لائے اور بادشاہ کی ملازمت حاصل کی۔

سنہ ۱۱۳۰ھ (سنہ ۱۷۱۸ء) مین اپنی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی۔ استعفا منظور ہوا اور دربار شہنشاہی سے ان کے عہدے ان کے فرزند رشید میر سید محمد کے حوالہ و تفویض کر دیے گئے۔ میر سید محمد اپنے پدر بزرگوار کے حسب الطلب سند تقرر پا کر وطن سے ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۱۳۰ھ (۴ مارچ سنہ ۱۷۱۸ء) کو روانہ بھکر ہوئے۔ ۲۶ تاریخ (یعنی ۱۶ مارچ کو) قصبہ دانسہ پہونچے اور شاہجہان آباد سے آنیوالون کی زبانی سنا کہ نواب حسین علیخان دکن سے مراجعت کر کے سواد دہلی مین دائرہ رکھتے ہین۔ میر سید محمد نے ادھر کا رخ کیا۔ ۲۷ تاریخ کو شہر مین داخل ہوئے شیخ فرید کے کٹڑے مین اترے۔ ۲۸ کو سورج گرہن پڑا۔ ان کو خیال ہوا کہ ایسے منحوس دن مین میر صاحب "قبلہ حقیقی" کی ملازمت کیا حاصل کرین کل مبارکی" کے ساتھ جا کر حاصل کرین گے۔ ۲۹ کو بوقت چاشت یہ تو تھئیا سواری مین تھے کہ خود میر عبدالجلیل کٹڑہ مین سید محمد کی فرودگاہ پر تشریف لے آئے اور ان کو اپنے قدمون پر سر رکھ دینے کا شرف عطا فرمایا۔ دربار کے معمولی مراسم و آداب سے فارغ ہو کر میر سید محمد اپنی جائے خدمت پر

اس سے پیشتر کے نرخ و اعداد تو آج افسانہ و داستان معلوم ہوتے ہین اور تاریخ فرشتہ، تاریخ سالک المصابح، فتوحات فیروزشاہی آئین اکبری اور پرانے گزیٹون کو پڑھ کر تو انیسویں صدی کا انسان متحیر رہ جاتا ہے۔

فیروزشاہ کے عہد مین گیہون ۷ من، جو ۳۰ من، گھی ۳ سیر فروخت ہوتا تھا۔

محمد شاہ تغلق کے وقت مین گیہون ۱۰ من، جو دس پیسے من، گھی روپیہ کا چودہ سیر

علاءالدین خلجی کے زمانہ مین گیہون چھ آنہ من، جو ۱۰ من، شکر روپیہ کی ۲۲ سیر، گھی ایک روپیہ کا ۳۳ سیر پختہ، دودھ ایک روپیہ کا چھ من ملتا تھا۔

پرتھوی راج کے عہد مین گھی ایک روپیہ من پختہ بکتا تھا اور من بھی آج کل کے من سے بڑا تھا

غدر سے پہلے دہلی مین بڑے سے بڑا ہاتھی تین سو روپیہ مین ملتا تھا۔

چلے گئے خود کام کرنا شروع کیا اور سید محمد نوح کو وطن واپس بھیج دیا۔ میر سید محمد اپنے ماموں کی نیابت میں، میر غلام علی آزاد بھی سنہ ۱۱۴۳ھ (سنہ ۳۱-۱۷۳۰ء) سے سنہ ۱۱۴۵ھ (سنہ ۳۳-۱۷۳۲ء) تک وہاں کام کرتے رہے۔ یہ تعلقات یا بادشاہی خدمات جن کا سنہ ۱۱۱۶ھ (سنہ ۱۷۰۴ء) میں آغاز ہوا تھا چالیس سال قائم رہے۔ انقلاب روزگار سے نادر شاہ کے تسلط پر سنہ ۱۱۵۵ھ (سنہ ۱۷۴۲ء) میں اس دودمان کا آب و خور ملک سندھ سے اٹھ گیا اور کلیتاً قطع تعلق ہو گیا۔

باز آمد۔ وطن اور اہل وطن سے سولہ سال دور رہنے کے بعد میر عبدالجلیل سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۲۰-۱۷۱۹ء) میں بلگرام تشریف لائے، ایک سال کے قریب (بلکہ صرف دس ماہ) وہاں قیام و توقف فرمایا۔ بعض مصالح ذاتی اور اغراض سیاسی کی وجہ سے، نیز استحفاظ آیندہ کے خیال سے شاہجہان آباد کو چلے جانے اور اعلیٰ وموالی دربار کے قریب، اہل حل و عقد کی ہمسائگی میں دارالخلافہ میں موجود رہنے اور قیام کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔۵

بِكُلٍّ تَدَاوَيْنَا فَلَمْ يَشْفِ مَا بِنَا عَلٰى اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَيْرٌ مِّنَ الْبُعْدِ

[ہم سب کچھ کر کے دیکھ چکے کسی سے ہماری تشفی نہ ہوئی۔ تاہم دوری سے قرب مکانی بہتر ہے]

سنہ جلوس فرخ سیر سے لے کر شروع سنہ محمد شاہی تک یعنی گیارہ سال تک سفر حضر میں میر عبدالجلیل حاضر حضور رہے۔ صرف دس ماہ کیلئے ایکبار وطن کو تشریف لے گئے تھے سید حسین علی خان کا قضیۂ قتل ان کے عقب میں گذرا۔

دوران قیام شاہجہان آباد میں اُن کے نواسے میر غلام علی اور میر محمد یوسف مع ایک اور عزیز میر عظمت اللہ بے خبر کے سنہ ۱۱۳۴ھ (سنہ ۲۲-۱۷۲۱ء) میں میر عبدالجلیل کے پاس آئے نواسوں نے اُن کے سایۂ تربیت و شفقت میں دو سال بسر کئے جن علوم کی تحصیل کا سلسلہ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۲۰-۱۷۱۹ء) میں بزمانۂ قیام بلگرام چھیڑا تھا اُنکو دو برس یہاں رہکر انجام کو پہونچایا۔

---

۲۱۵ لشکر۔ فرودگاہ اُمرا۔ کیمپ

جاگیر اور اضافہ پنجاہی

میر عبدالجلیل کی خانگی تحریرات سے دو وسائل آمد کا اور پتہ چلتا ہی مگر وہ دونون غیر مستقل اور غیر معیّن صورت مین ہی ہین ایک جاگیر[۲۱۶] دوسرا اضافۂ پنجاہی

میر سیّد محمد کو ایک بار اُن کے والد بزرگوار نے لکھا تھا۔ کہ "بغیر جاگیر کے فقیر کا یہان سے چلنا دشوار ہے مین چاہتا تھا کہ نوّاب امیر الامرا سے جاگیر کے لئے التماس کرون کہ اس اثنا مین قضاء الٰہی سے نورالدین علی کا واقعہ ہوگیا۔ نورالدین، نواب صاحب کا بیس برس کا جوان بھتیجا تھا۔ اس قضیہ کے بعد ہی امیر الامرا کے لڑکے کا حادثہ ہوا۔ اسی وجہ سے جب تک کچھ روز اور، زمانۂ ماتم کے گذر نہ جائین التماس کا پیش کرنا موقوف ہے ... مجھے دو وقتہ سوار ہو کر جانا پڑتا ہے"

(۲) "اس زمانہ مین پرگنہ ملانوہ[۲۱۷] سرکار لکھنؤ سے دو لاکھ دام کا پروانہ وکالت خان کے تغیر سے فقیر کے

---

۲۱۶ جاگیر و جائے گیر: قطعۂ ملک جو تعین منصب کے وقت سرکار بادشاہی سے امرا کے لئے مخصوص و معین ہو جاتا تھا [یہ لفظ اسی معنی مین متاخرین اہل ایران کی تحریرات مین بھی پایا جاتا ہے]۔ (۲) اراضی کا کوئی عطیہ جسکو حکومت نے کسی شخص یا اہل خدمت کے لئے بطور انعام یا مجلد وہ کسی کارنمایان کے دیدیا ہو۔ اس قسم کی حوالگی اراضی یا حوالگی جمع اراضی، سرکار برطانیہ ہند میں بھی کسی قدر رائج ہے (۳)۔ جو جاگیر کسی خاص عہدہ یا مرتبہ کے متعلق ہوتی تھی جاگیر منصب کہلاتی تھی۔

سلاطین سلف کا دستور تھا کہ مساجد مین امام، صرف پرہیزگار اور متقی، ذی علم اور عالی خاندان لوگون کو مقرر کرتے اور اُن کے لئے مدد معاش اور جاگیرین معین کر دیتے تھے۔ ایسے فرامین پر صدر الصدور کی تصدیق و دستخط ہونا لازم تھا۔ اوراق تاریخ شاہد ہین کہ جاگیرون اور قطعات کا دینا اگر مسلمانون کی ایجاد نہین تو کم سے کم یہ دستور اُن مین بہت پرانا چلا آتا ہے۔ رحمت عالم نبی اکرم روحی فداہ نے حضرت زبیر اور حضرت ابو ثعلبہ الخشنی دو ممتاز اور خوش نظم صحابیون کو ایک ایک قطعہ اراضی جاگیر کے طور پر عطا فرمایا تھا۔ خلفائے ثلثہ اولین رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی بعض مصالح اور ضرورتون سے اپنے قرون ہمایون مین عربستان اور دیگر ممالک مفتوحہ مین جاگیرین مرحمت فرمائی تھین اس کا رواج بنی امیہ مین زیادہ اور بنی عباس مین کم کم قائم رہا۔ شاہان سلجوقی و ایوبی وغیرہ نے اسکو خوب ترقی دی تھی

۲۱۷ ملانوہ اب عموماً ملانوان لکھا جاتا ہے۔ یہ پرگنہ اب تحصیل بلگرام ضلع ہردوئی صوبہ اودھ سے متعلق ہے

نام دفتر دیوانی سے تیار ہو کر آگیا ہے۔ اسکی نقل قاضی القضاۃ کی مہر سے بھیجدی گئی ہے اور دو روز کے

اور اُس قدیم شارع پر واقع، جو دہلی سے بنارس کو دریائے گنگ کے شمال ہوتا ہوا جاتا ہے -

اکبر کے عہد مین اس پرگنہ مین ۸۳۰۲۲ بگیہ رقبہ زیر زراعت تھا مالگذاری ۳۵۹۸۱۳ دام تشخیص تھی تین سو سوار و دو ہزار پیادہ فوج رہتی تھی۔ بینس ٹھاکروں کا زمیندارانہ قبضہ تھا۔ آئین اکبری مین اسکا ذکر ہے یہی انتظام کم و بیش اورنگ زیب کے زمانہ تک قائم رہا۔ موجودہ پرگنہ کا رقبہ انگریزی پیمائش سے ۹۱۶۱۲ ایکڑ یا ۱۴۳ میل مربع ہے جس مین ۱۳۲ مواضع داخل ہین

مسلمانون کی آبادی خاص ملانوان مین سکندر لودی کے وقت سے ہے۔ قانون گویان و چودھریان پرگنہ کا صدر مقام تھا۔ شیر شاہ سوری جب ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) مین یہان آیا تھا تو شیخ عبدالقدوس کو دو سو بیگھہ اراضی معافی، بود و باش اور اقامت صوم و صلوٰۃ کی شرط پر دی تھی

سید سالار مسعود غازی بھی ۴۲۴ھ (۱۰۳۳ء) مین تشریف لائے تھے، ان کے بعض رفقا کے مزارات موجود ہین شاید اسی مناسبت سے یہ آبادی کبھی غازی پور کے نام سے موسوم تھی

شہنشاہ عالمگیر بھی ادہر سے گذرا ہے۔ ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) مین شتاب رائے دیوان بہادر شاہ ملانوہ کا چکلہ دار تھا۔

خاص قصبہ مین عہد کہن کی یادگار ہندوون کے پرانے منادر کے سوا، چند مساجد اور مزارات باقی ہین۔ دو امام باڑے بھی ہین۔ مخدوم شاہ کی درگاہ اور اُن کے تلمیذ رشید قاضی بھکاری کی مسجد سنگین نہایت خوشنما ہین درگاہ کے پیچھے کنکر کا چبوترہ ہے۔ اُس پر ہندوانہ ساخت کے آٹھ نازک ستون قائم ہین جنپر نہایت عمدہ گلکاری کی گئی ہے گنبد سادہ، پٹھانون کی وضع تعمیر کا ہے۔ اسی کے قریب ایک نہایت پرانا اور عمدہ کنوان کنکر کا بنا ہوا ہے۔ درگاہ کی نگہداشت و مرمت کیلئے معافی باقی ہے۔ حضرت مخدوم ایک جہانگیر و جہان گشت سیاح تھے۔ مصباح العاشقین لقب تھا۔ شیوخ کے قیام کی بنیاد ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) مین اُن کے قدم سے پڑی۔ شاگرد کا نام مصباح الاسلام عرف بھکاری تھا جنکو لودی سلطان کی طرف سے ۸۴۸ھ (۱۴۴۴ء) مین خدمت قضا سپرد ہوئی اور معافی ملی تھی۔

جامع مسجد عہد اکبری کی تعمیر، اب شکستہ حالت مین ہے۔ قلعہ کا ٹیلہ باقی ہے جس پر زراعت ہوتی ہے

قصبہ ملانوہ کسی وقت بڑا بارونق تھا۔ اہم سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۷۳ء مین ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کی چھاؤنی یہان قائم کی گئی تھی جو بعد کو کانپور چلی گئی۔ اودھ کے الحاق اور سرکار برطانیہ کے قبضہ کے بعد ۱۸۵۶ء مین ملانوہ اُس ضلع کا صدر مقام قرار پایا تھا، لیکن بعد غدر دفاتر ضلع، ہردوئی کو منتقل کر دیئے گئے۔

ملانوان کی آبادی ۱۹۲۱ء مین نو ہزار چھ سو پانچ (۹۶۰۵) تھی

ش۲۱۸ ۵ چالیس دام ساوی ایک روپیہ سکۂ رائجہ کے ہوتے تھے حقیقت یہ ہے کہ دام کی قیمت مختلف

تفاوت سے ایک خط قاضی محمد باقر کے نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔ جسکے ساتھ نقل پروانہ منسلک ہے بہتر ہے کہ آپ پروانہ کی نقل جو اس خط مین ملفوف ہے "قاضی جیو" کے پاس ملانوہ بھیج دین تاکہ مطابق اس نقل کے محصول جاگیر کا حساب "وکالت خان" کے اجارہ دار[۲۲۱] یا عامل[۲۲۲] سے کرکے اپنے خاطر نشین کرلین عنقریب "پروانہ درگاہی" مع پروانہ نواب عالی جناب جج دیوان وفوجدار[۲۲۳] لکھنؤ کے نام ہوگا" آپ کے پاس بھیجدونگا۔ "قاضی جیو" کا آدمی یہان موجود ہے اُن کی بحالی کا پروانہ بھی تیار ہو رہا ہے عنقریب مل جائے گا"

اوقات مین مختلف رہی ہے کبھی پیسہ کے برابر بھی مانا جاتا تھا

۲۱۹۔ دفتر دیوانی۔ "دفتر" بمعنے فہرست دکاغذات۔ یا کوئی سرکاری رپورٹ یا تحریر جو امور مالیہ عامہ کے متعلق ہو کیسی سرکاری کام یا کاروبار کی جگہ۔ نیز عملہ۔ "دیوان" (بالکسر حسب روایت غیاث اللغات۔ دیوان بہ یائے مجہول کا معرب ہی) لوگون کے جمع ہونے کی جگہ، دربار یا اجلاس شاہی امراء وملوک کی نشستگاہ۔ نیز۔ وزیر مال۔ صدر عہدہ دار ریاست محکمہ مال یا خزانہ کا اعلےٰ عہدہ دار۔ "دفتر دیوانی" مسلمانون کے عہد سلطنت مین بڑا ضروری محکمہ تھا تمام معاملات مالی اور انتظامی کا حساب وکتاب اسی دفتر کے متعلق رہتا تھا [زمانہ موجودہ مین لفظ "دیوانی" عموماً سول کی عدالتون، اور معاملات نقد وجنس، اور حقوق کے متعلق انصاف گستری کے لئے مستعمل ہوتا ہی] عالمگیر اپنے رقعات (کے نمبر ۲) مین لکھتا ہی کہ "دیوان را میان صاحب جاگیر ورعایا دعامل امین گفتہ اند دیوانی کردن آسان وامین بودن مشکل"۔

۲۲۰۔ قاضی القضاۃ یا اقضی القضاۃ۔ وہ قاضی جو اور قاضیون سے مرتبہ قضا مین بلند ہوتا تھا [قاضی بمعنی حکم دینے والا یا ادا کرنے والا مجسٹریٹ یا عہدہ دار دیوانی] عہد شاہی مین قاضی وہ جج ہوتا تھا جو شرع شریف اسلامی کے احکام وحدود کے مطابق انفصال خصومات کرتا تھا۔ محکمہ رجسٹری (تصدیق وتسجیل اسناد وثائق وقبالہ جات) بھی اُسیکے تحت مین تھا۔ سرکار برطانیہ نے قاضی القضاۃ یا ہر قاضی کا عہدہ اٹھا دیا ہی اعراب قاضی صرف نکاح پڑھاتا یا عقد وازدواج کو درج رجسٹر کرتا ہے۔ اُسکا کوئی سرکاری عہدہ یا کوئی اختیار واقتدار باقی نہین رہا ہے۔

۲۲۱۔ اجارہ دار۔ کسی زمین کا پٹہ دار یا ٹھیکہ دار۔ یا جسکو کلیتاً پورا اختیار دیدیا گیا ہو۔ اجارہ کسی گانون یا ضلع کی مالگزاری کا ٹھیکہ یا پٹہ۔ نیز رسوم یا کسی اور قسم کے مطالبہ خراج کی تحصیل جمع کرنے کا اختیار دینا مثلاً کسی معینہ فیس بلا الاونس یا ابواب کا وصول وجمع کرنا۔

(۳) "اب امید ہے کہ جاگیر کی آمدنی بھی وصول ہو گی تو سب مشکلین آسان ہو جائین گی۔
جاگیر کا اصل پروانہ دفتر معلےٰ سے درست ہو کر نواب قطب الملک کی مہر سے مکمل ہو کر مل گیا
ہے نقل پیشتر بھیج چکا ہون اصل پروانہ اب رستم وغیرہ سپاہیون کے بدست بھیجتا ہون۔ اس
پروانہ کو اس لئے روک رکھا تھا کہ نواب عالی جناب کا پروانہ بھی فوجدار و دیوان لکھنؤ کے نام مل
جاے تو اسی پروانہ درگاہی کے ساتھ ساتھ بھیجدون چونکہ ماہ ربیع الاول مین نواب صاحب
اکثر متوجہ خدمت گذاری جناب اقدس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم رہتے اور شب
و روز اسی کام مین صرف کرتے ہین، وقت نہ ملا کہ ان پروانون کی "روانگی" حاصل کر لیتا
اور سپاہیان معتمد گھر روانہ ہو رہے ہین اس لئے اصل پروانہ بھیج دیا گیا۔ اسکے متعاقب نواب کے
پروانے بھی حاصل کر کے بھیجدیے جائینگے۔ جب اصل پروانہ پہونچے تو کسی معتمد کے ہاتھ
پرگنہ ملانوہ کو بھیج دیجیے گا تاکہ قاضی محمد باقر[۲۲۴] حسب صوابدید اس کو چودھریون[۲۲۵] اور قانونگویان
کو دکھادین پھر جب واپس آجاے تو اپنے پاس حفاظت سے رکھئے گا۔ اس قدر توقف کرنا مناسب
ہے کہ پروانہ نواب عالی جناب کا دیوان لکھنؤ کے نام اس بارہ مین آپ کے پاس پہونچ جاے
اُسوقت لکھنؤ روانہ کیجیے گا تاکہ "پروانہ مطابق" لے آے۔ اس پروانہ کی نگہداشت مین احتیاط
کیجئے گا کہ "سند درگاہی" (بادشاہی) ہے اور غالب ہے کہ فوجدار کا گماشتہ، جاگیر وکالت خان

۲۲۲ عامل۔ کوئی انتظامی یا اہل قلم عہدہ دار تحصیل کنندہ مالگذاری۔ اُس زمانہ مین صیغۂ انتظام کا ایک ماتحت
اہلکار ہوتا تھا۔ سندھ مین یہ لفظ اب بھی عہدہ اہل قلم کیلئے بولا جاتا ہے۔
یہان ایک ضروری بات اور لکھدینا چاہتا ہون چکلہ داری یا چکلہ دار کا عہدہ عمل سرکار یا گورنمنٹ کا ایک جزو
ہوتا تھا۔ یہ عہدہ سب سے پہلے شاہجہان کے عہد ۱۰۳۷ تا ۱۰۶۸ھ ۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸ء قائم کیا گیا تھا۔ زمانہ حال کے ایک ضلع سے چکلہ
بڑا ہوتا تھا اور موجودہ زمانہ کی قسمت یا کمشنری سے چھوٹا۔ وہ افسر جو چکلہ دار کے بعد ہی اس کا ماتحت
ہوتا تھا عامل کہلاتا تھا۔ اسکی عملداری تقریبا اتنے ہی قطعۂ ملک پر ہوتی تھی جتنی آجکل ایک تحصیل ہوتی ہے
یہ عامل تحصیل وصول مالگذاری کا مستاجر بھی ہوتا تھا اور جعلا فہ اسکو تفویض ہوتا تھا اُسکا حاکم منتظم بھی۔
۲۲۳ فوجدار شاہی زمانہ مین ایک گورنر ماتحت ہوتا تھا اور جسقدر رقبہ ملک کا اُسکے حدود عمل

کے دستور پر متعرض احوال نہ ہوگا۔ ورنہ فوجدار کے نام پروانہ متعاقب پہونچا ہوا سمجھیے گا۔"

(۱) مراسلت کا وہ حصہ تو اب مہیا نہین ہی جس سے میر صاحب کی اس تصدیع و زحمت کا نتیجہ معلوم ہو سکے۔ اغلباً وہ کامیاب ہوئے ہون گے کیونکہ اُنکی ایک تحریر سے قیاس ہوتا ہی کہ وہ اس کام کے انصرام وانجام کے بدون دہلی سے نہ ہٹے ہون گے۔" بدون کار جاگیر برخاستن بندہ ازین جا نمی شود کہ کار جاگیر بر ضروری است و برآمدن جاگیر محال محض شدہ۔ عالمے درین خیال سرگردان است امید وارم کہ بفضل الٰہی کار جاگیر حقصورت گیرد۔" اس کے متعاقب اطلاع دیتے ہین "ماہم بعد دخیل شدن گماشتہ در جاگیر ملانوہ بوطن می رسیم"

خطوط میر عبدالجلیل (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) مین اُنکی تحریر کی تاریخین درج نہین ہین لیکن اگر تسلیم کر لیا جاے (جیسا کہ دعوی ہی) کہ انکے رقعات تاریخون کے سلسلہ سے مرتب کیے گئے ہین تو عنایت نامہ شمارہ ۱۷ سے پتہ چلتا ہی کہ جاگیر کے عنایت کرنے کا پروانہ ملنے پر میر صاحب نواب امیر الامراکا "خلوت خاص کے وقت، شکریہ و تسلیمات بجالائے اور اشعار عربی وفارسی وہندی جو شکر نواب مین لکھے تھی پڑھ کر سنائے تھے نواب نہایت محظوظ ہوئے اور بہت تحسین وآفرین کی۔

(۵) فرد اضافہ جا ہی کہ حضرت خلد مکان عالمگیر غفر اللہ کے خط خاص مین ہی دفتر مین تھی بڑی تلاش سے بجنسہ فقیر کو دستیاب ہوگئی۔ اس کوشش مین ہون کہ فرد مذکور کو منظور کرا کے

واختیار کے اندر ہوتا وہ فوجداری کہلاتا تھا نیز، کسی ضلع کی سپاہ فوجی کا منتظم و نگران۔ عصر موجود مین عدالت ہاے مجسٹریٹی وجہی صیغہ مواخذہ وبادافش جرائم پر "فوجداری" کا اطلاق رکھیا ہے۔

اسی ذیل مین مورخین لکھتے ہین کہ بہ پیمایش ممالک واراضی کے بعد شہنشاہ اکبر نے یہ انتظام کیا تھا کہ جس قدر زمین کا محصول ایک کرور تنکہ ہو وہ ایک معزز کے حوالہ کی جائے جو "کروری" کہلاتا تھا۔ کروری سے بالاتر کارکن "فوطہ دار" ہوتا تھا۔

۲۲۴ چودہری۔ عہد گزشتہ مین صیغہ مال کا ایک اہلکار ماتحت ہوتا تھا۔ نیز بعض اشخاص کو خطاب کے طور پر (ہم) دیا جاتا تھا۔ آجکل معمولاً کسی پیشہ یا حرفہ یا ذات کے مکھیا یا سرغنہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ الفنسٹن صاحب Elphinstone تاریخ مرتبہ کاویل Cowell کے ضمیمہ پنجم کے حاشیہ مین لکھتے ہین کہ

سیاہہ بحالی حاصل کرلون "۔

(۶) " اضافہ کے مقدمہ مین نواب امیر الامرا سے عرض کیا تھا منظور فرمایا اور اپنے پیشکار کو پروانگی دیدی ہی پیشکار مذکور نے حقیقت (رپورٹ) دفتر سے لکھالی ہی۔ غالب ہی کہ عنقریب فرد حقیقت دستخط اضافہ سے مزین ہو جائیگی۔ بعنایت الٰہی اس کام سے بھی خاطر جمع ہو جائے گی "۔

(۷) " حضرت خلد مکان انار اللہ برہانہ نے بابتہ 'تغیری گجرات' کے بندہ کی بیس کی کمی کو بحال فرماکر پچاس کا اضافہ دیا تھا چونکہ ایکماہ بعد عالمگیر خلد مکان کا واقعہ ہوگیا۔ سند دفاتر معلٰے مین مرتب نہین ہوئی تھی۔ اس زمانہ مین خلد مکان کی دستخطی فرد بجنسہٖ دستیاب ہوگئی تو مین نے نواب امیر الامرا کے ملاحظہ کے لئے پیش کی۔ از راہ توجہ منظور فرماکر حقیقت دفتر سے تحریری طلب کی۔ ۷ ربیع الآخر سنہ ۴ کو دستخط بحالی کمی و اضافہ پنجاہی کی بموجب دستخط عالمگیر کے، فرد حقیقت پر کر دئے۔ الحمد للہ کہ یہ عقدہ حل ہوگیا۔ اب انشاء اللہ چند روز مین تصدیق ایک سو پچاس عہد عالمگیری دفاتر معلٰے سے مرتب ہو کر آجائے گی "۔

ان وسائل کے سوا ایک غیر مستقل ذریعہ آمد اور تھا۔ یہ جب دہلی مین تھے تو نواب اخلاص خان[226]

چودہری کا خطاب پہلے ایک پرگنہ کے افسر اعلی کو بطور موروثی ملتا تھا

[225] قانونگو۔ قانون، سریانی یا یونانی مین ہر چیز کی اصل یا سطر کتاب، جدول کو کہتے ہین مجازاً قاعدہ و دستور کہلاتا ہی۔ قانونگو مال کا ایک افسر معائن یا پرگنہ کا رجسٹرار، جو جائداد و حقوق مالکانہ و مزارعانہ کے صحیح اندراجات و نگہداشت کا نگران ہوتا تھا۔ انگریزی عملداری مین بھی یہ عہدہ قائم ہی لیکن اسکی خدمات اور اختیارات مین فی الجملہ تغیر ہو چکا ہی

[226] اخلاص خان، ایک ہندو نژاد، نو مسلم بہادر شاہی امیر تھا۔ تمام مورخین اسکی وضعداری اور روش صلح جوئی کی ستایش کرتے ہین۔ صاحب سیر المتاخرین اور حاجی مصطفے اسکو نہایت فاضل و قابل، فرزانہ و دانشمند لکھتے ہین۔ قطب الملک کا ندیم و معتمد تھا۔ سادات کی معاندت و وابستگی اور زمانہ کے رنگ و کیفیت سے نہایت دل شکستہ اور دنیا سے متنفر ہوگیا تھا۔ اس کا اثر طبقہ ہر فریق اور ہر جماعت پر یکسان تھا۔ سب اسکا احترام کرتے تھے۔ بہ نظر سفع منازعات ترک منصب و خدمت کر کے مشاغل علمی اختیار کر لئے تھے۔ فرخ سیر نامہ (عہد فرخ سیر کی تاریخ) لکھا کرتا تھا فرخ سیر نے جب خبر پائی کہ خلاف حکم شاہی امیر الامرا دکن سے ہندوستان آرہا ہے، ہوائے بغاوت اُسکے سر مین بھری ہوئی ہے تو فرخ سیر نے اخلاص خان کو امیر الامرا کے سمجھانے اور اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے

کی سرکار سے دو روپیہ روز ان کو ملتے تھے۔ مگر یہ رقم اُن کے خرچ کیلئے کبھی مکتفی نہوتی تھی۔ بلکہ اسکے سوا ایک روپیہ اور ہر روز خرچ ہو جاتا تھا۔ نوکرون اور کہارون کی تنخواہ، دربار کا خرچ، اور دیگر اخراجات اسکے علاوہ تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ دہلی مین مقروض ہو جاتے تھے اور جب ان کے مستقر الخدمت سے ہنڈوی آتی تھی تو سب سے پہلے یہ قرض بیباق کیا جاتا تھا۔

مخارج

میر عبد الجلیل جہان کہین رہتے تھے خرچ سے تنگ رہتے تھے۔ خود اپنا خرچ ' اعلا اور شریفانہ' پائے تخت کے اُمرا اور عمائد سے ہر وقت کا ملنا جلنا اور برابر کا برتاؤ۔ اُس پر گرانی اور مصارف ' وارد و صادر اشخاص' اعزہ اور امیدواران ملازمت کی مہمانداری' فرمائشات اہل وطن کی ہمسائی ان کا ہاتھ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ فوری اور ہنگامی ضرورتون کا پورا کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

وطن مین جانی و درگاہی دونون نوکر بیمار پڑے ہین۔ میر سید محمد نے اُنکے لئے خرچ مانگا ہی یہ جواب دیتے ہین کہ "بالفعل بیس روپیہ بھیجدیے ہین۔ اسکے بعد اور بھی بھیجون گا خاطر جمع رکھیگا اسوقت اس سے زیادہ مُیسّر نہین آیا۔"

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ "الحمد للہ آپ کا قاصد عین انتظار مین پہونچا تعلق خاطر کو رفع کیا وطن مین گرانی غلّہ اور درماندگی خرچ روزمرّہ اور دیگر خصوصیات کی نسبت جو کچھ لکھا تھا معلوم ہوا برخوردار من مجکو کسی لحظہ اور کسی لمحہ اپنے سے غافل نہ جانئے گا۔ اس سے قبل جو کچھ قلیل کہ مُیسّر آیا تھا' دیگر مداری اور فیض اللہ کو روانہ وطن کر دیا تھا بفضل الٰہی بخیریت پہونچ گئے ہون گے۔ تین

بھیجا تھا۔ میر سے اخلاص خان کو ربط و رسم خاص تھا۔ وہ میر کو بڑے اصرار و جد سے اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔

خیال ہے کہ اسی نام (محمد اخلاص خان) کا ایک امیر عالمگیر اورنگ زیب کا بھی معتمد خاص اور دمساز تھا۔ بادشاہ کے اخیر انفاس حیات مین بھی اُسکے قریب موجود تھا اُسنے اور عنایت اللہ خان نے بہت سے واقعات و حالات چشمدید نقل کیے ہین۔

چاہتا تھا کہ بہ مجرد پہونچنے قاصد کے فکر کرکے جلد اُس کو رخصت کر دیتا۔ لیکن ہر چند سعی کی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ حتیٰ کے چندے روز ضرورتاً توقف کرنا پڑا۔ اب اخوی میر کرم اللہ نے بڑی کوشش کرکے جزوی رقم حاصل کرکے سیوستان سے بھیجدی ہے۔ قاصد کو روانہ وطن کرتا ہوں۔ حق سبحانہٗ بخیریت پہونچا دے۔ چونکہ تمہارا بھیجا ہوا قاصد گھاسی چنداں ہوشیار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مہاجن کی معرفت ہنڈی روانہ کی گئی۔ اور اُس کو خطوط کے ساتھ وطن رخصت کر دیا۔ برخوردار! بھکر میں کوئی مہاجن ایسا نہیں ہے کہ ہنڈوی اکبر آباد یا قنوج کو لکھ دیوے ہنڈوی یہاں سے ملتان اور ملتان سے لاہور اور لاہور سے اکبر آباد اور وہاں سے قنوج چلتی لکھی جاتی ہے۔ اس صورت میں چار جگہ ہنڈوی کو باحتیاط بقید جنس وسکہ وسند کے لکھانا پڑتا ہے۔ اور یہ امر گھاسی کی عقل وسمجھ سے باہر نظر آیا۔ اس لئے ہنڈوی جوابی لکھا کر مہاجن کی معرفت بھیجی گئی ہے"۔

میر سید محمد کو اپنی کیفیت سے اطلاع دیکر نصیحت فرماتے ہیں "یہاں کے احوال نوع دیگر نظر آتے ہیں کہ تمام لوگ حضور پر نور میں ہماری خدمت کی تلاش کے لئے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ شہرت ہورہی ہے کہ ہماری خدمت حضور سے کسی دوسرے کے نام مقرر ہوگئی ہے۔ لہذا لکھا جاتا ہے کہ زیادتی اخراجات سے ہاتھ کوتاہ رکھئے اور اس طرح کیجئے گا کہ شرم رہ جائے۔ ہمارے جاگیر نہیں ہے خدانخواستہ اگر ہم یہاں سے اُٹھ کھڑے ہوں تو اُسی دن سے بے روزگار رہ جائیں گے۔

۲۲۷ بھکر حاکم نشین شہر تھا۔ دولت مند لوگ رہتے تھے۔ میر صاحب کے وقت کے حالات معلوم نہیں لیکن ۱۸۷۰ء کا گزیٹیر سندھ بالائی کے ذیل میں لکھتا ہے کہ یہاں تین قوم کے لوگوں کی آبادی ہے ہندو۔ سندھی۔ بلوچی۔ تمام تجارتیں نہ صرف بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں ہندوؤنکے ہاتھ میں ہیں بلکہ تمام ضروریات زندگی اور مایحتاج انسانی کو دیہات اور مفصل میں یہی لوگ پورا کرتے ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہ ہوگا جہیں بنئے کی دوکان نہ ہو۔ ہندوں کی حالت جیسی کچھ مسلمانوں کے ملک میں ہوتی ہے معلوم ہے۔ یہاں بھی گرے ہوے اور پست درجے اور متحمل طبقہ کے سے ہو رہے ہیں لیکن سارے ملک میں دولت جمع کرنا بھی یہ ہی جانتے ہیں۔ ان ممالک میں ہندو اسقدر کار آمد ہیں کہ اُنکی جان ومال کا بہت لحاظ وادب کیا جاتا ہے۔ بلوچیوں میں سے بڑے سے بڑا بدمعاش از زشت اعمال وسیہ کار بھی بالعموم ان کا خیال رکھتا ہے۔ شکار پور کے مہاجنوں کو دیکھئے۔ جو اپنی دولت و ثروت

اس لئے کہ نوکری کا مدار جاگیر پر ہے اور بے جاگیر والا نوکر گویا نوکر ہی نہیں ہے۔ اس بات پر نگاہ رکھ کر گزران کرنا چاہئے۔ جب کچھ کشایش ہو جائے اُس وقت اختیار ہے۔ غرض کہ ان مراتب کو خوب خاطر نشین رکھ کر عاقبت بینی اور دور اندیشی کو ہاتھ سے نہ دیجئے گا"۔

حضرت دہلی

میر عبدالجلیل کو دربار شہنشاہی میں آداب و مجرا بجالانے کا اعزاز چند بار نصیب ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ جب کہ زنجیر عدل والی رباعی لکھ کر عالمگیر خلد مکان کے حضور میں پیش کی تھی جس کا صلہ چار توڑے ہُون ملا تھا۔ دوسری مرتبہ جب کہ قلعۂ ستارہ کی فتح کی تاریخیں لکھ کر نذر کی تھیں۔ غالباً اُس وقت سوائے خشک ستایش و آفریں کے کوئی خلعت یا انعام بارگاہ خسروی سے عطا نہیں ہوا نہ کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسکے بعد جب[۲۳۸] میر دارالخلافہ

اور ساہوکارانہ کاروبار اور رسوخ کے لحاظ سے تمام ہندوستان اور ممالک مغربی و شمالی میں شہرت رکھتے ہیں ایسے بازار بہت کم ہوں گے جہاں ان ساہوکاروں کے گماشتے موجود نہ ہوں۔ کلکتہ سے لے کر جنیوا تک کی ہنڈیاں یہاں مل جاتی ہیں۔

۲۳۸ شہر دہلی کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۲۰۸۵۷۵ تھی۔ ۱۹۱۱ء میں برطانی ہند کا دارالملک یہاں منتقل ہوا۔ اور اُس وقت سے روز افزوں ترقی اور عظیم تغیر و عروج شہر کو حاصل ہے۔ کاروبار تجارت اور کارخانجات اور سلسلۂ تعمیرات میں انقلاب وارتقاے عظیم نمودار ہو رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مردم شماری ۳۰۴۴۲۰ پر پہونچی تھی۔ وہ رقبہ جہاں ارولی پہاڑیوں کا شمالی حصہ جمنا سے آکر مل گیا ہے مدت ہائے دراز بلکہ زمانۂ قدیم در قدیم سے یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی بڑے شہر کا موقع ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں پہلے شہر اندر پرستھ آباد تھا جسکی بنیاد ایک پانڈو راجہ جودھسٹر نے ڈالی تھی۔ ملا قاسم فرشتہ مشہور مورخ لکھتا ہے کہ دہلی یا دلی کی بنیاد اسکندر مقدونی کے حملہ سے پیشتر راجہ دھلو نے ڈالی تھی۔ راجہ اننگ پال نے شہر آباد کیا اور لال قلعہ بنوایا جہاں اب قطب مینار استادہ ہے۔ وہ متھرا سے لوہے کی لاٹ لایا اور ۱۰۵۲ء میں یہاں نصب کی۔

۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں شہاب الدین محمد غوری کو شکست دینے کے لئے رائے پتھورا اپنے رفیقوں اور حلیفوں کی زبردست و پُرشوکت جماعت لیکر بڑھا لیکن فیصلہ کُن جنگ سال بھر بعد میں ہوئی اور ہمیشہ کے لئے دہلی ہنود راجگان کے

دہلی) چلے آئے تھے کئی بار شرف حضوری میسر ہوا تھا۔ میر کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ دربار کی رسائی بہت مشکل بات تھی اور جو خلعت و انعام عطا ہوتا تھا اُس کا وصول ہو جانا اور بھی دشوار تھا۔ اس کے لئے بھی قواعد وضوابط معین تھے۔ جن کا مرعی رکھنا اور پورا کرنا دِقت

ہاتھ سے نکل گئی۔ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں قطب الدین ایبک (محمد شہاب الدین بن سام کے غلام) نے دہلی پر قبضہ کیا۔ اُسکے آقا کی وفات پر ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں دہلی خاندان غلامان کے بادشاہوں کا دارالملک ہو گئی۔ پُرانی دہلی کے سب سے بڑے اور شاندار کھنڈر اور ویرانے اسی نامور خاندان کی یادگار ہیں۔ پہلے مسجد جامع قطب الدین کی تعمیر شروع ہوئی تین سال تکمیل میں صرف ہوئے۔ التمش کے عہد میں اُسکی توسیع ہوئی۔ جو قطب الدین کا داماد تھا اور اس نسل کا سب سے بڑا فرمانروا مانا جاتا ہے۔ قطب مینار بھی اسی بلند حوصلہ اور عالی ہمت بادشاہ کی یادگار ہے۔ اسی کے قریب التمش کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کا غیر تکمیل یافتہ منار واقع ہے۔ منار کا آغاز ۷۱۱ھ (۱۳۱۱ء) میں ہوا تھا۔ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) تک خانوادہ غلامان کا عمل ودخل رہا۔ پھر جلال الدین خلجی نے ایک نئے خاندان کی بنا ڈالی۔ جلال الدین اور اُسکے کافر نعمت بھتیجے اور جانشین علاء الدین کے عہد میں تورانیوں نے وسط ایشیا سے اس ملک پر دو بار حملہ کیا برابر گھستے اور بڑھتے چلے آئے مگر بالآخر ناکام رہے اور پسپا ہوئے۔

۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں خاندان تغلق نے مملکت ہند پر قبضہ پایا۔ اُسکے بانی غیاث الدین نے ایک نیا دار الصدر تغلق آباد کے نام سے ایک پہاڑی کی بلندی پر پورب کو چار میل پر آباد کیا اُسکی عظیم الشان محلسراؤں قلعوں اور رفیع ایوانات کے نشانات اور پُرانی بنیادوں کے آثار اب بھی نمایاں ہیں۔ یہ تیسرا دارالسلطنت تھا غیاث الدین تغلق نے ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں وفات پائی۔ اور اُس کا بیٹا محمد بن تغلق سلطان الغ خاں تخت نشین ہوا اُس نے دار الحکومت کو ہٹانے اور دہلی کی پوری آبادی کو دولت آباد ملک دکن میں اٹھائے جانے کی تین بار کوشش کی۔ فاصلہ آٹھ سو میل سے زائد تھا اور آب و ہوا ناسازگار۔ ناکام رہا۔ ابن بطوطہ مشہور مغربی سیاح نے دہلی کو اُسکی آبادی یا بربادی کے ڈیڑھ سو برس بعد دیکھا تھا۔ قطب الدین کی مسجد کو بے نظیر بتاتا ہے۔ وہ شہر کی ویرانی وبربادی اُسکے عظیم الشان ویرانوں، سر بفلک عمارات اور اُسکے غیر آباد اور خالی مکانات کا درد انگیز تذکرہ کرتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق پھر دہلی کو جمنا کنارے ایک دوسرے مقام فیروز آباد پر اٹھائے گیا جو مقبرہ ہمایوں اور پہاڑی کے مابین تمام و کمال پھیلا ہوا تھا۔ اس بادشاہ کے ویران محل وکوشک، مقابر و مساجد اور اشوک کی لاٹ جو حضرت مسیح سے تین صدی قبل بنائی گئی تھی اب بھی یہاں نظر آتی ہے۔ وہی اب فیروز شاہ کی لاٹ کہلاتی ہے۔ اس دہلی کی تکمیل ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں ہوئی۔

جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ (دسمبر ۱۳۹۸ء) میں جب کہ خاندان تغلق کے دو رقیب دعویدار سلطنت کے باقی ماندہ ریزوں کے لئے جنگ وپیکار کر رہے تھے تیمور صاحبقران کے دَل بادل عساکر دہلی پہونچے۔ محمود شاہ ثانی جو

اور شفقت دونوں کا طالب و متقاضی تھا۔ صدر در فرمان شاہی کے بعد بھی جاگیر تو ایک بڑی چیز اور دیرپا بخشش و موہبت تھی، معمولی چیزوں کے ہاتھ آنے میں بھی بہت دیر لگتی تھی۔

جو برائے نام بادشاہ تھا گجرات بھاگ گیا اُسکی فوجوں نے عین شہر پناہ کے نیچے شکست کھائی۔ تیمور شہر میں فاتحانہ داخل ہوا۔ قتل عام و غارتگری تمام کا بازار چار روز تک گرم رہا۔ گلی کوچوں میں جوئے خون رواں تھیں اور کشتوں کے پشتوں سے راستے بند تھے۔ جب منگولیوں (تورانیوں) کی آتش عقاب کچھ سرد ہوئی اور یہ حملہ آور واپس ہوئے تو عورتوں اور مردوں کی ایک کثیر تعداد کو اسیرِ دام و غلام بنا کر کشاں کشاں ہمراہ لے گئے دو مہینے تک دہلی میں نہ حکومت تھی نہ حاکم۔ محمود شاہ واپس آیا اور اپنی بچی کھچی سلطنت کے ایک ٹکڑے پر قدم جمائے۔ ٨١٥ھ (١٤١٢ء) میں اُسنے وفات پائی اور سادات (جو منگولیوں کے زیر فرمان بلکہ حلقہ بگوش تھے دہلی اور اُس کے اطراف و جوانب میں ایک مختصر سی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ ٨٥٥ھ (١٤٥١ء) میں خاندان لودی نے عنان حکومت پائی۔ ٩٠٩ھ (١٥٠٣ء) میں سکندر ثانی نے اپنی سلطنت کا دارالصدر آگرہ بنایا۔ تاہم دہلی کی عظمت و شوکت کم و بیش قائم رہی۔ ٩٣٢ھ (١٥٢٦ء) میں پانی پت کے مقام پر بابر بادشاہ نے لودیوں کے اخیر تاجدار ابراہیم ثانی کو شکست دی اور دہلی میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنی بود و باش زیادہ تر آگرہ میں رکھی ہمایوں پھر دہلی چلا آیا۔ اور اُس نے اندرپرستھ کے موقع پر پرانے قلعہ کی ترمیم و تجدید بلکہ تعمیر شروع کی۔ ٩٤٦ھ (١٥٤٠ء) میں شیر شاہ سوری افغان نے ہمایوں کو ہند بدر کیا اور شہر کے گرد نیا حصار بنایا اور قلعہ بندی و تحصین کی۔ لال دروازہ اُسی کا تعمیر کردہ پھاٹک ہے جو بڑی سڑک کی ایک سمت موجودہ جیل خانہ کے رخ پر یکہ و تنہا موجود اور قائم ہے۔ سلیم گڑھ کے قلعہ سے شیر شاہ کے ایک بیٹے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے گرد و نواح کی شکستہ حال عمارات اور کھنڈروں میں مقبرۂ ہمایوں نہایت عبرت خیز اور اثر ڈالنے والی یادگار باقی ہے۔

اکبر اور جہانگیر تو معمولاً آگرہ، لاہور یا اجمیر میں رہتے تھے۔ شاہجہاں نے شہر کو موجودہ موقع پر از سر نو بسایا۔ قلعے درست اور تعمیر کئے۔ شہر کا نام اپنے نام پر شاہجہاں آباد رکھا۔ جامع مسجد تعمیر کرائی۔ نہر جمن غربی کو حفر کرا کے پھر جاری کیا۔ چند ایام کو چھوڑ کر اُس زمانہ سے برابر دہلی سلاطین مغلیہ کا دارالصدر رہی ١١٥٠ھ (١٧٣٧ء) میں بعہد محمد شاہ بادشاہ باجی راؤ مرہٹہ پیشوا دہلی آیا۔ دو سال بعد نادر شاہ فاتحانہ غرور و عُجب کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور قتل عام و خونریزی کے بارہ میں تیمور کی تقلید اور اُس کے مراسم جہانداری و جہانبانی کی تجدید کی۔ اس ایرانی فتحمند یا غارتگر نے اٹھاون ۵۸ دن تک سیل خون بہائے۔ غریب و امیر سب کو لوٹا اور گھسوایا۔ وہ جسوقت دہلی سے ہٹا ہے تو اُسکے مال غنیمت کا اندازہ چھتیس ٣٦ کروڑ (تیئیس ٢٣ ملین اسٹرلنگ) کیا گیا تھا۔ ١١٧٠ھ (١٧٥٦ء) میں اس شکستہ بال سلطنت کے تجزیے سے قبل اس آفت نصیب دارالسلطنت میں دوبار خانہ جنگیاں ہوئیں۔ احمد شاہ درانی نے جو کچھ پایا لوٹ مار کر لیگیا اور بالآخر غارتگری

فرخ سیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

"۴، ماہ ربیع الآخر ۲ سنہ جلوس (۱۱۲۸ھ) کو دیوان خاص میں حضرت ظل سبحانی کی ملازمت حاصل کی۔ ازراہ فضل و کرم تبرک یعنی خلعت بالابند مرحمت فرمایا اور تعلقہ خدمت کی رخصت دی۔ خلعت اور رخصت دونوں کے لئے آداب و تسلیمات بجالایا۔ اب بادشاہ ظل اللہ سے کوئی کام باقی نہیں رہا۔"

ایک اور موقع پر ذکر کرتے ہیں "یہاں کی رویداد یہ ہے کہ سیاہہ بحالی خدمات کا دفتر خالصہ شریفہ سے نواب قطب الملک کے دستخط کے بموجب 'دفتر بخشی الممالک' 'دفتر سوانح حضور انور' میں بھجوادیا تھا چونکہ خدمت سوانح بدستور نواب میر جملہ کی سپرد ہوا اور نواب نے کوکیطرفسی نیابتاً مرزا غلام محمد کام کرتے ہیں

کا خاتمہ مرہٹوں کے ہاتھ پر ہوا۔

۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں عالمگیر ثانی قتل ہوا جو واقعی بادشاہوں میں سب سے اخیر کہا جاتا ہے۔ شاہ عالم ثانی جس نے یہ خطاب خالی خولی اختیار کر لیا تھا اپنا اقتدار و اختیار دہلی میں بھی نافذ نہ کر سکا۔ حتی کہ شہر برابر افاغنہ اور مرہٹوں کا صیدگاہ بنا رہا۔ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو اُسکے آباء و اجداد کے گھر لے جاکر آباد کیا مگر ۱۲۰۲ھ (۱۷۸۸ء) میں مرہٹوں کی فوج محافظ محل شاہی میں مستقل طور پر مقیم ہوگئی۔ شاہ عالم بیچارہ سندھیا کے پنجہ میں اسیر و مقید رہا۔ ۸ ذیقعدہ ۱۲۱۷ھ یعنی ۱۴ مارچ ۱۸۰۳ء کو مرہٹوں کو شکست دے کر لارڈ لیک دہلی میں داخل ہوا اور بادشاہ کو اپنی حفاظت و حراست میں لے لیا۔ مفتوحہ و مقبوضہ علاقہ جات پر بادشاہ کے نام سے انگریز فرمانروائی کرتے رہے۔ صرف محلسرا کے اندر بادشاہ کا حکم نافذ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر اور ابوظفر بہادر شاہ کی شرکت یا الزام بغاوت نے اس برائے نام بادشاہ و بادشاہی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دہلی کی عمارات اور پرانے کھنڈروں کے متعلق پوری تفصیل سر سید احمد خاں بہادر کی مشہور کتاب آثار الصنادید میں ملے گی۔ لیکن اسی ذیل میں فرگسن صاحب کی "تاریخ عمارات ہندوستانی و شرقی" (مطبوعہ ۱۸۷۶ء) اور فینشا صاحب کی "دہلی سابق و حال" (مطبوعہ ۱۹۰۲ء) بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ اُن کو اسی آئینہ کا عکس سمجھنا چاہئے۔ اُمرا کے محلات، بادشاہوں کے قلعے اور ایوانات تو صفحۂ عالم سے اکثر محو و نابود ہو چکے لیکن اولیائے کرام کے مزارات و مقابر دہلی مرحوم کے نام کو اب تک روشن کر رہے اور یار و اغیار کو آستان بوس بنائے ہوئے ہیں ؎

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود — سالہا سجدہ گہ اہل نظر خواہد بود

مرزا پہلے خواصان عالی شان کے داروغہ تھے۔ اب سہ ہزاری منصب رکھتے ہیں اور قابلیت و استعداد سے خالی نظر نہیں آتے۔ فقیر نے اُن کی خدمت میں رجوع کیا۔ اُنھوں نے سند کے دینے میں تعلل کیا اور اس مقدمہ کو پھر عرض کیا۔ آجکل بادشاہ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ جب کوئی عرضی مکرّر جاتی ہے تو یا تو اُسمیں کچھ کمی کر دیتے ہیں یا قطعاً نامنظور فرماتے ہیں۔ خدا کے فضل سے فقیر کی عرضی پر دستخط خاص سے یہ فقرہ مزین فرمایا کہ "بدستور سابق بحال تبرک بہ دہند"۔ اب مرزائے مزبور نے سیاہۂ تبرک داروغۂ خلعت خانہ کے لئے بندہ کو دیدیا ہے۔ تبرک سرپیچ یا شال[۲۲۹] مرحمت ہوگا۔ داروغۂ خلعت خانہ اشرف علی خاں ہیں اور وہ کسی تقریب کی وجہ سے کئی روز سے دربار میں نہیں آئے تھے۔ اُن کے نائب سے رجوع کیا گیا۔ نائب صاحب چنداں متوجہ نہیں ہوئے اور فرمایا کہ بالفعل جنس موجود نہیں ہے، چند روز کے بعد آئیگی۔ اس لئے ایک آشنا کی معرفت اشرف علی خاں کے گھر پر گیا تو...... اپنے نائب سے تاکید کر دی کہ انکا کام آج ہی انجام کرا دیا جائے..... دربار کے کام کوئی اختیاری بات نہیں ہیں۔ ایک دن کے کام میں ایک مہینہ لگتا ہے اور ایک عالم سرگرداں پھرتا ہے....."

دہلی میں میر صاحب کا قیام شیخ فرید[۲۳۰] کے کٹرے میں رہا۔ کوئی حویلی کرایہ کی میسر نہیں آتی تھی۔ سرائے کا رہنا جو بازار کے برابر تھا انکو کبھی پسند نہیں آیا۔ لیکن کیا کرتے کہ ہر چیز کی قلت اور گرانی لشکر میں انتہا درجہ کی تھی۔

---

۲۲۹ شال نفیس و قیمتی شے جو بخوبی مشہور ہے۔ یہ چادریں کشمیر و پنجاب میں دُنبوں کے بال سے مختلف رنگ و وضع کی بُنی جاتی ہیں۔ ہمیشہ دو فرد (پرت) ملا کر فروخت کی جاتی ہیں یا تحفتاً پیش یا اعزازاً عطا کی جاتی ہیں یہی دوشالہ کہلاتا ہے۔

۲۳۰ شیخ فرید بخشی۔ تقوی سید، صحیح النسب، آل جعفر تواب، اُمرائے اکبری سے تھے۔ جوہر شناس بادشاہ کے دربار میں وفاداری و خیر جوئی سے کام لیا تھا خدمات شایستہ انجام دیکر اس منصب بلند (بخشی گری) پر ترقی پائی تھی جہانگیر کے عہد میں بہت سے معرکے مردانہ سر کئے اور کمال بہادری دکھائی تو مرتضی خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔
کٹرہ ہندی لفظ ہے۔ مارواڑی زبان میں کٹلو کہلاتا ہے۔ اصل میں بازار کی جگہ یا بازار کو کہتے ہیں۔ مجازاً محلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

میر صاحب کے لئے ایک بڑا کام فراہمی فرمایشات کا تھا میر سید محمد کبھی آئینہ کے لئے لکھتے تھے کبھی صندوقچہ کیواسطے۔ آئینہ عمدہ موجود تھا وہ میر صاحب نے بھیج دیا۔ صندوقچہ کی تلاش وخریداری ملتوی رکھی تھی۔ کبھی پارچہ کی ضرورت پڑتی تو یہاں سے گٹھری بندھوا کر سربمہر کسی ہرکارے کے ہاتھ یا کسی معتمد دوست کے ساتھ بھیجنا پڑتا تھا ع دراز دستی ایں کوتہ آستینان بیں

میر سید محمد اس قسم کی تصدیع کے شروع سے عادی تھے۔ جب اُن کے باپ بھکر میں تھے اُس وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ ایکمرتبہ سُرمہ منگایا۔ میر نے ان کا خط بجنس (خان صاحب مہربان فیض رساں) امین الدین خاں (فوجدار سرکار بھکر) کو دکھایا۔ انھوں نے ازراہ مہربانی سرمہ نفیس عنایت فرمایا۔ اُن کی سرکار کا سُرمہ نہایت خوب ہوتا تھا۔ بہت سے آدمی جن کی آنکھ میں چیچک سے گُل (پھول) پڑ گئے تھے اسی سُرمہ کی مُداومت سے صحت پا گئے تھے۔ اُسی کے ساتھ خان موصوف نے ایک (حلقہ) کمان بھی میر سید محمد کے لئے عنایت فرمائی۔

حُسنِ تدبیر و حُسنِ عمل

میر عبدالجلیل کی ذات جملہ اوصاف وکمالات سے متصف تھی وہ جہاں سازشوں اور گروہ بندیوں سے دُور رہتے تھے۔ وہاں یہ خوبی بھی ان میں موجود تھی کہ ہر جماعت میں رُسوخ اثر اور اعتماد رکھتے تھے۔ ہر دربار میں ان کی رسائی تھی۔ اگر نواب قطب الملک اور امیرالامرا انکا احترام کرتے تھے۔ تو اُسی وقت میں میر جملہ سمرقندی جو ان سیدوں کا مخالف بلکہ معاند تھا اور جس نے کبھی خود میر عبدالجلیل کو خدمات بھکر سے معزول کر دیا تھا اب میر کو آنکھوں پر جگہ دیتا اور انکی پرورش ومعاش کی فکر وتدبیر کرتا تھا۔ دربار شاہی میں بھی ان کو بار حاصل تھا اور اکثر بادشاہ ان سے بذات خاص واقف اور ان کے کمالات کے معترف تھے۔ میر کی اس دانشمندانہ روش کا حوالہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں دیا نہ میر سید محمد و میر غلام علی نے ذکر کیا ہے لیکن اس کا پتہ اُن خطوط سے چلتا ہے جو اُس وقت تو خانگی ومخفی طور پر محض اپنی حالت اور ہنگامی مجبوریوں کے

اظہار کے لئے لکھے گئے تھے مگر میر سید محمد نے اُن کی نگہداشت کی اور اس طرح اپنی اور اپنے باپ کی قابل قدر یادگار چھوڑی ہے۔ بعض کے دلچسپ اور ضروری اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں

(۱) [بحالت علالت سخت]۔ احوال بدن چنیں و رسیدن در لشکر و بیکار نشستن بغایت دشوار۔ و در سلطنتِ نو ہیچ یک از اُمرائے نو مارانمی شناسند و فضل کمال را کسے نمی پُرسد۔ و قواعد قدیمۂ سلطنت ہمہ برہم خوردہ و کارہائے خلائق ہمہ بند۔ مگر کسے کہ زر بسیار داشتہ باشد۔ وآں ہم عالمے ست کہ زر خرچ کردہ باز نقصان کشیدہ و خاک بر سر خود انداختہ می گردند۔ عامۂ خلق بایں حالت گرفتار از قبیل مضمون کریمہ است[۱۲۳] فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ الغرض از جملہ اُمرائے ایں زمان نوّاب دلیر دل خاں کہ در بھکر بخدمت ایشاں روشناسی بہم رسیدہ بود آشنا بودند...... خدمت صوبہ داری ملتان بہ نوّاب مقرر شد۔ مربّی کہ در اُردوے معلے بود آنہم بیروں رفت ...... بالفعل آمد و رفت بدربار امیر الامرا دارم۔ اما بسیار تنگ بار و عالی شان واقع شدہ اند.....

(۲) "آج دوشنبہ دوسری ذی الحجہ کو اگرچہ طاقت و توانائی نہ تھی ایک ماہ سات دن بعد سوار ہو کر شیخ الاسلام[۱۲۴] مدار علیہ سرکار میر جملہ کے یہاں گیا تھا..... لشکر کی روئداد یہ ہے کہ ارکان سلطنت کے عناصر اربعہ بمقتضائے تضاد طبعی ایک دوسرے سے ناسازش رکھتے ہیں۔ اسلئے قطب الملک اور امیر الامرا دونوں بھائیوں نے استعفار منصب کر دیا۔ لوگوں نے اس بات کو عرض اقدس میں بہ نوع دیگر پہونچایا چنانچہ کئی روز تک ہنگامۂ عظیم برپا رہا۔ قلعہ میں سات چوکیاں (پہرے) شب و روز موجود رہتی تھیں۔ چونکہ نفس الامر میں سادات کی طرف سے کوئی بات نہ تھی۔ اس لئے حضرت ظل سبحانی کی والدہ نواب قطب الملک کے گھر تشریف لے گئیں اور استمالت کر کے قطب الملک کو حضور پر نور میں لے آئیں۔ حضرت بدولت نے ان کے حال پر مہربانی کمال مبذول

[۱۲۳] تو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اُن پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی مگر جس کو خدا چاہے۔ (جزء ۲۴۔ سورۃ الزمر ع۔ ۷ - ۴)

فرمائی خلعت و سرپیچ مرصع اور پانچ گھوڑے دو ہاتھی مرحمت کئے[۲۳۲] لیکن امیر الامرا نے اب تک ملازمت نہین کی ہے۔ اپنی ملازمت کو ایک شق پر منحصر رکھا ہے کہ میر جملہ بنگالہ کو چلا جاسے اور مین دکن کو۔ جب میر جملہ رخصت بنگالہ لے کر روانہ ہو جائے گا مین بھی ملازمت کر کے دکن کو رخصت ہو جاؤن گا۔ اسلئے یہ قرار پایا ہے کہ ۱۱ ذی الحجہ کو میر جملہ رخصت ہو جائے۔"

(۳) " دربار کی حقیقت یہ ہے کہ میر جملہ عید اضحے کے دن ظل سبحانی سے بنگالہ کو رخصت ہو گئے[۲۳۳] چند روز سرانجام باربردار وغیرہ لوازم سفر کے لئے توقف کرنا پڑے گا۔ ساعت دیکھ کر بنگالہ کو روانہ ہون گے۔ سبحان اللہ عجب قسمت ہے کہ انھین دونون درباروں سے روشناسی حاصل ہوگئی تھی اور چاہتا تھا کہ اب کئی مہینے خدمت کر لی ہے تو اپنے کام کے لئے التماس کرون کہ یہ مقدمہ پیش آیا۔ گویا آج شاہجہان آباد مین داخل ہوا ہون۔ اب از سر نو کوئی اور فکر کرنا پڑی۔ نواب امیر الامرا سے خوب روشناسی ہوگئی تھی لیکن کیا فائدہ کہ اب یہ دکن روانہ ہو رہے ہین اس زمانہ مین کامون کے ازدحام اور کثرت سے ان کے حواس متفرق ہین۔ آج کل ان کے دربار مین اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ جتنی دربار شاہی مین بھی نہین ہوتی۔ اس پر بھی ہر روز مجرے کے لئے خلوت مین جاتا ہون۔"

(۴) "متواتر ماتم کے سبب سے کہ امیر الامرا کا جوان بھتیجا اور لڑکا واصل رحمت الٰہی ہو گئے عرض کرنے کا موقع میسر نہ آیا۔ نواب صاحب سلخ ماہ ربیع الاول سنہ سے شہر شاہجہان آباد سے باہر نکل آئے ہین اور حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ کے قریب دائرہ (لشکر و خیمہ) مین فروکش ہین۔ باوجود ناتوانی بدن کے کہ ہرگز اصلی حالت پر نہین آیا ہے ہمیشہ سوار ہوتا ہون

[۲۳۲] شیخ لائن 'رفعت پناہ عوالی دستگاہ' لکھے جاتے تھے اور محمدی خان خطاب ملا تھا

[۲۳۳] آزاد دہلوی لکھتے ہین سلاطین چغتائیہ مین یہ آئین تھا کہ جس امیر پر خفا ہوتے تھے اُسے بنگالہ پھینک دیتے تھے کچھ اس سبب سے کہ گرم ملک تھا اسپر ہوا مرطوب' بیمار ہو جاتے تھے۔ اور کچھ اس سبب سے کہ ولایتی لوگ اپنے ملک سے دُوری اور بُعد مسافت سے بہت گھبراتے تھے اور ناجنسی محض کی سبب سے اس ملک مین تنگ رہتے تھے

صبح کو سوار ہو کر امیر الامرا کے لشکر کو جاتا ہوں پھر وہاں سے دربار شاہی میں آتا ہوں خدا کرے کہ سب کام خاطر خواہ صورت پذیر ہو جائیں۔ اگر امیر الامرا یہاں کچھ زمانہ تک رہ جاتے تو تمام مطالب پورے ہو جاتے ...... ۱۴ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ کو سند خدمت سوانح نگاری بھکر و سیوستان کی مرتب ہو کر مل گئی مگر سند بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان کی ہنوز بخشی صاحبان کے دفتروں میں رجوع ہے"

(۵) "امیر الامرا روانہ دکن ہو گئے جب تک شاہجہان آباد سے چار پانچ کوس پر رہے فقیر برابر مجرے کیلئے جاتا اور دوپہر تک شاہجہان آباد آجاتا تھا۔ اب کہ دور پہونچ گئے ہیں آمد و رفت کے قابل مسافت نہیں رہی۔ ارادہ ہے کہ ۹ تاریخ کو گھر سے کوچ کر کے اُن کے لشکر کو چلا جاؤں اور اُن کی خدمت میں چند روز رہ کر رخصت ہو کر شاہجہان آباد آجاؤں ...... باوجود نحافت بدن اور قوت نہ ہونے کے دونوں وقت سوار ہوتا ہوں"۔

(۶) "نواب قطب الملک نے ہمارے اور آپ کے کام کے اجرا کی پروانگی برائے خوشحال چند پیشکار نواب امیر الامرا کو کہ بخشی الممالک ہیں، دیدی ہے کہ بندہ کا منصب اور خدمات آپ کے لئے مقرر کر دی جائیں اور بندہ کو دستک تعیناتی نواب بخشی الممالک کی دیدیں چونکہ ان دنوں بخشی گری اول کی نیابت پر نواب صمصام الدولہ[۵۲۴] خان دوران بہادر مقرر ہیں اس لئے ان کی اطلاع کے بغیر کام کی صورت نہیں نکلتی آپ (سید محمد) کی عرضِ حقیقت کے لئے جو عرضی دی گئی تھی اُسکو جب نواب خان دوران نے دیکھا تو پوچھا کہ سید محمد کہاں ہیں؟ اُن کو لے آیئے تاکہ بموجب تحریر امیر الامرا

۵۲۴ یہ "خان دوران چہارم" تھا۔ فرخ سیر کے عہد کے بڑے امرا میں شمار ہوتا ہے۔ محمد شاہ کی تخت نشینی، سید حسین علی خان کے قتل اور اُسکے بھائی قطب الملک کے قید ہو جانے پر "امیر الامرا" مقرر ہوا۔ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں "صمصام الدولہ" خطاب پایا اور ایک سال بعد "خان دوران بہادر"۔ اصلی نام خواجہ محمد عاصم تھا۔ عبد الصمد خان بہادر جنگ بھی کہلاتا ہے۔ نادر شاہ کے معرکہ میں نہایت شجاعت و مردانگی سے لڑا۔ خطرناک مجروح ہوا۔ تین دن درد و تکلیف برداشت کر کے ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۶ فروری ۱۷۳۹ء) کو اس دار ناپائدار سے رخصت ہوا۔

عرض کر کے منصب و خدمات کا تقرر کرا دیا جاے۔ بنابرین رائے خوشحال چند نے ... بندے سے تاکید کر دی ہو کہ آپ کے صاحبزادے کا کام تیار ہے انکو بلالیجیے تاکہ تصدیق منصب و سند خدمت اُن کو دیدی جاے ..... تمھارے منصب و خدمت کا ہمارے سامنے اس زمانہ مین بہت بڑا کام تھا بہ توجہ امیر الامرا فضل الٰہی سے امید ہو کہ بہ آسانی صورت نکل آئیگی۔ اپنی بے وسیلگی اور دربار کے رنگ کو دیکھ کر اس کو مین نے بہت غنیمت سمجھا ہی اور محض اسی واسطے کہ تمھارا قدم جم جاے مین نے دکن کا سفر اختیار کیا ...... ''

(۷) ''سواری وو وقتہ اور سفر ہمراہی نواب امیر الامرا کے سبب سے کہ جنکے ساتھ مین بائیس روز رہا اور شاہجہان آباد سے چھ منزل چل کر رخصت فرمایا تھا ... یہ ضرورت میرے خیال سے اُتر گئی تھی۔''

اقتباسات بالا کو مین نے حتی الوسع فارسی سے بلفظہا ترجمہ کر دیا ہے تاکہ قارئین محترم اُس زمانہ کے اصول انتظامی وقواعد ملک داری سے آگاہ ہو سکین۔ اسی ضرورت سے بعض کلمات بدستور رہنے دیے ہین جن مین سے کچھ تو دفاتر و سرکار کی مصطلحات تھین اور کچھ اہل غرض اور امیدواران کی اختراعات۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہو کہ باوجود انقلابات و بے اطمینانی شدید کے تبادلۂ خدمت اور اجراے احکام رد و بدل و بحالی جاگیر و مدد معاش مین کس قدر احتیاط کی جاتی تھی۔ حتے کہ باوصف میر صاحب کے ذاتی رسوخ و رسائی کے اُن کے فرزند ارجمند کی حاضری و موجودگی لازم سمجھی گئی اور وہ دار السلطنت کو بلائے گئے تھے۔ رائے خوشحال چند کی مہربانی اور نواب خان دوران بہادر کی سرپرستی و عنایت اُن کی اعانت نہ کر سکی۔ دربار شاہی اور خود بادشاہون کی کیفیت کچھ ہی ہو لیکن ارباب حل و عقد اپنے عمل مقررہ اور دستورات مستمرہ سے سر مو تجاوز نہ کرتے تھے اور اپنے فرائض کو بلا لحاظ و رعایت انجام دیتے تھے۔

وفات

بھکر کی آب وہوا[۲۳۵] امیر عبدالجلیل کے موافق مزاج نہ تھی۔ خاص کر سردی کا موسم نہایت دشواری اور بہت سی شکایات جسمانی میں گزرتا تھا۔ وہاں سے نکلے تو چار ماہ میں بھکر سے شاہجہان آباد کا سفر طے ہوا۔ اُس کے شدائد وصعوبات کو ناقابل بیان لکھتے ہیں پہونچنے کے سوا مہینہ بعد بیمار، اور سخت بیمار پڑے۔ خدا خدا کر کے صحت پائی۔ پایۂ تخت کے قیام کا وہ زمانہ نہایت پُرفتن اور پُرشور وشر تھا۔ بادشاہ گردی اور اُمرا کی سازشوں اور پُرپیچ چالوں سے کوئی ساعت خالی نہیں جاتی تھی۔ یہ عشرۂ مہلکہ میں گام زن تھے۔ دہلی کی آب وہوا، درد انگیز گرانی اور اخراجات سے تنگدستی وحیرانی، روز افزوں تھی تندرستی قائم نہ رہ سکی، اعتدال مزاج باقی نہ تھا۔ بارہا علیل ہوئے اور اچھے بھی ہو گئے۔ عمر کی آخر منزل یعنی سرسٹھویں سال میں ایسے بیمار پڑے کہ پھر بستر مرگ سے اُٹھ نہ سکے وہ مرض، مرض الموت ثابت ہوا۔ بہت سے ملازم، سچے رفیق و وفادار ساتھ تھے۔ معالجہ بھی

---

۲۳۵ میر عبدالجلیل بھکر میں انتہا درجہ کی سردی ہونے کے شاکی ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہوائے بھکر از سہ چہار سال این قدر مختلف شدہ کہ در نوشتن نمی آید خصوص در موسم سرما این قدر تغیر فاحش در ہوا بہم میرسد کہ ہیچ متنفسے از آزار سالم نمی ماند این معنی را از مداری فیض اللہ کہ تازہ می رسد تحقیق نمائید۔ مجھے اُن کے زمانہ کی کوئی تاریخ یا تحریر ایسی نہیں ملی جس سے مزید تحقیق وانکشاف ہوسکتا۔ البتہ آج سے ایک صدی پیشتر "سلسلۂ جدید رہنمائے سالانہ وگزٹیر صوبہ جات بنگالہ و آگرہ"، کا جو کام بحکم لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل New Series of the Bengal and Agra Annual Guide and Gazetteer, Calcutta, 1842.

شروع کیا گیا تھا اور جس کو بعد تکمیل ولیم رشٹن کمپنی نے اپریل ۱۸۴۲ء میں شائع کیا اُس سے پایا جاتا ہے کہ "جنوری میں یہاں ۴۵ درجہ پر سردی پڑتی ہے۔ اسیطرح گرمی بھی انتہا کی ہوتی ہے" ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ "بھکر میں فروری کے انتیس دن کا اوسط مقیاس حرارت بہت زیادہ تھا۔"

شیخ علی حزیں خدا آباد سے کشتی پر بھکر آئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ یہ شہر بھی اسی دریائے سندھ کے کنارے چند روز کی راہ پر واقع ہے۔ یہاں کے باشندگان کے اوضاع واطوار کی شکایت کرتے اور طبائع کو لطافت و لطافت سے باہر پاتے ہیں۔

خوب کیا۔ تیمار بھی طبیب و معالج، مزاج شناس، کہنہ مشق، ہمدرد و مہربان تھے لیکن یہ سب مداوا بے کار ثابت ہوا ؎

کیسی دوا، کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز   قسمت مین تھا کہ ناز مسیحا اُٹھائیے!

چھیاسٹھ سال چھ ماہ دس روز عمر پاکر میر عبد الجلیل نے شنبہ کی شب مین ۲۳ ربیع الآخر ۱۲۳۸ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۸۲۵ء کو شاہجہان آباد مین رحلت فرمائی۔ ضلع ہردوئی کے گزٹیر مطبوعہ ۱۹۰۴ء مین سال وفات ۱۸۳۳ء تحریر ہے۔ صاحب مفتاح التواریخ ۱۲۳۷ھ (ہزار دویکصد و سی و ہفت) لکھتے ہین فقیر (محرر سطور ہذا) نے میر غلام علی آزاد کی تحریرات پر اعتماد کیا ہے۔ اسی کی تائید اورینٹل سیلیکشن جلد

ڈاکٹر برنس Dr. Burns اپنی کتاب مسمّٰی بہ دربار سندھ Visit to the Court of Scinde مین لکھتے ہین کہ پُرانی تاریخون مین اس ملک کا نام سندھ سدیت تحریر ہے یعنی وہ زمین جو دریا سے تو برآمد ہوئی ہے دریائے سندھ کی رعایت سے اس قطعہ کا نام سندھ پڑا اور اسی بنا پر اہل یونان اس کو Scindomona کہتے ہین۔ یہان تین موسم ہوتے ہین (۱) بہار (۲) تابستان یا گرما (۳) زمستان یا سرما۔ بارش بھی کبھی کبھی جون جولائی مین ہوجاتی ہے۔

بالائی سندھ کی بیماریان۔ چونکہ موسم سرما مین بارش بہت ہوتی ہے اور سردی بھی بشدت پڑتی ہے اس لئے یہان بیماریان بہت پھیلی رہتی ہین۔ وجع مفاصل کے حملے نہایت سخت اور دورے دیرپا بلکہ نامفارق ہوتے ہین بخار کے بعد سندھ مین یہی بیماری سب سے زیادہ پھیلتی ہے۔

جب بخار پھیلا ہوتا ہے تو اُسکے بعد ہی طغیانی آب کے فرد ہوجانے کی وجہ سے ماہ ستمبر و اکتوبر مین دگتھیا کی فصل شروع ہوجاتی ہے جو کبھی کبھی آخر ماہ نومبر تک ختم نہین ہوتی۔ یہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ جب اس ملک کا ہر ایک باشندہ کم و بیش اس قسم کی شکایات تپ و لرزہ و ناسازگاری موسم کا اچھا خاصہ شکار ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ اکثر طحال کا بڑھ جانا ہوتا ہے یا استسقا، امراض چشم اور آشوب کا بعض خاص خاص موسمون مین بڑا زور ہوتا ہے اور بہت سی بیماریان (مثلاً متعلق تشنج وغیرہ کے) اور تپ دق مین یہان کے بہت سے باشندے مبتلا نظر آتے ہین۔

بااین ہمہ مصنف تحفۃ الکرام آب و ہوائے سندھ کی ستایش کرتا ہے ع بر فطرت سلیم او از حق سلام باد۔ اس کو اختیار تھا کہ وہ سندھ کو دوسرا کشمیر لکھے لیکن تاریخی واقعات پر پردہ کون ڈال سکتا ہے۔ مغلیہ بادشاہون کے احکام کو دیکھئے شیخ کمال بیابانی سے اکبر بادشاہ کو ناخوش ہوا تو ان کو بھکر بھیج دیا تھا شیخ حسین اجمیری سے بدگمانی ہوئی تو وہ بھی بھکر کو جلاوطن کئے گئے۔ سید محمد میر عدل بھکر اس خیال سے بھیجے گئے کہ ملک کا کنارہ ہے۔

اسکے متعلق گذشتہ صدی مین انگریز سیاحون اور فوجی افسرون نے اپنی سرگزشت اور یہان کے احوال تفصیل سے قلمبند کئے ہین

اوّل (Oriental Miscellany, Vol. I.) مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء کے دیباچہ نگار مکاتیب
کی روایت سے ہوتی ہے۔

ان کی وصیت کے موافق نعش وطن بھیجدی گئی۔ بلگرام مین جمعہ کے بعد ابلکہ عصر کے اوّل وقت ۶ جمادی الاول سال مذکور (۱۷ دسمبر ۱۷۲۵ء) کو ان کا پیکر خاکی پیوند خاک کر دیا گیا باغ محمود گورستان آبائی مین اپنے پدر بزرگوار میر سیّد احمد کے پاس جگہ پائی۔ فیالھا من روضۃ ما اکرمھا شانا و اعظمھا عزا و ایمانا ان کے ہم عمر و ہمدرس قدسی صفات سید طفیل احمد نے قبر مین اُتارا تھا۔ میر غلام علی آزاد سبحۃ المرجان اور ید بیضا مین میر عبد الجلیل کے آثار شریفہ کے ذیل مین لکھتے ہین کہ اُن کا جسد تابوت سے سالم و درست نکلا تھا کسی عضو مین اصلا کوئی تغیر یا خرابی نہین ہونے پائی تھی۔ آفتاب کی تپش اور چودہ دن کے سفر کو خیال کیجیے تابوت سے نکال کر نعش چارپائی پر لی گئی، جیسا کہ تازہ میت کو لے جاتے ہین۔ لب قبر لائے۔ زیر کمر چادر ڈال کر لحد مین اُتارا۔

اہل حکمت کا فتوی ہے کہ عالم کا آغاز و انجام معلوم نہین لیکن شاید میر عبد الجلیل کو اپنے آغاز و انجام یا کم از کم اپنی آرامگاہ خاکی سے کچھ آگاہی تھی۔ اُن کی مثنوی "امواج الخیال در تعریف بلگرام" کا مطلع ہے ؎

آب و گل من کہ فیض عام است — از خطۂ پاک بلگرام است

اہل عقیدت و ادراک نے اس کی تعبیر فرمائی کہ عنصر لطیف نے اپنے مسقط الراس کی طرف رجوع کیا اور فرع نے اصل کی جانب بازگشت فرمائی سچ ہے کل شئی یرجع الی اصلہ

(۱) میجر اوٹرم Major Outram کا محاصرہ سندھ و افغانستان ۱۸۳۸-۳۹ء مطبوعہ ۱۸۴۰ء

(۲) ٹی پوسٹنس T. Postans کے "سندھ مین ذاتی تجربات" مطبوعہ ۱۸۴۳ء

(۳) "سندھ کے متعلق سرکاری مراسلت" ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۳ء مطبوعہ ۱۸۴۳ء

تواریخ وفات

موت التقی حیوۃ لاانقطاع لہا قد مات قوم وہم فی الناس احیاء

میر عبدالجلیل کے اہل وطن و متوسلین و متعلقین کو ان کے انتقال سے جس قدر صدمہ و ملال ہوا ہوگا ظاہر ہے۔ اُن کا دائرہ اہل علم کا دائرہ تھا اور بڑا تھا تقریباً ہر ایک ہوا خواہ اور مداح نے ماتم گساری میں حصہ لیا اور اپنے دردِ دل کا اظہار مختلف پیرایہ و انداز میں کیا ہے۔ انمین سے چند جو انشاپردازی یا فن استخراج تاریخ کا عمدہ نمونہ ہین پیش کیجاتی ہین۔

میر غلام علی آزاد، نے آیات کریمہ سے نکالی تھین۔

(۱) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ [۲۳۶] [واسطے اُن لوگون کے کہ نیکی کرتے ہین نیکی ہے اور زیادتی ہے۔ جزء ۱۱ سورۂ یونس۔ ع۔ ۸]

(۲) اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عُقْبَی الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ [یہی لوگ ہین جنکی دُنیا کا انجام ہے ہمیشہ رہنے کے باغ۔ جزء ۱۳ سورۃ الرعد ع ۳-۹]

آزاد نے ایک مرثیہ رثّائیہ (قصیدہ) بھی لکھا تھا۔ جسمین ایک سو ایک شعر اور چار مطلعے تھے اور ہر مصرع سے تاریخ نکلتی تھی۔ ایک مطلع یہ ہے ؎

رسید روزگار از سموم برق تپان کباب شد جگر نار و لالہ بریان

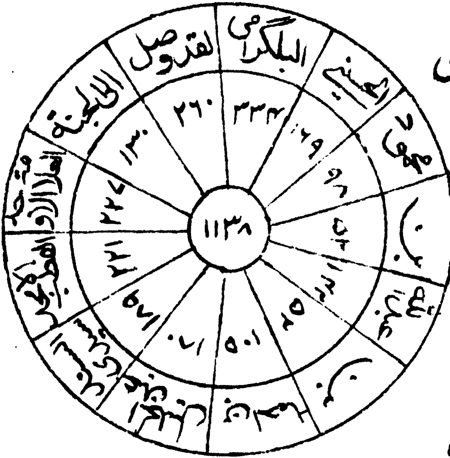
---

۲۳۶ الحسنی الجنۃ و الزیادۃ ہو اللقاء انتہی۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا اُن لوگون کے واسطے جنھون نے نیکی کی یعنی ایمان لائے۔ الحسنی جزاء خیر اور نیکی کی پاداش یعنی بہشت ہے وَ زِیَادَۃٌ نیکی کی جزا مین وہ افزونی جو بطریق تفضیل و رحمت ہوگی۔ اہل علم لکھتے ہین کہ حسنے جزاے نیک ہے، ایک کے بدلے ایک اور زیادہ دہ ہے جو ایک کے بدلے مین دس یا اُس سے بھی زائد عنایت ہو یا حسنے کو مغفرت سمجھئے اور زیادہ کو خوشنودی حضرت حق سبحانہ۔ تفسیر مدارک مین لکھا ہے کہ زیادۃ بندون کے قلب مین کی وہ محبت ہے جو دُنیا مین عطا ہو اور جس کا آخرت مین حساب نہ کیا جاے بعض فرماتے ہین کہ وہ ایک سحاب (ابر) ہے جو اہل بہشت پر سے گذرے گا اور جو خواہش کرینگے

ایک اور تاریخ بھی لکھی تھی ؎

میر عبد الجلیل کرد وفات　　ورضوا عنہ گشت سال ممات

ایک دائرہ تاریخی بھی تیار کیا تھا جس مین لاتعد ولاتحصے تاریخین برآمد ہوتی ہین اس کی تقریب آزاد ان الفاظ مین کرتے ہین۔



"وعبارت دائرہ مشتمل است بر صنعت اِطراد یعنی اسامی، اما ترتیب تا چہار پشت آمدہ بلکہ تا پنج پشت زیرا کہ نام پدر سید محمود سید حسین است پس لفظ حسینی درینجا بدو اعتبار آمدہ یکے نسبت با امام حسین علیہ السلام و دیگر نسبت بہ پدر سوائے آن مشعر است بر اظہار نسبِ مقام اصل و مسکن حال چون خالی از ندرت نیست دائرہ را با طریق استخراج ثبت می کنم۔

طریق استخراج تاریخ ازین دائرہ این است کہ از خانہائے چہاردہ گانہ ہر خانہ را کہ خواہند مبدأ قرار دہند و ہر عددے کہ بخاطر برسد شمار نمایند سوائے واحد و چہاردہ و اضعافش و اول بآخرین و ہر خانہ کہ شمار تمام شود، عددش بگیرند۔ پس عددے کہ بر آن شمار مقرر شدہ اگر فرد باشد باز خانہ منتہی را مبدأ گردانیدہ بتعداد نمایند مَرَّۃً بَعدَ اُخریٰ وَ دَورَۃً فَدَورَۃً تا آنکہ منتہی مبدا اصل گردد اکنون مقدار عددش بگیرند کہ مجموع اعداد حاصلہ تاریخ شود۔ و اگر زوج باشد خانہ مابعد منتہی را مبدا گردانند۔ و بہمین نمط شمار منجر شود تا آنکہ منتہی خانہ ماقبل مبدا اصل گردد پس بدستور مجموع اعداد حاصلہ تاریخ شود۔

مخفی نماند کہ مراد از اضعاف در اعداد مستثنے مثلین و سہ مثل و صاعداً باشد و اطلاق ضعف از روئے لغت بر

اُن پر برس جائے گا۔ جمہور محققین کا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے مراد حق تعالی کا دیدار ہے جو محض اپنے کرم و لطف سے بہشت والون کو نصیب فرماے گا

مثل فصاعداً آمدہ است برخلاف مصطلح علماء حساب فِي الْقَامُوسِ اَلضِّعْفُ بِالْكَسْرِ الْمِثْلُ اِلَى مَازَادَ يُقَالُ لَكَ ضِعْفُهٗ يُرِيْدُوْنَ مِثْلَيْهِ وَ ثَلٰثَةَ اَمْثَالِهٖ لِاَنَّهٗ زِيَادَةٌ غَيْرُ مَحْصُوْرَةٍ

آزاد سبحۃ المرجان میں ایسے دائرہ تاریخی کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُس کے واضع کا نام مجھے دریافت نہ ہوسکا سب سے پیشتر میں نے جس چیز کو دیکھا تھا وہ ایک دائرہ فارسی زبان میں تھا جس کو اُسکے مؤرخ نے ہندوستان کے ایک مشہور عارف باللہ[۵۲۳] کے لئے لکھا تھا جس نے سنہ ۱۰۶۱ھ (سنہ ۱۶۵۱ع) میں وفات پائی تھی۔

مصر دواکر بلگرام کے شاعر بھاکا و عالم سنسکرت نے اپنے ارتباط قدیم و محبت صمیم کے تعلق سے ایک دوھا (دوہرہ) میر صاحب کے ماتم میں نظم کیا تھا۔

نہ ہوا ہے او نہ ہوئے گا ایسو کہیں سُوشیل　　جیسو احمد نند جگ ہوے گیو میر جلیل

न हुआ है औ न होवेगा ऐसो कहीं सुशील
जैसो अहमद नन्द जग ह्वै गयो मीरजलील॥

اتفاق غریب یہ ہوا کہ جب اس دوہے کے اعداد نکالے گئے تو بلا کمی و بیشی تاریخ نکل آئی۔

---

۵۲۳ حضرت امیر ابو العلا نقشبندی اکبر آبادی سے مراد ہے۔ آپ کی تاریخ وفات کتاب فلاح دین و دنیا، میں ۹ صفر سنہ ۱۰۶۱ھ روز سہ شنبہ لکھی ہے۔ مفتاح التواریخ و تحفۃ الابرار و انوار العارفین و حجت العارفین بھی سنہ ۱۰۶۱ھ اور عمر ۷۱ سال لکھتے ہیں۔ امیر ابو العلاء کا سال ولادت ۹۹۰ھ اور مولد سرائے تلہ متصل دہلی تھا۔ آپ کے دادا امیر عبد السلام حسینی اکبر بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ یہاں سے زیارت بیت الحرام کیلئے تشریف لے گئے اور وہیں رحلت کی۔ ان کے بیٹے امیر ابو الوفا نے فتحپور سیکری میں وفات پائی اور نعش دہلی لے جا کر لعل دروازہ کے مدرسہ کے متصل دفن کی گئی۔ میر ابو العلاء نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے نانا خواجہ محمد فیضی کے زیر سایہ تربیت و تعلیم پائی۔ خواجہ صاحب عہد اکبری میں راجہ مان سنگھ صوبہ دار بنگالہ کے ہمراہ تھے اور بردوان کی فوجداری پر متعین۔ نانا کی شہادت کے بعد سہ ہزاری منصب مع سہ ہزار سوار آپ کو تفویض ہو گیا تھا۔ جہانگیر کے اوائل عہد میں دنیا کی ہوا و ہوس کو ترک فرما کر اجمیر چلے گئے وہاں سے آگرہ تشریف لائے اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔

عالم پُر است از تو و خالی است جائے تو

در ہیچ پردہ نیست، نباشد نوائے تو

تذکرۂ علّامہ میر عبد الجلیل بلگرامی

موسُوم بہ

حیاتِ جلیل

حصّہ دوم

جسمیں میر مبرور کے کلام اور تصانیف کا مبسوط تذکرہ، اور اُن پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔
نیز اولاد و احفاد و اعقاب و رمعاصرینِ قدر فرمایان کے مفصّل حالات مندرج ہیں

از

مولوی سیّد مقبُول احمد صاحب صمدنی

لیٹ ممبر رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ۔ و۔ فیلو رایل سوسائٹی
آف آرٹس، مینوفیکچرس اینڈ کامرس، لندن وغیرہ

---※---

کیوں اہلِ حشر ہو کوئی نظّارہ سوزِ دل

لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

فہرست عناوین مضامین تذکرہ علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی حصہ دوم

فہرست حواشی و فوائد تحت المتن تذکرہ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ دوم

بعض تصحیحات کتابت حصہ دوم

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
د	فہرست	١۴	اسکی ،وجہ	اسکی وجہ،	٣٣	٧	٠	تزوّدِ	تزوّدِ
۵	”	٩	احترار	احتراز	٣٦	٠	٢	٩٢٠ھ	٩٢١ھ
٦	٠	٣	ملکی	کی	٣٧	٣	٠	بِالتِنشاطِ	بِالتَّنشاطِ
۴	٠	١٦	میری	سیری	۴۴	٧	٠	اِنجھامۂ	اِنجھائۂ
١۴	١٩	٠	مفر	سفر	۴۴	٠	۴	سنہ ١٦٧٣	سنہ ١٦٧٣ء
١۵	٨	٠	بینی	ببیستی	۴٩	٦	٠	محفوظ	محظوظ
”	١٩	٠	١٨۵۴-١۵٣	١٨۵٢-۵٣	۵١	٨	٠	نست	نیست
١٩	١٩	٠	العلا	العسلا	”	١۵	٠	بتہادیا	بٹھادیا
٢٠	٦	٠	خوارند	خواندند	۵٣	١	٠	ہُزبَر	ہِزبَر
”	١٠	٠	تقیید	تقیید	”	٠	٢	موتم،فیم	موتم،فنیم
٢٢	١٠	٠	پیشر	پیشتر	۵۴	٨	٠	نصرتِ	نصرت
٢۴	٠	٧	عہدکی	عہدکے	۵۵	٠	٩	یعرفُ	یعرفٌ
”	٠	٩	موتیامحل	مٹیامحل	”	٠	١١	فحول	فُحُولُ
”	٠	١١	سیدمحمد قنوجی	سیدمحمد قنوجی متوفی	۵٦	٠	١٠	سر	سر دھر
				٢٢ شوال سنہ ١٠١١ھ	۵٧	٦	٠	تنیغ	تیغ
٢۵	٠	۵	٠٨٨ھ	١٠٨٨ھ	٦۴	٧	٠	مجھے	مجھے نشہ
٢٦	٠	٢	لڑکے کا	لڑکے سیدنور شمس	”	٠	٧	Biggs	Briggs
				مخاطب امجدخان کا	٦۵	۴	٠	بودوباش	بودوباش ۵٢ھ
”	٠	١۴	روایت	رفاہیت	٦٨	٩	٠	تخییل	تخیل
٣٣	٧	٠	جاہلاّتو	جاہلاّتو	٧۴	١١	٠	مفقدین	معتقدین

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۷۷	۵	۰	نہیاء نماز	نہیۂ نماز
۷۷	۰	۳	۱۶۷۲ء سمبت	۱۶۷۲ سمبت
۸۰	۱۱	۰	نہ ہوا تھے	نہ ہوا ہے
؍؍	؍؍	۰	کنین	کہیں
۸۲	۰	۰	چار	چہار
۸۳	۱۶	۰	बेहार	बेहात
۸۹	۱۴	۰	گردِ	گُرُدِ
۹۰	۷	۰	پیس	بس
۹۲	۰	۳	حدف تحتانی	حذف تحتانی
۹۵	۱۴	۰	شاگردن	شاگرداں
۹۷	۰	۱۳	فرمولی	فرملی
۹۹	۰	۱۹	کے سمت	کی سمت
۱۰۲	۰	۶	دیگر مسجد	دیگر مسجد
۱۰۳	۱۳	۰	مصاحیت سے	مصاحبت کی جہت سے
؍؍	۰	۱۹	سنہ ۱۰۰۸ھ	سنہ ۱۰۶۸ھ
۱۰۹	۰	۱۳	سنہ ۱۰۰۸	سنہ ۱۰۹۸ھ
۱۱۴	۳	۰	تخیل	تخییل
۱۱۵	۱۷	۰	نَصیبا	لَصِیبا
۱۲۱	۱۴	۰	بگلرار	بگلزار

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۱۲۲	۵	۰	جنوبی	جنوئی
۱۲۳	۷	۰	توسو	نوسو
۱۲۴	۱۱	۰	نواھی	نواحی
؍؍	۰	۷	آں بگلانہ	آں را بگلانہ
۱۲۷	۰	۶	اور دیگر	و دیگر
۱۲۸	۰	۸	سنہ ۹۸۱ء	سنہ ۹۸۱ھ
۱۳۱	۰	۱۲	سنہ ۱۳۳۶ء	سنہ ۱۳۲۶ھ
۱۴۰	۰	۳	فوجیں	فوجی
۱۵۳	۲	۰	معہ	مع
۱۵۳	۰	۹	صدی کے	صدی مسیحی کے
۱۵۵	۱۳	۱	کے مابین	نوٹ کی فاصل لکیر
۱۵۹	۲	۰	نُعِمَ	نِعْمَ
؍؍	۷	۰	المستصفی	المستنفعٔ
۱۷۵	۰	۱۸	وبات	دہات
۱۸۰	۵	۰	فماالقاوت	فماالتفاوت
۱۷۳	۹		qutidissime	putidissime
۱۷۳	۹	۰	qater	pater

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ازواج و اعقاب

میر عبدالجلیل کا ازدواج سید مرتضیٰ بن سید نصیر (ساکن) بلگرام کی دختر سے ہوا تھا۔ اس قران سعید کی یادگار ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکے کا نام سید محمد تھا۔ جو اپنے باپ کے خلف الصدق اور علم و فضل و سخنوری میں خاندان کا شرف تھے۔ ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ جدا لکھا جائیگا میر عبدالجلیل نے وقتاً فوقتاً جو خطوط داسفر سے ان کو لکھے تھے اور جن کو ترتیب دیکر انھوں نے یکجا کیا تھا محل مناسب پر ان پر بھی تبصرہ کیا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ تاریخ واقعات کو دُہراتی ہے میر عبدالجلیل کے باپ (سید احمد سید عبداللہ کے متبنیٰ تھے میر عبدالجلیل کے بیٹے کو بھی یہی صورت ضرورت پیش آئی۔ سید محمد کے کوئی اولاد صُلبی نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنے بھانجے سید غلام امام صادق (غلام علی آزاد کے سب سے چھوٹے بھائی) کو متبنیٰ کر لیا تھا۔

میر عبدالجلیل کی (۱) بڑی لڑکی سید محمد اشرف (پدر محمد یوسف) بن سید عبدالعزیز بھتہ سے

سلہ شجرہ طیبہ۔ جلد دوم

سلہ ۵۲ جب میر عبدالجلیل بھکر بن متعین و مقیم تھے تو محمد اشرف کو سیوستان میں اپنا نائب کر دیا تھا محمد اشرف جب وطن آئے۔ تو سید کرم اللہ اپنے برادر عم زاد کو نیابت سیوستان پر چھوڑ آئے تھے

سلہ ۵۳ محمد یوسف۔ میر غلام علی آزاد کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور ہم عمر و ہم سبق تھے۔ ایک مدت در تک دونوں یکجا رہے تھے جوانی اور بقیہ ایام حیات تقاضائے آب و خور سے آزاد نے سفر و سیاحت دکن میں بسر کئے اور یوسف نے وطن میں۔ یوسف نے بعد کو شاہجہان آباد جا کر علوم ریاضی و ہیئت و ہندسہ حساب وغیرہ تحصیل کئے۔ الفرع النابت من الاصل الثابت اُن کی تصنیف ہے۔ بیمار ہوئے۔ علاج کیلئے لکھنؤ گئے۔ ۲ جمادی الآخر ۱۱۶۲ھ (۲۱ جنوری ۱۷۴۹ع) کو لکھنؤ میں انتقال کیا نعش بلگرام آئی اور ۹ ماہ مذکور کو دفن کی گئی۔ یوسف و آزاد کے باہم بڑی محبت تھی۔ ایام مفارقت میں بڑی درد انگیز اور دلولہ خیز منظوم مراسلات وغیرہ لکھن ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ آزاد نے تاریخ وفات لکھی سلہ

مات محمد الزمان یوسفنا + ولہ راحۃ و ریحان

اذ تقاضیت عام رحلتہ + قال قلبی علیہ رضوان

(۲) منجھلی سید محمد نوح بن سید فیروز[۵۳] بہتہ (والد غلام علی آزاد) سے اور (۳) چھوٹی سید عنایت اللہ بن سید کرم اللہ سے بیاہی گئی۔ سید غلام صادق کے بڑے لڑکے میر اولاد محمد ذکا[۵۶]، زوجہ اولیٰ سے تھے۔ دوسری بی بی سے بھی اولاد ہوئی جس کا سلسلہ باقی و قایم ہے۔

سید نوح، اُن کے لڑکے اور متوسلین خود کو "بلگرامی" فخریہ بتاتے تھے لیکن بزرگان بلگرام کو اس دعوے انتساب پر ہمیشہ اعتراض رہا۔ منشی غلام حسن[۵۷] ثمین شرائف[۵۸] عثمانی مین لکھتے ہین۔

"بزرگ حضرت آزاد مذکور از قصبہ سمدن، در عہد ملک بہلول[۵۹] لودی در بلگرام برای تحصیل علم بر آمدہ بعد چندی بوجہ اخلاق اہلیان بلگرام طرح توطن انداختہ، این معنی بر جمہور قدمای بلگرام پیدا و ہویدا ست"

---

۵۴ سید محمد نوح سات سال تک بھکر، سیوستان میں میر عبد الجلیل کے نائب رہے تھے۔ ۱۰ محرم ۱۱۶۵ھ (۱۹ نومبر ۱۷۵۱ء) کی شب مین ستر سال کی عمر مین بلگرام مین ناگہان وفات پائی۔ کچھ دن تک نواب سربلند خان کی ملازمت و رفاقت مین بھی رہے تھے۔ الہ آباد متعلق خدمت تھا۔

۵۵ سید فیروز نے رجب ۱۱۲۰ھ (جولائی ۱۷۱۶ء) مین وفات پائی۔

۵۶ میر اولاد محمد ذکا، آزاد کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۰ رجب ۱۱۵۱ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۳۸ء) کو پیدا ہو۔ اپنی تاریخ ولادت خود کہی تھی ؎

روزے کہ نمود بندہ را حق ایجاد ۔۔۔ اولاد محمد پدرم نام نہاد
گفتم تاریخ خویشتن را من خود ۔۔۔ در ماہ رجب تولد ما رُو داد

آزاد نے ان کو ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۹ء) مین اپنے پاس بُلا لیا تھا۔ وہین اورنگ آباد مین زیر سایہ عم محترم تعلیم و تربیت پائی۔ خوش لیاقت و خوش گو تھے۔ آزاد نے تذکرہ خزانۂ عامرہ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) مین اُنکی فرمایش سے لکھا تھا۔

۵۷ غلام حسن صدیقی فرشوری تھے۔ نامور خاندانی قاضی اور اہل علم تھے۔ آزاد کی مآثر الکرام فی تاریخ و نسب سادات، بلگرام کے جواب مین وہان کے شیوخ کی ایک مبسوط تاریخ شرائف عثمانی نام ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵-۶۶ء) مین لکھی تھی۔ ان کا تذکرہ سرو آزاد مین بھی ہے (صفحہ ۳۰۵) شرائف عثمانی ایک مستند کتاب ہے۔ اکثر مورخین و تذکرہ نگاران نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

۵۸ افسوس ہے کہ یہ تاریخ اب تک طبع نہین ہوئی۔ بلگرام و سمدن و سندیلہ وغیرہ مین اس کے متعدد نسخے پرانے رؤسا و شرفا کے یہان محفوظ ہین، نیز انگلستان مین انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم مین۔ ولیم اروین نے کو اپنے کے نیلام گھر سے ایک نہایت صحیح و مکلف نسخہ خریدا تھا جس پر بعض پرانے اُمرا کی مُہرین اور عالی مرتبت انگریز عہدہ داران فوجی و ملکی کے دستخط ثبت تھے۔ مفتاح التواریخ مین مسٹر طامس ولیم بیل نے اس کتاب کا اکثر

سمدن ضلع فرخ آباد کی مقامی روایات اور پرانے اسناد و مقالات و مقامات بھی ثبتین کے قول کی تصدیق کرتے ہین۔ عہد اسلام کے نامور مورخ و محقق ولیم آروین نے جو فرخ آباد مین مدت تک حاکم اعلی رہے تھے۔ واقعات احمد شاہ ابدالی و وزیر عماد الملک[۱۱] کے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ مین اس امر کو اپنے مخصوص انداز مین بیان کیا ہے۔

فرزندانِ مجازی

اس صنف مین فرزندگان پیشینہ نے عموماً تلامذہ و خوشہ چینان خرمن علم کو شامل و داخل کیا ہے۔ میر عبد الجلیل کے شاگردون کا شمار بہت کم تھا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی عمر با حیاتِ علمی کا بڑا حصہ مشاغل خدمات اور حضوری دربار مین گذرا ہو جسکے اوقات عزیز ادائے فرائض و سنن کے بعد تمامتر حل و عقد امور حکومت و نظم اور عالم رزم و بزم مین بسر ہوتے ہون اپنے مائدہ فیض سے شائقین علم و فن کے لئے صلائے عام دینے کا موقع کہان پا سکتا تھا۔ تاہم وہ تھوڑا سا وقت جو میر صاحب بچا سکے اور جس مین اپنے مونہار اعزہ کو اپنے ہمراہ یا زیر نظر رکھ سکے بہت قابل قدر تھا اور حقیقتاً وہ نہایت عمدہ مصرف و شغل مین گذارا گیا۔ میر عبد الجلیل کے دونون جگر گوشے (دختر زادے)

حوالہ دیا ہے اور بہت سے بلگرامی حضرات کے حالات اسی سے نقل کئے ہین۔ اسکا ایک عمدہ اور مکمل نسخہ بنگال ایشیاٹیک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ مین موجود ہے۔

[۹] سلطان بہلول نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ع) سے ۸۹۴ھ (۱۴۸۸-۸۹ع) تک یعنی ۳۸ سال ۸ ماہ، رونق سلطنت کی تھی

[۱۰] مشین نے چند واقعات چشم دید کو ۱۸۰۵ع (۱۲۲۰ھ) مین کپتان جوناتھن اسکاٹ کی فرمایش سے قلمبند کیا تھا۔

[۱۱] Ahmad Shah Abdali and The Indian Wazir Imad-ul-Mulk (1756-57), by William Irvine.—1907. Bombay Education Society's Press.

غلام علی آزاد، اور محمد یوسف، یوسف، بلحاظ تعلیم و تربیت اُن کے خلف صالح اور بہترین یادگار ثابت ہوئے ہین۔ آزاد کا ترجمۂ احوال و سوانح مستقلاً اس تذکرہ مین دیا جائیگا۔ یوسف کا مختصر تذکرہ حواشی ذیل مین آچکا ہے۔

ان کی تعلیم و تعلم کی حالت بھی یہ تھی کہ جب ۱۱۳۲ھ / ۱۹-۱۷۲۰ء مین سولہ سال کے بعد میر عبد الجلیل بلگرام آئے تھے تو آزاد سترہ سال کے تھے اور یوسف آزاد سے چھ ماہ چھوٹے۔ دونون نے اپنے سن شعور مین ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بلگرام کے دس ماہ کے قیام مین جو کچھ سیکھا ہوگا اسکو محض شرف تلمذ یا احراز سعادت کہنا چاہئے۔ اسی عمر مین اُسی استعداد و قابلیت کیساتھ دونون نے میر صاحب سے سند حدیث مسلسل بالاولیۃ اور حدیث اسودین کی

۵۱۲ حدیث رحمت مسلسل بالاولیت یہ ہے الراحمون یرحمہم الرحمن تبارک وتعالی ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء اس کی تضمین بہت سے ائمہ و حفاظ حدیث نے فرمائی ہے۔ شیخ ابو الخیر محمد بن محمد بن علی الشہیر بابن الجزری کہتے ہین۔

تجنب الظلم من کل الخلائق فی کل الامور فیا ویل الذی ظلما
وارحم لقلبک خلق اللہ کلھم فانما یرحم الرحمن من رحما

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر دمشقی فرماتے ہین۔

بادر الی الخیرات یا ذا اللب مغتنما ولا تکن عن قلیل الخیر محتشما
واشکر لمولاک ما اولاک من نعم فالشکر یستوجب الافضال والکرما
وارحم بقلبک خلق اللہ وارعھم فانما یرحم الرحمن من رحما

۵۱۳ محدثین کے نزدیک بالاتفاق اسودین (دو کالی چیزون) سے مراد کھجور اور پانی ہین۔ ظاہر ہے کہ عرب کی عمدہ اور نفیس کھجور سیاہ ہوتی ہے۔ اُس کی مجاورت و مقارنت کے سبب سے پانی کو بھی سیاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کلام عرب مین اس طرح اکثر آتا ہے جیسے ابوین اور قمرین۔ اسکو تغلیب کہتے ہین۔

ماثر الکرام مین حدیث اسودین کی سند کا حاصل کرنا لکھا ہے اور وہ حدیث یہ ہے عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا شَبِعْنَا مِنَ الْاَسْوَدَيْنِ متفق علیہ حضرت عائشہ فرماتی ہین کہ پیغمبر خدا نے وفات پائی اور ہم نے دو سیاہ چیزون یعنی کھجور اور پانی سے پیٹ نہین بھرا یعنی یہ قوت بھی بطریق سیری نہ ملا، اس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

مسلسلات مین بھی ایک حدیث متعلق بہ اسودین داخل ہے جو حدیث مسلسل بالضیافۃ علی الاسودین

حاصل کی۔ اکثر کتب احادیث کی بھی اجازت پائی۔ اِس کے بعد یہ دونون (خالہ زاد بھائی جو ہم عمر اور ایک ہی سال کے پیدا تھے اور ہمیشہ ایک جگہ رہے تھے) سنہ ۱۱۳۴ھ مطابق سنہ ۱۷۲۱ع مین میر عظمت اللہ بلگرامی کو ساتھ لے کر شاہجہان آباد گئے اور وہان دو سال کے قریب اُن کی صحبت مین رہے اور بعض کتابین حدیث و سیرۂ نبوی و ادب و دیگر فنون کی پڑھین لغت بالخصوص قاموس جس کے میر صاحب ماہر فرید سمجھے جاتے تھے، انھین سے پڑھی طریق تحصیل یہ تھا کہ ہمیشہ دو کتابین یا ایک ہی کتاب دو مقام سے باہدگر پڑھتے تھے۔ ایک سامع ہوتا تھا دوسرا قاری۔ دونون کی رفتار علم یکسان و برابر رہتی تھی۔ احیاناً اگر ان مین سے ایک بیمار پڑجاتا یا کوئی اور امر مانع پیش آجاتا تو دوسرے کا سبق بھی ناغہ کر دیا جاتا، معرض توقف مین رکھا جاتا۔ اسکے ساتھ یہ روش بھی جاری رہتی کہ یہ دونون جب موقع پاتے تو اورون کو بھی پڑھاتے تھے۔

میر عبدالجلیل کے جامع کمالات و فنون بیٹے میر سید محمد کو بھی اِن کے فیضان صحبت اور ارشاد و ہدایت سے کافی حصّہ پہنچا تھا۔ اُنھون نے اپنے باپ کے پارہائے جگر یا زاد ہائے سبع کے القاء و ترتیب مین حصّہ لیا تھا اسلئے وہ بھی جداگانہ تذکرہ کے محتاج و مستحق ہین۔

یا حدیث مسلسل بالاضافۃ علی الاسودین کہلاتی ہے وہ یہ ہے

قال علی بن ابی طالب کرم اللہ وجھہ۔ اضافنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی لتمر والماء ثم قال من اضاف مومنا فکانما اضاف آدم علیہ السلام ومن اضاف مؤمنین فکانما اضاف آدم وحوا ومن اضاف ثلاثۃ فکانما اضاف جبرئیل ومیکائیل واسرافیل ومن اضاف اربعۃ فکانما قرأ التوراۃ والانجیل والزبور والفرقان ومن اضاف خمسۃ فکانما صلی الصلوٰۃ الخمس فی جماعۃ من اول یوم خلق اللہ عزوجل الخلق الی یوم القیامۃ ومن اضاف ستۃ فکانما اعتق ستین رقبۃ من ولد اسماعیل علیہ السلام ومن اضاف سبعۃ غلقت عنہ ابواب جھنم السبعۃ ومن اضاف ثمانیۃ فتحت لہ ثمانیۃ ابواب الجنۃ ومن اضاف تسعۃ کتب اللہ لہ حسنات بعدد من عصاہ من اول یوم خلق اللہ الخلق الی یوم القیمۃ ومن اضاف عشرۃ کتب اللہ لہ اجر من صام وصلی وحج واعتمر الی یوم القیمۃ ۔

جب تک دارالخلافہ مین قیام تھا بعض جلیل القدر مشائخ و عمائد بھی ان کے حلقۂ درس مین حاضر ہوتے اور مائدۂ فیض سے زلّہ ربائی کرتے ہیتے فقر و تصوّف کی کتابین پیش نظر ہوتین۔ مجاہدات و ریاضت و تزکیۂ نفس و مکاشفات کے مسائل زبان حال سے بیان ہوتے غوامض و نکات حل کئے جاتے۔ انوار و برکات کا نزول ہوتا۔ ایک طرف دونون نوردیدہ (آزاد و یوسف) علم و ادب کے سبق لیتے۔ دوسری طرف سید غلام مصطفیٰ شہید معتمد و مصاحب نوآب مبارز الملک سربلند خان توفی ناظم گجرات، مثنوی مولانا روم کا ورد کرتے سبقاً سبقاً پڑھتے اور اجازت و سند لیتے تھے، میرآزاد یدبیضا مین لکھتے ہین " مستعدانے کہ در وادی علوم علم مہارت می افراشتند اکثر مشکلات لاینحل خود را برای عقدکشای آنجناب عرض می داشتند "

میر عبدالجلیل کے بعض خواص تلامذہ اور نیازمند احباب یہ تھے

(۱) میر احمد لاہوری متخلص بہ فائق عالمگیری منصب دار اور لاہور مین مہتمم خزانہ سرکار تھے بڑے طباع و ذہین نظم مین سلیقۂ وافر رکھتے تھے جس زمانہ مین کہ میر صاحب شاہ دولا گجرات مین تشریف رکھتے تھی میر احمد اپنے اشعار انکے پاس بھیجا کرتے تھے اور بڑے عجز و عقیدت سے اصلاح کیلئے درخواست کرتے تھے۔ انکے بعض سودات کے آخر مین انکے قلم سی لکھی ہوئی یہ عبارت ملی تھی

" سیدا، ملاذا، مشفقا، مہربانا! درین ولا از شغل باز ماندہ از گفتنی ہا گذشتہ غزلے چند نوشتہ شدہ بنظر اصلاح خواہد در آمد۔ "

---

۵۱۴ نوآب سے اور مہاراجہ ابھے سنگھ والی مارواڑ سے احمدآباد گجرات کے قریب ۸ ربیع الآخر ۱۱۴۳ھ (دسمبر ۱۷۳۰ع) مین جنگ شدید ہوئی اُسی مین شہید ہوئے تھی نعش مبارک ہرچند تلاش کیگئی نہین ملی شہادت سے پہلے یہ رباعی کہی تھی جسمین حال آیندہ کی خبر دی تھی ؎

در خلوت ما، ورائے ما پارے نیست | یعنی کہ بعرش و فرش اغیارے نیست
ماچون جانیم پاک ز آلایش مرگ | مارا بہ جنازہ و کفن کارے نیست

میر عبدالجلیل کے ہموطن اور بڑے مرتاض اور عالم ربانی تھے گو بظاہر سپہ گری کے پیرایہ مین بسر فرماتے ابتدا مین فارغ تخلص کرتے تھے پھر ترک کر دیا تھا۔ غزل اور رباعیات کا دیوان مکمل ہوچکا تھا۔ توحید مین باعمل

فائق کا خاندان بھر شاعر، اور شہرت یافتہ شاعر تھا میر جلال الدین سیادت، ان کے حقیقی بھائی تھے لیکن فائق نے ایک بیگانہ سے تلمذ و اصلاح پسند کی۔ بھائیوں سے رجوع نہیں کیا یہ محض قدر کمال اور نظر انتخاب کی کشش تھی۔

(۲) سید محمد زمان راسخ سہرندی، بڑے پایہ کے شاعر اور خوش گو تھے۔ انکی شہرت اور ناموری ایران تک پہونچی تھی۔ مرزا طاہر نصیر آبادی نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں ان کو یاد کیا ہے۔ شاہزادہ محمد معظم بن عالمگیر بادشاہ کی سرکار میں منصب ہفت صدی ذات پر سرفراز تھے اور حسن شمائل و لطف خصائل سے متصف میر عبد الجلیل اور راسخ سے بڑا ارتباط تھا کچھ روز تک دونوں آگرہ میں اقامت گزین رہے تھے اُس وقت کا اختلاط و وِداد آخر تک قائم رہا۔ اُسی زمانہ سے راسخ اپنا کلام میر کو دکھاتے تھے سنہ ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ع) میں سہرند میں وفات پائی۔ "راسخ بمرد" تاریخ ہے۔ مثنوی خوب کہتے تھے یادگار شایستہ چھوڑی تھیں۔ راسخ ہی نے ناصر علی کو بچایا اور دہلی بھجوا دیا تھا۔ شیخ محمد معصوم نے ناصر علی کو ایک باغ میں شراب پیتے دیکھا اور پوچھا "کیا ہے؟" جواب ملا کہ " وہ شراب جس کو ملائکہ پیتے ہیں"۔ شیخ نے تو درگزر فرمایا لیکن صوفیوں اور علماء نے تکفیر کی بنا پر محضر قتل تیار کیا راسخ مع اپنے اقربا کے مسلح ہو کر گئے اور ناصر علی کو ساتھ لے جا کر سہرند سے دہلی روانہ کر دیا۔

راسخ کے لڑکے میر معصوم مخاطب بہ عالی نسب خان متخلص بہ وجدان بھی مشہور شاعر تھے ارادت خان اور میر غازی شہید دونوں راسخ کے شاگرد تھے۔

(۳) شیخ محمد رضا جن کا ذکر پیشتر آچکا ہے اصل میں شوشتر کے رہنے والے تھے۔ بھکر میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ عربی فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک بھکر کے اکثر عہدے مثلاً فوجداری بھکر وغیرہ اصالتاً و نیابتاً ان کے تعلق رہے تھے۔ میر عبد الجلیل سے اعتقاد تمام رکھتے تھے اور بے انتہا انقیاد و اطاعت سے پیش آتے، اپنا کلام شاگردانہ دکھاتے تھے۔ سنہ ۱۱۴۲ھ (۳۱-۱۷۳۰ع) میں وفات پائی۔ میر عبد الجلیل جب

کے لکھنے میں سلیقۂ عالی رکھتے تھے حکیم سحابی کی تقلید میں ایک پورا دیوان رباعیات کا مرتب کر لیا تھا۔

ہندوستان چلے آئے تھے تو بھکر مین شیخ کو اپنی خدمات پر نیابتًا مقرر کر آئے تھے،

(۴) شیخ سیف الدین محمد طبیعت تخلص، اعیان و مشائخ الور[۱۵] سے تھے، ان کے والد شیخ غلام محی الدین، صاحب فضل و کمالات تھے جا علوم متداولہ اور فنون متعارفہ مین دستگاہ کامل عربی و فارسی ہندی کی نظم مین سلیقہ خوب رکھتے تھے۔ شیخ سیف الدین نے اوائل مین مختصرات متداولہ مختصر المعانی تک اپنے والد سے پڑھی تھین۔ اس کے بعد میر عبد الجلیل کی صحبت مین پہونچے اور اُن سے فضائل و کمالات اکتساب کئے، علوم ادبیہ مین پوری مہارت اور عربی و فارسی کی نثر مین ید طولیٰ رکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد جب ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴-۳۵ع) مین سفر سندھ سے واپس آرہے تھے تو شیخ سے ملاقات کا اتفاق ہوا، ایک ماہ کے قریب شب و روز صحبت رہی

[۱۵] الور: شمالی راجپوتانہ مین ایک بڑی ریاست ہے جس کے اطراف مین صوبہ پنجاب دریا ستہائے جے پور و نابھ و پٹیالہ و بھرت پور واقع ہین۔ یہان کی پہاڑیون مین بعض نہایت عمدہ قسم کے پتھر برآمد ہوتے ہین شہر الور۔ راجپوتانہ مالوہ۔ ریلوے لاین پر واقع ہے۔ الور کا تلفظ مختلف طور پر کیا جاتا ہے اور مختلف وجوہ تسمیہ بتائی جاتی ہین بعض کہتے ہین کہ پہلے اس کا نام الپُور یعنی مضبوط شہر تھا بعض کا قول یہ ہے کہ اس کا پُرانا نام اَرْبَل پُور یعنی شہر اَرْبلی منسوب بہ اروَلی (سلسلہ کوہ) تھا جسکے ساتھ الور کی پہاڑیان وابستہ ہین جنرل کننگھم کا خیال تھا کہ یہ نام قبیلہ سَلْوِسْ سے نکلا ہے پہلے سَلْوہ پورہ تھا پھر سَلْوَر پھر ہَلْوَر اور بالآخر الْوَر ہوگیا۔ شہر کے پانچ پھاٹک ہین اسکے گرد فصیل و خندق ہے صرف ایک موقع پر اسی طرف اتنی جگہ پر نہین ہے جو سلسلۂ کوہ سے محفوظ ہے اور جس طرف سے قلعہ ہر قسم کے حملون سے بچا ہوا ہے۔

۱۹۰۱ع مین شہر کی آبادی ۵۶۷۷۱ تھی مگر گذشتہ مردم شماری (۱۹۲۱ع) مین ۴۴۷۶۰ رہگئی عمارات قدیمہ مین ایک پرانا مقبرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ع) مین ترنگ سلطان کی یادگار مین بنایا گیا تھا جو فیروز شاہ تغلق کا بھائی تھا۔ بعض کہتے ہین کہ ناہر خان میواتی کا پوتا تھا چند قدیم مساجد بھی ہین جن کے کتابے ستاہ حال و مقال ہین۔ ان مین سے حسب ذیل قابل تذکرہ ہین (۱) مدور مسجد، جو دائرہ کی مسجد کہلاتی ہے قریب ۱۵۶۹ع (۹۷۶ھ) کی تعمیر ہوئی ہوگی جب اکبر کا گذر اس طرف سے ہوا تھا۔ یہی اکبری مسجد بھی کہلاتی ہے اور محلات کے قریب ہے (۲) اورنگزیب کی بنوائی ہوئی مسجد (۳) قلعہ نہایت مستحکم و استوار ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

میر آزاد ان کی خوبی و فضائل، حسن شمائل، تہذیب اخلاق، مکارم آداب، شکوہ، تمکین و وقار، ہر ہر ادا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ شیخ کہتے تھے کہ میں مدت سے میر عبدالجلیل کے کمالات کا شہرہ سن رہا تھا اور ان کی محبت غائبانہ میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی اور بڑھتی جاتی تھی۔ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں میں وارد دہلی ہوا اتفاقاً جہاں فروکش ہوا تھا اسی کے قرب و جوار میں میر مرحوم بھی اقامت گزین تھے مجھے جیسے ہی اکی اطلاع ملی میں نے آپکی خدمت میں رقعہ لکھا۔ اس میں یہ دو شعر استاد مرحوم کے بھی داخل کر دیئے تھے۔ ؎

سلام علی من شاقنی بوصالہ — وان لم افز الا بطیف جمالہ

عشقت وما ابصرتہ غیر اننی — سمعت من الحاکین وصف کمالہ

رقعہ بھیجنے کے بعد خدمت میں حاضر ہوا اور سعادت ملازمت حاصل کی۔ میں نے جو کچھ پایا ہے یہ سب میر کے فیض تربیت سے ملا ہے۔

خُدّام

عالمگیر سا باجبروت و جوہر شناس شہنشاہ اپنے رقعات میں ہر جگہ کاردان و کارآمد آدمی کے نہ ملنے کا اعتراف کرتا اور کہتا ہے کہ "آدم خوب نایاب است" اسکی زبان پر یہ شعر بار بار آجاتا ہے ؎

آنچہ بر جستیم و کم دیدیم و بسیار است و نیست — نیست جز آدم، درین عالم کہ بسیار است و نیست

یہ تو ڈھائی سو برس پہلے کی بات تھی۔ اب اس زمانہ میں کہ ہر طرف سے قحط الرجال کی شکایت کی

نگو ہسار اجیو تون نے اسکو بنوایا تھا جو خانزادون کے تسلط سے پہلے یہاں غالباً حکمران تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑی قبر ہے جو فتح جنگ کی کہلاتی ہے غالباً وہ بھی خانزادہ تھا لیکن اس کا نسل ہنود سے ہونا کتبہ سے عیاں ہے کتبہ ۹۵۴ھ (۱۵۴۷ء) کا ہے اور ناگری ہے۔ یہ مقبرہ ساٹھ فیٹ مربع ہے۔ تین منزلین اسی طول و عرض کی ہیں جن پر انہوزہ نما "ہشت گوشہ" مینار چارون کونون پر ہیں۔ سب سے اوپر ایک چوتھی منزل بھی ہے جو مربع ہے مگر نسبتاً عرض و طول کسی قدر کم ہے۔ اسکی ہیئت ہشت گوشہ، صراحی دار گردن سے ابھرتا ہوا گنبد نمودار ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا مربع قبہ بنا ہوا ہے جو ایک برگ و بار دار ظرف پر قائم ہے۔

صدہائے دلخراش اور بھی بلند ہو رہی ہے کون شخص اُس خوش نصیبی کا اندازہ کرسکتا ہی جو میر عبدالجلیل کو اپنے ملازمان خدمت اور مقربان صحبت کے بارہ مین حاصل تھی۔ اُن کے خطوط سے جو میر سید محمد کو لکھے مین پایا جاتا ہی کہ ان اقارب و ارذال کی تعداد کثیر بھی مسلمان چاکرون سے ہندو نوکرون اور کہارون کا شمار زیادہ تھا جو ہر قسم کی خدمت بجالانے اور وطن اور عزیزان وطن کی خبر اور ڈاک برابر لاتے رہتے تھے۔ اُن خطوط سے معلوم ہوتا ہی کہ۔ فرحجام حسین۔ مداری و فیض اللہ خدمتگار ذاتی تھے گھاسی قاصد تھا فریدؔ۔ پانڈے چنتامن۔ حجال داسو دبھی ہم وطن اور معتمد ملازمان خدمت سے تھے۔ نچ کا کوئی خط ان لوگون کے ذکر سے خالی نہین جاتا تھا کبھی اصرار کرتے مین کہ ان رفیقان دُور افتادہ از وطن کے گھر پر ان کی خبر خیریت پہونچا دینا کبھی فرزند رشید کو لکھتے ہین کہ "جانی و درگاہی کے بارہ مین آپنے لکھا تھا بالفعل مین روپیہ بھیجتا ہون۔ اس کے بعد اور بھی بھیجون گا۔ خاطر جمع رکھو گا اس وقت اس سے زیادہ میسر نہوا" کم از کم ہر تحریر مین یہ تاکید ضرور ہوتی تھی کہ "مردم ہمراہی" کے گھر پر نام بنام خیریت کہدینا اور سلام پہونچا دینا۔ اہل وطن سے کسی کا قاصد جب کبھی خبر خیریت لے کر گھر سے آتا تھا تو اُسپر بھی نگاہ لطف و کرم مبذول رہتی تھی میر صاحب معمولاً اپنے خدمتگاران کو نفر لکھتے تھے اور سپاہی و چپراسی کو پیادہ۔

نین سکھ اُن کا منشی اور مقرب خاص تھا جس زمانہ مین دربار کی حاضری دونون وقت دینی پڑتی تھی اور میر صاحب عدیم الفرصت تھے تو افسوس کرتے تھے کہ "نین سکھ بیمار ست لہذا جواب خطوط مردم

اکبر کے زمانہ مین اوچھیہ آگرہ مین ایک سرکار تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہی۔ "او قلعہ دارد از سنگ بالای کوہ" ہزلری نیس راج راجشیر بھارتہ دہرم پربھاکار سوائی مہاراج شری سنگھ جی دربندر دشرگمونی بالقابہ کے عہد دولت مین شہر اور ریاست اورسنے کمال رونق و ترقی حاصل کی ہے۔ حضور ممدوح بڑے علم دوست ہنر پرور بیدار مغز و روشن خیال فرمانروا مین۔ اور کے ممتاز و نامور رؤسا کو جو دلچسپی السنہ و علوم مشرقیہ کے ساتھ رہی ہے اور جس کا جلوہ مرزا غالب اور دیگر انشا پردازون کی نیازمندانہ و شکرانہ تحریرات مین نظر آتا ہے۔ وہی التفات دسرپرستی سرکار عالی بھی مبذول فرما رہے مین۔

آنجا کہ میر بند نمی شود کہ بنویسیم۔ بہر کدام عذر خواہند گفت“۔ دوسرے خط مین لکھتے ہین کہ ”نیناسکھ بتاریخ ششم جمادی الآخر سنہ ۴ بقضائی الٰہی فوت شد۔ تاسف بسیار نمودیم بجز صبر چارہ نیست“ کوئی نوکر مر جاتا تو ان کو بے حد قلق و الم ہوتا۔ میر عبد الجلیل کا ایک پروردہ یا غلام تھا جس نے سفر دکن مین بہت خدمت کی تھی اور کمال وفادار و ثابت قدم ثابت ہوا تھا۔ قضائے الٰہی سے خلد مکان کے لشکر مین وبا پھیلی۔ ایک عالم تاراج فنا کے حوالہ ہوا اس غریب کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا میر نے اس رفیق دیرینہ کے ماتم مین ایک نہایت پُرسوز مثنوی لکھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

بیا اے خامۂ ماتم روایت پریشان ساز گیسوئے حکایت

میر ناصر علی[۱۶] سرہندی سے ایک روز اس مثنوی کا ذکر آگیا سُن کر نہایت محظوظ ہوئے نقل کی استدعا کی۔ میر عبد الجلیل نے ایک نسخہ بھیجدیا۔ ناصر علی نے اسکی رسید مین یہ شعر فی البدیہہ کہکر اور زرافشان کاغذ کے شقہ پر لکھ کر بھیج دیا۔ ؎

ندانم تا چہا از دست آن وب تو می آید کہ بوئے خون مظلومان ز مکتوبت می آید

ہزار رحمت اس گمنام غلام پر جس کی موت اُسکے بقائے نام کا باعث ہوئی اور شہرت دوام کی خلعت مین فرجام ان کا ملازم ذات تھا۔ لگیرام مین بیمار پڑ گیا تو برابر اسکی مزاج پُرسی کرتے اور دعا کے ساتھ یہ کہلا بھیجتے ہین کہ ”اگر خوب تندرست ہو گئے ہو اور سفر کی طاقت ہو تو یہان آنا۔ ورنہ وہین ٹھہرنا تکلیف نکرنا“

[۱۶] شیخ ناصر علی سرہندی، سید تھے مشیخت و بزرگی کے اعتبار سے شیخ کہلاتے تھے۔ بڑے مشہور اور قادر الکلام شاعر تھے۔ علوم و فنون ظاہری کے سوا کمالات باطنی مین بھی پایہ بلند حاصل تھا شیخ محمد معصوم خلف الصدق حضرت مجدد سے استفادہ کیا تھا۔ سلسلۂ علیا نقشبندیہ مین منسلک تھے۔ اپنے وطن سرہند مین پیدا ہوئے۔ وہین درس و تعلیم پائی۔ ابتدا مین مرزا فقیر اللہ مخاطب سیف خان بدخشی متخلص بہ والا کے یہان ملازم رہے جب مرزا صوبہ الہ آباد کی حکومت پر مامور ہوا تو شیخ بھی اُس کی رفاقت مین الہ آباد چلے آئے اور چند روز نرمبنی کی سیر و تفریح سے دل و دماغ تازہ کرتے رہے۔ سیف خان خود جوہر قابل، قابل دوست تھا۔ فن موسیقی اور رقص ہندی مین ایک نہایت نفیس کتاب فارسی زبان مین ”راگ درپن“ نام لکھی ہے۔ اُس کے ساتھ شیخ کی خوب بسر ہوئی۔ اُسکی وفات پر [illegible] (۱۶۰۸ء) مین شیخ بیجاپور چلے آئے اور امیر الامرا

اولادِ معنوی

اس ذیل مین میر عبدالجلیل نے کچھ بڑا سرمایہ نہین چھوڑا۔ اس کے وجوہ بھی یقیناً وہی تھے جو فرزندان مجازی کے تذکرہ مین بیان ہو چکے ہین۔ تاہم یہ عنوان بھی خالی نہین رہا بلکہ اسکی بحث و تفحص و تبصرہ نے اس ناچیز تالیف کے چند اوراق سے زیادہ حصہ لے لیا ہے۔ اس ہیچمدان نے ہر صنف کلام کو جدا جدا رکھنا اور ان پر نظر ڈالنا چاہا ہے۔ میر صاحب کے نتائج طبع سے چند مختصر مثنویان چند قصائد چند رباعیان۔ چند نغمے۔ اور چند قطعات تاریخ یادگار ہین۔

مثنویات مین سے صرف مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ ایک مستقل کتاب ہے جو طبع ہو چکی ہے جس پر جداگانہ تبصرہ کیا جاویگا۔ اسیطرح مثنوی کتخدائی ارشاد خان اور مثنوی امواج الخیال۔ اور یہی چند چیزین ہین جو آزاد کے زندہ جاوید قلم کے طفیل مین کم و بیش ہم تشنہ کامان علم و ادب تک پہونچی ہین۔

باوجودیکہ میر عبدالجلیل اپنی خدمات شاعرانہ و ثناگستری کا صلہ نہین لیتے تھے تاہم بوجہ تعلقات دربار و ملازمت سرکار آپ کو امرا کی قصیدہ خوانی بارہا کرنی پڑتی تھی۔ ان کے بعض قصائد اپنے اپنے موقع پر حسب ضرورت نقل کیے جائینگے۔ ان کے قصیدے متوسط درجہ اور حیثیت کے ہوتے تھے جنمین کوئی زور یا خاص شان سخنوری یا لطافت ادا نہین پائی جاتی۔

باقی چیزین (تاریخین رباعیان قطعات اور معمیات)، نہایت مختصر اور متفرق ہین جن کو اس خاندان کے علمی متروکات سے ڈھونڈھ کر نکالنا پڑا ہے۔

ذوالفقار خان بن اسد خان وزیر اعظم اورنگزیب و شاہ عادل پسر شریف خان صدر کل و غضنفر خان کی قدرشناسی و زرپاشی سے برفاہ و آسایش گذاری۔ بالآخر ایک فقیر مجذوب شاہ جمید کے کہنے سے دکن سے پھر ہندوستان چلے آئے شاہجہان آباد مین قیام اختیار کیا قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ (۵ اپریل ۱۶۹۷ء) کو ساٹھ سال کی عمر مین رحلت فرمائی۔ مرقد حضرت سلطان المشائخ کے حوالی مین دفن ہوے۔ ان کی مثنویون کو اہل سخن بڑی قدر اور لطف سے دیکھتے اور پڑھتے ہین بعض حضرات نے انکی تقلید پیروی بھی کی مگر ناکام رہے،

میر غلام علی آزاد سبحۃ المرجان مین میر عبد الجلیل کے تفردات سے ایک دلیل ہندی کا بھی حوالہ دیتے ہین جو مسئلہ جز لایتجزأ کے ابطال کے بارہ مین ہے۔ اس رسالہ پر چھپیہ زر کو دسترس نہ ہوسکا ورنہ کچھ اُس سے بھی التقاط و استنباط کیا جاتا۔ آزاد نے جس قدر نقل کیا ہے۔ وہ عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے قطعاً دلچسپ نہین۔

بل صاحب کی انگریزی تاریخ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۱ء مین دو کتابون کا نام اور لیا گیا ہے (۱) آداب المرسلین (۲) تبصرۃ الناظرین۔ (حالانکہ تبصرۃ الناظرین میر سید محمد کی تحریر ہے)

میر غلام علی آزاد اور دیگر تذکرہ نویسون نے میر عبد الجلیل کی تصنیفات مین ان دونون کتابون کا ذکر نہین کیا اور اس لئے اِن کو میر عبد الجلیل سے منسوب ماننے مین تامل ہوتا ہے۔

ایک اور چیز بھی مستقل تذکرہ اور تبصرہ کی محتاج و مستحق ہے اور جس کی نسبت آزاد نے مآثر الکرام مین تحریر فرمایا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق الشان پارہ از منشآت والاجمع کردہ اند" یہ خطوط وہی ہین جو میر صاحب نے اپنے صاحبزادہ کو سفر پیش تر پایہ تخت دہلی، سے لکھے تھے اور جن سے زیادہ تر ذاتی معاملات اور تعلیمات اور خاندانی احوال پر روشنی پڑتی ہے اور کاتب اور اُسکی ناجمعیت خاطر اور دربار کے پُر آشوب حالات کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے والے کو قلم اٹھانے وقت، یہ وہم و گمان بھی نہوگا کہ یہ تحریرات خانگی عوام کے ہاتھون مین کسی وقت پہنچین گی۔ اور دو ڈھائی سو برس بعد اُن حالات و کیفیات کو طشت ازبام کرین گی جنکی بروقت خبر و شہرت ہوجاتی تو ہنگامہ برپا ہوجاتا اور سیل خون روان ہوجاتے۔ ان کے علاوہ کچھ اور منتشر و متفرق رقعات تلاش سے ایسے بھی ملتے ہین جو اپنی عالمانہ انشاپردازی اور عارفانہ نکتہ طرازی مین بے مثل ہین اور جنکا نقل کرنا ناچیز جامع اوراق نے ناگزیر سمجھا ہے۔

ماٰخذ مآثر الکرام مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ (سنہ ۱۹۱۰ء) صفحہ ۲۶

انشائے جلیل

میر عبدالجلیل کی جملہ تصانیف معلومہ میں غالباً یہی پہلی ہے اس لئے اس نقش اوّل کا ذکر بھی سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔

نام کی وضع و اسلوب کا اقتضا تو یہ تھا کہ یہ انشا میر کے رقعات و خطوط کی متضمن ہوتی لیکن اس کے علی الرغم مصنف فاضل نے اس میں شہنشاہ اورنگ زیب کی بعض لڑائیوں اور فتوحات دکن کو تحریر کیا ہے عبارت کا طرز وقائع نعمت خان عالی سے ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وقائع کی طرح اس میں تلازمہ کی صنعت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔ وہ کمی کثرت آیات قرآنی، احادیث نبوی اور اقوال عرب سے پوری کی گئی ہے۔ اپنے اور دوسروں کے طبع زاد اشعار بھی حسب ضرورت درج کئے ہیں۔

واقعات تمام تر وہی ہیں جو اس ناچیز تذکرہ میں محل مناسب پر مذکور ہو چکے ہیں۔ میر محمد رضا کی رفاقت میں ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں میر عبدالجلیل وطن سے نکل کر مقام "برسرور اسلام پور" پہونچے میرزا محمد علی کی وساطت سے نواب بخشی الملک مخلص خان کی ملازمت، بعد ازاں بادشاہ دین پناہ کی حضوری کی عزت حاصل کی۔ میر نے اپنے مربیوں اور محسنوں کے سلسلہ میں ملتفت خان خواص، حجۃ الملک اسد خان، بخشی الملک بہرہ مند خان، روح اللہ خان میر ساماں۔ تربیت خان میر آتش، خدا بندہ خان افسر جوتات، مرزا یار علی بیگ داروغۂ ڈاک، شیخ نور الحق محتسب، وغیرہم کے نام لئے ہیں اور ان کا اور ان کی عنایات و توجہات کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا ہے۔ مضامین میں سے چند کے عنوان یہ ہیں۔

عرض مطالب سلطنت۔ ہنگامہ مزاحمت چوبداران واحوال خود و دیگر مردم (میں زیادہ شکایت مسلمان چوبداروں کی ہے جنکا شعار کعبہ کی راہ بند کر دینے والے فرنگیوں، سے کسی طرح کم نہ تھا! میر کی عمر اب تک عہد عیش و فراغت میں گذری تھی، اُن کے لئے سفر دور و دراز، نیاز کیشی و زحمت کوشی کا یہ دوسرا موقع تھا یہی پریشانی و سرگردانی ۱۱۰۵ھ میں ان کو ناکام و نامراد واپس لائی تھی

"عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد + نازپروردِ تنعم نبرد راہ بدوست" لطیفہ استاد شدن و تقدیم و تاخیر" میں اپنی سرگذشت لکھتے ہیں۔ صف دوم میں ان کو جگہ دینا قرار پایا تھا مگر اس ہنگامہ رستخیز میں "ایا سوء اتفاق سے درجۂ چہارم میں کھڑے کئے گئے۔ اس کے بعد کوچ از منزلگاہ" "بسر فتح بسنت گڈھ" کا بیان ہے۔ میر صاحب نے فتح کی پانچ تاریخیں کہی تھیں جنمیں سے چار اس انشا میں درج کی ہیں اور جامع احوال نے ان کو اس تذکرہ میں تحت عنوان مناسب نقل کر دیا ہے۔

۱۶ جمادی الآخرہ کو حضرت کی سواری "سیر بسنت گڈھ" کے لئے جاتی ہے۔ نواب صاحب میر عبدالجلیل کے بارہ میں گذارش کرتے ہیں۔ میر نیاز عقیدت یعنی اپنی تاریخیں پیش کرتے ہیں۔ پڑھنے کیلئے ارشاد ہوتا ہے۔ صلہ ایک لطیفہ بن کر سامنے آتا ہے۔ بخشی الملک مخلص خان "جابستی" عرض کرتے ہیں۔ قدر شناس بادشاہ منصب صدی مرحمت فرماتا ہے۔

مزید واقعات ان عنوانات سے واضح ہوں گے۔

محاصرۂ قلعہ ستارہ، سوختن باری قلعہ، ناگزیر شاہی مورچال، غنیم کا مقابلہ، لڑائی کی تفصیل، ۱۳ ذیقعدہ کی شام کا معرکہ، تسخیر، یورش قلعہ، فتح قلعہ پرلی۔

استدادِ مہمات سے اسی دوران میں برسات کا موسم آجاتا ہے جو فوج کشی، زور آزمائی اور صف آرائی کے منافی و مناقض ہے۔ افواج کی مراجعت کا فرمان صادر ہونے سے "ہنگامہ باربرداری" بلند ہو جاتا ہے۔ دریائی کستنا کا عبور اور تعدی جماعہ اوزبکیہ کی روداد بہوشان گڈھ پہنچ کر بند ہو جاتی ہے مگر خود اس قلعہ (بہوشان گڈھ) کی تفصیل، اس کے استحکام و استواری کی تشریح کچھ دور تک ختم نہیں ہوتی۔

باایں ہمہ تفصیلات و تعدد مضامین و عنوانات کتاب محض مختصر ہے۔ ضخامت سینتیس (۳۷) صفحات سے متجاوز نہیں۔ مولوی مسیح الزمان لکھنوی نے اپنے مطبع مسیحائی (لکھنؤ) میں ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲-۵۳ء) میں طبع کرائی تھی۔ حاشیہ پر انشا کی شرح موسوم "کلمات انبل" مطبوع ہے جو مولوی سید امیر حیدر بلگرامی متخلص بہ امیر (میر غلام علی آزاد کے پوتے، میر عبدالجلیل کے سرنامی) نے ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء)

مین قلمبند کی تھی۔ مطبع کے خطاط، لالہ رنگین لال شاداب نے کتاب نہایت پاکیزہ، واضح، خوش خط اور حتی الوسع صحیح لکھی ہے۔ تحشیہ حافظ سید محمد عبد اللہ کے قلم سے ہوا۔ انشائی علیقہ اور کمیاب کتابون کے دلدادہ، مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کے نفیس ذخیرہ مین اس کا ایک سال خوردہ نسخہ کمال احتیاط و عرق ریزی کے ساتھ مجلد کیا ہوا موجود ہے۔

آخر کتاب مین میر غلام علی آزاد کے چار قصیدے شامل کر دیے گئے ہین۔ چارون مطلعے ملا کر ایک سو ایک شعر ہین جن سے تاریخ وفات ۱۳۰۰ھ نکلتی ہے۔ میر سید محمد کو بھی ہمین یاد کیا اور اُن کا نام نامی لیا ہے۔ تاریخ کی پابندی اور اہتمام کے باعث سے آزاد کے اکثر شعر بے لطف بلکہ بعض مطالب و معانی کی رفاقت و رقابت سے بے نیاز و آزاد نظر آتے ہین، یا ایسے پیچیدہ، دقیق اور عسیر الفہم ہو گئے ہین جن پر المعنی فی بطن الشاعر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مُنشآت جلیل

انشائے جلیل کو چھوڑ کر نثر کی دوسری یادگار یہی ہے۔ وہ توقعات جو انشائے جلیل کے نام سے پیدا ہوئی تھین کچھ نہ کچھ اس مجموعہ سے پوری ہو جاتی ہین گویا کہ اُس مبتدا کی یہ خبر ہے۔ میرے نزدیک یہ مکاتیب انشائے جلیل سے زیادہ کارآمد اور قابل قدر اس اعتبار سے ہین کہ ذی فہم پڑھنے والے کو بہ یک وقت یہ ادب و انشا کا بھی سبق دیتے ہین پند و اندرز کا بھی علم و عمل کا بھی۔ اسی کے ساتھ ان سے اُس گئے گذرے زمانہ کی بہت سی غیر معروف باتون اور معاملون کا پتہ چلتا ہے۔ ان سے نہ صرف ایک متنفس (کاتب خطوط) کی زندگی کے ہر پہلو اسکی عزیمت و استقلال جرأت و استقامت کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ دنیا مین افراد انسانی کو کیونکر رہنا اور بسر کرنا چاہیے جس کا ماحصل حافظ کی زبان مین یہ ہے ؎

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است | با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

مین تو اس نایاب مجموعہ کو بارھوین صدی ہجری کے ممتاز علمی و ادبی کارنامون مین شمار کرتا ہون میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام مین بذیل ترجمہ میر عبد الجلیل لکھا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالی خلف الصدق ایشان پارۂ از منشآت والا جمع کردہ اند"، افسوس ہے کہ وہ سب خطوط جنکی ترتیب و تہذیب میر سید محمد کے ہاتھون ہوئی تھی، دستیاب نہین ہوتے۔ زیر نظر مجموعہ صرف بائیس خطوط مختصر و مطول کا ہے جو میر عبد الجلیل نے اپنی بیکاری و اسیدواری کے ایام مین اپنے فرزند دلبند میر سید محمد کو سفر سے بھیجے تھے جن کا حوالہ اس تذکرہ مین پیشتر بھی دیچکا ہون۔

محب فرزانہ مولوی حافظ محمد عثمان صدیقی (استاد معاون، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد) کے کتب خانہ مین ایک نادر الوجود چیز اورینٹل سلینی نام The Oriental Miscellany. I یعنی نخبۃ الشرق حصہ اول ہے جس کا آج کوئی دوسرا نسخہ ہندوستان کی مشہور لائبریرئون مین پایا نہین جاتا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مین بعض کتب و مکتوبات شرقیہ سے التقاط و اقتباس کیا گیا ہے اور اصل فارسی عبارت کے ساتھ ترجمہ انگریزی کو بھی صفحات مقابل پر جگہہ دی ہے۔ یہ کتاب دار الامارۃ کلکتہ مین ۱۷۹۸ع مین طبع اور غالباً زیر اہتمام افسران سرکار السٹ انڈیا کمپنی شائع ہوئی تھی پیش نظر جلد ۱۸۰۱ع مین فورٹ ولیم کالج کے طلبہ کے مصرف کیواسطے حوالہ کی گئی تھی اس مین بعض منتخبات تاریخی و علمی و ادبی و سیاسی کے سوا شہنشاہ اکبر اور سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے چند کمیاب فرامین بھی ہین نیز ایک مکمل و مبسوط تحریر کا انگریزی ترجمہ ہے جو سید امیر حیدر بلگرامی نے جب وہ صدر نظامت عدالت کے مفتی کے منصب پر مامور تھے در بارہ حقوق مالی سرکار و محاصل کاشت اراضی وغیرہ بحوالہ کتب فقہیہ و احکام شریعت اسلام علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فارسی مین قلمبند فرمائی تھی۔ میرے نزدیک جس حصہ پر فی الواقع جامع کتاب کو نازش و مباہات ہونا چاہیے وہ (میر عبد الجلیل کے) یہی منشآت اصلی ہین جو مع ترجمہ ۴۰ صفحات پر چھپے ہین اور مختلف مضامین و مباحث پر مشتمل ہین۔ ان خطوط سے اُن ایام کی اکثر تاریخی و ملکی واقعات کے علاوہ میر کے خاندان کی اندرونی حالت، سادہ و بے تکلف طرز معاشرت، اور قصباتی شرفاء

کے ماندہ بود کی کیفیت اور سچے اخلاص و مودت کا اظہار ہوتا ہے بطور دیباچہ یا تعارف انگریزی مین تین صفحہ پر میر کے مختصر حالات بھی درج کر دیئے ہین۔ اُن کی بے نیازی اور شان استغنا کی بالخصوص تحسین و مدحت کی ہے۔ جامع متفرقات لکھتا ہے کہ "میر عبدالجلیل نے یہ خطوط میر سید محمد کو لکھے تھے میر سید محمد نے ان کو سلسلۂ تاریخ سے یکجا کر لیا تھا پھر اپنے بھانجے کے حوالہ کیا تاکہ اس کے منشیانہ انداز پر نظر ڈال لین اصل فارسی کا طرز تحریر سلیس و صحیح ہے۔ انداز کلام نہایت شاندار اور پُر اثر واقع ہوا ہے۔ دربار دہلی کے بعض واقعات و حالات جو اثنائے مکاتبت مین سپرد قلم ہو گئے ہین بغایت دلچسپ ہین بنظر بر جمیع حالات یہ مجموعہ فارسی زبان کے نوجوان شائقین کو بیحد مفید و کارآمد ثابت ہوگا اور انگریزی خوانون کو بھی پوری دلچسپی و تفنن کا ذخیرہ اس مین فراہم ملے گا۔"

قرینۂ غالب ہے کہ اس کتاب (داونیٹل سلینی) کی تجویز و ترتیب مین مفتی میر امیر حیدر کی شرکت و اعانت ضرور رہی ہوگی اور یہ خطوط انھین کے ذریعہ سے انگریز مولفین کو دستیاب ہوئے ہون گے۔ مگر ان خطوط کی ترتیب ٹھیک نہین پائی جاتی۔ ان کے آخر مین تاریخ تحریر، تحریر ہے اس لئے ان کے سلسلہ و ترتیب کے متعلق تیقن کے ساتھ کچھ نہین کہا جا سکتا۔ یہ بھی پتہ نہین چلتا کہ میر سید محمد، میر غلام علی یا میر امیر حیدر نے اس مجموعۂ خطوط کا نام کیا رکھا تھا۔ انگریزی مؤلف نے "مختلف معاملات پر باپ کے اصلی خطوط بیٹے کے نام" سے ان کا تعارف کرایا ہے منشآت جلیل، کا عنوان جامع تذکرہ دفقیر مقبول، کا مجوزہ ہے۔ سہولت و دلچسپی کے لئے بعض خطوط یا ان کے مضامین کا اقتباس پیش کیا جائے گا۔ کچھ شک نہین کہ بہت سی باتین چھوٹی چھوٹی اور معمولی ہین مگر انھین کے پڑھنے اور جاننے سے روشن ہوتا ہے کہ دُنیا کی رفتار اور ہمارے ملک کے متوسط طبقہ کے زندگی بسر کرنے کا رنگ ڈھنگ ڈھائی سو برس پہلے بھی کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا کہ آج ہے۔

---

۵۱ غالباً میر غلام علی آزاد سے مراد ہے

اگرچہ خطوط تمامتر خانہ داری کے تردوات، اور دنیوی معاملات کی خبرگیری و خبرداری کے حال مین اور ظاہر ہے کہ انھین ضرورتون سے معرض ترقیم مین آئے ہونگے تاہم کوئی رقعہ اخلاقی تربیت، دینی تعلیم علمی نصائح اور آداب وتہذیب آموز ہدایات سے خالی نہین پایا جاتا فرزند سعادت منش کی کوئی ضرورت یا فرمایش پوری کرتے ہین تو اسی کے ساتھ پند و موعظت بھی کرتے جاتے ہین اور ہر حال مین تحصیل علوم پر کمال سعی مبذول رکھنے کی تاکید کرتے ہین ایک طرف میر سید محمد کے لئے سُرمہ چشم تلاش کرکے یا امین الدین خان صاحب فوجدار سرکار بھکر سے لے کر بھیجتے ہین تو دوسری طرف کتابون کو دھوپ دینے اور بیش قیمت وکمیاب نسخون پر لحاظ خاص اور توجہ کامل رکھنے کے لیئے قدغن فرماتے ہین۔ حفاظت ونگہداشت کے لئے محض تاکید ہی نہین ہوتی بلکہ اس کی تفصیل وتشریح کا کوئی جزئیہ ترک نہین ہونے پاتا۔ جیسا کہ روضۃ الناظر اور رسالہ کلمہ طیبہ کے بارہ مین نقل ہوچکا ہے۔

تشویق تحصیل علم باوجودیکہ میر سید محمد پختہ عمر پر پہونچ چکے ہین خود بھی ذی فہم و ذی علم ہین لیکن پدر شفیق کا بزرگانہ ارشاد یہی ہے۔

در شغل تحصیل علم سعی برکمال نمایند ومحط نظر علم تفسیر وحدیث وفقہ واصول باشد و اضراب از علوم دیگر بالکلیہ نباید نمود۔ اقل مرتبہ این است کہ مصطلحات ضروری علوم دیگر البتہ آشنائی تام حاصل باید۔ اگرچہ خمیر ما بہ تحصیل علوم دینی قرار باید داد اما از تمک گیری منطق وحکمت بقدر کفایت ودیگر علوم متعارف روزگار غافل نباید بود بالجملہ مضمون این شعر رنگین را مدنظر باید داشت

احرص علی کل علم تبلغ الاملا ولا تواتس بعلم واحد کسلا

یعنی حریص باش بر ہر نوع علم تا برسی امید خود را والفت مگیر بر علم واحد از روئے کاہلی

النحل لما رعت من کل فاکھۃ ابدت لنا الجوھرین الشمع والعسلا

مگس شہد ہرگاہ می چرد از ہر میوہ ظاہری گرداند برای ما دو قسم جوہر را یکے موم و دیگرے شہد

الشمع باللیل نور یستضاء بہ والشھد یبری باذن الباری العللا

جوہر موم در شب نورے است کہ طالب روشنی کردہ می شود اما ان نور او جوہر شہد صحت می بخشد بحکم خداے آفریدگار بیمار بیمار را۔

ترہیب و ترغیب: ایک دوسرے والا نامہ مین نصیحت فرماتے ہین۔

در باب خواندن خود کہ رسالۂ اعلام الہدی میخوانند نوشتہ بودند معلوم شد۔ برخوردارا خواندن رسالہای غیر متعارف فائدہ نہ دارد۔ باید کہ کتب درسی متعارف را تحصیل نمایند کہ ہمین کتب درسی خواندہ شد رسالہای غیر متعارف خود بخود آسان می شوند مثلاً شرح عقائد را کہ خواندند دیگر رسالہ اعلام الہدی حل می شود سعی نمایند کہ تحصیل علم بر ترتیب شود کہ این معنی ضروری ست و ہمین ایام تحصیل کمالات است باز این وقت بدست نخواہد آمد۔

ایک تیسرے موقع پر ایک سچی اور سادہ زبان ترجمانی دل یون کر رہی ہے "عربی پڑھنے مین جو اپنی تقصید کا حال لکھا تھا موجب انشراح خاطر ہوا حق تعالیٰ میری زندگی مین تمکو کمال انسانی پر پہونچا دیوے تاکہ ہماری آنکھون کو روشنی حاصل ہو۔"

صلاح نیک ۔ میر سید محمد کو عینک کی ضرورت ہے یا محض شوقیہ فرمائش ۔ میر عبد الجلیل بھکر مین تلاش کرتے ہین نہین ملتی ہے معذرت کرتے ہین اور لکھتے ہین" بارے ہم تلاش باقی ہے جس وقت میسر ہوگی بھیجدون گا مگر خیال رہے کہ جس وقت آنکھ خیرگی کرنے لگے تو رات کو مطالعہ موقوف رکھے گا۔ آنکھ کی محافظت بھی ضرور ضرور چاہیئے۔"

خیر اندیشی و شفقت ۔ میر عبد الجلیل از خود جتنے تحائف وہدایا بھیجتے تھے ان مین ضروریات ذاتی یا مصنوعات مقامی یا دیگر اشیائے کار آمد کے سوا کوئی نہ کوئی سلاح یا سپاہیانہ ہتھیار ضرور ہوتا تھا چنانچہ بھکر سے سرمہ اور ایک جلد شرح ملّا کے علاوہ ایک حلقہ کمان بھی فرید ملازم کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ چیز فوجدار صاحب نے میر سید محمد کے لئے خاص کر بہم پونچائی تھی۔

مالی مشکلات و وصول نقد بھکّر سے اکثر ہنڈوی آٹھ نو سو روپیہ کی آیا کرتی تھی معمول یہ تھا کہ جب کوئی معقول رقم جمع ہو جاتی تھی تو شیخ محمد رضا نائب خدمات خرچ کے لئے میر صاحب کے پاس بھیجدیا کرتے تھے لیکن ہنڈوی کا بھنانا اور مہاجنوں سے روپیہ کا منگانا ایک کار اہم ہوتا تھا جس کے منگانے اور لانے کیلئے خاص آدمی بھیجنا پڑتا تھا اور جسمیں بعض اوقات صرف بھی زائد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہنڈوی آٹھ سو روپیہ کی آئی تھی جس میں سے مابجے صرف ہنڈیاون کے بابت بھکر میں خرچ ہو گیا تھا باقی روپیہ شاہجہان آباد سے اکبرآباد میر صاحب کے پاس پہونچا اور ان کے کام آیا۔

ایک دشواری وطوالت اور بھی تھی کہ بھکر میں کوئی مہاجن ایسا نہ تھا کہ اکبرآباد یا قنوج کو براہ راست ہنڈوی لکھ دیتا بھکر سے ملتان، اور ملتان سے لاہور، اور لاہور سے اکبرآباد، اور وہان سے قنوج چلتی، ہنڈوی لکھا ہوتی تھی اور اس صورت سے چار جگہ ہنڈوی کو باحتیاط بلقید جنس سکہ وسنہ لکھنا پڑتا تھا

سید محمد نوح جب تک سیوستان میں رہے خطوط اور ہنڈوی شاہجہان آباد بھیجتے تھے۔ یہاں بھی وہی مرحلہ پیش آتا تھا کہ ایک معتبر آدمی بھیجکر روپیہ وصول کیا جاتا اور پھر ہنڈوی قنوج بھیجی جاتی تھی میر عبدالجلیل کے بعض رقعات میں سید محمد نوح اور ان کے خطوط کا حوالہ ہے۔ ان کے خطوط ایسے مفصل ہوتے تھے کہ بلگرام کو ان کا باصلہ بھیجدینا ضروری سمجھ لیا گیا تھا

ایک بار سید نوح نے سیوستان سے کچھ روپیہ بھیجا تھا۔ ہنڈوی شاہجہان آباد کے مہاجن کے نام تھی وہان تک قاصد کے بھیجنے اور روپیہ منگانے میں دیر ہوتی تھی۔ ضرورت شدید تھی۔ میر عبدالجلیل نے وہیں اکبرآباد میں کسی مہاجن کے ہاتھ کچھ نقصان اٹھا کر فروخت کر دی۔ ایک ہزار بتیس روپیہ وصول ہوئے۔ آٹھ سو ستائیس روپیہ کی ہنڈوی قنوج کو میر سید محمد کے نام روانہ کی گئی۔ مبلغ فرخ سیری سکہ اٹاوہ لکھائے گئے تین سو چھ روپیہ اکبرآباد میں تقاضادار لوگوں کو ادا کیا گیا۔ اس قرض و تقاضا کی وجہ سے میر عبدالجلیل یہ لکھتے ہیں۔ کہ نواب اخلاص خان کی سرکار سے جو دو روپیہ روز ملتا ہے اس میں

کیسے پورا پڑسکتا ہے ایک روپیہ روز اور خرچ ہوجاتا ہے۔ نوکرون کی تنخواہ (طلب نفران) خرچ دربار اور دیگر ابواب اسکے علاوہ آٹھ سو ستائیس روپیہ جو گھر بھیجے ہین اُس کے خرچ کی تفصیل و مدات بتاتے ہین کہ پانچ روپیہ پیر صاحب و قبلہ شاہ لطف اللہ کو، اور تین سو ساٹھ روپیہ برخوردار سید محمد نوح کے گھر مین (میر عبدالجلیل کی منجھلی بیٹی کو) اور بیس روپیہ اپنی بڑی بہن اور بیس روپیہ چھوٹی ہمشیرہ اور چار سو بائیس روپیہ اپنی والدہ کو گھر کے خرچ کے واسطے دیدینا۔ اس روپیہ مین جو ضروری اور ناگزیر اخراجات ہون اُن کو مقدم رکھا جاے اور جو رقوم دس بیس روز کے توقف سے ادا ہوسکتی ہون ان مین توقف کردینا مین چند روز کی رخصت لے کر وطن آرہا ہون اُس وقت جیسا مناسب ہوگا انجام دیا جاے گا"

نئی چیز:۔ سید کی نلیون کی چھتریان ہماری یاد کی بات ہین اور خال خال اب بھی نظر آجاتی ہین۔ مگر دو ڈھائی سو برس پہلے کے عجائبات ہین۔ یورپ کی عینک لکڑی کے فریم کی ہوتی تھی اور بڑی قدر واحتیاط کی چیز تھی۔ میر عبدالجلیل دہلی مین عینک کے محتاج ہین۔ فرزند رشید کو پیشتر بھی لکھ چکے ہین اور اب پھر لکھتے ہین کہ "یون تو دہلی مین عینکین بہت ہین بہت ملتی ہین۔ لیکن نگاہ کی موافقت معدوم۔ ایک نہایت عمدہ عینک بلگرام مین دستیاب ہوگئی تھی اُس کو نوکرون نے گم کردیا۔ ہر چند اسباب مین ڈھونڈھا نہین ملتی ہے"۔ فرنگی عینک حلقہ چوبی" کی گھر پر چھوڑ آیا تھا اس نظر سے کہ بڑی نفیس شے تھی اور اُسوقت مین چندان محتاج بھی نہ تھا سمجھا تھا کہ گھر پر باحتیاط رکھی رہے گی۔ ممکن ہے کہ تم نے کسی اور کو دیدی ہو اگر اُس سے واپس لینا ممکن ہو تو مستر د کرلو وہ میری آنکھون کے بہت موافق تھی۔ ادیم السمار تک نظر آتا تھا۔ مین یہان سے دو عینکین خرید کر کے تمھارے لئے بھیجتا ہون۔ یا بیت معلوم ہے صرف موافقت چشم کی وجہ سے اِس درجہ مبالغہ کر رہا ہون۔ حسین خدمتگار سے پوچھے گا کہ آخر بلگرام والی عینک کیا ہوگئی قلمدان مین طاق پر رہا کرتی تھی۔ کس نے اٹھائی۔ کہان رکھدی؟"

دُور کی خدمت ما قبول نیسے گریز۔ تیرھوین عنایت نامہ مین تحریر فرماتے ہین "جب نواب میر جملہ روانہ بنگالہ ہوگئے تو رفعت پناہ عوالی دستگاہ شیخ لالن نے جنکو حال مین محمدی خان کا خطاب ملا ہے منزل کیمپ، فرید آباد سے خدمت سوانح نگاری سرکار امتیاز گڈھ عرف اودنی اور سرکار قمر نگر عرف

کرنول مضافات بیجاپور کی سند بندہ کے نام تیار کر کے بھیجدی اور معذرت فرمائی کہ اگر ہم شاہجہان آباد رہجاتے تو آپ کے لئے ضرور کوئی خدمت ہندوستان کی حاصل کرتے اب کہ نواب بنگالہ جا رہے ہیں ناچار یہی بھیجی جاتی ہے۔ ہر چند دور ہے مگر خدمت اچھی ہے۔ بندہ وہان کے جانے نہ جانے میں متردد تھا۔ مکنون خاطر یہ تھا کہ اگر سرکار نواب امیر الامراء سے کوئی خدمت کم و بیش ہندوستان کی میسر ہوجاتی تو قناعت کر لیتا۔"

طریق سفر قنوج[۵۹] کے شارع اعظم پر واقع ہونے کی وجہ سے بلگرام سے آنے جانے والوں کی پہلی منزل وہین ہوتی تھی۔ میر عبدالجلیل اور ان کے سب اہل خاندان کا بھی معمول یہی تھا۔ جب دہلی سے میں کچھ عرصہ رہکر اور کوشش کر کے سید محمد کو اپنی جگہ کرادیا ہے تو ان کو دہلی بلا رہے ہیں بضرورت شدید

۵۹۔ قنوج کسی وقت شمالی ہند کا دارالملک، اور سب سے بڑا اور پرانا شہر تھا۔ اب ضلع فرخ آباد میں ایک چھوٹا شہر یا بڑا قصبہ رہ گیا ہے۔ پرگنہ و تحصیل رہا۔ کا صدر مقام ہے۔ دریائے گنگ کے داہنے کنارے پر ایک پرانی بلند پہاڑی پر آباد تھا۔ مگر اب دریا چار میل پورب کو ہٹ گیا ہے۔ شارع اعظم شاہی اور ریل اسٹیشن سے پختہ سڑک شہر تک گئی ہے۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ ہے۔

گذشتہ صدی کے اندر اسکی آبادی میں تغیر نمایاں ہوتا رہا ہے ۱۸۴۷ع میں ساڑھے سولہ ہزار نفوس کی تھی ۱۸۵۳ع میں بائیس ہزار بائی گئی ۱۸۹۱ع میں ۱۷۵۵۲ اور ۱۹۲۱ع میں ۱۲۵۸۰ تھی۔ باشندگان قریب دو ثلث کے ہندو اور ایک ثلث مسلمان ہیں۔ رقبہ مسکونہ دوسو اٹھانوے ۲۹۸ ایکڑ پانچ مواضع، قنوج و کندرولی و تاج پور و نو کاشت و علاء الدین پور و عمر پور کی آراضی میں پھیلا ہوا ہے۔ آبادی کی شکل مثلث نما واقع ہوئی ہے پرانے شہر کے کھنڈرون، ویرانون، امنادر و محلات کے ٹیکرون پر اکوسون تک ہر طرف نظر پڑتی ہے خشت پارے اور سنگ ریزے ہر جگہ سنگ راہ ہوتے ہیں۔ پرانے ٹھیکرے، پرانے سکے، مورتون کے ٹوٹے ہوئے حصے اطراف کے کھیتون اور خالی زمینون میں دور تک ملتے ہیں۔ کرنیل ٹاڈ Colonel Tod لکھتے ہیں کہ کبھی اس شہر کا حصار تیس میل سے زائد تھا۔ مگر دیگر اہل فرنگ مورخین اس کو مبالغہ پر محمول کرکے باور نہیں کرتے چینی سیاح ہیون تسانگ کی مفصل تحریر اور زمانہ موجودہ کے کھنڈرون سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانا قنوج گنگا کی پرانی پہاڑی پر تین میل سے زیادہ طول میں آباد رہا ہوگا۔ آبادی تمام تر نشیب و فراز اور پست و بلند واقع ہوئی ہے۔ بہت سے نالے کھالے زمین کو کاٹتے ہوئے دریا میں جاگرے گئے ہیں بہت سے مکانات جو اس وقت نیم ویران غیر آباد و شکستہ حال نظر آرہے ہیں کسی وقت نہایت شاندار مرتفع اور مستحکم عمارات رہی ہونگی۔

تعمیرات محدثہ میں نالے پر ایک پل ہے جس کو سمبت ۱۷۵۸ (۱۷۰۱ع) میں چند اگروالہ دولتمندون نے

تاکید کرتے ہین اور لکھتے ہین کہ "پرانا گھوڑا اب سواری کے قابل نہین رہا ایک منزل بہل وطن سے قنوج تک کے لئے کرایہ کرلو اور محض ضروری (لابدی) اسباب لے کر چلے آو" آگے چل کر تسلی دیتے ہین کہ "جب انشاء اللہ منصب وخدمت تمہارے نام ہو جائیگی تو جہان آباد سے تمہاری ضروریات سفر کا سرانجام کرا کے پالکی کی سواری پر روانہ بھکر کرادینگے۔ وطن سے صرف ضروری سامان لے کر چلنا چند کمتر و بسکتر آسودگی ہینتیہ انشاء اللہ جب اپنے تعلقہ خدمت مین یا ملتان تک پہونچ جاؤ گے تو جو کچھ چاہو سب میسر و مہیا ہو جائے گا۔ بالفعل یہان خود جریدہ پہونچ جاو" پھر خیال آتا ہے کہ دہلی جلد تر پہونچنے کی ضرورت ہے تاکید بھی کر رہا ہون بہل آہستہ آہستہ چلیگی۔ دیر مین پہونچین گے تو تاکید وہدایت فرماتے ہین کہ "چار کہار جوان زود رو کرایہ کر کے چوپالہ مین تنہا ہمارے پاس چلے آو۔ دودست رخت پوشاکی دربار سوائے پارچہ پوشاکی خانہ مطلوب ہین۔ اگر موجود ہون تو بہتر۔ ورنہ فرجام کے ہمراہ جو سامان

بنوایا تھا۔ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول۔ اس کا زراعتی فارم اور بورڈنگ ہوس کلب گھر، شفاخانہ، اور کوتوالی بعض عام عمارات ہین۔

قنوج جتنا قدیم اور عظیم شہر رہا ہے اس کی مناسبت سے یہان کے آثار وصنادید نہ تو عجیب ہین نہ کثیر التعداد بے شبہ اسکی کہن سالی اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے اس سے زیادہ کی توقع کی جاتی تھی۔ انگریزون کی رائے ہے کہ ہندوؤن کے زمانہ کی یادگاروں اور مذہبی عمارات کو دسوین صدی مین محمود غزنوی کے غیظ وغضب اور بے پناہ تیغ وتبر نے غارت وتاراج کر دیا تھا۔ اسلئے جو کچھ آثار قدیمہ باقی ہین وہ صرف مسلمانون کے عہد کی ہین۔ بلحاظ اہمیت یا وسعت جو قابل لحاظ ہین حسب ذیل ہین۔

(۱) نواب بہادر خان شاہجہانی امیر کی تعمیر کردہ سرائے کا مغربی پھاٹک اور چند کوٹھریان

(۲) رنگ محل یا موتیا محل جس کو سید محمد قنوجی استاد اورنگ زیب وبانی سرائے میران نے ۱۰۹۶ھ مطابق ۱۶۸۵ء مین تعمیر کرایا تھا۔ عمارت قریباً نابود ہو چکی۔ بنیادین اور کچھ کچھ دیوارین قائم ہین

(۳) مقبرہ سید محمد قنوجی مذکور۔

(۴) جامع مسجد جسکی نسبت ہندو دوستیا کی رسوئی ہونے کا دعوی کرتے اور پانڈو نسل کے راہبگان کی تعمیر بتاتے ہین۔ ایک بلند پہاڑی پر پرانے قلعہ کی ناف مین واقع ہے ملک الشرق ابراہیم شاہ والی جونپور نے

بھیجا گیا ہے اس مین سے جو پسند ہوئے کرجامہ اور دوتھی تیار کرا کے لیتے آو۔ اگر پہلے سے تیار ہون تو نئے کپڑے بنوانے کی احتیاج نہین ہے خواہ مخواہ دیر ہوگی جب نعلقہ خدمت پر پہونچ جاؤ گے تو وہان بہت سے کپڑے اور دوتھی میسر آجائے گی" ہرچند سبکبار تر آسودگی بیشتر واز وسواس براہ فراغت کامل تر"

مودت و محبت اولاد و عیال کی الفت جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے میر عبدالجلیل پر بھی بدرجہ نہایت غالب تھی۔ ہرچند کہ سادہ بیانی اور احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن جذبات دل کی جھلک ہر ہر قدم پر نمودار ہوجاتی تھی۔ یہ وہ انداز تحریر نہین ہے جو کہ اکثر انشا پردازون مین نظر آجاتا ہے بلکہ حقیقت حال کا اظہار کرتا ہے۔ میر عبدالجلیل نے ان تمام رقعات مین میر سید محمد کو ایک ہی

اس کی ترمیم و اصلاح ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷ع) مین کرائی تھی۔ جنرل کننگھم نے اس کو پہلے ۱۸۳۸ع مین، اور بعد مرمت مزید ۱۸۶۲ع مین دیکھا تھا۔ اپنے سیاحت نامہ مین دونون حالتون کا فرق دکھایا ہے۔

(۵) روضہ شیخ کبیر بالا پیر متوفی ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ع)، سنگ ورسے سال تعمیر ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ع) پایا جاتا ہے۔

(۶) روضہ شیخ محمد مہدی (فرزند شیخ کبیر) بعہد اورنگ زیب ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ع) مین تعمیر ہوا تھا۔ شیخ مہدی نے ۱۰۸۰ھ (۱۶۷۰ع) مین انتقال کیا۔

(۷) عالمگیری مسجد جو ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ع) مین شیخ مہدی نے رنگین پتھرون سے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد مذکور کا بیرونی دروازہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ع) مین تیار ہوا تھا۔

(۸) درگاہ شیخ ناگاہ ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ع)

(۹) مسجد مخدوم جہانیان جہان گشت، بخاری۔ و مقبرہ سید جلال وغیرہ۔

(۱۰) روضہ اولاد مخدوم۔ صدر دروازہ کے کتبہ سے واضح ہے کہ اس کو سید راجو نے ۱۸۸ھ (۱۶۷۷ع) مین بعہد سلطان حسین شرقی تعمیر کرایا تھا۔ مع مقبرہ وغیرہ۔ ان عمارات کو زلزلہ سے نقصان پہونچا تھا ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ع) مین کامل مرمت ہوگئی۔

(۱۱) روضہ مخدوم اخی جمشید۔ واقع راجگیر ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ع) کی تعمیر ہے۔ اورنگ زیب نے درستی کرادی تھی۔

(۱۲) روضہ چندن شہید واقع اسمعیل پور نورالدین جس کی تعمیر بابر بادشاہ نے کرائی تھی۔ مابین ۹۳۳ھ و ۹۳۷ھ (۱۵۲۶ع تا ۱۵۳۰ع)۔

(۱۳) سید محمد قنوجی کی تعمیر کردہ پختہ سرائے جو شہد آباد کبیر معروف بہ سرا میران میں برلب شارع اعظم قنوج سے

مختصر طرز سے برابر مخاطب کیا ہے " برخوردار سعادت اطوار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالی " مگر تیسرے خط مین قلم کی متانت و سنجیدگی پر دل کی بے چینی و بیقراری غالب آگئی ہے ۔ میر صاحب ضبط نہین کر سکے ہین ۔ فرماتے ہین :۔

" برخوردار سعادت اطوار کامگار میر سید محمد دعمرہ وسلامت ۔ بعد دعوات مزید حیات و ترقی درجات شوق ملاقات کہ بیرون از احاطہ عبارت است مشہود خاطر عزیز آنکہ خطوط آن برخوردار مصحوب فرحام حسین متواتر رسیدند ۔ از خبر خیریت آن برخوردار خاطر را مسرور گردانیدند ۔ الحمد للہ علی ذالک شوق ملاقات

کوس کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) مین تیار ہوئی تھی ۔

(۱۴) سرائے مذکور کے قریب ایک باغ اور احاطہ کے اندر سید موصوف کے لڑکے کا عالی شان مقبرہ ۔

(۱۵) میر بنگالی کی عظیم الشان حویلی جو ایک نالے مین کمال رفعت و استحکام کے ساتھ بنائی گئی تھی اب صرف چار دیواری ، برج اور پھاٹک باقی ہے ۔

عہد ہنود کے آثار مین پرانا قلعہ ، ہے جو عام طور راجہ جے چند راٹھور کا قلعہ کہلاتا ہے ۔ ایک انجنیر اور سپاہی جنرل کننگھم کا قول ہے کہ وہ اسکا موقع نہایت مستحکم اور مضبوط ہے ۔ توپ کی ایجاد اور استعمال سے پہلے اس نے قنوج کو ایک زبردست اور اہم مقام بنا رکھا ہوگا ، اب اس مین صرف بھیشم کلی برج کے کچھ نشانات باقی رہگئے ہین ۔ راجے پال کا مندر قلعہ کے اندر سب سے پرانی یادگار ہے ۔ اسکی جگہ ضرور پرانی ہے مگر تعمیر جدید و مختصر ہے ۔

مسلمانون مین سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے ۹۳ھ (۷۱۲ء) مین قنوج پر حملہ کیا اور بعہد خلیفہ ولید اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا ۔ مسلم مورخین و سیاحین مین سے ابن وہاب جسکا سفر نامہ اب نایاب ہے مگر ابو زید سیرافی بصری تیسری صدی اسلامی کا مورخ اس کا حوالہ دیتا ہے ۔ چوتھی صدی کے سیاح و تاجر و جغرافی ابن حوقل موصلی اسی عصر کے مورخ مسعودی بغدادی ۔ آٹھوین صدی کے لغوی و محدث فیروز آبادی نے اپنی تالیفات مین قنوج کا ذکر کیا ہے ۔ اسی صدی کا نامور سیاح ابن بطوطہ طنجی مغربی بھی یہان آیا تھا اپنے رحلہ و سفرنامہ مین اسکی ویرانی و بربادی پر آنسو بہاتا ہے ۔ تاریخ فرشتہ نے قنوج کی سرسبزی و شادابی اور آبادی کی کثرت سے حالات لکھے ہین جن کے ماننے مین صاحبان نظر اور اہل تحقیق کو کلام ہے ۔ آئین اکبری مین لکھا ہے " قنوج باحویلی قلعہ از خشت پختہ دارد از امصار بزرگ ہندوستان " ۔

ممالک غیر کے مورخین مین سے بطالمی Ptolemy نے اس کو کنیا جیزا Canogiza کے نام سے یاد کیا ہے ۔ چینی بودھ زائر فاہیان Fa Hian یہان پانچوین صدی عیسوی کے آغاز مین آیا تھا

آن برخوردار در عرصۂ تحریر گنجایش پذیر نیست **شعر**

کتبت وکدت من شوق وتوق — الیک اکون سطراً فی الکتاب

یعنی نوشتم من خط ترا و قریب بودم از شوق و آرزومندی کہ بسوی تست، اینکہ باشم من سطر در خط خود۔ **بیت**

دل جدا، دیدہ جدا، سوی تو پرواز کند — گرچہ من در قفسم، بال و پرم بسیار است

حق سبحانہ این آرزو را کہ منتہی اہم است بخیر و خوبی زود میسر آرد۔

تیسرے خط مین تعلق خاطر اور اشتیاق دیدار یون ظاہر فرمانے ہین:۔

برخوردارا! در خط مراہی حسین خدمتگار از کسل جسمانی خود نوشتہ بودند کہ اکثر علیل می باشند بنا بر آن ارادہ سفر این طرف دارند۔ برخوردارا! خود می دانید کہ در بساط ما ہمین شما اید کسے کہ یک پسر داشتہ باشد باختیار خود جدائی پسر را قبول ندارد۔ تمام آرزوے ما ہمین ست کہ شما را سیر ببینیم اما اسباب مختلفہ و دواعی متفرقہ نمی گزارند کہ شما را بطلبم۔

ہیون تھسانگ Hewen Thsong ساتوین صدی عیسوی مین بعہد ہرش وردھن آیا تھا اُسوقت قنوج منتہائے عروج و ترقی پر تھا۔ اُس نے پوری تفصیل کے ساتھ یہان کے حالات ماضیہ و عصریہ لکھے ہین۔ انگریز مورخین و سیاحین مین سے پادری ٹیناںٹ Rev. Mr. Tennant اٹھارہوین صدی کے ختم کے قریب اور مسٹر ولیم ہنٹر William Hunter اُن کے بعد ہی آئے تھے مشہور صناع دانیال Daniell نے قنوج کا نقشہ کندہ کرکے سنہ ۱۸۰۰ع مین شایع کیا تھا میجر تھارن Major Thorn نے ۱۸۰۵ع مین جنگ مرہٹہ کے زمانہ مین قنوج کو دیکھا تھا

عصر موجودہ مین قنوج فی الجملہ ترقی کر رہا ہے۔ تجارت عطر و عطرسازی، روغن خوشبو، تیاری عطردان چوبی صندوقچہ منقش و گلکاری و پارچہ دیسی بجامت و اپنگ پوشش وغیرہ کی چھپائی کے لئے بہت شہرت رکھتا ہے۔ سواد و مضافات شہر مین دور دور تک بیلا، چمبیلی اور گلاب کے باغات و قطعات چلے گئے ہین۔

انگریزی کا ہائی اسکول اور سنسکرت و عربی کے متعدد مدارس شائقین علم اور طلبہ کو فیض عام پہونچا رہے ہین۔

میر عبدالجلیل کو اپنے نواسہ کے ساتھ بھی بڑی محبت والفت تھی باوجود پریشانی خاطر اسکا جلوہ اکثر مواقع پر نظر آتا ہے۔ میر سید محمد کو لکھتے ہین

برائے علاج درد گوش برخوردار سید غلام علی قلمی بود۔ الحق بسبب سواری دو وقتہ و سفر ہمراہی نواب امیر الامرا کہ بیست دو روز ہمراہ ایشان ماندیم و از شش منزل شاہجہان آباد رخصت فرمودند از خاطر رفتہ بود۔ الحال انشاء اللہ از حکیم جیو[۵] حقیقت ظاہر نمودہ نسخہ گرفتہ دوا تیار کردہ می فرستد۔

اعتراف منت یہ حکیم جیو حکیم صاحب مہربان حکیم محمد جعفر[۲] تھے جنکی سعی و توجہ سے ذی قعدہ ۱۱۳۸ھ جلوس رنگالا ۱۱۳۹ھ مین شدید علالت اور تپ محرقہ سے میر عبدالجلیل کو نجات ملی تھی۔ میر صاحب دہلی پہونچتے ہی سخت بیمار ہو گئے تھے۔ نو وارد تھے نہ کوئی یار تھا نہ مددگار۔ نا آشنا لوگون سے واسطہ د سابقہ تھا۔ کئی خطون مین اس بیماری، اپنی تکلیف، بخار کی شدت، تیمم سے نماز ادا کرنے، تیل کا استعمال چھوڑ دینے، سخت پرہیز کرنے اور بعد صحت ایک ضیافت و دعوت کی تقریب مین پرہیز توڑنے کی تفصیل لکھی ہے۔ ہر موقع پر اس معالج مہربان کا بار بار شکر ادا کرتے اور سعی ابرائے آزار کی ستائش و تحسین فرماتے ہین۔

۵۔ ہندوستان بلکہ تمام ممالک عرب و عجم مین اس شریف پیشہ کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ اُس وقت تک اطبا کا یہ فیض رسان و کریم النفس طبقہ طمع و آز سے پاک و بے نیاز تھا۔ حکما کی مدد معاش اور بہ اطمینان گزران کے لئے سلطنت کی طرف سے سیر حاصل جاگیرین، اور معافیان عطا کی جاتی تھین۔ امرا اور اہل دل وظائف وسالیانے مقرر کر دیتے تھے۔ اطبا خواہ کسی درجہ و شان کے ہون اُس کار خیر کی انجام دہی کے لئے کوئی مزد یا اجر لینا اپنے مرتبہ سے فروتر اور باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ سلاطین عہد ان کو بڑے بڑے خطاب حکیم الملک، حاذق الملک، شفاء الملک وغیرہ دیتے تھے۔ ان کا رتبہ وزرائے سلطنت سے بالاتر مانا جاتا تھا۔ حکیم الملوک، بہادر شاہ اور عظیم الشان کا طبیب خصوصی تھا اور شیخ محمد حسین شیرازی متخلص بہ شہرت، اعظم شاہ اور شاہ عالم بہادر شاہ کا۔ فرخ سیر نے اسکو حکیم الممالک خطاب دیا تھا۔ مرزا محمد ہاشم شیرازی مخاطب بہ سید علوی خان معتمد الملوک، عالمگیر، محمد اعظم و شاہ عالم کا حکیم تھا۔ محمد شاہ نے اسکو سونے مین تلوایا تھا شش ہزاری منصب رکھتا تھا تین ہزار درہم نقد پاتا تھا۔ اسکے کمال اور حذاقت کی وجہ سے نادر شاہ فرمان روائے ایران اسکو بڑی کوشش سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

حکیم جعفر غالباً میر کے ہموطن تھے۔ تیسرے رقعہ مین لکھتے ہین کہ اب ستائید حکیم صاحب بھی شاہجہان آباد

شکر صحت نوین والا نامہ مین دو کلمہ خیریت بامژدہ صحت اپنے قلم سے زیادہ اُس زمانہ کی محاورہ کے موافق "بخط خود" لکھ کر اہل خاندان کو بھیجتے ہین تاکہ خاطر جمع ہو، ہر خط مین از سر نو زندگی پانے اور موہبت الٰہی کا دل و زبان سے شکر بجالانے کے لئے اپنے تمام متعلقین کو تاکید کرتے اور لکھتے ہین کہ" ایک من آرد کی روٹی پکوا کر فقرائے بلگرام کو بانٹ دینا۔

"الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ما حبانا من الانجلا"

خدا کا شکر ہے پھر خدا کا شکر ہے کہ ہمکو بیماری سے صحت بخشی۔

عنایت نامہ ذیل بیست و دوم اس سلک گوہرین کا واسطۃ العقد ہے یہ مجموعہ منشآت اس خط پر ختم ہو جاتا ہے۔ میر عبد الجلیل ایک مدت مدید تک وطن سے دُور اور اہل وطن سے مہجور رہکر اب بلگرام پہونچنا چاہتے ہین جہان شاہی دربار کے مخصوصان، امرائے دولت کی سازشون اور نفاق اور پرشور بدحوالی سے مامون و محفوظ رہنے کی توقع ہے خود تو گھر پہنچنے اور گھر والون اور متوسلون کو دیکھنے کی عجلت و بیقراری ہے مگر اُن پر اصرار و تاکید ہے کہ اپنے جذبات شوق کو روکین، اُن کے استقبال کے لئے دور تک نہ آئین گھر کے قریب مِل لین۔

برخوردار کامگار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعوات مزید حیات مشہود آنکہ روز پنجشنبہ دوم جمادی الآخرہ ۱۱۳۲ھ از جناب عالی متعالی مرخص شدہ روانہ وطن گردیدہ چہارشنبہ ہشتم ماہ مزبور بخیر و عافیت بقنوج رسیدیم شنبہ ۲۸ جمادی الاولیٰ قاصد اجورہ دار بادو پروانہ جاگیر خود و شما روانہ وطن کردہ از آمدن خود اطلاع دادہ بودم والفا وعدہ کہ پیش از رسیدن خود بوطن بہ پنج شش روز خبر خواہم داد بجا آوردم۔ صاحبی میر کرم اللہ و میر اشرف بسواری دو بہل کرایہ تا قنوج رسیدند۔ آدم پیش آن برخوردار فرستادہ شد امروز کہ پنجشنبہ است انشاء اللہ بوطن می آرسم دو سواری اسپ از برادران بعاریت بدست آوردہ برائے ہر دو کس تا آب گنگ بفرستند

آگئے ہوں گے اُن سے دوا اور تدبیر ازالۂ مرض کرنا چاہئے"۔

کہ از آز روے آب بہ سپاہان سوار شدہ بوطن برسند شتر برخوردار سید محمد اعظم براے باربرداری بار کہ بر بہل بود باشند لیتہ و رسن تیز بفرستند یک پہر روز برآمدہ بندہ از قنوج روانہ بلگرام خواہد شد شاید تا ظہر آن روے آب برسیم آن برخوردار و ہر کس کہ ہمراہی شما کنند ہرگز ارادہ آمدن تا لب آب گنگ نخواہید کرد کہ ہوا بسیار گرم ہست من خود آنجا میرسم آخر روز اگر بعد در آمدن باشید تا لکر الی بیایند و الا این ہم دشوار بہست بخدا کہ ہرگز راضی نیستم ہمان جا ملاقات خواہد کرد کہ خوشی قیمتی مادریست زیادہ بجز شوق چہ نویسد و السلام

شاعری

سید عبد الجلیل کو شاعری میں چندان شغف نہ تھا نہ اسمین کوئی دلچسپی و شیفتگی تھی۔ آپ کا شعر کہنا محض "تقریبی" ہوتا تھا۔ مدتین گذر جاتین اور ایک مصرع موزون کرنے کی نوبت بھی نہین پہونچتی تھی لیکن جب کوئی تقریب پیش آجاتی تو اندک توجہ سے معانی و مضامین مسخر و حاضر نظر آتے تھے۔ آپ کی طبیعت قدرۃً معنی آفرین واقع ہوئی تھی۔ شعر گوئی محض تفنن خاطر کے لئے ہوتی تھی یا اس خیال سے کہ کوئی صنف کمال ان سے باقی نہ رہجائے۔ وہ شاعری کو اپنے مرتبہ سے پست و حقیر سمجھتے تھے جیسا کہ اپنے "قصیدہ نسبی" مین فرماتے ہین ؎

مقصود من تفنن طبع است از سخن   ورنہ سزاے رتبہ من نیست شاعری

اصل یہ ہے کہ یہ قصیدہ اُن کے تمام قصائد مین ممتاز اور خوبیون سے مالامال ہے اسمین متانت و استواری و پختگی کلام کے ساتھ خیال آفرینی، نزاکت ادا اور حسن ترکیب نمایان ہے۔ بند شین دلآویز ہین۔ باقی قصائد مین کوئی ما بہ الامتیاز شے نظر نہین آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن مین آورد کا حصہ آمد سے غالب رہتا تھا۔ جو کثیر المشاغل اور مختلف المقاصد شخص دوراز کار باتون سے زبان کو آلودہ نہ کرتا ہو وہ ترہات شاعرانہ پر کب توجہ کرے گا لیکن خاہشمند اور ارباب

احتیاج مانتے نہ تھے مجبورانہ اُن کی تشنگی وضرورت رفع کردیجاتی تھی۔ چنانچہ قصیدہ فتح آگرہ مین لکھتے ہین ؎

شعر گر فضل من نہ پوشیدے　　　　می شدم در فن سخن اقدم

گر بہ پرسی زجامعیت من　　　　میر خسرو دہم جواب نعم

میر صاحب نے ضرورتاً قصائد زیادہ کہے ہین اُن کے کلام مین، کہین کہین ابوطالب کلیم ملک الشعرائے شاہجہانی اور حاجی محمد جان قدسی کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہو۔ معاصر نہ سہی یہ دونون قریب العہد ضرور تھے۔ اگران کے کلام وکمال کا گہرا رنگ میر عبدالجلیل پر چڑھ گیا ہو تو تعجب کی بات نہین۔ البتہ تشبیہات کی نُدرت اور استعارات کی شوخی یہان کمیاب ہے کم مشقی اور کم توجہی ان التقصیرات کی ذمہ دار ہے۔ ورنہ جودت طبع، ذہانت اور وسعت نظر ومعلومات مین میر صاحب کس سے کم تھے؟

میر عبدالجلیل هفوات شاعرانہ سے نہایت احتراز کرتے اور اپنے فرزندان وتلامذہ پر اس قسم کے لوث وآلودگی سے محفوظ رہنے کے لئے سخت تاکید رکھتے تھے بالخصوص انبیا علیہم السلام کی شان مین حضرت یوسف پر شوق مجازی کو ترجیح دینے اور صبر ایوب پر عاشق کے طعن کرنے پر نہایت سرزنش کرتے (علیہما السّلام) اگر کسی جگہ اس قسم کے ترہات واباطیل نظر سے گذر تو سورہ شعرا کی آیۃ خاتمہ زبان پر آجاتی تھی۔ یعنی وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (اور جنھون نے لوگون پر ظلم کئے ہین اُن کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ کیسی جگہ اُن کو لوٹ کر جانا ہے۔ جزء ۱۹۔ سورۃ الشعراء ع ۱۱-۱۵)

میر صاحب کا کلام عربی وفارسی وترکی وہندی چار زبانون مین پایا جاتا ہے اور انصاف یہ ہے کہ باوجود عدم اعتنا، وفقدان توجہ کے انھون نے اپنا کمال کمال دکھادیا ہے۔ بیشک وہ غزل کم کہتے تھے، لیکن باقی تمام اقسام سخن مین بے بدل جواہر بکھیرے ہین اور ثابت کیا ہے کہ شخص واحد کو تمام انواع شاعری پر اس درجہ دسترس وعبور بہم پہونچنا دشوار ہے دقیقی نے اسکے

بلکہ زاہد خشک، لیکن آغاز شباب مین رنگین مزاجی وظرافت مین بھی کامل تھے۔ ع

ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا؟

تخلّص۔ میر عبدالجلیل ابتدا مین "طرازی" تخلّص کرتے تھے پھر اس مناسبت سے کہ سید واسطی الاصل تھے "واسطی"، قرار دیا لیکن زیادہ تر دیکھا یہی گیا ہے کہ وہ اپنا پورا نام "عبدالجلیل" اور کبھی کبھی "میر جلیل"، داخل کلام کرتے تھے۔ وہ دونون تخلص ان کی جوانی اور انکی شاعری کی جوانی کے یادگار تھے اور نام کا لینا یا نظم کردینا انحطاط عمر یا زمانہ پختگی کلام وکمال مین اختیار کیا تھا صاحب حیات الشعرا نے ان کا نام میر جلیل لکھا اور ان کو حرف میم مین ذکر کیا ہے خود میر نے ایک موقع پر فرمایا ہے ؎

خدنگ غمزہ شوخ مغ صنوبر قد　　ز کند شست سر خستہ جان میر جلیل

عَرُوض

میر عبدالجلیل کی مہارت فن عَروض عربی وفارسی مین بدرجہ نہایت تھی شیخ سعدی کا شعر ہے

وَاِن سَلِمَ الاِنسانُ مِن سُوْءِ نَفْسِہٖ　　فَمِنْ سُوْءِ ظَنِّ المُدَّعِی لَیسَ یَسلَمُ

میر نور اللہ احراری نے اس قول کی شرح مین لکھا ہی کہ لَیْسَ یَسْلَمُ سے لَایَسْلَمُ زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بحالت لَیْسَ ہونے کے مصرع بڑھ جاتا ہے۔

میر عبدالجلیل نے اس قول پر معارضہ کیا اور یہ حاشیہ لکھا ہے۔

"مخفی نماند کہ این بیت بروزن دوم از اوزان ثلثہ بحر طویل است کہ عروض وضرب آن مقبوض می آید و تقطیع مصراع ثانی کہ مناط گفتگوست ذو وزن بہ وزن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعلن باشد چنین ست فمن سو فعولن ءظنن نلمد مفاعیلن دعی لی فعولن سن یسلمو مفاعلن۔ وچون تقطیع مذکور معلوم گردید ظاہر شد کہ واجب ومتعین است کہ نسخہ لیس یسلم باشد نہ لایسلم چنانچہ میر گمان بردہ۔ چہ حرف لام ویا از حرف لیس در تقطیع بالفظ دعی مرکب شدہ

فعولن خواہد شد و تسلیم بر وزن فاعلن خواہ ماند و فاعلن در ضرب بحر طویل نمی آید چنانچہ بر متبع عروض ہویداست چہ ضرب بحر طویل تامی باشد یا مقبوض یا محذوف۔ و فاعلن ازین ہر سہ قسم خارج ست پس آنچہ میر نوشتہ کہ از نسخہ لیس مصرع زیادہ می شود موافق میزان طبع میر ست نہ موافق میزان عروض طرفہ آنکہ مصراع در صورتیکہ لاتسلیم باشد کم می شود۔

وجہ مناسب این مقام است بیتے کہ خلیل بن احمد واضع فن عروض در مثال وزن دوم بحر طویل آوردہ ؎

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَاکُنْتَ جَاهِلًا ۞ وَیَاْتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ

و عبارت میر کہ لاتسلیم فصیح تر از لیس تسلیم می نماید چہ در نسخہ لیس مصراع زیادہ میشود انتہی محل تامل ست۔ زیرا کہ منطوق عبارت دلالت دارد برین کہ زیادت مصراع منافی فصاحت ست و وزن عروضی را وجوداً و عدماً در فصاحت و عدم آن دخلی ست و حال آنکہ ہیچ یکے از علمائے معانی این معنی را در فصاحت کلمہ و کلام و عدم آن اعتبار نکردہ۔ بہ فرض تنزل اقتضائے عبارت میر آنست کہ بر تقدیر زیادت فصاحت مرتفع می گردد و حال آنکہ لفظ فصیح تر کہ برائے تفضیل است دال ست برین کہ نسخہ لیس تسلیم ہم فصیح ست پس فصاحت این نسخہ با زیادت وزن باعتقاد میر چہ قسم جمع می تواند شد اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ هَفَوَاتِیْ وَاعْفُ عَنْ زَلَّاتِیْ "

حسن طلب

میر عبد الجلیل کو ایکبار زمخشری کی کتاب ربیع الابرار کی ضرورت ہوئی خواجہ عبد الباسط دہلوی سے منگائی اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

۵۲۱ عنقریب زمانہ تجھ پر بہت سی نامعلوم باتیں ظاہر کریگا اور تجھے وہ شخص خبریں دیگا جس کو تو نے اس غرض سے بھیجا نہیں "سبعہ معلقہ" قصیدہ ثانیہ طرفہ بن عبد البکری۔

۵۲۲ زمخشری، ابو القاسم جار اللہ محمود بن محمد بن عمر خوارزمی طریقتاً حنفی عقیدتاً معتزلی تھے۔ ائمہ نحوین

یا باسط الایدی ایا غیث الندی   صیرت مزرعۃ العطا مربعا

لا[ث] غروان ارجو الربیع بفضلکم   فالغیب یعطی العالمین ربیعا

خواجہ صاحب نے کتاب مذکور فوراً اسیر صاحب کی خدمت مین بھیجدی جو اُن کے کتبخانہ مین مدت تک موجود رہی۔

[ث] سبحۃ المرجان مین یہ مصرعہ یون لکھا ہے۔ لا غروان اطلب ربیعا منکم

مربع بروزن بیع سرسبز۔ ظاہرا مربعہ کہنا چاہیئے تھا یہ عایت مزرعۃ ارض مربعہ مخصبۃ کو کہتے ہین

داخل ہین۔ ان کا دعوی تھا کہ اُن کی تصانیف نحویہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے سیبویہ کی کتابون سے کسی طرح کم مرتبہ نہین رکھتی ہین۔ اسی کے ساتھ وہ بڑے بلند پایہ لغوی، ادیب و مفسر بھی تھے۔ ابو عمر و عامر بن حسن سماسرہ کہتے ہین کہ زمخشری بروز چہارشنبہ ۲۷ رجب ۴۶۷ھ (۲۲ مارچ ۱۰۷۵ع) کو بمقام دیہہ زمخشر ملک خوارزم پیدا ہوئے اور شب عرفہ ۵۳۸ھ (۷ دسمبر ۱۱۴۳ع) مین قصبہ جرجانیہ (خوارزم) مین وفات پائی (جرجانیہ معرب ہے اصل نام فارسی کا گرگانج تھا۔ دریای جیحون کے کنارے واقع ہے) فاضل ابو مضر کے شاگرد تھے استاد شفیق کی رحلت پر مرثیہ رثائیہ لکھا تھا ؎

وقائلۃ ما ھذہ الدرر التی   تساقطہا عیناک سمطین سمطین

فقلت لہا الدر الذی کان قد ملا   ابو مضر اذنی تساقط من عینی

حج بیت اللہ کی عزیمت سے جب زمخشری بغداد ہوکر گذرے تو اُن کی آمد پر شیخ شریف ابو السعادات ابن شجری ملاقات کیلئے آئے اور چند اشعار پڑھے زمخشری کی مدح وثنا کی۔ زمخشری خاموش بیٹھے سنتے رہے حتی کہ شیخ نے اپنی تقریر ختم فرمائی۔ تو زمخشری نے اُن کا شکریہ ادا کیا تعظیم دی اور اپنی جانب سے تواضع وانکسار کا اظہار کیا۔ اسکے بعد ایک روایت بیان کی کہ جب زید الخیل بارگاہ نبوت مین حاضر ہوئے اور جمال مبارک دیکھا تو بے اختیار بہ آواز بلند تشہد پڑھنے لگے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے زید الخیل ہر مرد کہ جسکی مجھسے توصیف کی گئی ہو، مین نے اُس کو اُن صفات سے دون وفروتر پایا مگر تم کو کہ تم بیشک اُن اوصاف سے جو سنے تھے فوق وبالاتر ہو پھر زمخشری نے کہا کہ یہی کیفیت ہمارے شیخ شریف کی بھی ہے اور اُن کو دعائین دین اور ثنا وصفت کی۔ شیخ شریف اپنی مجلس مین وقور وصاحب ہمت حسن تھے۔ ادب نفس اور آداب درس سے خالی کوئی کلمہ زبان سے نہین نکالتے تھے۔ اس لئے حاضرین متعجب تھے کہ سلسلہ نبوت کا ایک جھیہ ہم معزز شخص تو بہان شعر ہی پڑھ رہا ہے اور اسکے روبرو ایک ادیب وشاعر مناسب حال حدیث بیان کرتا ہے

زمخشری اور ابن عطیہ کے ساتھ جو مباحثے اثیر الدین ابو حیان اندلسی نے لئے تھے ان کو ابو حیان کے شاگرد

لیکن فعیل مذکر و مونث دونون کے لئے آتا ہے جیسے اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (خدا کی رحمت خاص رکھنے والون سے قریب ہے جزو سورۂ الاعراف ع ۷، ۱۴) صاحب قاموس نے رسل کے مادہ مین اس قاعدہ کی تصریح کی ہے ۔ لاغرو بمعنی لاعجب ۔ رشید وطواط نے حدائق السحر مین تاکید المدح بمایشبہ الذم کی مثالون مین بدیع ہمدانی سے یہ مثال نقل کی ہے ؎

هُوَ الْبَدْرُ اِلَّا اَنَّهُ الْبَحْرُ زَاخِرًا سِوَى اَنَّهُ الضِّرْغَامُ لٰكِنَّهُ الْوَبْلُ

اور لکھا ہے کہ مین نے یہ شعر بلخ مین ابراہیم غزی شاعر کے روبرو پڑھا اُس نے یاد کرلیا اور ایک ہفتہ سے زیادہ اس کے مثل کہنے کی فکر کرتا رہا مگر ناکام رہا اور اپنے عجز کا اعتراف کیا اور اقرار کیا کہ بدیع سے پیشتر نہ تو کسی نے ایسا کہا اور نہ اب کہہ سکے گا ۔ میر عبد الجلیل فرماتے ہین کہ اس نفی تابیدی سے تعجب ہے جو رشید وطواط نے غزی سے نقل کی ہے چنانچہ اسی طرز پر ایک شعر خود نظم کیا اور اس مین مراعات نظیر کا حق ادا کر دیا ہے ؎

هُوَ الْقُطْبُ اِلَّا اَنَّهُ الْبَدْرُ طَالِعًا سِوَى اَنَّهُ الْمِرِّيْخُ لٰكِنَّهُ السَّعْدُ

شیخ تاج الدین احمد بن عبد القادر بن مکتوم نے قلمبند کرلیا تھا ۔ در اللقیط نام رکھا تھا ۔ زمخشری و وطواط سے بھی مناظرہ ہوا تھا ۔ اُس کی روئداد کا ایک ورق مدینہ منورہ مین عارف حکمت بے کے کتبخانہ مین محفوظ ہے ۔ ابن وہاس سلیمانی فقیہ مکّی کا قصیدہ زمخشری کی مدح مین مشہور ہے ۔

زمخشری کی بہت سی تصانیف موجود ہین ۔ ربیع الابرار و نصوص الاخیار و متشابہ اسامی الرواۃ والنصائح الکبار والنصائح الصغار ، ضالۃ الناشد و الرائض فی علم الفرائض ، شقائق النعمان فی حقائق النعمان ، شافی العی من کلام الشافعی ، القسطاس فی العروض ، معجم الحدود ، منہاج فی الاصول ، مقدمۃ الادب ، کتاب الکشاف عن حقائق التنزیل (تفسیر مین) کتاب المفصل فی النحو ، کتاب المفرد والمولف (نحو مین) اور اطواق الذہب غایت شہرت سے محتاج تعارف نہین ۔ ان کے سوا کتاب الفائق (تفسیر حدیث مین) اساس البلاغۃ (لغت مین) اور کتاب اسماء الادویہ و الجبال ، مقامات الزمخشری اور اعجب العجب شرح لامیۃ العرب (للشنفری) بھی قابل ذکر ہین ۔

ف حضرت زید الخیل الطائی کا نام نامی حضور اقدس صلعم نے "زید الخیر" رکھا تھا ۔ آپ کے حالات استیعاب اور اصابہ وغیرہ مین ملتے ہین ۔ عرب کے نامور شاعرون مین سے تھے ۔ الشعر والشعراء مطبوعہ لیڈن مین (صفحات ۵۶ الغایۃ ۱۵۸ پر) آپ کے اخبار و احوال بالتفصیل مرقوم ہین ۔

اشعارِ متفرق

(فارسی)

(۱)

وِردِ خود نامِ خدا با نامِ احمد کردہ ام
دانۂ تسبیح از میمِ محمد کردہ ام

(۲)

بجز مژگان ندارد چشمِ بیمارِ تو غمخوارے
بلاگردانی برگشتہ مژگانت تماشا کن

(۳)

سرت گردم ادا فہمی سوادِ نامۂ گلگون
چو دودِ آہ در لختِ جگر پیچیدہ می آید

(۴)

شامِ غم را در سوادِ نامہ پنہان کردہ ام
صبحِ محشر می دمد از صفحۂ مکتوبِ ما

(۵)

خزان بہار ندارد، ولے حنائے نگار
خزان چو کرد، نماید بہارِ نیلوفر

(۶)

با نتظارِ قدومِ تو، لالہ در گلشن
ستادہ قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت

۵۲۳ ربیع الابرار، اب تک حلیۂ طبع سے معرّیٰ ہے البتہ تلاش سے کہیں کہیں اسکے خطیہ نسخے مل جاتے مین پانچ چھ سو صفحات کی ضخامت ہوگی عربی سے فارسی مین بھی ترجمہ ہوا ہے محمد بن یعقوب نے ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ع) مین اصل عربی کا اختصار کرکے روض الاخیار المنتخب من ربیع الابرار کے نام سے موسوم اور سلطان سلیم خان بن بایزید خان عثمانی سے منسوب کیا تھا۔ یہ مختصر ۱۲۸۰ھ مین مصر مین طبع ہوا تھا۔ بعض لکھتے ہین کہ ابوالحسن الواحدی نے متنبی کی شرح لکھی تھی زمخشری نے اُس سے التقاط کیا۔ قاضی نور اللہ نے مجالس مین ربیع الابرار کا حوالہ دیا اور ذکر کیا ہے مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی نے بھی فوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مین ربیع الابرار کا نام لیا ہے۔

مُستزاد

یہ رُباعی چارون زبانون مین محض اپنی تفریح طبع کے لئے بصنعت مُستزاد کہی تھی ؎

جَاءَ النَّیرُوزُ بِالنَّشاطِ الاَوفی　فِی خَیرِ قُدُومِ　سالِ نو کا دن بڑی خوشی کیساتھ آیا　نیک آنکے ساتھ
پھولین دُرم بیل پھلی بن اولہا　تر و تر رہی جھوم　شاخین پھولونسے لد گئین جنگل لہلہانے لگا　درختنا پنا سر اٹھانے لگے
نیکی کندوز کلدی یزی بولدی ییش　قتلغ بو سوم　نئے سال کا دن آیا بیابان سرسبز ہو گیا　مبارک ثابت ہو
چون شہپر طاؤس گُل اندر صحرا　آورد ہجوم　مور کی پھیلی ہوئی دُم کیطرح جیسے جنگلمین پھول　اکھٹے ہو گئے مین

---

۵۴۴ نوروز ماہ کا پہلا دن ہے۔ اس روز آفتاب بُرج حمل مین آتا ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی دربار اکبری مین لکھتے ہین کہ "نوروز کو ایشیا کی ہر قوم و ملت اور ہر ملک کے لوگ ہمیشہ عید مانتے اور مناتے رہے ہین۔ موسم بہار مین طبائع انسانی مین ایک ولولہ و جوش پیدا ہو جاتا ہی خواہ ترکان چنگیزی ہون یا زرتشتیان ایرانی ... اسی لے بادشاہان تیموری بھی نوروز کے دن شاہانہ فر و سطوت و تمکنت سے جشن کیا کرتے تھے۔ اکبر نے اس کے اہتمام و احتشام کو زیادہ چمکا دیا تھا۔ نوروز سے لیکر اٹھارہ دن تک اُمرا اُسکے تکلفات و ضیافت مین مشغول و مصروف رہتے تھے۔ رقص و طرب کی محفلین گرم ہوتین، اور وہ سب رُسوم ادا کیجاتین جو اکبر کے نزدیک ہندوستان کی دلدہی اور استمالت کے لئے ضروری تھین۔ راجہ مہاراجہ ایک طرف، ایرانی تورانی سردار دوسری طرف، اپنی شان و شوکت اور بہادری و شجاعت کی نمائش کرتے تھے۔ پہلے شاہزادون کی پھر امرا کی درجہ بدرجہ انذرین گزرتی تھین۔ تخت گاہ تک پہونچکر آداب زمین بوس بجالاتے شعرا قصائد پیش کرتے صلہ و خلعت پاتے۔ بادشاہ کا تلادان سونے کی ترازو مین سونا چاندی سے کیا جاتا۔"

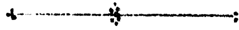
شاہجہان نے اس رسم کو بالکل اُٹھا دیا تھا۔ شاہزادہ ولی عہد محمد معظم بہادر شاہ نے ایک مرتبہ یہ جشن منایا تھا۔ عالمگیر کو خبر ملی تو فرزند سعادت توام کو ان الفاظ مین سرزنش فرمائی۔

"از عرض بے غرضے ظاہر شد کہ امسال نوروزے بطور اہل ایران بتکلف کردہ اند بفضل الٰہی عقائد خود درست دارند۔ این بدعت تازہ از کہ آموختہ اند۔ ظاہر آن عرب کہ خود را سیدی گویند تعلیم کردہ باشند۔ بہرحال چون این روز از اعیاد مجوس ست و باعتقاد ہنود روز جلوس بکرماجیت و مبداء تاریخ، من بعد عمل نباید و چنین جہالت بفعل نہ گراید۔"

اَشعارِ عَربی

میر عبد الجلیل کا کلام عربی کبھی مُدوّن نہین ہوا متفرق اشعار جا بجا تذکرون مین ملتے ہین بعض منتخب نقل کیے جاتے ہین ؎

یا صاح لا تلم المتیم فی الھوی — ھو عاشق لا ینثنی عن خلہ
یابی الدواء سقامہ کعیونہ — فعلی الطبیعۃ یا معالج خلہ



حبیبی قوس حاجبہ کنون — وصاد یدا ابن مقلۃ شکل عینہ
لعمری انہ نص جلی — علی ان الرمایۃ حق عینہ



کسی شاعر کے دو شعر مشہور ہین اُس رنگ مین فرماتے ہین

حبیبی ثغرہ کالسین شکلا — وکالمیم المدور شکل فیہ
ھما اسم ویا عجبا حیاتی — اذا ما ذقتہ لا شک فیہ

میر غلام علی آزاد لکھتے ہین کہ اسمین ضمیر مذکر حیوۃ کیطرف راجع کردی گئی ہو اسمین اصلاح اس طرح پر ہو سکتی ہے

٭ رفع بدعت نوروز و تبدیل آن بجشن نشاط افروز جلوس مبارک" کے عنوان سے منشی محمد کاظم بن محمد امین نے عالمگیر نامہ (مطبوعہ کلکتہ کالج پریس ۱۸۶۸ع صفحہ ۳۸۹) مین ان احکام و ہدایات شاہی کا ذکر کیا ہے۔
شاہ دین پناہ کی رحلت کے ساتھ جب مہمات مملکت مین تخلل اور اساس سلطنت مین تزلزل آیا تو یہ بدعات و رسوم پھر تازہ ہوگئین
دولت و حشمت کے ایسے کرشمے دور زمانہ نے بہت دیکھے ہین ؎
این چنین بسیار کردست و کند — سبحہ را زنّار کردست و کند
ہندوستان مین سال شمسی کے آغاز پر نوروز ۲۲ یا ۲۳ مارچ کو ہوتا تھا اور مغلون کے آخر عہد تک بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔

فتاۃ ثغرھا کالسین شکلا | وکالمیم المدور شکل فیھا
ھما سمٌّ و یا عجبا حیاتی | اذا ماذقتہ لا شک فیھا

معمّے

ید بیضا مین لکھا ہے کہ میر عبد الجلیل کے معمیات چارون زبانون مین ہین اور بکثرت ہین منجملہ اُن کے یہ دو معمّے نقل بھی کئے ہین جن کا آیات قرآنی سے استخراج کیا تھا۔

(۱) علی کے نام کا وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ یَقُولُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ [اور سورج اور چاند ایک جا کر دیے جائین۔ اُس دن آدمی بول اُٹھیگا کہ اب کدھر کو بھاگ جائین جز ۲۹۔ سورۂ القیمۃ ع ۱-۱۷] شمس سے مراد عین ہے اور قمر سے ماہ۔ اور ماہ سے تیس۔ اور تیس سے لام اور یقول کی تحلیل سے دو چیزین پیدا ہوئین ایک ی۔ دیا۔ اور دوسرا قول یعنی قیل دکھا گیا، کہ جب نام علی نکل آیا تو اس کے یہ معنی یہ ہوئے "جب وہ لایا جائے جو انسان کامل ہے۔ آج اُس سے گریز کہان ممکن ہے"۔

(۲) بصیر کے نام کا اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا [میرا یہ کُرتا لے جاؤ اور اس کو والد صاحب کے منہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگین گے جز ۱۳۔ سورۂ یوسف۔ ع ۱۰-۴] ابی سے مراد اُس کا مرادف 'والدی' ہے۔ عدد القمیصی، اور 'والدی'، کے 'بصیرا'، کے اعداد کے برابر ہین تو معما کے معنی یہ ہون گے "پس اس کو میرے والد (باپ) کے اوپر ڈال دو۔ جو 'ابی' کا مرادف ہے"۔ اور آیہ کی عبارت سے بھی لفظ بصیر کا خروج ظاہر ہے۔

آج یہ تکلفات بارگران، اور نازک خیالیان روح فرسا ثابت ہو رہی ہین لیکن ڈھائی سو برس پہلے یہی معرکہ دبستان صنعت کا زیان معیار کمال اور حُسن کلام سمجھی جاتی تھین۔

مُلّا محمد قاسم کاہی نے ایک پورا رسالہ فن معمّا مین لکھا ہے۔ امین بنی کے نام کا یہ معمّا تحریر کیا ہے

بر شعر تا شستافتہ ام | از محمد بنی ستگافتہ ام

میر عبدالجلیل نے بھی اسی طرز پر معمّا امام کے نام کا نکالا ہے ؎

در معمّا چو کام یافتہ ام — من علی را امام یافتہ ام

علی کے نام کا یہ معمّا ناصر علی سے منسوب ہے جس میں اعراب کی بھی تصریح ہے۔ ؎

چشم بکشا، زلف بشکن، جان من — بہر تسکین دلِ بریان من

یعنی مترادف چشم، عین۔ وَ بکشا، بمعنی افتح۔ یعنی عین کو فتحہ دیجئے۔ زلف، عمل تشبیہ سے لام ہو جاتی ہے۔ بشکن عمل ترادف سے بمعنی اکسر یعنی لام کو کسرہ دیجئے۔ دل بریان، یا ہے۔ تسکین، سکون دینا۔ حاصل کل عَلِیْ ہوا۔

آزاد نے بھی ایک معمّا باسم ممنون لکھا تھا جس پر میر عبدالجلیل نے صاد کیا تھا ؎

غم من بے نتیجہ بود اوّل — شکر ایزد نتیجہ داد آخر

غم من، اول شکل منطقی ہے یعنی غم صغریٰ و من کبریٰ۔ اوّل بے نتیجہ ہو گیا یعنی غین کا نون جاتا رہا، مم، کہ حد اوسط ہے باقی رہا۔ آخر نتیجہ غین، نون ہوا۔ نون رہا، ممنون حاصل ہوا۔

متصوفانہ مکاتبت

سید اسمٰعیل بلگرامی خلیفہ شاہ عبدالرزاق بانسوی نے ایک رقعہ میر عبدالجلیل کو لکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ یقظہ (بیداری) افضل ہے یا نوم (خواب)؟

میر صاحب مشفق مہربان فیض رسان سلامت حقیقت نوم و یقظہ بر ارباب معانی منکشف

---

۴۲۵ میر سید اسماعیل سادات حسینی واسطی کے عشیرہ پنج بعیہ سے، بلگرام محلہ سیدان پورہ کے باشندے تھے۔ ابتدائے حال میں کتب درسی پر عبور حاصل کیا اور فضائل رسمی کو اکتساب فرمایا تھا۔ میر طفیل محمد بلگرامی کے علاوہ دیگر اساتذہ سے مختلف مقامات میں بھی تحصیل علوم کی تھی۔ خدا طلبی کی شورش جب سر میں بڑھی تو شیخ عبدالرزاق بانسوی کی خدمت میں پہونچے، شرف بیعت حاصل کیا اور مورد عنایات خاص ہوئے۔ بارہ سال کے قریب شیخ کے زیر سایۂ تربیت رہ کر ریاضت ہائے شاقہ فرمائیں اور فائز بہ فیوض ہو کر منتہائے معارف

وہویدا است بعضی نوم را بر یقظه ترجیح داده اند و بعضے یقظه را بر نوم - این معنی را مشروحاً تحریر فرمایند
والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم -

میر صاحب نے اس کا جواب حسب ذیل تحریر فرمایا -

بیدار دل، خوابیده ہوا، ثابت مقام تسلیم و رضا سلامت - از معارضۂ نوم و تفضیل یقظه و نوم نگارش رفته رمز آگاہا! اگرچه منطوق کلام اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَهُوْا و حدیث شریف اختصام ملاء اعلیٰ در تصعید عمل متیقظ به بالا روی بانحطاط درجهٔ جواب دارد ع چشم تو نه بخت ماست پر خواب چرا است؟

پہونچ گئے شیخ کے انتقال کے بعد سجادۂ خلافت کو زینت دی حضرت شیخ کے تمام خلفا اور مریدان کو اپنا مقتدا سمجھتے اور مانتے تھے . اعتقاد کامل رکھتے اور ادب و احترام کرتے تھے حسب روایت مآثر الکرام علامۃ العصر مولوی نظام الدین خلف الصدق مولانا قطب الدین شہید سہالوی نور اللہ ضریحہما نے بھی شیخ کی وفات کے بعد میر کی خدمت میں رجوع کیا تھا - میر نے رسولی (ضلع بارہ بنکی)، تابع لکھنو، میں قیام اختیار فرمایا تھا - لیکن ملک میں بھی اکثر تشریف لاتے اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہتے تھے - ارادتمندان عقیدت کیش کی تعداد کثیر تھی - ۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ (۲۵ نومبر ۱۷۵۱ء) کو رسولی میں استراحت دائمی پسند فرمائی -

۵۲۶ شاہ عبد الرزاق، در اصل قصبہ محمود آباد (جوار بانسہ) کے رہنے والے تھے، بانسہ، تابع لکھنو (حال واقع ضلع بارہ بنکی)، کے شیوخ قدوائی میں آپ کا ننھیال تھا - اسی ارث مادری کے علاقہ سے بانسہ میں توطن فرمایا تھا - شروع زمانہ میں پیشہ نوکری اختیار کیا تھا کسب معاش فرماتے رہے - پھر ترک ملازمت فرما کر ایک عمر سیر و سیاحت میں گذار دی - سواد احمد آباد گجرات میں شاہ عبد الصمد خدانما کی خدمت سے مشرف ہوئے - مرید ہو کر مقاصد اعلیٰ پر پہونچے - وہاں سے وطن مالوف واپس آئے - لباس ہمیشہ اہل دنیا کی طرح پہنتے اور شغل کاشتکاری سے قوت حلال بہم پہونچاتے تھے - حضرت کی حالت دیکھ کر ہر وضیع و شریف مطیع و منقاد ہو جاتا تھا - علمای متبحر اور فضلائے عصر آپ کے حلقہ بگوش اور ارادت مند تھے - با این کہ امی محض تھے آیات قرآنی کو از بر پڑھتے اور نہایت خوب تفسیر فرماتے تھے - ایسے حقائق و معارف و اسرار بیان کرتے تھے کہ جنکو سن کر عقلاء و دانشمند متحیر رہ جاتے تھے - بروایت میر غلام علی آزاد - ۵ شوال ۱۱۳۶ھ (۱۷ جون ۱۷۲۴ء) کو اور حسب تحریر بزرگان فرنگی محل ۶ شوال روز چہار شنبہ کو رحلت فرمائی - مدفن شریف بانسہ میں ہے - مزار متبرک ہے -

۵۲۷ اختصام ملاء اعلیٰ - حدیث شریف میں آیا ہے کہ تین اعمال کے لیجانے میں ملائکہ باہم خصومت اور جھگڑا کرتے ہیں - اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَلِیْنُ الْکَلَامِ وَالصَّلٰوۃُ بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ (۱) کھانا کھلانا (۲) کلام کی نرمی

اما مضمون کریمہؑ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ
باعتبار کفالۂ تقلیب کہ مشتمل ست بر اسرار عجیب، دلالت بر رفعت شان از خود خوابیدگان وارد ع
زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری است۔

واگرچہ بظاہر خطاب قمؑ یا نومان ناظر بہ تہدید ست اما تعطیہ بہ فضل عبا مشعر بہ غایت تعظیم وہم
چنین مضمون این منظومۂ ہندی ع یار آیوتب گانون سوئے کیسین ٹھگت بہ اپت ہوئے،
اگرچہ ایمائے بہ تنقیص نوم دارد اما فحوائے دوہرہ ؎

سپنین دیکھون پیہ مین کھل گئی انکھ بھاگ — اور گنواوت سوئی سب سون تو گنوا یو جاگ

از غایت نزاکت کاری مبنی است بہ تفضیل نوم بر بیداری ؎

خوشا بحالت آن عاشقے کہ در شب ہجر — بخواب شد آئی و او شرمسار برخیزد

تحقیق مقام آنکہ تا سرے بخیال او داری اگر بیداری است بہ از نوم، واگر نوم است بہ از بیداری
نمک ریزی شبلی در چشم و مژہ برای رفع خواب و خوابیدن عبودؑ ہفت سال و اوّل در آمدن او بہ بہشت،
ہر دو صواب است۔ این ست ما حضر فکر مستقیمؑ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ؎

(۳) نماز نوافل شب جس وقت کہ لوگ سو رہے ہون۔ یہ حدیث بتمامہ مشکوۃ کی تیسری فصل، باب المساجد و مواضع الصلوۃ مین موجود ہے۔

۵۲۸ اور تو ان کو سمجھے کہ جاگتے ہین حالانکہ وہ سوتے ہین اور ہم داہنی طرف کو اور بائین طرف کو اُن کی کروٹین بدلواتے ہین۔ (جزو ۱۵-سورۃ الکہف ع ۳-۱۰)

۵۲۹ قم یا نومان۔ بغزوہ خندق مین کفار کے فرار کی شب مین ابر و سردی سخت اور ہوا نہایت تند تھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفۃ الیمان کو کفار کے لشکر کی خبر لگانے اور تیر چلانے کو بھیجا اور دعا فرمائی حتی کہ سردی اور بھوکھ انکی دور ہو گئی۔ پھر وہ جیسے ہی لوٹ کر آئے جاڑے کا اثر تیز ہو گیا حضرت صلعم نے فضل عبا یعنی اُس لباس گلیم کا جو دوش مبارک پر تھا گوشہ زائد انکو اُڑھا دیا اور پائے مبارک اُنکے سینہ پر رکھدیا تسکین ہو گئی اور سو گئے جب نماز صبح کا وقت قریب آیا تو آپنے فرمایا "قم یا نومان" یعنی اے بہت سونے والے اُٹھ۔

۵۳۰ عبود بفتح عین و تشدید بار مضموم۔ آپ ایک حبشی غلام تھا جو سات سال تک سوتا رہا اور سب سے پہلے بہشت مین داخل ہوا سبب یہ ہے کہ اُس زمانہ کے پیغمبر کو انکی اُمت نے ایک کنوئین مین بند کردیا تھا۔ عبود

بعض تاریخین

میر عبدالجلیل کو تاریخ گوئی مین بڑا ملکہ تھا۔ ان سے سُنکر اس فن کی ابتدائی تاریخ آزاد نے سبحۃ المرجان مین درج کی ہی۔ ان کے دائرہ تاریخی کا ذکر اور اُسکے متعلق شیخ غلام نقش بند کی ستایش بیشتر حوالہ قلم کر چکا ہون۔ یہان صرف چند تاریخین جو خوبی فن اور لطافت محاضرات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہین نقل کی جاتی ہین۔

تہنیت فتح یا جلوس مین بارگاہ شاہانہ مین پیش کی گئین۔

سُلطان اورنگ زیب عالمگیر نے جب ۱۳ ذی قعدہ سنہ ۱۱۱۱ھ (۲۲ اپریل سنہ ۱۷۰۰ع) کو مرہٹون کو شکست دیکر قلعہ ستارہ[۵۳۲] گڈہ (واقع دکن)، فتح کیا تو اُسی شب مین میر عبدالجلیل نے عربی و فارسی و ہندی مین یہ تاریخین گیا۔

اُن پر ایمان لایا اور تمام قوم سے چھپا کر اُن کی خبرگیری و خدمت کرتا رہا صاحب قاموس نے اس کا پورا قصّہ مادہ عبد مین ذکر کر دیا ہے۔

۵۳۱ اور ہر ایک دانا سے بڑھکر دوسرا دانا ہے (جزو ۱۳ سورہ یوسف ع ۹-۳)

۵۳۲ ستارہ (یا شہر ستارہ۔ اسی ضلع کا صدر مقام صوبہ بمبئی مین) دریای کرشنا اور دینا کے اتصال پر واقع ہے۔

ستارہ کا مضبوط قلعہ ایک چھوٹے سے ڈھالو مگر سنگلاخ کوہچہ کی چوٹی پر نصب کیا ہوا نظر آتا ہے ہندو مورخین لکھتے ہین کہ اسکا نام ستارہ اسکی سترہ (۱۷) دیوارون، برجون اور پھاٹکون کے شمار د مناسبت سے پڑا تھا جو اُن کی تحریر کے مطابق اس قلعہ مین تھے۔

مسلمانون کا پہلا حملہ دکن پر ۱۲۹۴ع (سنہ ۶۹۳ھ) مین ہوا تھا۔ یوگری کا یادو خاندان ۱۳۱۲ع (سنہ ۷۱۲ھ) مین برباد ہوا تو مسلمانون کا تسلط بخوبی ہو گیا ۱۳۴۷ع (سنہ ۷۴۸ھ) مین بہمنی خاندان نے عروج پایا۔ پندرھوین صدی کے آخر مین بہمنیون پر زوال آیا اور ہر سردار بجائے خود ذی اختیار بن بیٹھا حتی کہ سلطنت بیجاپور قائم ہوئی جسکے تحت مین مرہٹون نے بڑھنا شروع کیا۔ ستارہ مع اضلاع ملحقہ پونا اور شولاپور کے مرہٹون کی قوت کا مرکز بنگیا۔ ستارہ اور اُس کے متصل کے قطعات کوہکن مین مرہٹون کی تاریخ کے بہت سے اجزا اور اُن کے اعمال وافعال وقوع پذیر ہوے ہین سیواجی کو پہلے پہل اس طرح شہرت نصیب ہوئی کہ اُس نے جاولی (متصل مہابلیشر) کے راجہ کو قتل کر ڈالا اور واسوتا کا زبردست قلعہ اور جاولی کو فتح کر لیا ۱۶۵۵ع (سنہ ۱۰۶۶ھ) مین

لکھین اور رسالہ ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور مین پیش کین اور خسروانہ تحسین کے مورد مستحق ہوئے۔ رسالہ کا نام گلزار فتح شاہ ہند، طوطی نامہ فیروزی شاہ عالمگیر، رکھا تھا خوبی یہ ہے کہ ان دونون نامون سے بھی تاریخ ۱۱۱۱ھ برآمد ہوتی ہی پہلی تاریخ عربی کی اور دوسری فارسی کی تقریبًا ایک ہین۔ ان کا اختراع صنعت تعمیہ کے عجائبات مین شمار ہوتا ہے۔

فی العربیۃ ؎

لَمَّا تَوَجَّهَ سُلْطَانُ الْأَنَامِ إِلَى	رَبِّ السَّمٰوٰاتِ فِي تَأْيِيدِ إِسْلَامِ
أَقَرَّ إِبْهَامَهُ فِي أَصْلِ خِنْصَرِهِ	بِوِرْدِ يَا قَادِرُ رَأْفَتَّاحُ أَكْمَامِ
فَصَارَ حِينَ افْتِتَاحِ الْاِسْمِ مُفْتَتَحًا	حِصْنٌ لِمَنْ عَبَدُوا أَحْجَارَ أَصْنَامِ

سیواجی نے پرتاب گڈھ کا مشہور و مضبوط حصار تعمیر کیا جس پر بادشاہ بیجاپور نے بسر کردگی افضل خان مرہٹون کے استیصال اور اس قلعہ کے فتح کرنے کیلئے فوج بھیجی سیواجی مشاورۃ و مصالحت کے حیلہ سے قلعہ کی دیوار کے نیچے افضل خان سے ملاقی ہوا اور اُس کو اپنے مشہور خنجر ' داگھ نک ' نام اسے ہلاک کردیا فوج منتشر و پریشان ہوگیٔ ۱۶۷۳ء (۱۰۸۳ھ) مین اس نے ستارہ فتح کیا۔ راے گڈھ مین اپنی آزاد بادشاہی کی راج دھانی قائم کی ۱۶۷۴ء (۱۰۸۵ھ) مین تاج پوشی کی رسم ادا کی ۱۶۸۰ء (۱۰۹۲ھ) مین اس نے وفات پائی سمبھاجی جانشین ہوا ۱۶۸۹ء (۱۱۰۰ھ) مین اورنگ زیب نے حملہ کرکے اسکو گرفتار کراکے قتل کرادیا۔ عالمگیر کی سیل روان طاقت کو کون روک سکتا تھا۔ اس نے ۱۷۰۰ء (۱۱۱۲ھ) مین قلعہ ستارہ بھی فتح کرلیا اور مرہٹون کو شکست فاش دی ۱۷۰۷ء (۱۱۱۹ھ) مین اورنگ زیب نے وفات پائی

پیشوا کی لڑائی کے اختتام کے قریب خفیف مزاحمت کے بعد ستارہ انگریزون کے قبضہ مین آگیا مگر فاتحین نے اسکو مع قطعات متصلہ کے پھر سیواجی کے خاندان کے قائم مقام کے حوالہ کردیا ۱۸۴۸ء مین اخیر راجہ کی وفات اور اولاد نرینہ نہ چھوڑنے پر یہ ریاست بحق سرکار برطانیہ ضبط ہوگئی

شہر ستارہ کی آبادی بھی رو بہ زوال ہے ۱۹۰۱ء مین چھبیس ۲۶ ہزار کے قریب تھی ۱۹۲۱ء مین ۲۲۴۵۴ رہ گئی۔ یہ قلعہ والی پہاڑی کے دامن مین آباد ہے ۱۸۲۰ء مین محض ایک کوچہ سفالہ پوش مکانات کا تھا جس مین کچھ سنگین تھے اور کچھ خشت پختہ کے۔ راج کی شکست کے بعد قدرتًا آبادی مین زوال شروع ہوگیا۔

نَظَرتُ فِی آلِفَاتٍ وَھِیَ اَربعَۃٌ ۔۔۔ مِن فَوقِ اِبھَامِہٖ مِن غَیرِ اِبھَامٍ
وَجَدتُّھُنَّ لِعَاءِ الفَتحِ حِینَئِذٍ ۔۔۔ رَقمًا عَلٰی سَنَۃٍ مِن مَدِّ اِبھَامٍ
لِلّٰہِ تِلکَ یَدٌ بَیضَاءُ قَد نُزِعَت ۔۔۔ لِلنَّاظِرِینَ فَیَا لِلمُعجِزِ السَّامِی
ھٰذَا البَدِیعُ مِنَ التَّارِیخِ اَنشَاءَہٗ ۔۔۔ عَبدُ الجَلِیلِ بِتَائِیدَاتِ اِلھَامٍ

اہل اوراد کا داب و دستور یہ ہے کہ جب انامل پر ورد کا شمار کرنے لگتے ہین تو خنصر (انگشت شہادت) کی جڑ سے ابتدا کرتے ہین میر صاحب نے ابہام (انگوٹھا) کا خنصر کی جڑ مین ٹھہرانے کا ارادہ کیا ہے جس سے تاریخ کی خوبی اور بھی بڑھ گئی ہے یعنی اس سے سنہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پھر رقم کے الف اُس پر درج کر لیجیے جیسا کہ اکثر نسخ نویسان کا معمول ہے۔ رقما علی سنۃ من مد ابہام مین اسی طرف اشارہ ہے۔ اس مین شک نہین کہ یہ تاریخ بہترین قسم کی ہے جو بڑی عرق ریزی و خوض سے کسی کو مل سکتی تھی اگر اسکے حُسن کو اشعار مین بھی ظاہر نہ کر دیا ہوتا تاہم اس کی خوبی و شان و جدت اختراع روشن تھی۔

اسی کے ہم مضمون اور ہم شکل ذیل کی فارسی تاریخ مین جو انگلیون کی شکل سے نکالی ہے ایک جدت آفرینی کی ہے اور کمال طباعی و ذہانت دکھائی ہے ؎

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد ۔۔۔ بورد اسم اعظم در شمارہ
قلاع کفر شد مفتوح فی الحال ۔۔۔ ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتان شہ بر مد ابہام ۔۔۔ برابر چار الف کردم نظارہ
بعینہ بود شکل سال ہجری ۔۔۔ پئے تاریخ تسخیر ستارہ
چنین تاریخ گفتن اختراع است ۔۔۔ شد از عبد الجلیل این آشکارہ

اس نوع کی تاریخ کو استنباط کہتے ہین۔ اعداد کی صورت مین سال تاریخ بیان کر دی ہے یعنی بادشاہ کی چارون انگلیون کو چار الف تصور کیا کہ جن سے اعداد سال ہجری یعنی گیارہ سو گیارہ

آثار گذشتہ مین صرف راجہ کا محل باقی ہے جس مین اب جج صاحب کی کچہری ہوتی ہے۔

۵۳۳ میر حمزہ انکندری نے بھی خواجہ محمد کی وفات کی تاریخ (صوری و معنوی) اسی پیرایہ مین کہی تھی یعنی مرتبہ احاد و عشرات و مأت کے توافق پر مصرع نہ را بہ سقم سہ بار بنویس۔ جب نو کے ہندسے کو تین بار لکھا جاوے تو نو سو ننانوے ہوتا ہے یعنی نہصد و نود و نہ ۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ مصرع کے اعداد بھی حساب سے بھی وہی ہوتے ہیں۔ ہندی کی کسی شاعر نے ہندسہ نو کے مضمون کو اپنی زبان مین کسقدر خوب ادا کیا ہے ۔ و اکو نا نو مر دیکھو جاگت ایرم پایو جیسے کو تیسو نو دکھی نادھو نا دبچا۔

کی صورت پیدا ہوئی اور ابہام (زانگشت) کو سنہ کی شکل مانا کہ جس پر وہ چارون الف مرقوم تھے۔ اس تاریخ فارسی نے عربی تاریخ سے بھی زیادہ شہرت وقبولیت پائی۔

ایک اور تاریخ تعمیہ کے ساتھ یہ ہے ؎

چو شاہ عالمگیر آفتاب عالم تاب — کہ تیغ اوست بگیتی کلید فتح الباب
ستارہ قلعۂ کفار را محاصرہ کرد — بعزم آنکہ نماید بنائے کفر خراب
چنان بزلزلہ آمد زمین زہیبت او — کہ کوہ گشت چو دریا و قلعہ شد گرداب
چو فتح شد پی تاریخ فکر می کردم — برآمد از تہ دریائے فکر دُرِّ خوش آب
چو از درون ستارہ جنود شرک برفت — طلوع کرد درو آفتاب عالم تاب

یعنی لفظ "ستارہ" کے اعداد سے "جنود شرک" کے اعداد خارج کر دیجیے اور "آفتاب عالمتاب" کے اعداد شامل کر دیجیے تو تاریخ فتح بے تکلف برآمد ہو گی۔

یہ ایک اور قطعہ ہے جس سے چار مرتبہ تاریخ نکلتی ہے ؎

چو محی الدین محمد شاہ غازی — ستارہ فتح فرمود از اشارہ
رقم کردم ز کلک فکر بیتے — کز و شد چار تاریخ آشکارہ
بود ہر مصرعہ اش تاریخ و منقوط — ہمان عاطل ہمان شد در شمارہ
محمد شہ اساس سطح را کند — برآمد باطل از حصن ستارہ

آخر کے دونوں مصرعوں سے از روئے حساب جمل جداگانہ تاریخ برآمد ہوتی ہے اور اگر اس شعر کے حروف منقوطہ یا غیر منقوطہ کو لیجیے تو بھی وہی تاریخ نکلے گی۔

بہ طریق تعمیہ یہ تاریخ بھی ہے ؎

جشن سہ بارہ گیر بہ فتح ستارہ گڑھ — نظارہ کن جوانب و اطراف بوستان
این بیت را بہ تعمیہ گیرد اگر کسے — تاریخ با لفظ شود از لفظ او عیان

یعنی لفظ جشن کو اگر تین بار حساب کیا جاسے تو اکہزار انسٹھ (۱۰۵۹) حاصل ہوتا ہے جو بوستان کے اطراف

بے، د، نون، ہین کہ جن کے اعداد دو اور پچاس، باون ہوتے ہین۔ مجموعہ ایکہزار گیارہ ہوا۔ جو تاریخ کا عدد ہے اور مادہ تاریخ الفاظ جشن، ب و ن ہے کہ ان مین سے ہر ایک منقوط ہے۔

تاریخ مندرجہ ذیل بھی بطور تعمیہ ہے ؎

چو سیوا و سنبھا و رانا بہ گیتی | زتیغ شہنشاہ گشتند پارہ
الف ہای این راجہ ہا را بیک جا | نوشتیم تاریخ فتح ستارہ

یعنی ایک الف سیوا اور ایک الف سنبھا و دو الف رانا کہ جن کا مجموعہ چار الف ہوتا ہے جب یکجا لکھے جائین تو سال ہجری کے اعداد یعنی ۱۱۱۱ کی شکل پیدا ہوگی۔

فتح بسنت گڈھ کی پانچ تاریخین لکھی تھین۔ انشائی جلیل مین چار نقل کی ہین۔

نثر عربی مین صَارَ دِیَارُ الْکُفْرِ مَکَانَ الْاِسْلَام

نظم عربی ؎ جَاھَدَ السُّلْطَانُ بِالْوَجْہِ الْاَتَمِّ | صَارَ دَارُ الْکُفْرِ طَمْسًا بِالْیَقِیْنِ
قُلْتُ فِی تَارِیْخِ ھٰذَا الْاِفْتِتَاحِ | جُنْدُ نَصْرِ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ الْمُبِیْن

نثر فارسی فتح بسنت گڈھ بمدد ایزدی

نظم فارسی ؎ شاہ اورنگ زیب عالمگیر | چون کمر از پی جہاد بہ بست
کرد فتح بسنت گڈھ بغزا | سال تاریخ کوہ کفر شکست

میر عبد الجلیل نے فرخ سیر بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخین بھی چارون زبانون مین لکھی تھین۔ آیہ کریمہ یُورِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ [۱] سے اس کا استخراج کیا ہے ؎

قَدْ تَوَلّٰی فَرُّخ سیر ملک ھند | ولہ من عون القدیر اعتلاء
فاقتبسنا تاریخہ من کلام | صمدی یورثھا من یشاء

ہمزہ بیشمار داخل حساب ہے سال جلوس ۱۱۲۴ ہجری تھا

مفتاح التواریخ اور بیلس اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری مین زمانہ جلوس جنوری ۱۷۱۳ع

---

[۱] جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے (جزء ۹ سورۃ الاعراف ع ۱۵-۵)

مطابق ۱۱۲۵ھ لکھا ہی یہ صریحًا غلط ہی فرخ سیر کی تخت نشینی قلعۂ دہلی مین جمعہ ۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ کو ہوئی تھی جو ۹ جنوری ۱۷۱۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ غالبًا مسٹر بیل نے انگریزی سے سال ہجری بنانے مین غلطی کی ہے۔

خطاب

نواب غازی الدین خان نظام الملک آصف جاہ کو جب شاہ عالم نے صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر متعین کیا اور "خان[۵۳۵] دوران بہادر" خطاب دیا تو میر عبد الجلیل نے تاریخ عطائے خطاب "خان دوران بہادر" سے نکالی ۱۱۲۲ھ

ولادت

میر سید نور الحق خلف الصدق سید العارفین شاہ لدھا بلگرامی کی ولادت از لفظ "بخت مند" ۱۰۹۶ھ

میر غلام نبی میر صاحب کے خواہر زادے[۵۳۶] بلگرام مین ۲ محرم ۱۱۱۱ھ (۲۰ جون ۱۶۹۹ع) کو تولد ہوے۔ میر صاحب اُسوقت اُردوے عالمگیری کے ساتھ نواحی قلعہ ستارہ مین تشریف رکھتے تھے۔ خبر پہنچی تو تاریخ نکالنے کی فکر ہوئی۔ اسی خیال مین سو گئے۔ عالم رویا مین بچہ کی صورت نظر آئی زبان سے کہہ رہا تھا ع نور چشم باقر عبد الحمید م۔ بیدار ہونے پر اعداد کا شمار کیا۔ پوری تاریخ تھی۔ تین مصرعے اور لگا کر بحر رمل مسدس سالم مین جو تین بار فاعلاتن ہوتی ہی قطعہ نظم کردیا ہ

---

۵۳۵ دولت تیموریہ کے تیسرے امیر تھے جنکو یہ خطاب عطا ہوا تھا۔ مفصل تذکرہ اپنے موقع پر آئیگا۔ "خان دوران جہارم" صمصام الدولہ عبد الصمد خان، بہادر جنگ تھا۔

۵۳۶ میر غلام نبی۔ علاوہ قرابت کے میر عبد الجلیل کے تلمذ سے بھی شرفیاب تھے۔ میر سید محمد کے بعض خطوط مین بھی انکا تذکرہ ہے اور بڑی محبت و اشتیاق کیساتھ یاد کیا ہی۔ پایان عمر مین نواب صفدر جنگ کے رفقاء و متوسلین مین ہو گئے تھے افاغنہ کے معرکہ مین ۲۲ شوال ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ع) کو اس خاکدان ہستی کو چھوڑا۔ نعش کا پتہ بھی نہ چلا۔ ہندی مین تخلص رس لین کرتے تھے یعنی "رس مین محو"۔ متعدد تصانیف چھوڑی تھین "انگ درپن" بالخصوص قابل ذکر ہی۔ ہندی شعرا کے تذکرون مین انکا نام ممتاز اور چوٹی کے لوگون مین لیتے ہیں انکو عزت و اختصاص کی جگہ دیگئی

Heritage of India Series

نورچشم میر باقر گفت با من | چون گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتم | نورچشم باقر عبدالحمیدم

باقر باپ کا نام اور عبدالحمید دادا کا تھا ۱۱۱۱ھ اہل وطن کو لکھا کہ یہ مولود مسعود شاعر ہوگا۔ جیسا آپنے فرمایا تھا آخر ویسا ہی ہوا۔ میر غلام نبی شاعر غرا ہوے۔ نبی تخلص تھا۔ موسیقی اور ساز ہندی مین ماہر کامل تھے۔ میرزا جان جانان مظہر دہلوی فن شعر ہندی مین اُن کے شاگرد تھے۔ میرزا محمدامین اُن کا بڑا معتقد تھا۔ غلام نبی کے ہندی اشعار اور غلام علی کے عربی قصائد سنکر نہایت محظوظ ہوتا تھا اور یہ قطعہ نظم کیا تھا ؎

درین زمانہ کہ ارباب فضل کمیاب ست | ز بلگرام دو شخص اندر سخن استاد
یکے امام زمان سید غلام علی | کہ بہ شعر عرب مثل او ندارد یاد
دگر جہان ہنر سید غلام نبی | رساند فطرت او شعر ہند را بمراد
نگاہدار الٰہی ہمیشہ ایشان را | بِمُرسَلِ عَرَبِیِّ وَّ اٰلِهِ الْاَمْجَادِ

میر عبدالجلیل کو اعزہ کی فرمائشات کی تعمیل مین کبھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ سید محمد روشن ساکن سانڈی کے یہان لڑکا پیدا ہوا جس کی میر سید محمد سانڈوی نے اطلاع دی اور تحریر قطعہ تاریخ کے لئے استدعا کی۔ چنانچہ یہ تاریخ تولد اُن کو لکھ کر بھیجدی گئی ؎

حق تعالی بہ محمد روشن | پسرے داد سعادت میلاد
سال تاریخ چو جستم ز خرد | گفت از دو چشم پدر روشن باد
سنہ ۱۱۲۶ھ

متعلق وفات

میر سید مبارک محدث بلگرامی ؎

مقدس گہر میر سید مبارک | چو فرمود در ہجر رحلت ستناہ
بہ رحلت آن مظہر سر شست | خرد گفت تاریخ رضوان پناہ
سنہ ۱۱۱۵ھ

سید مزنی بلگرامی اور میر سید احمد دبن سید بدہ) بلگرامی نے ایک سال مین رحلت فرمائی دونو کی

تاریخ بھی ایک ہے ؎

میر سید احمد آن بحر سخا، مولوی سید مربی دین پناہ،
ہر دو زین گلخن سرائے بی بقا جانب فردوس سر کردند راہ
عالم اندر دیدہا تاریک شد مردمک پوشید زین ماتم سیاہ
تا قیامت از دل پر شورِ خلق بر مزار ہر دو سوزد شمع آہ
خواستم از بہر شان تاریخ سال گفت ہاتف ہر دو خلد آرامگاہ ۱۱۱۷ھ

سید محمدی بلگرامی اور قاضی محمد حافظ بلگرامی کی مشترک تاریخ ؎

چون میر محمدی و قاضی حافظ بُردند بیک سال سوی جنت راہ
گشتند برضوان الٰہی واصل ہاتف تاریخ گفت رضوان اللہ ۱۱۲۳ھ

بندگی، سید محمد حسن بلگرامی ۔ ایما تخلص ۔ جوان نازک و نازنین تھی ۔ دھول پور کی لڑائی مین جو عالمگیر کی رحلت پر شاہ عالم اور اعظم شاہ کے مابین ۲۰ ۔ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۱۰ رجون ۱۷۰۷ء) کو ہوئی یہ شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ تھے اور ان کے باپ سید محمد اشرف درگاہی شاہزادہ محمد اعظم کے نوکر ۔ شاہ عالم فتحیاب ہوا لڑائی سے فارغ ہوکر ۲۱ تاریخ کو سید محمد حسن قیامگاہ پر پہونچے ہتھیار سب بدن پر سجے ہوئے تھے ۔ گرمی اور تابش آفتاب اور حرارت موسم کی تاب نہ لا سکے خیمہ پر آتے ہی رفقا سے کہا کہ میرے سلاح اُتار لو ۔ اب تاب و طاقت نہین رہی ہے سیدھے سیدھے لیٹ گئے اور چراغ حیات گل ہوگیا ۔ تجہیز و تکفین کرکے دھول پور کے دروازہ پر دفن کر دیا جب آمد و رفت کے لئے راہ کھلی تو سید درگاہی لڑکے سے ملنے گئے ۔ وہ جوان مرگ زیر خاک تھا ۔ رنج و الم کیا ۔ بے سود تھا ۔ میر عبد الجلیل نے تاریخ رحلت آیہ کریمہ اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ مین پائی (جو پریشانی اور رنج مجکو ہے اُسکی فریاد خدا ہی سے کرتا ہون جزء ۱۳ سورۂ یوسف ع ۱۰-۴) اور بدنصیب باپ کو لکھ کر بھیجدی ۔

اورنگ زیب بادشاہ کے تولد کی تاریخ کلیم کاشانی نے آفتاب عالم تاب بتعمیہ یک نکالی تھی

جب بادشاہ تخت سلطنت پر چالیس سال کی عمر میں بیٹھا تو تاریخ جلوس، خود "آفتاب عالمتاب" نکالی اور جب نوے سال کے سن میں رہگرائے عالم بقا ہوا تو میر عبدالجلیل نے تاریخ رحلت "آفتاب عالمتاب" نکالی ''فا'' بفتح فا بمعنی سایہ زوال آفتاب ہے

انتباہ ۔ اشتباہ

ریزہ ہائے نبات والی بارش کی رباعی

فرخ سیر آن شہنشۂ با برکات ۔ چرخ از ادب او شدہ شیرین حرکات

در سند زمین عہد عشرت مہد ش ۔ بارید سحاب ریزہ قند و نبات

کی نسبت نواب حاجی سید جعفر علی خان، خلاصۃ المفتاح میں لکھتے ہیں "تعجب نیست کہ دریں مصرع تاریخ ہم باشد چراکہ اعداد مصرع ۱۱۲۳ھ می شوند" نواب صاحب ایک کہنہ مشق تاریخ گو تھے اس لئے اُن کی نگاہ زود رس اس مصرع کی معنوی خوبی اور تاریخی احتمال پر پہونچ گئی لیکن کوتاہ بین سیرت نویس اس امر سے قطع نظر نہیں کر سکتا کہ واقعہ عہد فرخ سیر کا ہے جو خود ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا اس لئے اس کا زمانہ ۱۱۲۵ھ یا ۱۱۲۶ھ ہونا چاہیئے۔

قصیدہ فتح آگرہ

نیکو سیر بن محمد اکبر بن خلد مکان قلعۂ آگرہ میں محبوس تھا۔ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں صفی خان قلعہ دار اور ہزاری سرسین و دیگر واقعہ طلبان نے اُسکو قلعہ سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا تھا۔ امیر الامرا حسین علی خان دہلی سے لشکر جرار لے کر آگرہ پہونچا اور تین ماہ سے زائد محاصرہ کر کے رمضان میں قلعہ کو فتح کیا۔ میر عبدالجلیل نے اسپر یہ قصیدہ[۳۷] لکھا۔ نواب پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ اس کے صلہ میں باصرار دیتا رہا۔ لیکن میر عبدالجلیل نے صلہ لینا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ ؎

مژدہ اے دوستان کہ در عالم ۔ نقد شد نسیۂ بہار ارم

[۳۷] نواب سید صدیق حسن خان نے بھی اس قصیدہ کا ذکر اپنے تذکرہ شمع انجمن مطبوعہ ۱۲۹۳ھ میں کیا ہے۔

نونهالِ طرب ببار آمد | گل فشان گشت خاطرِ خرّم
دل خوشی نشهٔ رسا بخشید | به گُل و سبزه و بهار قسم
باغ از بس شگفتگی پُر کرد | ساغرِ گل ز بادهٔ شبنم
ابر دامن کشان خرامان ست | برق رقصان و رعد گرم نغم
نوبهار از برائے رسمِ نثار | هر طرف از شگوفه ریخت درم
که امیر سر آمدِ اُمرا | کرد تسخیر قلعهٔ اعظم
این ظفر از مواهب عظمی است | بر زبان واجب است ذکرِ نعم
پسر اکبر آنکه در افواه | یافت نیکو سیر لباس علم
بود در حصن آگره محبوس | همچو مفهوم ممتنع بعدم
داشت جیتے دکنج عافیتے | خاطر آسوده تر ز صید حرم
ناگهان نفس شوم رهش زد | خفیه آمیخت در طعامش سم
دید اسباب بغی آماده | اشتهاها ف و لقمه پُر زد بسم
زر بسیار فوز مره او باشس | اکبر آباد و قلعهٔ محکم
ابروے فتنه زه نمود کمان | زلف آشوب گشت خم در خم
از بدر داشت ارث بغی از آن | فتنه انگیخت در کمال اعظم
گرد پرونده نے ز چتر به سر | بیخت بر فرق خود غبار الم
چون برید این خبر به دهلی برد | شعله زد خشم داورِ عالم
خسروِ دین پناه شاه جهان | آب و رنگِ بهارِ فضل و کرم
آن ابوالمجد والعلا ذوالجود | مسند آرائے چار بالش جم
بنده اش کیقباد و کیکاؤس | نوکرش گیو و بیژن و رستم
بخشی الملک را اجازت داد | تا کشد لشکرِ ظفر پرچم

آن امیر جماعهٔ امرا ‌‌ چون حسین علی ز بر بر شیم
قرّة العین حیدر کرّار ‌‌ نخبهٔ نسخهٔ بنی آدم
خلف الصدق موتم الاشبال[۱] ‌‌ بیش او شیر شرزه کم ز غنم
جود او شهرهٔ دیار عرب ‌‌ تیغ او ضابط بلاد عجم
ناز دارد نسبتش سمو نسب ‌‌ بالد از همتش علو همم
می کند با جماعهٔ دل ریش ‌‌ لطف او آنچه می کند مرهم
غوطه در جود او زند دریا ‌‌ لطمه از دست او خورد ضیغم
هست مقیاس جود او به سحاب ‌‌ مثل مقیاس فربهی به ورم
در فن صرف همتش نبود ‌‌ ذکرے از لا و از لن و از لم
در صف جنگ با سر اعدا ‌‌ چون الف گشته تیغ او الزم
دشنه و نیزه اش بجان عدو ‌‌ می کند کار عقرب و ارقم
تیغ او شد به فرق اعدا غرق ‌‌ همچو حرفے که می شود مدغم
در دل خصم او در آید رمح ‌‌ چون در آید به اهل خود محرم
باکمندش سر معاند او ‌‌ مثل دلوے است با رسن منضم
ظفر از فوج او شود پیدا ‌‌ فتح با تیغ او بود توأم
کرد نهضت بدولت از دهلی ‌‌ فضل حق هم عنان ظفر همدم
لشکرے در حساب بیش از حصر ‌‌ دلو از نعرهٔ یلان در رم
همه زور آوران فیل شکوه ‌‌ که به شیر ژیان زدندے لم

[۱] ۵۳۸ موتم الاشبال عیسیٰؒ پسر زید شہیدؒ کا لقب ہے جو امیر الامرا حسین علیخان ممدوح، اور میر عبد الجلیل (مادح) دونوں کے جد اعلی تھے۔ موتم ایتیم کرنے والا۔ اشبال جمع شبل بچہ شیر یعنی شیر کے بچوں کو یتیم کرنیوالا آپ شیر کا شکار اکثر کیا کرتے تھے اسلئے اس لقب سے مشہور تھے۔

گرد اسپان فوج نصرت موج — دامن افشان برین بلند خیم
آمد و قلعه را محاصره کرد — همچو انگشت و حلقهٔ خاتم
شرح اسباب قلعه گیری تخت — سرمهٔ عجز در گلوے قلم
چون نهنگان به دور گرد ابے — توپ ها گرد قلعه‌ها جمع بهم
خصم را سوخت توپ "شیر دهان" — کس ندیده است شیر آتش دم
اژدهائے ست توپ "غازی خان" — کز سر هند و ان نمود لقم
چه نویسد ز توپ "قلعه کشا" — اسم او بر تلاشش دست علم
تا بر آید به قلعهٔ نصرت — سینه گردید فوج را سلم
هر طرف شد مرتب از ساباط[۵۳] — زخمهٔ بهر دشمنان دژم
زان طرف هم مخالف سرکش — کوششے داشت در ثبات قدم
دست و پا زد درون قلعه بسے — چون جنینے که واجهد به شکم
کرد اسقاط این جنین آخر — صدمهٔ توپ هاے مستحکم
کار بر اهل حصن شد دشوار — مرگ مقطوع، زندگی مبهم
قلعه شد بر جماعهٔ اعدا — از مصیبت چو حلقهٔ ماتم
شد برون آمدن چنان دشوار — که سخن از زبان اهل بکم
از برون هم ره رسد شد بند — چون نفوذ صدا بگوش اصم
از سر عجز خواستند امان — با لب خشک و دیدهٔ پر نم
از ترحم به جان امان بخشید — وقت قدرت خوش است ترک نقم
فتح قلعه بزور تیغ نمود — این چنین می کنند اهل همم
شد سیه طالعے ز قلعه برون — همچو از لفظ دائره آدهم[۵۴]

[۵۳] ساباط وہ سقف جو دو دیواروں کے اوپر ہو اور جس بن ہو کر راہ چلتی ہو۔ اسی کا پورا مرادف کلمہ انگریزی مین 'کاری ڈور' ہے۔
[۵۴] اس شعر مین) اسم ' ادہم ' کے مشہور معے کی تلمیح ہے کشید تنگ چنان نقش آن دہن پرکار ؛ کہ دور

این مُعمّی کشود فطرت او	ورنہ این عقدہ بود جَذرِ اَصَم[۵۴]
شاد گشتند دوستان یکسر	عام شد عیش در صُنوفِ اُمم
شرح حال منافقان گویم	کہ بہ آن چو جَذرِ[۵۴] نفیہ اُم اَعلم
سُرخیِ انفعال رُوئے سیاہ	خوش خضابے است از حنا و کَتم[۵۴]
نَحمَدُ اللّٰہَ وَاہِبَ الآلاءِ	حَمدَ مُستَظہِرٍ بِمَا النِّعَم
گن کتھن کی سکت کہاں پاوے	رسنان سے ئے جو اپناک جسنم

دائرہ در مرکزش گرفت قرار، دائرہ کا دَور دال ' اور ' ھا ' ہیں اور اُس کا مرکز یا مرادف ' ام '۔ جب دال اور ہا ' ام ' کے اندر قرار پا جائیں تو ادہم ہو جائے گا۔ ادہم لغت میں سیاہ کو کہتے ہیں۔ قلعہ سے سیاہ طالع کا نکلنا گویا ادہم کا دائرہ سے نکلنا ہے۔ تنگ ہونے کی رعایت سے قلعہ اور دائرہ میں تشبیہ لطیف پیدا ہو گئی ہے۔

۵۴ لغت میں ' جذر ' اصل کو کہتے ہیں۔ اہل حساب کی اصطلاح میں وہ ' عدد ' ہوتا ہے جس کو اپنے دل میں مان کر ضرب دیا جائے۔ ایسے عدد کو جذر کہتے ہیں اور اُسکے حاصل ضرب کو مجذور۔ ' اصم ' لغواً نہایت بہرا، بالکل بہرا، سخت مصمت۔ جس عدد کا جذر عدد صحیح نہ ہو وہ فن حساب کی اصطلاح میں ' اصم ' کہلاتا ہے۔ مثلاً گیارہ۔ اسکے مقابل کو ' منطق ' کہتے ہیں مثلاً نو۔ عدد منطق کا جذر بہ سہولت حاصل ہو جاتا ہے، جیسے نو کا جذر تین۔ عدد اصم کا جذر نہایت دشوار ہے۔ عدد صحیح نہیں ہو سکتا۔ مگر تقریباً بنا لیا جاتا ہے۔ اسی لئے حکما نے اپنی مناجات میں کہا ہے

سُبحٰنَ مَن لَا یَعرِفُ جَذرَ الاَصَمِّ اِلَّا ھُوَ

علم معقول میں ' جذر الاصم ' ایک مشہور مغالطہ ہے جس کا واضع ابن کمونہ بغدادی تھا۔ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں فرماتے ہیں۔ وَھٰذِہٖ مَغلَطَۃٌ تَحَیَّرَ فِیہَا عُقُولُ العُقَلَاءِ وَفُحُولُ الاَذکِیَاءِ وَبِھٰذَا سَمَّیتُھَا بِمُغَالَطَۃِ جَذرِ الاَصَمِّ علامہ ممدوح شرح مقاصد میں بعد تحریر جواب کے لکھتے ہیں لٰکِنَّ الصَّوَابَ عِندِی فِی ھٰذِہِ القَضِیَّۃِ تَرکُ الجَوَابِ وَالاِعتِرَافُ بِالعَجزِ عَنِ الاِشکَالِ۔

میر باقر استرآبادی نے بھی اس بحث کو افق المبین میں لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے کم زَلَّت فِیہِ اَقدَامُ الاَقوَامِ وَاَقرَبُھُم اِلَی الصَّوَابِ وَاِصَابَۃِ الحَقِّ مَنِ اعتَرَفَ مِنھُم بِالعَجزِ بظاہر معترف سے میر باقر کی مراد علامہ تفتازانی معلوم ہوتے ہیں۔

پس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اشکال و عدم انحلال میں یہ عقدہ (جذر اصم) کے مثل ہو رہا ہے خواہ علم حساب کا ہو خواہ علم معقول کا۔ قلعہ کے مستحکم اور سنگین ہونے کے اعتبار سے لفظ اصم (جسکے معنی سنگ سخت مصمت کے ہیں)

رمضان ایلچی بولدی بخشی فتح — کلدی بوی آی نینک ایکی پرم
از پے ہم دو عید گشت پدید — معنی فطر جلوہ کرد اعم [۵۴۴]
ہر طرف مجلس طرب چیدند — آن یک از شعر و دیگرے ز حکم
وان دگر از ترانۂ رنگین — چنگ و طنبور کردہ باہم ضم
نغمہ گویان فارسی ز نشاط — کوک کردند زیر را با بم
نغمہ سنجان ہند سر کردند — سپت سُر در مراتب سرگم [۵۴۵]
نغمہ تا چاک دل رفو سازد — زہرہ از چنگ دارد ابریشم
زین ترنم جہان طراوت یافت — زانکہ در جوہرش بود تر و نم
شعرا ہم قصیدہا گفتند — انوری گشت پیش شان ابکم
ہر یکے سفت دُرِّ تاریخے — کہ از و آب شد گہر در یم
من ہم از باغ معنئ رنگین — گل چیندے زدم بفرق قلم
ورق ہا بیاض سینۂ حور — سطر ہا سلک گوہر نیلم

نہایت مناسب واقع ہوا ہے (سرو آزاد)

۵۴۲ حضرت حذیفہ بن الیمان مشہور صحابی اور محدث اور رسول اللہ صلعم کے صاحب راز تھے حضرت صلی اللہ صلعم نے اُن کو منافقون کے حال سے پوشیدہ آگاہ کر دیا تھا حضرت عثمان کی شہادت کے چالیس دن بعد ۲۰ محرم ۳۶ھ (۲۶ جولائی ۶۵۶ع) کو مدائن میں وفات پائی۔ اس شعر میں ممدوح کے ساتھ اپنی محرمیت اور کمال تقرب کا اشارہ ہے

۵۴۳ کتم ایک قسم کی گھانس جس کا خضاب بنایا جاتا ہے یعنی نیل۔

۵۴۴ قلعہ ماہ مبارک رمضان میں فتح ہوا تھا اس لئے دو عیدین بہم پیش آئین پہلی عید فتح، جس کو عید مجازی کہنا چاہیئے۔ دوسری عید رمضان، جو عید حقیقی ہو۔ اسی طرح لفظ فطر بھی معنی حقیقی میں جلوہ گر نظر آتا ہے یعنی روزہ کا کھولنا اور معنی مجازی میں بھی یعنی فتح۔ یہ بھی دروازہ کا کھولنا ہے۔

۵۴۵ ہندوستان کے اہل موسیقی نے آواز کے سات مرتبے قرار دئے مین جو سپت سُر کہلاتے ہین سپت یعنی سات و سُر یعنی آواز، ہر مرتبہ کیلئے ایک نام مقرر کر رکھا ہے اور ہر نام کے سر سے ایک حرف لیکر اوس سے سرگم بنایا ہے اس شعر مین سرگم سے مراد انھین مراتب سابعہ سے ہے۔

شعر گر فضل من نہ پوشیدے می شدم در فن سخن اقدم
گر بہ پرسی ز جامعیت من میر خسرو دہد جواب نعم
کرد عبد الجلیل در تاریخ "قلعۂ آگرہ گرفت" رقم
بر دعا بہتر است ختم سخن کہ بر آمین کند ملایک معلم[1]
چار چیزش نشاط افزا باد تا بود سبزہ در چمن خرم
دست زر پاش و تیغ اعداکش عمر ممدود و دولت ادوم

اَمواجُ الخیال

یہ مثنوی آپ نے اپنے وطن بلگرام کی تعریف میں عنفوان جوانی میں لکھی تھی یہی وجہ ہے کہ اس میں میر صاحب کے کلام مؤخر کے مقابلہ میں بڑا فرق ہے۔ اس میں ایک طولانی باب موسیقی ہندی کے نام سے ہے جس میں تمام قواعد واصول و فروع اس فن لطیف کے بیان کر دیئے ہیں یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی اور کمیاب ہے ؎

آب و گل من کہ فیض عام است از خطۂ پاک بلگرام است
سبحان اللہ چہ بلگرامے! کوثر مے و آفتاب جامے
خاکش گل نو بہار عشق است آبش مئے بے خمار عشق است
از عشق سرشتہ ایزد پاک از روز ازل خمیر این خاک
ہر لالہ کزین دیار روید تخم دل داغدار روید
ہر گل کہ دمیدہ است زین خاک خونین جگرے است پیرہن چاک
نرگس نہ بود بصحن گلزار منصور بر آمدہ است بر دار
گل با سنبل بہم دران خاک آویختہ بسملے بہ فتراک

[1] یعنی معلم بالفتح جس پر نشان کر دیا گیا ہو

خورشید از آن بهار نیرنگ / بر مرده گلے است باخته رنگ
سنبل به چمن بود بصد ناز / زنگی بچۂ کمند انداز
از فیض هوائے آن گلستان / سرسبز شود نفس چون ریحان
ز آتشکده سبزه می زند جوش / همچون خط یار از بناگوش
تا شد چمنش به دیده محسوس / شد پردۂ چشم بال طاؤس
تابستانش که عیش بارست / چون گرمی عشق سازگارست
گرمی آنجاست مایۂ زیست / گوئی که حرارت غریزیست
سرما چو در آن مقام آید / عنقائے هوا بدام آید
هر دود که از جگر کند گل / افسرده شود چو شاخ سنبل
چون موسم برشگال آید / حسنش بجد کمال آید
جولان سحاب شوخ و طناز / چون خیل پری بود به پرواز
درویش هوا بسے نفس سوخت / تا خرقۂ رقعه رقعه دوخت
در نشۂ ذکر جهر شد مست / تسبیح هزار دانه در دست
شاهنشه رکیه تازه برسات / ساغر کش نشۂ مباهات
نقاره نواز حشمت خویش / مشکین علم سحاب در پیش
از برق نموده تیغ خون ریز / وز ابر سپر دلاویز
ترکش ز نقاط بهارین / وز قوس قزح کمان زرین
تا رُوے زمین به دست آرد / بر فوج خزان شکست آرد
باریدن ریزه ریزه باران / کرده ورق نشاط افشان
نقشے است ازین بهار مرغوب / ظل ممدود ماء مسکوب
هر سو صنعے کرشمه پرداز / از نوک نگه جگر رفو ساز

تا پائے کشان کمند کاکل　　سرمست نگاہ پُر تغافل
تادرتتق حیا نشستہ　　حق ازمژہ بر نگاہ بستہ
صفہائے مژہ بہ ترکتازی　　مشغول نبرد نیزہ بازی
قدے ونہال جلوہ نوخیز　　حُسنے وبہار غمزہ گل ریز
ازچین جبین ناز نخچیر　　دربائے نگاہ بستہ زنجیر
ازواشدن گل تبسم　　درخون شفق طپیدہ انجم
ازسینہ شان کہ خوش بہارست　　پیشانی صبح داغدارست

فقرائے دارالسلام بلگرام کی مدح مین لکھتے ہین ؎

ازفرقۂ طالبان مولے　　رنگینئی بزم وصف اولے
وحدت نگہان کثرت آثار　　ازبادۂ نفی غیر سرشار
اطواروجود دیدہ یکرنگ　　حیرت بنگاہ کردہ ہم سنگ
میناشکنان بزم ہستی　　مدہوش شراب حق پرستی
دل کردہ نہ بہر یارخودفرش　　اَلرَّحمٰنُ اِستَوٰی عَلَی العَرشِ
طے ساختہ وادی شریعت　　جاکردہ بہ منزل حقیقت
واکردہ نظر بہ حُسن جاوید　　ازدیدۂ سرمہ سائے توحید
سرگرم طواف کعبۂ دل　　قُربانی نفس کردہ بسمل
تایافتہ گنج کُنت کنزا　　دادہ دل ودین زکوٰۃ ازکے

فضلائے شہر کی توصیف مین فرماتے ہین ؎

دقت منشان نکتہ پرداز　　دربرسرکوچہ اش سخن ساز
بشگافتہ ہریکے بہ تحقیق　　ازدقت نغز مغز تدقیق

---

۵۴۷ اَلرَّحمٰنُ عَلَی العَرشِ استَوٰی ۔ رحمٰن عرش پر براج رہا ہے (جزء ۱۶ سورہ طٰہٰ ع ۱-۱۰) استوا اللہ علی العرش کا مسئلہ

برابروے خود نمودہ واجب　　تنقیح اصول ابن حاجب
برچشم شمردہ فرض چون دین　　تلویح رموز حکمۃ العین
ابروے بیان شان رفیع است　　مفتاح معانی بدیع است
ہر بحث کہ دل کند بصد غور　　در حیز حل کشند فی الفور
از منطق شان خطا نفور است　　تصدیق بہ حکم شان ضرورست
ہر فرد یگانۂ اماثل　　شیرازۂ نسخۂ فضائل
دانائے حقیقت کیانی　　اشراقی حکمت یمانی

مثنوی کدخدائی ارشاد خان

ارشاد خان نواب امین الدولہ سنبھلی وقایع خوان حضور فردوس آرامگاہ محمد شاہ کا بیٹا تھا۔ امین الدولہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہو میر صاحب کو جو اختصاص نواب سے بلحاظ تعلقات وخدمت ہونا چاہیے تھا ظاہر ہے۔ حق یہ ہو کہ میر صاحب نے حق محبت اور حق شاعری دونون اسمین ادا کر دیے ہین۔ مثنوی کمیاب ہو اسکے بعض اجزا میر غلام علی آزاد کے پاس تھے جو خزانۂ عامرہ سے نقل کیے جاتے ہین۔

پان کی صفت مین بر سبیل ایہام ؎

بسر سبزی ست برگ پان نکو فال　　زبان من بود در وصف آن لال

حمام کی تعریف مین ؎

عطا بخشی این حمام کن گوش　　کند مرد برہنہ را گہر پوش
بہ بین در بیت رنگینش بہ انصاف　　کہ دارد معنی بس شستہ وصاف

واعتقاد مسلمانون کے مختلف فرقون مین ہمیشہ سے مختلف فیہ چلا آتا ہو بعض اسکی تاویل کرتے اور استیلا یا قہر سے مراد لیتے ہین بعض اسکو لفظا مانتے اور تسلیم کرتے ہین پیروان مذاہب ائمہ کا عمل یہی ہے حضرت امام مالکؒ کا قول مخصا اس بارہ مین یاد رکھنے کے قابل ہو "الاستواء معقول والکیف مجہول، والایمان بہ واجب، والسؤال عنہ بدعۃ"

دلِ سنگین پُر سوراخ اعدا | بجائے سنگ پا مستعمل آنجا
بہم فوارہ و حوض اندستا دان | برقص دانہ مروارید رقصان

[دانہ مروارید ایک نوع کا ناچ ہے جو ولایت کی لولیان ناچتی تھین] یہ اشعار بھی ملاحظہ ہون ؎

بدولت پیش آورند فیلے | چہ فیلے در تجمل بے بدیلے
لباس زر بر آن از بس رسا بود | سراپا در نظر کوہ طلا بود
عماری را بہ پشت او شکوہے | طلائی گنبدے بالائے کوہے
سوار فیل آن والا مکان شد | بہر جانب دو دستش زر فشان شد
کف نواب زر میر یخت پائین | دعا میرفت بالا با صد آئین
بگرد فیل جمعیت بہ انبوہ | چو شیران بلیہ در دامن کوہ
ز فیلان علم پیش سواری | خرامان پے بہ پے ابر بہاری
بہ پشت فیل مرد نیزہ بردار | سماک رامح از گردون نمودار
صف پیلان پس لشکر بہ انبوہ | کہ پشت فوج را نہا بود بر کوہ

آتشبازی کی توصیف مین ؎

ہوائی بسکہ زد از ہر طرف جوش | ہوا شد در عروسی بادلہ پوش
دید تا چشم شب را روشنائی | ہوائی شد عجب میل طلائی
بیان چنبر و چرخی کنم چند | درین گرداب زرین شد نگہ بند
ز جنگ آتشین فیلان بہ تحریر | رقم بر یکدگر پیچد چو زنجیر
چنان گردید یک دیگر ستیزہ | کہ اجزائے بدن شد ریزہ ریزہ
بیکسو طرفہ دیوان ترش رو | مہیا بہر ہیجا چین بہ ابرو
نگاہ خشم از چشم آفت زہر | نہان در دیدہ شان گردش دہر
درین دیوان سرکش چون نظر کرد | رخ دیو سفید از سہم شد زرد

چنان دجّال زین دیوان رسیده | که در پس کوچه محشر خزیده
بهم افروخت هر یک زآتش کین | تعجب مین بهم رجم شیاطین

دلہن کی صفت مین ؎

تتق از حجلۂ زیبا کشادند | عروس شرمگین را جلوہ دادند
چو صبح پاک دامن پاک تخمیر | حیا چون سرمہ در چشمش وطن گیر
خموشی گوہر درج دہن بود | چو غنچہ مجتمع ہر عضو تن بود
چو داماد آن عروس شرمگین دید | بہندوستان نگارستان چین دید
در گنجینۂ اعزاز بکشاد | ز والا گوہری دل رونما داد
چو وقت آمد کہ آسایش نماید | درے از خرّمی برخود کشاید
بخلوت خانۂ باہم دردن شد | مپرس از حالت آنجا کہ چون شد
بعید است از بلاغت در نکوئی | کہ حرف پردہ را بے پردہ گوئی
خدا گفتہ است در قرآن نظر کن | بجائے جامعوہن باشرہن
ہمین باشد سخن از حسن تمہید | میان ہر دو صحبت کوک گردید

[کوک بضم کاف کپڑے کے دو ٹکڑون کو باہم بخیہ سے سرسری پیوند کردینا تاکہ سینے مین کم و زیادہ نہ ہونے پاسے اور سازون کو ہم آہنگ اور آوازون کو موافق بنا دینا "صحبت کوک گردید" یعنی موافق ہوئی چونکہ بخیہ بھی سوئی کے ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اسلئے لفظ کوک یہان نہایت مناسب و برمحل واقع ہوا ہے۔]

مثنوی طوئے محمد فرخ سیر بادشاہ

میر عبد الجلیل کی تمام مثنویات بلکہ تصنیفات مین یہ مثنوی سب سے بڑی اور ایک پوری کتاب ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع لکھنؤ مین رجب ۱۲۹۹ھ یعنی جون ۱۸۸۲ء مین آٹھ صفحات پر یہ مثنوی

میر عبدالجلیل بلگرامی" کے نام سے چھپی ہے اور بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اُسکی کتابت و تصحیح کما ینبغی نہین ہوئی تاہم اس مین اتنے اغلاط نظر نہین آتے جتنے اُس وقت کی اور مطبوعہ کتابون مین پائے جاتے ہین۔ حاشیہ پر حل لغات و مشکلات بخوبی ملکہ بافراط کر دیا گیا ہے جو کہین کہین غیر متعلق و بے محل معلوم ہوتا ہے۔ خط معمولی ملکہ اچھا ہے۔ کاغذ بادامی ہے۔ منشی دیبی پرشاد معائن مدارس بدایون اس کی طبع و اشاعت کے محرک تھے

فرخ سیر بادشاہ کی شادی راجہ اجیت سنگھ راٹھور (پسر مہاراجہ جسونت سنگھ) مرزبان جودھپور مارواڑ کی بیٹی کے ساتھ ۲۲ ذیحجہ ۱۱۲۷ھ (۸ دسمبر ۱۷۱۵ع) روز پنجشنبہ کو ہوئی تھی یہی آخری راجپوتنی تھی جو مغلی حرم سرا مین آئی۔ یہ قرابت جیسی عظیم الشان تھی ویسی ہی تزک و احتشام سے تقریب بھی انجام دی گئی۔ صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ "وزیر حسن علیخان نے اسباب شادی دختر کا حسب رسوم ہنود سر انجام کیا۔ اس شان و شوکت سے شادی ہوئی کہ ہند اور دکن مین کسی راجہ اور بادشاہ کے عہد مین نہ ہوئی تھی

ش۵۲ فرخ سیر کے ازواج و اعقاب کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھنا تو اُسکے تاریخ نویس کا کام ہے۔ لیکن سلسلہ تحریر مین اسقدر بتا دینا ضروری سمجھتا ہون کہ فرخ سیر کی پہلی بیگم "فخر النسا" صبیہ سعادت خان تھی جس کے بطن سے تین بچے ہوئے تھے دو (۱) محمد فرخندہ سیر جہانگیر شاہ (۲) جہان مراد شاہ صغر سن ہی مین والدین کو داغ مفارقت دے گئے (۳) بادشاہ بیگم جس کا عقد محمد شاہ سے ۹ صفر ۱۱۳۳ھ شنبہ کی رات مین ہوا اور ملکۃ الزمانی کے لقب سے شہرت پائی فرخ سیر کے محل مین ایک پہاڑی راجہ کی لڑکی بھی تھی اُس سے نکاح ہوا یا نہ ہوا یہ نہ جانا۔ وہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ع) مین محل سرای شاہی مین داخل ہوئی تھی۔ اُسکی نودہ پودہ بھی نہین رہی

ایک اور بات بھی میری نظر سے گذری ہے جس کو سپرد قلم کرتا ہون "شکارپور ضلع بلندشہر مین قصبہ کے شمال ایک نہایت قابل لحاظ عمارت "بارہ کھمبا" (دوازدہ ستون) کے نام سے مشہور ہے۔ ستون سنگ سرخ کے ہین اور بہت ضخیم اور بھاری ہین حتی کہ عامۃ الناس مین یہ خبر شائع و ذائع ہے کہ اسکی تعمیر غیر انسانی ذرائع سے ہوئی تھی۔ انگریز محققین لکھتے ہین کہ "فی الواقع یہ ایک نا مکمل مقبرہ ہے جس کو ۱۷۱۹ع (۱۱۳۲ھ) کے قریب شہنشاہ فرخ سیر کے داماد سید فضل اللہ نے تعمیر کرانا شروع کیا تھا"

سرکاری گزیٹیر کے لکھنے والے اسکی صحت و تحقیق کے ذمہ دار ہین۔ مجھے اسکے باور کرنے مین تامل ہے فرخ سیر نے اپریل ۱۷۱۹ع (۱۱۳۱ھ) مین تینتیس ۳۳ سال کی عمر مین جان بحق تسلیم کی ۱۱۲۶ھ مین اسکی عمر تئیس ۲۳ سال کی رہی ہوگی۔ فضل اللہ کی شادی کب ہوئی؟ شاہزادی کا نام کیا تھا۔؟ کس کے بطن سے تھی تئیس تینتیس

شب پنجشنبہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ کو بادشاہ حسن علی خان کے محل پر نواب شایستہ خان کی حویلی یا بارہ دری مین آیا مع امرا و ارکان سلطنت کے آیا عقد نکاح پڑھایا۔"

تواریخ مارواڑ مصنفہ منشی مرلی داس سے پایا جاتا ہے کہ امیر الامرا سید حسین علی خان ابتدائی معاملات و شرائط مصالحت طے کر کے دکن کی جانب روانہ ہو گیا اور حسب قرارداد شہنشاہ کا ماموں شایستہ خان ۲ جمادی الاول ۱۱۲۷ھ (۶ مئی ۱۷۱۵ع) کو دہلی سے جودھپور اس لڑکی کے لانے کیلئے بھیجا گیا وہ ۲۵ رمضان ۱۱۲۷ھ (۵ ستمبر ۱۷۱۵ع) کو دارالسلطنت واپس پہونچا اور ۲۹ رمضان کو شادی ہوئی"

مجھے اس تاریخ کے صحیح ماننے مین تامل ہے۔ یہ مہینہ اور تاریخ ایسی مہتم بالشان تقریب کے لئے مناسب نہین ہوتا ہے یہ ممکن ہے کہ نکاح (اگر ہوا ہو تو) آنے کے ساتھ ہی اس تاریخ پر ہو گیا ہو اور مراسم شادی اور احتشام شاہانہ ذی الحجہ مین انجام دئے گئے ہون جیسا کہ ایمان مترجم سیر المتاخرین لکھتا ہے لیکن مثنوی سال و ماہ و یوم یا کسی واقعہ کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ وہ الفاظ و لغات اور اصطلاحات کا ایک گورکھ دھندا ہے جس سے کوئی بات نکالنا دشوار ہے سخن شناس دقیقہ رس لطف سخن پا سکتے ہین ساچق و جشن طرب کی رنگین بیانی کے سوا مثنوی نکاح یا کسی اور رسم شرعی و رواجی کا پتہ نہین دیتی۔ میر عبدالجلیل نے اس لڑکی کو رانی کہکر یاد کیا ہے سیر المتاخرین مین بھی رانی لکھا ہے مورخین اسکا نام

برس کی عمر خسر بننے کیلئے کہانتک مناسب تھی فضل اللہ کس کا مقبرہ منوا رہا تھا۔ یہ سب باتین محتاج جواب اور قابل تحقیق ہین۔

۴۹ سیر المتاخرین بارہوین صدی ہجری کی ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ، میر غلام حسین خان ولد ولد میر ہدایت حسین خان طباطبائی حسنی کی تالیف ہے (۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ع) سے لیکر (۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ع) تک کے حالات تحقیق و صحت کے ساتھ اس مین قلمبند کئے ہین۔

اسکا ترجمہ اردو مرأۃ السلاطین کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ ایک ہندی نژاد فرانسیسی ایم۔ ایمان M. Raymond نے (۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ع) مین کیا تھا جس نے مشرف بہ اسلام ہو کر حاجی مصطفےٰ نام اختیار کیا اور اسی نام سے شہرت پائی۔ دوسرا ترجمہ ۱۹۰۲ع مین لندن مین کرنل جان برگس Colonel John Biggs نے شائع کیا۔

میر غلام حسین خان میر غلام علی آزاد کا معاصر تھا۔ واقعات کے لکھنے مین ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے اور اپنی تحقیق و تلاش کے سامنے دوسرے کو نہین مانتا۔

۵۰ صاحب مفتاح التواریخ شروع سال ۱۰۲۸ھ (بیجز اردسبت ہشت) لکھتا ہے اگر اس کو کتابت کی غلطی اور سال کو ۱۱۲۸ مان لیا جائے تو بھی خلاف قرینہ ہے کہ محرم کے مہینہ مین یہ جشن ازدواج منایا گیا ہو۔ میر غلام علی مصفیا و سرو آزاد مین جشن طوے کا زمانہ ۱۱۲۷ھ لکھتے ہین۔ اسکی تائید میر حسن، ایجاد تخلص، معالی خان خطاب مولف فرخ سیر نامہ کے قطعہ تاریخ سے ہوتی ہے

بائی اندر کنور بتاتے ہین۔ بدنصیب بائی کی مدت عیش و اطمینان نہایت تنگ تھی خود فرخ سیر کو فراغ و عافیت نصیب نہ رہی شادی کے ساڑھے تین سال بعد کچھ دن سخت اذیت کیساتھ اسیری مین کاٹکر اُس نے جان دی فرخ سیر کی اس رانی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ راٹھور راجہ جسکی آمد و رفت بلکہ ایک حدتک بود و باش دہلی مین رہتی تھی اور جو آخر کار بعض مجبوریون یا مصالح سے داماد کے خلاف سازشون اور مشورون مین سادات بارھہ کے شریک ہوگیا تھا لڑکی کو واپس لے گیا اور مراسم ضروری انجام دیکر اُسکو اپنے دہرم اور خاندان مین ملالیا جودھپور چلے جانیکے بعد پتہ نہین ہے کہ رانی کا انجام کیا دوسری شادی ہوئی تھی یا نہین پہ اُسنے کب اور کہان اور کسعمر مین وفات پائی یہ سب اُمور معرض خفا مین ہین۔ صاحب تواریخ مارواڑ نے بھی اس بارہ مین کچھ نہین لکھا صاحب سیر نے بھی اسی قدر لکھا کہ فرخ سیر کی وفات کے بعد اُسکے تمام اہالی و موالی کی جاگیرین ضبط کرلی گئین صرف رانی کی جاگیر اجیت سنگھ کی دلجوئی کے خیال سے بحال رہی۔

زیباغ مہاراجہ جسونت سنگھ ۱۲۰۱ھ بشکوے دولت بیاد گلے

۵۵۱ رانی سنسکرت کا لفظ ہے اسکے معنی ملکہ کے ہین یعنی جو کسی راجہ یا بادشاہ کی زوجہ ہو۔ اس کا اطلاق شاہزادی پر بھی ہوتا ہے یہ امر قابل غور ہے کہ راجپوت شاہزادے جو مسلمان ہوجاتے تھے اپنے پُرانے ہندوانہ رسم ورواج پر قائم رہتے تھے۔ حتی کہ اپنے ہی خاندان والون کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ اپنے ہی خاندان مین شادی بیاہ کرتے اور اپنی بیویون کو خطاب بھی ہندوئن کے طریقہ پر دیتے تھے بہرحال رانی خالص ہندوانہ خطاب ہے

۵۵۲ موسیو رامان ترجمہ سیر المتاخرین کے ذیل مین لکھتا ہے کہ راجہ اجیت سنگھ نے جو عوام الناس کی لعن وطعن وملامت وتشنیع سے بہت گھبرا گیا تھا بارہا کوشش کی کہ اپنی خدمت صوبہ داری گجرات پر چلا جاے مگر اجازت نہین ملی اور چار و ناچار شہر مین رہنا پڑا۔ اس جاہ طلب غیرت مند راجپوت نے اپنے داماد کے خلاف معاملات مین جو حصہ لیا تھا۔ اُس سے لوگ نہایت متنفر تھے اور آوازے کستے تھے۔
رامان قسطنطنیہ کی سید الیس تھا۔ دس سال تک معظمہ مین رہا تھا۔ ہندوستان مین تربیت پائی تھی۔ سیر المتاخرین کے سوا تاریخ کشمیر وغیرہ متعدد کتابون کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کو ایشیائی خصائل کا اقتضا کہئے یا فطرت انسانی کا جذبہ کہ اُسنے راجہ کے ان اعمال کو نہایت کراہت وقباحت سے دیکھا اور تلخی سے یاد کیا ہے

اصل مثنوی مین بارہ سو چار شعر ہین اور خاتمہ مین بیاشی اتفاقات سے مثنوی فرخ سیر کے روبرو پیش نہ ہو سکی تھی اس لئے اس خاتمہ مین ناظم نے اس واقعہ اور اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیا ہے اور جو غیر واقع وناواجب شاعرانہ ستایش لوگون کی مثنوی مین لکھی گئی تھی اُس سے گریز واستغفار کیا ہے اور بارگاہ الٰہی مین آمرزش ومغفرت کی دعا کی ہے۔ فرخ سیر کی رحلت پر میر عبد الجلیل نے بددل ہو کر اس مثنوی کو الگ ڈال دیا تھا۔ وہ کہتے ہین کہ ؎

چہ گویم دل ازین بیداد چون شد | برنگ غنچۂ ناشگفتہ خون شد
بدل دادم قرار عہد پیدر | کہ این اوراق را سوزم سراسر

جلانے کی نوبت نہین آئی تھی کہ میر صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر رہنے دیا اور ؎

بساط عزم خود را در نوردید | بقائے خود در القائے سخن دید

وہ اس کو صاف نہین کرنا چاہتے تھے حتی کہ وفات پائی۔ انکے انتقال کے بعد میر غلام علی آزاد نے اس مسودہ کو صاف اور بیاض کیا اور حتی الوسع مشکل ابیات کو حل کر کے حواشی لکھے۔

یہ مثنوی بڑی ہے اور اس سے انتخاب کرنا مشکل۔ اس مین بہت سے لطائف وظرائف مندرج ہین خصوصاً اُس مقام پر جہان ہندی راگون کے نام اور اُن کی کیفیت فارسی کے قالب مین ڈھالی گئی ہے۔ شاعر کے تصرف اور قدرت کلام وکمال کو دیکھ کر عقل سرگشتہ وحیران ہو جاتی ہے۔ نہ صرف نغمہ اور سنگیت بلکہ اکثر علوم متعارفہ وفنون متداولہ اس شناور بحر سخن کے سامنے سیل دریا کی طرح بہتے نظر آتے ہین۔ مگر بدنصیب و بدمذاق نگارندۂ اوراق جو ان عجائب وغرائب سے خود افادہ نہین کر سکتا ان کو نقل کر کے قارئین تذکرہ کو بھی بے لطف و بدحظ کرنا نہین چاہتا۔ جہانتک کہ آمد کا تعلق ہے اکثر اشعار سلیس اور پرکیف ہین تمکنت واحتشام شاہانہ کے ساتھ ساتھ اپنی شوکت وشان کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیتے۔ لیکن اسکے بعد صرف آورد اور عالمانہ ومغلق ترکیبات ومحاورات واصطلاحات کی نمایش ہے۔ ایسی تخیل بندیون اور اداشناسیون سے لطف اٹھانیوالے اس صدی مین ناپید ہین۔ ؎

مجکو جو اشعار پسند آئے ہیں ان میں سے بعض کو پیش کرتا ہوں۔

تمہید میں فرماتے ہیں ؎

نوید طوئے شاہ ہفت کشور
جہاں را نوبہار سے رخت در بر

شہنشاہ سریر سرفرازی
خدیو عصر فرخ شاہ غازی

معین الدین محمد شاہ جم جاہ
شہ گیتی ستان فرخ سیر شاہ

طراز نوبہار پادشاہی
وجودش مظہر ظل الٰہی

شہنشاہ کرم گستر گہر بخش
بعاجز پرور یہا بحر و بر بخش

جبلی خصلت این شاہ غازی
عدالت پروری عاجز نوازی

رئیس راجہائی عمدہ ہند
کہ ملکش می کشد تا کشور سند

رشید دودمان نسل راٹھور
کہ ممتاز است از اقران درین دور

مہاراجا اجیت الفاظ نامش
بہ لفظ سنگہ می گردد تمامش

نگیتی مرزبان مارواڑ است
کہ نوک نیزۂ او مار وار ست

کیفیت خطا اتفاق در آغاز جلوس شاہ والا
تمرد گونہ سر زد زراجا

پئے تادیب او فوجی روان شد
سم اسپان زمین انجم نشان شد

چو راجا لشکر نصرت اثر دید
بساط ملک خود را بے سپر دید

باز سال جگر پر کالۂ خویش
توسل جست با شاہ ظفر کیش

پری پیکر بتے عصمت نقابے
سپہر مقنعہ را آفتابے

زعصمت در حیا پیچیدہ خود را
چو بود ر برگ گل ذرہ دیدہ خود را

بدرگاہ جہانبانی روان کرد
بصد عجز و ادب عرض امان کرد

شہنشہ خواند مضمون مبارک
اجیر للمشرک ان ہو استجارک

تقبل کرد و راجہ را امان داد
تو گوئی مردہ را باز جان داد

ازان پس از پے تشریف راجا — بہ مہمان خانہ داد آن شمع راجا
بہ ایمان آن صنم را آشنا کرد — گرہ از رشتۂ زنار وا کرد
قرین شد از شہ نصرت موطن — بہ حسن ظاہر او نور باطن
پس آنگہ شد پئی شان عروسی — بہ حکم شاہ سامان عروسی

اس کے بعد آرایش ساچق۔ وصف حنابندی۔ نور پاشی چراغان۔ پوشاک وجواہر تخت روان، نقارخانہ۔ آتش بازی اور بہت سے مختلف عنوانون کے تحت مین میر نے داد سخن دی ہی۔ گران تکلفات کا بیان کرنا تکلف سے خالی نہین۔

ناچ شروع ہو کر ختم ہو گیا۔ بزم افروزی رقص کنجنیان، کی تصویر کھینچنے اور اُن کے کمال کی داد دینے، اُن کی دلربائیون کا اندازہ دکھانے کیلئے زاہد خشک شاعر کا قلم عالم تصور اور عالم تخیل کی ایک محفل عیش وطرب مین گام زن رہا۔ اُسنے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا ہی۔ گلگون قبا رنگین ادا، شاہدان دہلی وجودہ پور کے تقوی شکن انداز اور حیا سوز کرشمہ و ناز دکھائے ہین۔ مگر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ پوری داد سخن نہ دینے کا الزام مین اپنے سر لیتا ہون میر کی روح پاک اور یاد نیک سے مجھے شرم آتی ہی لیکن اظہار حقیقت سے مجبور ہون کہ مین اُنکی توصیفی تحریر و تصویر کشی مین اصلی رنگ و روغن کی جھلک نہین پاتا۔ بحالیکہ ظہوری ترشیزی کے وصف رقاصان کے ان پانچ سادہ شعرون مین مستی اور نشاط کا ایک پورا عالم محسوس کر رہا ہون

بیا مطرب با پردہ ساز کن — طرب می رود نالہ آواز کن
غم و غصہ چون تارک بدسگال — ز رقص سہی قامتان پایمال
ز ہر سو دلے مبتلا می کنند — بخاطر فریبی چہا می کنند
کمرہا چو در پیچ و تاب آورند — چہ دلہا کہ در اضطراب آورند
با فشاندن دست مانند گوش — بہ برچیدن پائے دزدند ہوش

ظہوری مختصر سی بزم طرب مین اپنی جادو نوائی سے سُننے والون کو مسحور کر جاتا اور اُنکے خرمن صبر و

وقرار پر بجلیاں گرا دیتا ہے۔ میر اپنے اظہار کمال خیال بندی اور صورت کشی یا قلم کے ترکتاز کے لئے پانی پت کا میدان بھی تنگ پاتے؛ رعد کی طرح گرجتے اور صواعق برق کی طرح چلتے ہین۔ بالآخر قوس قزح بنکر رہجاتے ہین۔

ظہوری کی بحر بھی جُدا ہے۔ مین دونون کا مقابلہ اور اُن کے انداز کلام کا موازنہ نہین کرنا چاہتا تھا شعر یاد آگئے تو لکھ دئے ہین۔ میر کے اسی رنگ کے چند مزہ دار شعر جن مین انھین خیالات کو موزون کیا ہے اب نقل کرتا ہون ؎

بہر عضوی طرب مستانہ رقصد | چو جوش مے کہ در میخانہ رقصد
ز جبتن جستن شان می جہد دل | غم از پاکوب شان در رقص بسمل
بپا برچیدن ہر ناز پرور | گزارد بے قراری پا بر اخگر
کمر در پیچ و تاب رقص بے تاب | چو موئے کوفتد در جوش گرداب
خرام عشوہ ہای شوخ و طناز | چو موج مے بصید دل سبکتاز
چو ہر شوخ جبین آئینہ رقصد | نگہ در چشم و دل در سینہ رقصد
ادائی گردش چشم فسون ساز | بچرخ آوردہ دلہائے نظر باز

شُترکائے صحبت گشت و گشت بزم عشرت سے سیر ہو گئے ہونگے اسلیئے اب میر کی سنجیدہ ظرافت یا "ہنگامہ سازی ہزالان" سے اُن کی ضیافت طبع کر دینا ناگزیر ہے ؎

زہے ہزالان گروہے گرم بازی | برقص طرفہ در دستان طرازی
عمامہ کردہ کج بر نوک ابرو | زدہ پس خم چو ماہ نو بزانو
ز رقص شان کہ دارد از طرب بہر | بہر سو ولولہ افتادہ در شہر
بجد از بسکہ در ہزل اند ہر یک | نماید صورت شان ہزل مبشک
برنگ کبک گہ قہقہہ بخندند | ز قلقلہائے مینا شیشہ بندند
ز بزم افروزئی شان گشت بیتاب | بہار فرفرہ[۱] بستان قلاب

۵۵۳ فرفرہ۔ چمڑے کی پھرکی۔

مُغَنّیانِ مُشکّان محفل طوٗے ... بانواعِ ظرافت قافیہ گوے

بہم کردند گوک از نغمہ و ساز ... یکے نازو یکے قاز و یکے باز

عماری بر سرین سلطان بر سر ... بیا بنگر مقدم شد موخر

بادشاہ کے مشکوے عروسی مین پہونچنے اور وہان کی رُوداد سے یون پردہ اُٹھایا جاتا ہے

شہنشہ در حرم تشریف فرمود ... حرم از مقدمش شد عشرت آمود

پرستاران بگرد شاہ بجاہ ... زدہ حلقہ چو دُور ہالہ بر ماہ

ز عصمت ہر یکے را غازہ بر زو ... ز عفت مشک آگین چین گیسو

سخن چون در گلستان حرم شد ... ادب انجا عنان گیر قلم شد

کہ تفصیل سخن انجا محال ست ... قلم نامحرم رودادِ حال ست

خموشی ادب بہتر ز گفتن ... کہ این جا غنچگی بہ از شگفتن

کہ نشنید و ندید آئین مجلس ... بجز گوشِ گل و جز چشم نرگس

رسومِ مُصحف و آئینہ بینی ... بود معمول در حجلہ نشینی

رُخ عروس مُصحف آیات نور ست ... دلش آئینہ رُوئے سرور ست

دگر ہم ہر چہ رسم کدخدائیست ... کہ آن شایانِ شانِ بادشائیست

بجا آورد شاہ ہفت کشور ... بہار تہنیت شد جلوہ گستر

عروس، دولت خانہ شاہی مین اس شان سے لائی جاتی ہے

شہنشہ شد روان با شوکت و شان ... گہر بارید ہمچون ابر نیسان

عقیب تخت شہ چنڈول رانی ... نگارین محمل بلقیس ثانی

۵۵ چنڈول - ہندی لفظ ہے حرف اوّل کے زبر و زیر دونون طرح سے مستعمل ہے - آجکل زیادہ تر چوڈول کہلاتا ہے - جو پالکی عربی فارسی مین محفہ یا ہودج رائج ہے جیسے ایک بڑی ڈولی ہوتی ہے جس کے دونون طرف چوبین یا بانس لگائے جاتے ہین

نہان در عروج عالی سپہرے — بُرجِ اعلا رخشندہ مہرے
چو شد دولت سرائے شاہ پیدا — کہ دولت بر جمال اوست شیدا
فرود آمد بشان و شوکت و جاہ — برنگ آیۂ رحمت شہنشاہ

ولیمہ کا انتظام و اہتمام مطبخ ہمایون سے کیا جاتا ہے ؎

چو در زیر سپہر آبنوسی — ولیمہ سنت آمد در عروسی
بحکم شاہ شیلانی کشیدند — چہ شیلانے فراوانے کشیدند
چو لذت داد دل را شولہ و آش — بقادل، مرحبا، طباخ، شاباش

میر صاحب مثنوی کو اس دعا پر ختم کرتے ہین ؎

بیا عبد الجلیل بلگرامی — سخن را بر دعا بہتر تمامی
دُعای شاہ دین پرور ادا کن — اجابت می شود ممنون دعا کن
ہمیشہ تا بود در ہفت کشور — عروس آمادۂ آغوش شوہر
عروس سلطنت با رونق و جاہ — بود دائم در آغوش شہنشاہ
کنند از عیش و عشرت شادمانی — چو بلقیس و سلیمان کامرانی
بہ شاہنشاہ جہانبانِ گہر ریز — مبارکباد این طوئے دلاویز
شہنشہ با عدالت کامران باد — جہان تا ہست دائم در جہان باد
بود تاریخ طوئے شادمانی — نشاط اندوز وصل شادمانی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دعا نامقبول ہوتی ہے۔ مداح و ممدوح از وج و عروس، دونون ناکام اور مطرود رہ جاتے ہین۔ میر کی مبارکباد اور مثنوی جب مسامع شہنشاہی تک نہین پہونچنے پائی تو کارالٰہمان

اور کندھون پر لے کر کہار چلتے ہین۔ کسی وقت اُمرا اور اعلی الطبقہ کے لئے سواری کی سب سے عمدہ اور شاندار چیز سمجھی جاتی تھی

میر حسن دہلوی مثنوی "بدر منیر" مین فرماتے ہین ؎

چلے لے کے چنڈول جس دم کہار — کیا دو طرف سے زر اُس پر نثار

عالم بالا کی بارگاہ تک اُن کی دُعا کے پہونچنے اور اُنکے التفات و توجہ کی توقع کون کرسکتا تھا؟

اس میں شبہ نہیں کہ "فخریہ" کے زیرِ عنوان اور "خاتمہ" میں میر نے بے مثل لکھا ہے۔ اپنے واقعات و مکنونات خاطر کو نہایت سادگی اور سچائی اور دردِ دلی کے ساتھ ادا کردیا ہے۔ فخریہ میں اپنی نسبت جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کے وہ ضرور مستحق اور شایاں ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب کی مملوکات جمیلہ میں اس مثنوی کا بھی ایک نفیس قلمی نسخہ موجود ہے بروز چہار شنبہ ۱۱۷۱ھ میں بتاریخ ۱۶ رمضان المبارک (۲۴ مئی ۱۷۵۸ء) مولوی طالب حق نے اس کو بمقام لکھنؤ، لالہ رام نراین کے دروازہ پر ختم کیا تھا۔ یہ بزرگ بیوندی (ضلع کانپور) کے باشندے، زمینداری پیشہ، اصحاب علم و ارباب ادب خاندان سے تھے۔ خود مولوی صاحب اور ان کے والد مولوی محمد جان نثار نے متعدد تالیفات یادگار چھوڑی ہیں اور بہت سی مفید کتابیں نقل و کتابت فرمائی تھیں۔

بذلہ سنجی و ہزل سرائی

آغاز شباب (اور غالباً قیام اکبرآباد کے زمانہ) میں ہزل گوئی بھی کی تھی۔ ایسے اشعار کا کہنا خواہ اقتضائے عمر و ولولۂ ذوق سے رہا ہو خواہ استجماع فنون کی نظر سے، بہرکیف اس رنگ میں بھی بہ رضائے حسب اُس دور کے مذاق طبائع کے اعتبار سے بعض نہایت لطیف اشعار کہہ ڈالے ہیں۔ اُن کا ترجیع بند مشہور ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

منم آن بانکہ و دلیر و اجل | کز من افتاد در جہان کھل بل

ترجیع بند کے آخر میں تخلص "اثل" لکھا ہے، ممکن ہے کہ تحسین و تزئین شعر کی ضرورت یا قوافی کی کمیابی و ندرت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہو۔ یہ شعر بھی اُسی ترجیع بند کا ہے ؎

---

۵۵ میر جعفر زٹلی کے چھوٹے بھائی میر صفدر کا تخلص بھی "اثل" تھا، عہد اورنگ زیب میں تھے۔ اثل کی نظم و نثر کا نمونہ سوانح میر جعفر زٹلی (موسوم بہ زٹل نامہ جعفری مطبوعہ مطبع وکٹوریہ پریس لاہور ۱۹۱۶ء) میں ملے گا۔

شعر بارہ[۵۵۶] ہزاریان وبدی   ہمشیرہ بلگرام را عشق است
بروایت آزاد یاران حرفت پیشہ نے اِس شعر کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔

یہ اشعار بھی آپ ہی کے نتائج طبع سے ہیں ؎

عدو گر ہمہ تن ز فولاد گیرد   ز سر تا قدم ہیچ زنجیر اگر دد
بکشتی برق بے دھڑک پکڑ و   بجز حکم اللہ شپیسے نہ اکڑ د

بعض تذکرہ نویسون نے ہزل و ظرافت کو میر صاحب کے علو شان و زاہد مزاجی سے بعید سمجھ کر اس ترجیع بند اور اسی جنس کے دیگر اشعار کو اور شاعرون سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ نواب محمد مصطفٰے خان شیفتہ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور اپنے مشہور تذکرۃ الشعرا موسوم بہ گلشن بیخار[۵۵۷] مین لکھتے ہین

"اثل تخلص، سیر عبد الجلیل نام، از سادات گرامی قدر شاہجہان آباد دہلی بودہ است۔ شاگرد معنوی جعفر زٹلی، و استاد در الظاہر ندیدہ۔ از وست ؎

زلف ہے چہرہ پہ یا جنجال ہے   جنبش ابرو ہے یا بھونچال ہے"

نیز منشی گوکل پرشاد، متخلص بہ رسا، اپنے انتخاب اشعار سراپا، موسوم بہ ارمغان گوکل پرشاد[۵۵۸] کی فہرست شعرا مین ایک صاحب کا تذکرہ کرتے ہین۔

"اثل" میر عبد الجلیل دہلوی تخلص سے ظاہر ہے کہ کس مذاق کے انسان تھے۔ اس پر تماشا یہ کہ حضرت جعفر زٹل کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام مین یہی ایک شعر تین چار تذکرون مین درج پایا جاتا ہے۔ وہ شعر بہ ذیل "شانہ کشی عروس مضامین زلف" صفحہ ۱۱ پر نقل کیا ہے ؎

زلف ہے چہرے پہ یا جنجال ہے   جنبش ابرو ہے یا بھونچال ہے

---

۵۵۶ بارہ ہزار بلگرام کا ایک محلہ ہے۔   ۵۵۷ مطبوعہ مطبع منشی نول کشور صفحہ ۱۴
۵۵۸ ارمغان گوکل پرشاد ۱۲۹۵ھ مطبوعہ مطبع مطلع نور منشی بہاری لال واقع کانپور ۱۸۸۲ء (۱۲۹۹ھ) صفحہ ۷

میر عبدالجلیل بلگرامی کے اس قسم کے کلام کی نسبت میر غلام علی سرو آزاد مین یقین دلاتے ہین
کہ "بلا ریب زادۂ فکر ایشان ہست"

شیفتہ اور اُن کے بعض متقدمین ، معاصرین یا متبعین نے میر عبدالجلیل کو دہلوی لکھا ہے اور سراپا وغیرہ دیگر تذکرہ نویسان متاخر نے اُنھین سے نقل کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے سوا اور کوئی صاحب شعرائے ظریف مزاج سے دہلی مین اس نام کے نہین گذرے ہین۔ اِن کا قیام بہ سلسلۂ ملازمت و رسائی دربار شاہی و رسوخ و قدر افزائی امرائے عالی جاہ ایک مدت تک دارالسلطنت مین رہا تھا اس لئے ممکن ہے کہ وہ بھی دہلوی کہلائے یا مان لئے گئے ہون لیکن اس مین بھی شک نہین کہ پرانے تذکرہ نگار اپنی تحریرات مین اتنی احتیاط نہین برتتے تھے جتنی کسی ذمہ دار لکھنے والے کو لازم تھی۔ وہ الفاظی و انشا پردازی ، مبالغہ و ثنا خوانی مین اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتے تھے کہ صحت روایت اور تحقیق و تنقید سے دور پڑ جاتے تھے۔

میرے خیال مین میر صاحب کے معتقدین و دلدادگان کو اس بارہ مین کسی گریز یا معذرت کی ضرورت نہین ہے بعض مشاہیر شعرا اور اہل علم مین بھی ہاجی و ہرزہ سرا گزرے ہین۔ اس مین ہندوستان

---

۵۹ میر عبدالجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی سید فرش بلگرامی ، عجیب تخلص کرتے تھے منقبت اہل بیت مین ان کا کلام مشہور ہے۔ اس سے کبھی فرصت پاتے یا کوئی صحبت ساز گار مل جاتی ، تو دل بہلانے کیلئے کچھ ہزل بھی کہہ ڈالتے تھے۔ فارسی و ہندی آمیز اشعار زیادہ لکھتے۔ اُن کا ایک شعر یادگار رہیگا ــ اندر کے اثر گر زلم بہ سمند ؛ شعلۂ ہفت آسمان ٹپ جائے
اتفاق وقت ہے کہ یہی مضمون صادق بھی آیا قضائے الٰہی نے کار فرمائی کی۔ احمد آباد گجرات مین سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) مین گھوڑے پر ایسے سوار ہوے کہ گردھی نہ آتی تھی۔ ملٹ کر آنا اور کنارہ بھی نہ ملا واقعہ قضی الرحمن لابد واقع

ایک اور صاحب ، صاحب قران تخلص ، میر امام علی نام ، سادات رضویہ بلگرام سے نہایت فحش اور ہزل کہنے والے تھے ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) مین وفات پائی۔ ان کو مانڈر صاحب نے اپنی تاریخ مین ہجو گو اور مسخرہ کے نام سے یاد کیا ہے۔

Maunder's Biographical Treasury.

یا ایران[۶۰] کی تخصیص و قید نہین ہا گر سیرفطا بنی قوت سخن یعنی اور بذلہ گوئی کو خواہ عنفوان جوانی (جوانی کی ابتدا کہ یادت بخیر !!) خواہ کہولت و پیرانہ سالی مین نمایان کیا ہو تو بھی اس سے اُن کی شان کمال پر حرف نہین آسکتا، وہ بالغ قلم جو اواخر عمر اور کہن سالگی مین ہنگامہ سازی ہزالان "، کے عنوان سے اُن کے کارنامے بیان کرنے اور اُن کی گرم بازاری دکہانے کی قدرت رکھتا ہو، جو اُسکے ادائے کمال اور جوہر فن کی نسبت یہ کہہ رہا ہو کہ ؎

بہ نظم آرند دُر بہر صنع ہمل — بمفتاح طرب فصل مطول
مدار الدہر ترویج الملاہی — مشار الشہر تشریح الملاہی

اُسکے لئے چند سادہ و حاسیانہ اشعار کا موزون کر دینا کیا دشوار ہوگا۔ عرب کے مشہور شاعر و فلسفی جاحظ کا قول ہے کہ "مضمون بازاریون تک کو سوجھتے ہین جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لُطف ادا و بندش کا ہے"

میر صاحب کی تمام تصانیف اور تحریرات مین ایک فقرہ یا شعر بھی ہجو یہ نہین ملے گا۔ وہ اس سے نہایت احتیاط و اجتناب کرتے تھے۔ کسی کی بدگوئی یا کلمات رکیک و اہانت سے زبان قلم کو آشنا نہ کرتے۔

---

۶۰ ملا نور الدین محمود ترخان بلاذری۔ قاسم کاہی۔ عبید زاکانی۔ خاقانی شروانی۔ ابو العلی گنجوی۔ رشید وطواط۔ شفائی اصفہانی وغیرہ بلکس پایہ کے نامود حکیم و عالم، ناثر و ناظم گذرے ہیں۔ ان کے دیوانوں کا جائزہ لیا جائے تو حقہ سے زیادہ ہزل کا پلہ بھاری ملے گا۔

ہندی شاعری

پورب خصوصاً اودھ کی رسیلی سرزمین کو اہلِ روایت طلسم زار الفت بتاتے اور اس کے سینہ پر عشق و محبت کے بڑے بڑے کارنامے منقوش پاتے ہیں اسی موسیقی نواز و جنوں آفریں مٹی سے میر عبدالجلیل کا خمیر تھا حسن اتفاق سے جب دور اور جس طبقہ میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اُسکے روح رواں (۱) سید نظام الدین المتخلص بہ مدھنایک[۶۱] (۲) دیوان سید رحمت اللہ[۶۲] بزرگان بلگرام (۳) بلبھدر[۶۳] برہمن عمدہ بلگرام (۴) چنتامن[۶۴] (۵) بہشت رام[۶۵] (۶) بھوکن[۶۶] باشندگان کوڑا جہان آباد[۶۷] تھے جنکی ہندی شاعری اور بھاشا میں کمال کا شہرہ اطراف و نواحی میں پھیلا ہوا تھا اور جنکی صحبت سے میر نے فیض اُٹھایا تھا (۷) مُلا محمود جونپوری[۶۸] اور (۸) شیخ شاہ محمد فرملی[۶۹] بلگرامی کی ہندی میں نکتہ سنجی اور جنوں نوازی کی یاد تازہ و باقی تھی۔

۶۱ سنہ ۱۰۰۹ھ (سنہ ۱۶۰۰ء) میں وفات پائی۔ مُنا دھند کا نور مدھنایک سنگار دو کتابوں کے مصنف تھے سنسکرت و بھاشا بنارس میں پڑھی تھی۔ ہندی موسیقی کے علم نادو تال اور سنگیت میں یکتا تھے۔ مہارت عظیم حاصل تھی۔ اس فن کے محققین بھی ان کے شاگرد ہونے پر فخر اور اُن کے کمال کے معترف ہیں۔ سُندر نام ایک عورت پر عاشق ہوئے اور اُسی کے ہو رہے۔ نواب کمال الدین خاں رئیس شاہ آباد ان کا معتقد اور قدر شناس و خدمتگزار تھا۔ راگ میگھ میں ان کی کرامت زبان زد عوام و چشم دید خواص تھی۔

۶۲ چلچ مئو و بیسواڑہ کے حاکم تھے۔ خیر اندیش خان عالمگیری اور عبدالصمد خاں اور دیگر اُمرا کے یہاں انکی بڑی عزت تھی۔ جاگیر وافر رکھتے تھے۔ اہل فن و کمال کو بہت دیتے تھے۔ چنتامن صاحب کبت بچار سے انکا مناظرہ اور بالآخر اُس کا دیوان کے کمالات کا اعتراف کرنا صفحات تاریخ پر یادگار رہیگا۔ پورن رس انکا دیوان موجود ہے سنہ ۱۱۱۸ھ (سنہ ۱۷۰۶ء) میں رحلت فرمائی۔

۶۳ بلگرام کے رئیس اور صاحب کمال تھے۔ نوس سنگار، ایک کتاب شیخ الاسلام شیخ اڈہن بلگرامی کے نام پر لکھی اور اُس کا نام 'صوفی ست' رکھا۔

۶۴ چنتامن یا چنتامنی، ایک قنوجی برہمن رتنا کر ترپاٹھی کا بیٹا، سنسکرت کا بڑا عالم اور ہندی

اسی خاک بلگرام سے شیخ عنایت اللہ کا پتلا بنا تھا جو اعجوبۂ زمانہ اور نادرۂ یگانہ تھے جملہ فنون السنۂ عربی وفارسی وہندی میں انکو قدرت عظیم حاصل تھی۔ ایک شیخ ابوالوقت کے مرید وخلیفہ تھے تصفیۂ قلب تزکیۂ باطن وتہذیب اخلاق انتہا تک پہونچا دی تھی۔ سنسکرت اور بھاشا اور موسیقی ہندی میں کمال رکھتے تھے باایں ہمہ زندگی کا کچھ عجیب وغریب طرز تھا۔ نہایت تڑکے صبح کو اٹھتے اور کچھ دیر تک نغمات ہندی سے شغل کرتے۔ اسکے بعد تہیا نماز فجر فرماتے تھے۔ لباس فاخرہ پہنکر اور اسلحہ بدن پر سجا کر متوجہ نماز ہو جاتے اور ارکان نماز بہ خضوع وخشوع تمام ادا کرتے

مبارک علی جن کے دوہے چھوٹی چھوٹی بحروں کے اب تک مشہور و زبان زد ہیں اسی بلگرام کے باشندے تھے۔ سنہ ۱۵۸۳ء میں اسی جگہ پیدا ہوئے تھے

میر عبدالجلیل کی فطری موزونیِ طبع جو عربی وفارسی میں کوس لمن الملکی بجا رہی تھی ہندی میں بھی چمکنی

کا بڑا گوی (شاعر) تھا۔ شاہ شجاع بن شاہجہاں بادشاہ کی سرکار میں عزت ووقار سے بسر کرتا تھا۔ خود جہاں پناہ تک بھی رسائی تھی۔ اسکی متعدد تصانیف ہیں۔ ایک کبت بچار ہے۔ فن عروض میں چھند بچار خوب لکھی ہے۔
سال ولادت ۱۶۱۳ء (۱۶۷۲ء سمبت) اور وفات ۱۷۱۵ء ہے۔
یہ ان چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ (جو حقیقی نہ تھے)

۶۵ مت رام اور بھوشن کی نسبت ماہرین فن لکھتے ہیں کہ اپنے بڑے بھائی چنتامنی اور چھوٹے بھائی نیل کنٹھ (جٹا شنکر) سے بھی زیادہ باکمال اور قادر الکلام تھے۔ مت رام سنہ ۱۶۸۲ء میں فوت ہوا۔

متی رام ابتدا از راجہ راؤ بھاؤ سنگھ (والی بوندی) کا درباری شاعر اور حاشیہ بوس بساط امارت تھا۔ اس نے علم بدائع ومعانی میں ایک کتاب للت للام لکھکر راجہ کو پیش کی تھی۔ اس میں حتی الوسع مثالیہ اشعار اپنے ہی طبعزاد درج کئے تھے اور زیادہ تر ایسے ہی اشعار تھے جن سے راجہ کی مدح وثنا نکلتی تھی۔ اس کے تتبع وتقلید میں دیو دت نے سنہ [illegible]ء میں للت للا تحریر کی۔

بوندی سے تعلق قطع ہوا تو متی رام نے راجہ شمبھو ناتھ سلطانی سے توسل پیدا کیا۔ اس کی فرمائش سے کتاب چھند سار پنگل تصنیف کی جو فن عروض میں بڑی عزت واستناد کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ رس راج خالص عاشقانہ شاعری ہے اور اسکی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ متی رام کی ست سئی بھی کافی شہرت رکھتی ہے۔

۶۶ بھوشن کو سنا ہر رزم وبزم دونوں کے بیان کرنے میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کے مختلف راجگان وروسا کے یہاں رہا تھا اسکی قدردانی خصوصیت کے ساتھ شیواجی مرہٹہ اور چھتر سال راجہ (بوندیل کھنڈ) نے کی اُسنے

اور اپنا علم بلند کرنے لگی۔ دکھانے لگی کہ آہنگِ حجازی اور ترانۂ عراقی سے انکا نغمۂ ہندی دیگر نہیں رہ سکتا یعنی آفرینی و نازک خیالی میں سحر طرازان حجاز اور افسوں خوانان پارس سے جادو نوایان ہند کسی طرح کم نہیں ہوتے ان کا فن "نایکا بھید" انہیں کی ایجاد اور تنہا انہیں کا حصہ اور انکی زندہ کرامت ہے میر عبدالجلیل سے جب فرمایش کی جاتی تھی یا خود انکا دل چاہتا تھا تو بھاشا میں بھی کہہ دیتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شعر گر فضل من نہ پوشیدے — می شدم در فنِ سخن اقدم
گر بہ پرسی ز جامعیتِ من — میرِ خسرو دہد جواب نعم

بھی انکو اپنے فیض کلام سے غیر فانی بنادیا اور بے مثل قصائد و مدائح لکھے ہیں۔ شیواجی کے کارنامے شیوراج بھوشن میں نظم کئے ہیں۔ شیوا باونی، چھتر سال دشک بھی بڑے پایہ کی نظمیں ہیں بھوشن کی زبان بھاشا ہے مگر عربی فارسی کے الفاظ بھی موقع محل سے آجاتے ہیں

مصنف ہندی نورتن کا بیان ہے کہ بھوشن کی پیدایش ۱۶۳۵ء میں ہوئی تھی۔ انتقال ۱۷۱۵ء (دسمبت ۱۷۷۲) میں ہوا۔ بعض تذکرہ نویس سال ولادت ۱۶۱۳ء (دسمبت ۱۶۷۰) لکھتے ہیں۔

۵۶۷ میر غلام علی بلگرامی، سرو آزاد (تذکرہ دیوان سید رحمت الله) میں ان بھائیوں کا مسکن کوڑا جہان آباد لکھتے ہیں جو ضلع فتحپور میں ایک مشہور اور قدیم قصبہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ باکمال تکمان پور یا تکوان پور کے رہنے والے تھے جو ضلع کانپور میں گھاٹم پور کے جنوب جمنا کنارے واقع ہے اور جو اس وقت تری وکرم پور کہلاتا تھا۔ ان دونوں مقامات کا فاصلہ چنداں زیادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت تکوان پور متعلق کوڑا جہان آباد کے رہا ہو یا باعتبار قرب و شہرت ایسا لکھا گیا ہو کیونکہ عہد اورنگ زیب میں گھاٹم پور متعلق حویلی و سرکار کوڑہ کے تھا۔

۵۶۸ ملا محمود۔ فاروقی شیخ تھے۔ علمائے اشراقیین اور حکمائے مشائین کی بہترین یادگار اور یگانۂ روزگار تھے۔ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تصنیفات شروع کردیں۔ حکمت میں شمس بازغہ اور فن بلاغت میں فرائد تحریر کی تھی۔ مدۃ العمر کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے رجوع یا انکار کرنا پڑا ہو۔ جب کوئی سائل مسئلہ پوچھتا اگر دل حاضر ہوتا تو جواب دیدیتے تھے ورنہ کہدیتے کہ اس وقت خاطر متوجہ جواب نہیں ہوتا بھاکا کو در عہد ہندی کی جانب راغب کیا تھا لیکن وزراء نے مہم بلخ کے درپیش ہونیکی وجہ سے اس تجویز کو مسترد کرا دیا

اُس دَور کے بعض امرا کو بھی ہندی بھاکھا کی شاعری کے ساتھ التزام خاص تھا۔ میرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خاں بدخشی، صوبہ دار الہ آباد تھا۔ عہد عالمگیری میں صوبہ دار کشمیر بھی رہا تھا۔ سہرند سے ایک منزل پر سیف آباد اُسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ سیف خاں جوہر قابل رکھتا تھا اور عالی دوست تھا۔ فنِ موسیقی ورقص ہندی میں راگ درپن، فارسی زبان میں اُسکی تالیف ہے۔

امیر الامرا حسین علی خاں کے دربار میں میر عبد الجلیل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عالم شاعر کے کبتوں کا تذکرہ ہونے لگا تو نواب صاحب سُنکر نہایت محظوظ ہوئے اور میر سے فرمایا کہ عالم کے کبت ہمارے لئے فراہم کرا دیجئے۔ ان کے زمانہ کے شرفا میں شعر و شاعری کا عموماً چرچا رہتا تھا خواہ کسی زبان کی ہو۔ ہر

کچھ روز بعد ظاہر ہوا کہ جس زمین پر ملا محمود نے رصد لگانا تجویز کیا تھا اسی جگہ کو حکمائے پیشین میں سے کسی نے رصد کے لئے پسند و اختیار کیا تھا۔ امیر الامرا شایستہ خاں اور شاہ شجاع انکے شاگرد تھے۔ فن نایکا بھید میں بھی انکا ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے اور بہت مستند ہے۔ اس فن میں اہل ہند نے باعتبار ادا، و انداز، و درجات عمر، و مراتب العنت و بے الفتی وغیر ذالک معشوقہ کو کئی قسم میں تقسیم اور ہر ایک کے لئے ایک نام معین کیا ہے اور اُسی مناسبت سے ہر قسم کے اشعار آبدار نظم کئے ہیں۔ ملا کا رسالہ فارسی میں ہے انکو مثال کے لئے فارسی اشعار (جو کہ عموماً امارد کے حلیہ و شان میں ہوتے ہیں) عورتوں کے متعلق نہیں ملے اس لئے رسالہ مثالیہ اشعار سے خالی و معرّیٰ رہ گیا۔ ملا نے ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں انتقال کیا۔

۵۶۹ شیخ شاہ محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں صاحب ثروت و اقتدار تھے۔ حصار و دریری چندوار کی حکومت سپرد تھی دریری ایک محال یا پرگنہ صوبہ و سرکار ملتان میں تھا۔ محال چندوارہ سرکار جانپانیر، صوبہ گجرات میں تھا۔ شکار کو گئے تھے کہ کسی گانوں میں ایک صاحب جمال لڑکی کے تیر نگاہ کے شکار ہوگئے۔ وہ بھی بڑی شوخ اور حاضر جواب تھی۔ اسکی ذہانت اور فی البدیہہ جوابات پر شیخ صاحب مفتون ہوگئے اور اپنے گھوڑے پر سوار کر کے لے کر چلدیئے، گھر لاکر تربیت کی۔ نظم ہندی میں وہ شیخ سے بھی فائق اور سابق اور لطافت و ظرافت اور بدیہہ گوئی میں یکتا نکلی دونوں کی نکتہ سنجی اور پر لطف گفتگو (ید بیضا میں) دیکھکر ان کے قدرت کلام سے حیرت ہو جاتی ہے۔

۵۷۰ کبت یا سیکھہ نظم کی ایک خاص صنف ہے جسمیں دو مصرعے ہوتے ہیں زبان برج بھاکھا ہوتی ہے جو متھرا اور بندرابن اور گوالیار اور قرب و جوار میں بولی جاتی ہے۔

۵۷۱ عالم، اصل میں برہمن تھا جو کسی مسلمان رنگریزن پر جو خود بھی شاعرہ تھی عاشق ہو کر مسلمان ہوگیا تھا

ہر لکھے پڑھے خاندان میں کچھ نہ کچھ اس کا ذخیرہ ملجاتا تھا۔ میر عبدالجلیل اور ان کے قرابت داروں کے گھر بھی اس سے خالی نہ تھے۔ نواب صاحب کے لئے میر کو یہ سوغات اپنے وطن سے منگانا پڑتی۔ ایک موقع پر میر سید محمد کو لکھتے ہیں کہ "ہر قدر کبت[۱] عالم[۲] و سکھ کہ ہر دو پیکے اندیش ہر بنس مصر وداکرد پسران گھسیٹے و دیگر مردم بہم رسد بخط ہندی نویسانده یک جزو، دو جزو، ہر چہ میسر آید زود بفرستند، و در خط ہندی تحریف کم است۔ و ہندی راکہ بفارسی نویسند، در خواندن تحریف بسیار واقع می شود اما ہندی خوشخط باشد بخط رکیک نبود۔ دریں باب تاکید دانند۔"

یہ مصر وداکر، ہربنس برہمن کے بیٹے اور بلگرام کے معزز اور خوشحال لوگوں میں سے تھے۔ سنسکرت و بھاشا میں ان کی قابلیت و جامعیت مسلم اور مشہور تھی۔ میر عبدالجلیل نے ان کو بار بار لکھکر دہلی بلایا اور سید حسین علی خاں امیرالامرا کے یہاں ملازم کرا دیا تھا۔ یہ نواب کے ندیم و مصاحب خاص تھے۔ میر کے مرثیہ میں ایک دوہہ اُنھوں نے لکھا اور بیانِ واقعہ عالم پر آشکار کر دیا تھا ؎

نہ ہوا ہے اَو نہ ہوئے گا ایسو کین سوشیل   جیسو احمد نند جگ ہوے گیو میر جلیل

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب اس دوہہ کے اعداد کا شمار کیا گیا تو بلا تخرجہ و تعمیہ تاریخ نکل آئی، خیال رہے کہ ۲۳۔ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ کو میر عبدالجلیل نے وفات پائی تھی۔

اور اُس سے عقد کر لیا تھا۔ ایک لڑکا جہان نامی اس دورِ مسرت و عیش کا یادگار تھا۔ عالم نے اپنی محبوبہ جنکوم کی وفات میں دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ اس کی نسبت ہندی شعرا لکھتے ہیں کہ برہ میں ٹکسالی چھند ہے۔ شاہزادہ معظم شاہ کا ملتزم خدمت تھا۔ اس کا کلام نہایت دلکش ہے۔

[۲] مسٹر بیل اور سنٹیل بیاگرفی کل ڈکشنری میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے فن موسیقی میں شیخ عالم نے مادھو اٹل یا مادھو نایک نام ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ نام اس ماہرِ فن موسیقی سے منسوب ہے جس نے اس کو سب سے پہلے ہندی میں لکھا تھا۔

۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں انتقال کیا۔

۵۷ سروِ آزاد میں 'سکھ نکھ' ہر جگہ لکھا ہے۔ جو قوام فطرت انسانی اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس وقت شرفا میں اسی طرح مستعمل ہو۔ مگر آج کل عموماً ترتیب الفاظ بالعکس 'نکھ سکھ' بتائی جاتی ہے۔ جس سے ہندوستان کے عامۃ الناس 'نکھ سے سکھ تک' اور خواص 'نکھ سے سکھ تک' یعنی ناخن پا سے لیکر موئے سر تک مراد لیتے ہیں۔ 'نکھ' لغتہً و عرفاً ناخن اور 'سکھ' سر کی چوٹی کے بال کہلاتے ہیں۔

حال میں رسالہ زمانہ (کانپور) کے کسی مضمون نویس نے جہاں پدماوت کے تمام تراجم و اشاعات کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ "حسین الدین غزنوی نے فارسی میں ۱۶۶۱ء (۱۰۷۲ھ) میں اورنگ زیب عالمگیر کے نام پر "حسن و عشق" لکھکر اپنا زور قلم دکھایا تھا۔ بعد ازاں ضیاء الدین عبرت دہلوی اور اُن کے استاد عشرت نے فارسی سے اُردو میں نقل کیا۔ پھر میر عبد الجلیل نے اسی پر طبع آزمائی کی اور اخیر میں کسی شخص ابراہیم نامی نے پشتو میں نقل کیا۔" میر عبد الجلیل کی طبع آزمائی کی نوعیت اس مقالہ نگار نے نہیں لکھی ہے۔ میر فارسی اور ہندی دونوں میں قدرت تام رکھتے تھے۔ نظم و نثر دونوں اُن کے قلم کے سامنے سر جھکائے ہوئی تھیں۔ لیکن اس سوال سے قطع نظر کرکے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر عبد الجلیل کے تمام علمی کارناموں کا بیان میر غلام علی آزاد وغیرہ اُن کے خاص اعزہ نے جہاں کیا ہے وہاں اُنکی پدماوت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ تذکرہ ید بیضا میر کی رحلت کے بعد قریب تر زمانہ میں لکھا گیا تھا اُسکی تالیف کا مقصد اصلی محض میر کے نام کا احیاء اور اُنکی علمی و ادبی خدمات کا ابقا تھا۔ قرین قیاس نہیں ہے کہ آزاد کو ترجمہ پدماوت کا علم نہو۔ صاحب البیت ادری بما فیہ۔ اور اگر تھا تو تذکرہ سے کیوں متروک ہو گیا۔ معہذا کسی اور معاصر یا قریب العہد مورخ نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ دو سو برس کے بعد اگر کوئی اہل قلم اس واقعہ کو لکھتا ہے تو اُس کو اپنے ذرائع علم اور اُن کے اسناد کا حوالہ دینا چاہیے۔

میر کی منظومات میں سے "شکھ نکھ" بھی دیں کے وزن میں ہے۔ اس گلدستہ کے چند پھول پیش کئے جاتے ہیں۔

الہ نام پوتھی پر لکھی اپنہ بھائی	अलह नाम पोथी पर लिख एहिँ भाय ।
جیوں جڑائی کو ٹیکو بھال سُہائی	ज्यों जड़ाय को टीको भाल सुहाय ॥

مجازاً حلیہ یا وہ کلام جس میں محبوب کے جملہ اعضا و جوارح کی ناخن پا سے لیکر موئے سر تک مختلف تشبیہات و تلمیحات کے ساتھ تعریف کی جائے۔

اسی کو فارسی زبان میں سراپا کہتے ہیں یعنی تمام و کمال کیونکہ اس میں تمام اندام اعضائے معشوق کا اول سے آخر تک وصف بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ کا نام کتاب پر اس غرض سے لکھا جاتا ہے جیسے خوبصورت عورت کی جبین پر جڑاؤ ٹیکا زیب دیتا ہے۔

کیس پاس کی پھانسی پھانسو لوگ — केश पाश की फाँसी फाँसो लोग ।
ایک شیام تم اوپر الک سنجوگ — एक श्याम तुम ऊपर अलक सँजोग ॥

زلف کے دام میں لوگ پھنستے ہیں۔ ایک تم سانولے ہو، اوپر سے زلفیں کالی ہیں۔

پھلواری گھونگھٹ کی پاتیں جات — फुलवारी घूँघट दै यातें जात ।
سمن باس بن چھائیں نہیں سہات — सुमन बास बिन छाहीं नहीं सुहात ॥

نقاب ڈال کر باغ میں اس لئے جاتے ہیں کہ بغیر سایہ کے خوشبو کا لطف نہیں ہوتا۔

واکپول نرمل تیں درپن ہار — वाकपोल निर्मल तें दर्पन हार ।
پرت انت جھوٹھے کے مکھ پر چھار — परत अंत झूठहू के मुख पर छार ॥

اس کے عارض شفاف سے آئینہ ہار مان گیا۔ جھوٹے کے مونھ پر آخر خاک ڈال جاتی ہے۔

واتل دیکھ تریّن باڑھت جوت — वातिल देखि तरैयन बाढ़त जोत ।
دنت چیکنوں دیکھے کھلست کوت — दंत चीकनो देखे खुलसत कोत ॥

اس کے خال کے دیکھنے سے تیّروں کی روشنی افزوں ہوتی ہے (ہندوؤں میں رواج ہے کہ بزرگوں کی روح کو آرام دینے کی غرض سے تل اور پانی دیتے ہیں) اور دانتوں کی چمک سے کوت یعنی سمتیں کھل جاتی ہیں۔

نکھن جھلک مہندی سنگ یوں چھب دین — नखन झलक मेंहदी संगवों छब दीन ।
چنیں لال تر جیسیں ڈھاک نوین — चुनीलाल तर जैसे ढाक नवीन ॥

ناخنوں پر مہندی کا رنگ یوں کھل رہا ہے۔ گویا سرخ یاقوت کے نیچے ڈاک لگی ہے۔

بھاؤ ناہہ کی تر کو کھو جات — भाव नाभि के तक को कहो न जात ।
کنول کلی لو موندی بھلی یہ بات — कँवल कली लौं मूदी भली यह बात ॥

ناف کے مقام کا خیال بیان میں نہیں آسکتا گویا کملوں (نیلوفر) کی کلی بند ہو گئی ہے

بینی پیٹھ دوؤ مل متو جو کین　　बेनी पीठ दोऊ मिल भलो जो कीन ।
تانبی جکلی باتن من ہر لین　　लांबी चकली बातन मन हरि लीन ॥

معشوق کی چوٹی سے اور اُسکی پشت نے متفق ہو کر لمبی چوڑی باتوں سے دل لے لیا (پیٹھ چوڑی اور چوٹی لمبی)

جگل جنگھ سو مومن اٹکو جائے　　जुगुल जंघ सों यो मन अटको जाय ।
انت باندھیت سے گہنے کیہیں لائے　　अंत बांधियत गहने कहीं न काय ॥

دونوں ساقوں میں میرا دل اٹک گیا (مصرعہ ثانی کو بعض سخن فہم مہمل بتاتے ہیں۔ کم از کم صحیح پڑھا نہیں جاتا اور نہ کوئی معنی سمجھ میں آتے ہیں)

کنول سانجھ موندت نہیں کوش سکور　　कँवल सांझ मूंदत नहि कोष सिकोर ।
وا چرنن کو بندت انجل جور　　वा चरनन को वन्दत अञ्जलि जोर ॥

کنول شام کو اپنا جسم سکوڑ کر بند نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسکے قدموں کی پرستش کرتا ہے

پھلواری جگ میں سبے سینچت لی لی باس　　फुलवारी जग में सबै सींचत लै लै बास ।
سوکھے روکھ پلاس کو رت بسنت کی آس　　सूखे रूख पलास को रितु बसंत की आस ॥

لوگ خوشبو لیکر باغ کی آبپاشی کرتے ہیں خشک ڈھاک کو صرف موسم بہار کی امید رہتی ہے

رجنی سجنی پیہ سنگ پاون روپ بہات　　रजनी सजनी पीय सँग पावत रूप बिहा[illegible] ।
اب پریتم بچھرے بھئی پاون پکھے کی بھانت　　अब प्रीतम बिछुरे भई पांव पखे की भांति ॥

یار کے ساتھ رات جلد گذر جاتی ہے ہجر میں وہی رات کاٹے نہیں کٹتی

تو ناسا کی ڈاہ کی کیر لگی جیہ کونچ　　तो नासा की डाह की कीर लगी जिय कोंच ।
ماہر کھونٹ نت کرے کہہ دیت ہے چونچ　　माहुर खूँटो नित करै कहे देत है चोंच ॥

تیری ناک کے حسد سے طوطا زخمی ہو گیا ہے اُسکی چونچ صاف ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ہمیشہ زہر گھونٹا کرتا ہے

प्यारी तेरे चरन के कहू कहाँ लौ भेद । پیاری تیرے چرن کی کہوں کہاں لو بھید
छिन बिछुरत जाके परे झावाँ छाती छेद ॥ چھین بچھرت جاکے پرے جھاواں چھاتی چھید

تمہارے پاؤں کا کیا بیان کروں جس کی ایک لمحہ کی جدائی سے جھانواں کے سینہ میں چھید ہو جاتے ہیں (جھانواں جس سے پاؤں صاف کیا جاتا ہے)

یہ اشعار سروآزاد سے لئے گئے ہیں۔ ان کے فارسی جامہ کو ہٹا کر بھاشا کے اصلی قالب میں دکھانے کے لئے مجھے دشواری اٹھانا پڑی ہے جن ماہرین نے مدد فرمائی انکا ممنت گزار ہوں میر غلام علی نے کچھ ایسے شعر بھی نقل کئے ہیں جو نستعلیق خط میں ہونیکی وجہ سے صحیح نہیں پڑھے جاتے اور وزن و معنی سے بیگانہ نظر آتے ہیں

لکھ کپوت واکریواں آتھ ابھرام — ہوئی اتیت کرڈاری سیری سیام

سنگھ ناتھ جبو موری دہوں کیا کھوئی — کری لاک جہاں بچھر یوہت تہاں ہوئی

کم نصیب محرر سطور سے جو ایسے لطیف فن سے بھی بے بہرہ ہے قدیم بھاشا کے متعدد قدر شناس حضرات نے میر جلیل کی ہندی شاعری کی تحسین و ستایش کی ہے۔ اہل ذوق کی زبان پر انکا کلام ابتک باقی ہے اسکی قبولیت عام کی شہادت یہ کیا کم ہے کہ صوبہ متوسط میں جسکو ہندی بھاشا کے ادب و شعر کا گہوارہ کہنا چاہئے کسی وقت اسکے بعض اجزاء مدارس سرکاری کی نصاب میں داخل تھے (پاٹھ پستک چوتھی۔ مؤلفہ مسٹر ہری گوپال پادھیا بی۔ اے۔ جو ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۰ء تک جاری رہی) شیو سنگھ سروجے وغیرہ بعض مطبوعہ کتابوں میں بھی اسکے منتخبات موجود ہیں اس دور کے لحاظ سے انکا معیار بہت بلند بتایا جاتا اور انہیں حق شناسی و خدا پرستی کا حقیقی جلوہ دکھایا گیا ہے

मीर जलील की कविता—बरवै छन्द

सुरति आय गई तुम्हरी अस प्रिय जान ।
स्वामि मोर बड़ समरथ जिय हरसान ॥
सबहिं अलँगतें मन हठि तुमरी ओर ।
अरज करहिं सुन लीजहि तनि करि कोर ॥ १

तनिक दया के चितये मोर बचाव ।
जल ऊपर चींटी को तिनुकइ नाव ॥
बिलगराम कर वासी मीर जलील ।
तुम्हरी शरण गहि गाढ़े से निधिपील ॥ २

میر جلیل کی کویتا۔ بروے چھند

صورت آئے گئی تمہری اس پیے جان
سوامی مور بڑ سمرت جیے ہر کھان
سبہنہ النگ تیں من ہٹ تمہری اور
ارج کری سُن لیجیے تن کر کور ١

تنک دیا کے چتیئے مور بچاؤ
جل اوپر چینٹی کو تنکئی ناؤ
بلگرام کر باسی میر جلیل
تمہری شرن گہ گاڑھے سے ندھ پیل ٢

ظرافت و حاضر جوابی

میر عبدالجلیل سے کسی بے تکلف ہندو دوست نے کہا "آپ صاحبوں کا قول ہے کہ لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ o (تر و خشک کتاب واضح میں لکھے ہوئے ہیں۔ جزء ۷ سورۃ الانعام ع ۷۔ ۱۳۱) بھلا یہ تو فرمائیے کہ اس میں کانَ کا بھی کچھ ذکر ہے؟" [کانَ بفتح آخر۔ ہنود کے ایک بڑے اوتار اور معظم مقتدا کا نام ہے] میر صاحب نے فرمایا کہ "ہاں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ o [اور نا فرمان بن بیٹھا۔ جزء اول سورہ بقرہ۔ ع ۴۔ ۷]

سبحۃ المرجان میں میر غلام علی آزاد نے اس واقعہ کو صنعت الوقلمون کے ذیل میں تحریر کیا ہے

بندۂ راقم کو اندیشہ ہے کہ اس زمانہ (بیسویں صدی مسیحی) کی رفتار اور انسانی طبائع کی افتاد دیکھ کر یہ سوال و جواب ناشائستہ اور قابل اعتراض نہ سمجھا جائے۔ اس لیئے یہ نظر انداز نہ کیجیے گا کہ آج سے ڈھائی سو برس پہلے اہل ہند کا سچا اخلاق، باہمی ارتباط و اختلاط اس ڈھنگ کا نہ تھا۔ اُس وقت کے ہندو اور مسلمان کسی متعصبانہ رنگ میں رنگے ہوئے نہ تھے۔ نہ ایک دوسرے پر مذہبی طعن یا چوٹیں کرتے تھے۔ یہ اُن کے غایت خلوص اور بے تکلفی کا تقاضا تھا کہ جو کچھ زبان پر آجاتا تھا اُسکو سادگی سے کہڈالتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بُرا نہیں مانتا تھا اور نہ بدنیتی و بدمذاقی پر محمول کرتا تھا۔

مجھے اپنے بارے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت محض جامع احوال و اقوال کی ہے مستند کتابوں میں میر عبدالجلیل بلگرامی کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق کوئی بھی واقعہ اچھا یا برا جو کچھ نظر پڑ جاتا ہے اُسکو نقل کر دیتا ہوں۔ میں اپنی خدمت کی بجا آوری پر مامور اور اسلیئے مجبور ہوں۔ قارئین معظم مجاز ہیں کہ میر عبدالجلیل اور اُن کے ہندو دوست کی نسبت جو رائے چاہیں قائم فرمائیں۔

معاصرین انکی رائیں اور دلچسپ صحبتیں

بلگرام کی علمی مجلسوں کی روداد بیان کرنے کی اس مختصر تذکرہ میں گنجائش نہیں۔ وہاں علم بھی تھا فضل بھی، فقر بھی، اہل علم بھی تھے، صاحبانِ عمل بھی۔ میر عبد الجلیل کی بے تکلفانہ نشست وبرخاست اور ہر وقت کا ساتھ انھیں ارباب کرست و شفقت سے تھا۔ وہاں کی بزم سخن میں شمع کمال پر ہر طرف سے پروانے تصدق و نثار ہوتے رہتے تھے۔ جہت و صنعت کی کوئی قید نہ تھی فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی۔ جز ۳۔ سورۃ البقرۃ ع ۱-۳۴) میرا ایمان ہے لیکن میر سید مبارک محدث، میر طفیل محمد، سید اویس، میر نعمت اللہ سجادہ نشین شاہ طیب، ان کے صاحبزادے شاہ لسین (حفید مخدوم محمد رکن الدین خیرآبادی)، سید عبد النبی (خلیفہ میر سید محمد کالپوی)، مولوی سید مربی، میر سید لطف اللہ المعروف بہ شاہ لدھا، میر عظمت اللہ بیخبر، سید نور اللہ، سید محمدی (معتقد علیہ شاہ عالم بادشاہ) اولیاے کامل میں سے کس کو ایک دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ اس لئے ان عزیزان یگانہ کو چھوڑ کر ع یودم پیشہ باہم پیشہ دشمن کے مقولہ پر اعتماد کرکے دوسرے رخ یعنی اغیار و بیگانہ کی طرف توجہ کروں گا ع

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

(۱) سراج الدین علی خاں[۹۵] آرزو اکبرآبادی رجب ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں گوالیار سے دہلی آئے تو انکے اخراجات کیلئے سرکار بادشاہی اور دیگر امراء کے یہاں سے درماہے مقرر ہوگئے۔ اس وقت

---

[۹۵] بڑے نامور شاعر اور صاحب کمال اس صدی میں گذرے ہیں۔ ایک تذکرہ شعراے فارسی و ہندستانی و دکنی کا مجمع النفائس نام نہایت مکمل مستند اور عمدہ انتخابات کلام کے ساتھ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں لکھا تھا۔ اس میں آزاد کو نہایت خلوص و خوبی سے دو جگہ یاد کیا ہے۔ خان آرزو اکبرآباد میں ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں متولد ہوئے تھے۔ ۲۳۔ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (۲۶۔ جنوری ۱۷۵۶ء) کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ خان آرزو کی ملاقات شیخ

سے لیکر میر عبدالجلیل کی وفات ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تک دونوں کی بڑی پرلطف صحبت رہی دونوں ایک دوسرے کے کمال و کلام کی داد دیتے تھے۔ پھر آرزو اودھ چلے گئے۔ وہاں میر عبدالجلیل کے نواسے میر محمد یوسف بلگرامی سے تین بار ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے علاوہ شناسائی سے وہ دہلی میں بھی دوبار آرزو سے مل چکے تھے۔ آرزو فیض آباد میں اُن سے بڑی محبت و تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہاں مہمان رکھا۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ "سرو آزاد لکھتے وقت آرزو سے میں نے اُنکا تذکرہ منگایا تو اُنھوں نے کمال اخلاق سے وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا پر عمل فرماکر اپنے احوال و اشعار لکھ بھیجے۔ اور یہ بھی اضافہ کیا کہ "فقیر بخدمت میر عبدالجلیل مرحوم بلگرامی مکرر مستفید شدہ و صحبتِ شعر اتفاق افتاد۔ حالا بادۂ ارتباط دو آتشہ شد و گل دوستی رعنا گشت"

(۲) خواجہ عبدالباسط علوی سے "کتاب ربیع الابرار" منگانے اور خواجہ صاحب کی کرمت کا ذکر "حُسنِ طلب"[۱] کے عنوان سے ہو چکا ہے۔

(۳) سید علی معصوم مدنی مصنف "انوار الربیع فی انواع البدیع" سے اورنگ آباد دکن میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ اُن کا قول تھا واللہ مارأیت ھذا السید بالھند نظیرا ما التقاہ

علی حزیں سے دہلی میں ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۱ء) میں ہوئی تھی شیخ تازہ وارد تھے۔ خان نے اُنکی غلطیاں پکڑیں اور "تنبیہ الغافلین" لکھ ڈالی۔ اسکے سوا مثمر، عطیۂ کبریٰ، سراج اللغات، چراغ ہدایت، غرائب اللغات وغیرہ بہت سی مستند و محققانہ کتابیں لکھی ہیں۔

۵ جزء خامس۔ سورۃ النساء ع ۱۱۔ ۸ "اور جب دعا دے جاؤ تم دعا کے ساتھ، تو دعا دو اُس سے بہتر یا"

اس آیت کے ذیل میں افادہ و افاضۂ عام کے لئے ایک بات قابل تحریر ہے کہ امام بخاری ادب المفرد میں لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہئے جس طرح وہ تم کو سلام کرتا ہے خواہ وہ شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا یعنی جب کوئی شخص تم کو سلام کرے تو اُس سے زیادہ اچھے طور پر جواب دو ورنہ برابر کے طور پر تو ضرور دینا چاہئے۔ حضرت عبداللہ کا دوسرا قول اسی ذریعہ سے منقول ہے لو قال لی فرعون بارک اللہ فیک۔ قلت وفیک۔ اگر مجھکو فرعون بھی کہے کہ خدا تجھکو برکت دے تو میں بھی وہی کہوں گا۔ (تجھکو بھی خدا برکت دے)

فی خمائل الادب غصناً نضیرا۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا کہ "من در تمام عمر خود جامع غرائب علوم مثل میر عبدالجلیل نہ دیدم"۔

(۴) مرزا محمد علی خاں متین کشمیری نے بھی اپنے تذکرہ حیات الشعرا[۵۷۵] میں میر عبدالجلیل کا ذکر کیا ہے۔ اُسوقت اِن کا تخلص "میر جلیل" تھا۔

متین نے ایک روایت میر عبدالجلیل کی طرف منسوب کر کے لکھی ہے جسکی میر غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں تغلیط کرتے اور لکھتے ہیں کہ میر محمد زماں راسخ (پدر میر معصوم وجدان تخلص مخاطب بہ عالی نسب خاں) نے یہ شعر کہا تھا ؎

دلبرے یافتم و گوشۂ خلوت رفتم | رفتم شمع بہ اندازۂ کاشانۂ خویش

اسپر بعض طباع شعرا نے ایراد کیا۔ میر راسخ آزردہ ہو کر محمد اعظم شاہ کے لشکر سے چلے آئے اور بالآخر یہی شعر انکی نوکری اور ہفت صدی منصب چھوڑنے کا باعث ہوا۔ آزاد نے یہ واقعہ شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری سے سنا تھا اور شاہ صاحب نے آقا رضائی المتخلص بہ مشہور لاہوری کی زبان سے

(۵) میر محمد مراد المتخلص بہ لائق جونپوری عنفوان جوانی میں مرزا صائب[۵۷۶] کی ملاقات کے شوق میں

---

۵۷۵ اس تذکرہ میں خلد منزل بہادر شاہ کے عہد سے لیکر فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے زمانہ تک کے شعرا کے حالات ہیں

۵۷۶ مرزا محمد علی صائب تبریزی کے باپ عباس آباد اصفہان کے رئیس لڑو سلطے۔ مرزا نے اصفہان میں نشو و نما پائی تھی حرمین محترمین و دیگر مقامات متبرکہ کی زیارت کر کے وطن واپس چلے آئے تھے۔ بڑے درویش اور عالی منش انسان کامل تھے۔ باوجود سُنّی مذہب ہونے کے اہل ایران میں مقبول و عزیز رہے۔ کمال احترام و وقار سے بسر کی۔

جہانگیر کے آخر عہد مگر اپنے شباب میں تاجرانہ ہندوستان آئے۔ ظفر خاں ناظم کابل سے بڑے مراسم ہو گئے۔ جو خود ایسے کبیر تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں وہ ہندوستان آیا تو مرزا کو ساتھ لایا۔ مرزا کے پدر گرامی قدر بھی ان کو وطن واپس لے چلنے کے لئے ہندوستان آئے۔ برہان پور میں ہجراں کیش یعقوب کی آنکھوں نے دور افتادہ یوسف کے دیدار سے روشنی پائی۔ تاہم کچھ تو ظفر خاں کے خلوص و ارتباط اور کچھ شوق گلگشت کشمیر نے مجبور کیا۔ کشمیر سے مرزا کو اصفہان جانے کی اجازت ملی۔ بادشاہ ایران شاہ عباس صفوی نے قدردانی کی ملک الشعرا بنایا۔ ہندوستان کی یاد وطن میں بھی باقی رہی جن امرا سے یہاں رسم و راہ ہو گئی تھی ان سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھا اور جو کچھ مقدر تھا

ہندوستان سے اصفہان کو پاپیادہ گئے۔ایک زمانہ تک اُنکی خدمت میں رہے اور خوب مستفید ہو کر آئے تھے۔اس خیال سے کہ لائق نے محض اُن سے ملنے کے لئے اسقدر تکلیف و تعب سفر برداشت کیا تھا مرزا صاحب بھی بڑی مدارات و دلجوئی سے پیش آئے۔اپنی مجلس میں جگہ دی تھی۔ان کے اشعار کو بھی بہت پسند کرتے اور تحسین فرماتے۔میر مراد اورنگ زیب عالمگیر کی پیشگاہ سے مدت تک دارالسلطنت لاہور کی سوانح نگاری پر سرفراز رہے تھے۔میر عبدالجلیل سے بیحد ربط و رسم رکھتے تھے۔انہیں کے اشارہ سے اپنا خمسہ نظم کیا تھا۔مخزن اسرار کے مقابلہ میں جو مثنوی لکھی ہے اُسکے خاتمہ میں میر صاحب کا اور اُنکی تکلیف دہی کا ذکر کرتے اور ان الفاظ و اشعار میں اُنکی ستایش فرماتے ہیں ؎

راقم این نامۂ معنی سواد محو سخن بندہ محمد مراد
بود شبے انجمن آرائے فکر داشت سرے گرم ز سودائے فکر
یافتہ از قید تعلق خلاص خامہ بکف منتظر فیض خاص
چہرہ طراز گل افسانۂ دام نہ معنئ بیگانۂ
پنجۂ اندیشۂ اعجاز من شانہ کش زلف بتان سخن
قطرۂ از ابر سخن ریختے موج گہر از دلم انگیختے
خستہ دلم در ہوس رہبرے جان گرو آرزوئے ہمدمے
از ورم القصہ در آمد درم اہل سخن را بہ سخن رہنمول
نشۂ سرجوش خمستان ہوش از پئے تحقیق سخن چشم و گوش

نقد و جنس نذر و نیاز ہوتی رہی۔

غزلیں بالکل نئے طرز کی لکھتے تھے۔کلام میں اخلاقی رنگ غالب تھا۔تشبیہات کے بادشاہ تھے۔مرزا شاعری کے ایک جداگانہ طریقہ کے موجد مانے اور بتائے جاتے ہیں۔اساتذۂ فن سخن میں انکا شمار نمبر چوتھا ہے۔

ان کا دیوان اسی ہزار شعر کا ہے اور ہر صنف کلام پر مشتمل ہے۔

سنہ ۱۰۸۰ھ بر سنہ ۱۶۶۹ء میں وفات پائی اصفہان مدفن ہے۔

صورت از دگشتہ بمعنی دلیل — سیدِ علامۂ عبد الجلیل
کردہ بموزونیٔ طبع سلیم — طالبِ خویشم چو کلام کلیم
می دہد از لفظ بمعنی پیام — زود تر از نکہتِ گل با مشام
می برد از طرزِ مطالب سراغ — گرم تر از نشۂ مے با دماغ
دید کہ فکرِ سخنم پیشہ است — دل گردِ صورت اندیشہ است
گفت سخن سادہ و پُر کار بہ — ناب کنِ سبحہ و زنّار بہ
بس بود از بہر سخنور گوا — معنیِ بیگانہ لفظ آشنا
گفتن او فکر مرا تازہ کرد — روے سخن را بہ نفس غازہ کرد
شد ز پری خانۂ دل جلوہ گر — خیل معانی ز پئے یک دگر
جرعہ کشِ بزم ادیبی شدم — نیچہ در خمر نویسی شدم
خامہ بہ تحریر گرد ساختم — نقش دل آویز بہ پرداختم
از مددِ باطنیٔ گنجوی — طرز سخن یافت ز فکرم نوی

لائق ایک موقع پر میر عبد الجلیل سے فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا صائب کی خدمت میں حاضر تھا فرمانے لگے کہ "اب میری عمر ستر سال کی ہوئی تو قدرے چاشنیٔ سخن پیدا ہوئی ہے۔ لیکن بے سود۔ کوچ کا وقت آچکا۔" مرزا کے علاوہ صلہ اور مراتب کمال کے بارہ میں لائق بہت سی باتیں نقل کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے مرزا صائب کو شعر کہتے وقت کبھی تامل و غور کرتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ ایک روز مرزا اپنے چمن کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے۔ میں نے التماس کیا کہ آج تو چہرۂ انور سے کچھ تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔ مرزا نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اس وقت فردوسی کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

بفرمود تا رخشش را زیں کنند — دم اندر دمِ نائے زریں کنند

شفائی نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

بفرمود تا زیں برابرشش نہند — چہ زیں، ہیمہ بالائے آتش نہند

دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس پر طبع آزمائی کروں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اسکی فکر میرے ذمہ چھوڑ دیں۔ مرزا نے براہ مہربانی منظور کیا۔ میں نے تمام شب غور کیا۔ ایک شعر موزوں ہوگیا۔ صبح کو حاضر ہو کر عرض کیا۔ مرزا صاحب نے بہت تحسین و آفریں فرمائی ؎

بفرمود تا زیں براد ہم نہند　　　بہ پشتِ صبا مسندِ جم نہند

(۶) ناظم خاں فارغانی تمی نے میر کی مدح میں کہا ہے ؎

چو توئے نجابت شاہ بہ قلمرو معانی　　　بہ تو ہیچ کس نماند تو بہ ہیچ کس نمانی

(۷) شیخ ناصر علی سرہندی سے میر صاحب کی ملاقات اورنگ آباد دکن میں ہوئی تھی۔ میر صاحب خود آزاد سے کہتے تھے کہ خوب پر لطف صحبت رہی۔ اور لوگوں کو ممانعت کردی گئی تھی۔ اول وقت سے آدھی رات تک برابر جلسہ قائم رہا۔ ناصر علی نے اس زمانہ میں ایک قصیدہ لامیہ تازہ کہا تھا تشبیب موسم گرما کی توصیف میں تھی اور گریز نعت سرور انبیا علیہ التحیۃ والثنا پر۔ مطلع یہ تھا ؎

گداخت بسکہ ہوائے تموز مغز خیال　　　شرر ز سنگ برآید بصورت تبخال

سارا قصیدہ پڑھکر سنایا اور پوچھا "کوئی شعر پسند آیا؟" میں نے کہا کہ "تمام قصیدہ خوب ہے" پھر کمال بہ جد کہا کہ "اگر کوئی شعر پسند آگیا ہو تو نشان دیجئے"۔ میں نے کہا کہ "ایک شعر" اس کلمہ کو سنکر شیخ کے چہرے پر تغیر ظاہر ہونے لگا میں نے دیکھ لیا۔ کہا کہ "سب جواہر ریزے ہیں اور قیمت و جوہریت کی مرتبہ میں سب مساوی۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی ایک کی آبداری دوسروں سے ممتاز ہو جاتی ہے" یہ بات سنکر انکا رنگ اصلی حال پر آگیا اور پوچھا کہ آخر کون سا شعر اچھا معلوم ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ ؎

ز بسکہ نم بہ زمیں نارسیدہ می سوزد　　　چو شمع بر سر شاخ است ریشہائے نہال

ناصر علی نے تحسین کی اور تسلیم کیا کہ "فی الواقع میں بھی اسی شعر کو اور سب شعروں سے ممتاز سمجھتا ہوں"
میر عبدالجلیل یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے ناصر علی کے دو شعروں میں دخل دیا تھا۔ ایک شعر آزاد کو یاد نہیں رہا۔ دوسرا یہ شعر ہے جو عالمگیر کی مدحیہ مثنوی میں کہا تھا ؎

محی الدین محمد زیب اورنگ　　　فضائے شش جہت بر شوکتش تنگ

میر عبدالجلیل کا اعتراض تھا کہ بادشاہ کا لقب محی الدین ہے۔ یلب افعال سے آیا ہے تشدید نہیں ہے۔ ناصر علی نے اعتراف کیا۔

اسی مثنوی میں ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں لکھا تھا ؎

بفکر لامکان سیر سش ہم آہنگ　　فضائے نُہ فلک بر شوخیش تنگ

میر صاحب نے فرمایا کہ بادشاہ کی اور اُسکے گھوڑے کی تعریف ایک پر واز پر واقع ہوئی ہے اور بادشاہ کی نسبت شوخی ملائمت نہیں رکھتی۔ ناصر علی نے اس شعر کو نکال ڈالا۔ اکثر نسخوں میں یہ شعر پایا نہیں جاتا ہے۔ ایک قدیم نسخہ میں البتہ بعینہ باقی رہ گیا ہے بعض نسخوں میں مصرع یوں بدلدیا ہی

؎ شہنشاہ جہان ہوش و فرہنگ　　مُحیِ الدّین محمد زیب اورنگ

خیال رہے کہ ناصر علی بڑی شہرت و شان اور قدرت و کمال کا شاعر گذرا ہے جو اپنے خیال میں صائب کو بھی کچھ نہ سمجھتا اور اکثر اشعار میں اُسکے ساتھ معارضہ کا داعیہ رکھتا تھا اُسکے ہمعصر بھی اُسکے کمال کو مانتے اور قدر کرتے تھے۔ محمد افضل سرخوش اُس کی نسبت کلمات الشعرا میں لکھتا ہے ؎

در ملک سخن بود جہانگیر علی　　در مشرب دل ولی علی پیر علی

با شعر علی نمی رسد شعر کسے　　زاناں کہ خطا کس بہ خطِ میر علی

(۸) مرزا[۵۷] خاضع، جو مرزا صائب کی صحبت سے مستفیض ہو چکے تھے میر عبدالجلیل سے بڑی قدر و عزت سے ملتے تھے۔ دونوں کی صحبتیں شاعرانہ نکات اور روایات کی بہترین یادگار تھیں۔ خاضع کہتے ہیں کہ یہ دو مصرعے مدت سے میرے گوشزد ہو رہے تھے (۱) از شیشۂ بے مے، مَی بے شیشہ طلب کن؛

[۵۷] اہل لغت کی تحقیق یہ ہے کہ میرزا ایلئے حروف کے ساتھ پیشتر شاہزادوں کے القاب کے لئے مخصوص تھا۔ کچھ زمانہ سے عام طور پر سردار زادگان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایران میں اس کا اطلاق سادات پر ہوتا ہے۔ غالباً اصل میں امیرزا بمعنی امیر زادہ تھا۔ کثرت استعمال سے الف اول حذف ہو گیا۔ حذف تحتانی کے ساتھ مرزا بھی بولا جاتا ہے۔ حاجی مصطفٰے معروف بہ رائے مان (سنہ ۱۲۶۷ء میں) لکھتا ہے۔ مرزا کے معنی شریف زادے کے ہیں مگر ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں اس سے مراد ایسے شریف آدمی سے لیجاتی ہے جو لکھ پڑھ سکتا ہو یہ ایک ایسا وصف ہے جو مسلمانوں میں کم مگر ہندوؤں میں زیادہ پایا جاتا تھا نام سے پہلے اگر یہ لفظ لگایا جائے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نام کے بعد آئے تو ہمیشہ اُس سے مقصود شاہی خاندان کا کوئی فرد یا شاہزادہ ہوگا۔

(۲) دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن وموون۔ ایک روز میں نے مرزا صائب کے روبرو عرض کیا۔ مرزا نے پہلے مصرعہ کے لئے فی البدیہہ فرمایا ع حق راز دل خالی از اندیشہ طلب کن۔ دوسرے کے ساتھ یہ مصرعہ لگایا۔ بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر مراتب ہا[۵۷] ۔ خاضع نے یہ واقعہ میر عبدالجلیل سے نقل کیا تھا اور میر صاحب سے سنکر میر عظمت اللہ نے اپنے "سفینۂ بے خبر" میں درج کیا ہے۔

(۹) میر محمد ہاشم تخلص بہ جرأت مخاطب بہ موسوی خاں پہلے دہارودار[۵۹] کے قلعہ دار تھے۔ پھر امیر الامرا سید حسین علی خاں کے ہمرکاب ہندوستان چلے آئے تھے اور یہاں کے اکثر صاحبانِ کمال مثل مرزا بیدل[۶۰]

---

۵۸ بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را مشہور و زبانزد عالم ہے۔ مگر میر غلام علی نے سرو آزاد میں "مراتب ہا" نقل کیا ہے۔

۵۹ دہارودار، صوبہ بمبئی میں ایک قصبہ کا نام ہے۔ ضلع اور تعلقہ دہارودار اسی پرانے مقام سے موسوم ہے۔ بتفصیل و تاریخ چنداں دلچسپ نہیں۔

۶۰ مرزا عبدالقادر برلاس بیدل تخلص عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں ممتاز اور عدیم النظیر مانے گئے ہیں۔ بہت سے اہل سخن نے انکے اتباع و تقلید کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ زیادہ عمر دہلی میں بسر ہوئی۔ آغاز شباب میں شاہزادہ محمد اعظم خلف عالمگیر کی نوکری کی منصب عالی پایا۔ کسی اتفاق الحال نے مرزا کی سخن سنجی کی تعریف شاہزادے سے کی۔ فرمایا "ہماری شان میں قصیدہ لکھیں ہم بقدر استعداد قدردانی کرینگے" مرزا نے سنا تو قطعاً انکار کیا۔ اسی وقت نوکری چھوڑ کر شاہجہاں آباد چلے آئے۔ بقیہ عمر یہیں ختم کر دی۔ با ایں ہمہ استغنا و بے نیازی شان کمال یہ تھی کہ اواخر عہد عالمگیر سے لیکر اوائل جلوس محمد شاہ تک تمام ارکان سلطنت ان کی خدمتگزاری و آستاں بوسی کو اپنا افتخار سمجھتے اور مراتب نیازمندی بجا لاتے تھے قلیچ خاں آصف جاہ کو انکی شاگردی پر ناز تھا۔ دکن گئے تو بڑی محبت و اعزاز سے لکھکر مرزا کو بلایا۔ جواب ملا ؎

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش　　من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

نواب شکر اللہ خاں مع تمام خاندان کے انکا بڑا معتقد اور قدر شناس تھا۔ امیر الامرا حسین علی خاں سے ربط و رسم خاص تھا لیکن فرخ سیر کے قتل پر جو برہمی و بے لطفی پیدا ہوئی اسکا اظہار مرزا نے اپنی تاریخ "بپا دادیت دیگر گمراہی کرد" میں کر دیا۔ مرزا بڑے بلند پایہ سخن سنج تھے۔ تمامی اصناف سخن، غزل، مثنوی، رباعی، قصیدہ، ہر صنف میں انکا کلام موجود ہے۔ نثر بھی ایک طرز خاص سے نہایت لطیف لکھتے تھے۔ مزاج اور کلام دونوں پر فقر و تصوف کا رنگ غالب تھا

(۱۵) اہل فقر و فضل میں سے سید قاسم اسرار بلگرامی سے میر عبدالجلیل کو بہت عقیدت تھی۔ اُن کے دیوان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "سید قاسم اسرار، صاحب سخن بود۔ گویا پر تو سید قاسم۵۵۲ انوار بر ساحت احوالش تافتہ 'قاسم اسرار گردیدہ'"۔ اسی طرح ان کی نسبت ان کے پیر و مرشد سید تاج الدین حجرہ نشین فرماتے تھے کہ "قاسم اسرار مرآۃ این ملک است"۔ مرشد کی رحلت کے بعد اُن کے ایما کے موافق سید قاسم شمس۵۵۳ آباد (ضلع فرخ آباد) چلے آئے جس جائے بلند کا پتہ دیا تھا وہاں اقامت گزیں ہوئے۔ دو تین مہینے بھی نہ گزرے ہونگے کہ کسی دولت مند کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے عالی ہمتی سے مسجد و خانقاہ و چاہ و روضہ و باغ وہاں بنوا دیا اور رقم خرچ مقرر کر دی۔

(۱۶) سید محمد اشرف، معروف بہ سید۵۵۴ درگاہی، مشہور عالم و صوفی تھے۔ ان کا طریقہ بالکل سلف

---

۵۵۲ قاسم انوار، سید معین الدین علی کا لقب تھا۔ شیخ صدر الدین موسیٰ اردبیلی کے سلسلہ میں تھے۔ تبریز میں پیدا ہوئے۔ آذربیجان اپنے وطن اصلی سے جیلان، وہاں سے ہرات چلے آئے۔ علوم ظاہری و مدارج معنوی کی تکمیل یہیں فرمائی۔ رؤسا و اشراف کی ایک بڑی جماعت مرید و معتقد تھی۔ لوگوں کی سعایت و بدگوئی سے سنہ ۸۳۰ھ (۲۷-۱۴۲۶ء) میں شاہرخ مرزا نے ان کے اخراج کا حکم دیا۔ تعمیل بدکنار، یہ بھی کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ حکم آپ تک پہونچا دے۔ شاہزادہ بایسنغر بحیلۂ زیارت حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں آپ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اے عاشقاں! اے عاشقاں!! ہنگام آنشد کز جہاں ۔۔۔ مرغ دلم طیراں کند بالائے ہفتم آسماں

پھر اسی سلسلۂ کلام میں محل مناسب سے آپ کو آپ کا ارشاد یاد دلایا ؎

قاسم سخن کوتاہ کن، برخیز و عزم راہ کن ۔۔۔ شکر بر طوطی فگن، مُردار پیش کرگساں

سید صاحب دعا و تحسین فرماتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے سمرقند گئے پھر شہر جام، جو متصل ہرات ہے، چلے آئے۔ بقیہ عمر یہیں طے کی۔ اسی شہر کے محلہ خرجرد میں سنہ ۸۳۵ھ (۱۴۳۱ء) میں رحلت فرمائی۔ بعض مورخین مثل صاحب تاریخ حبیب السیر آپ کا سنہ ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں خراسان میں وفات پانا لکھتے ہیں۔ مثنوی انیس العاشقین آپ کی تصنیف ہے۔

۵۵۳ شمس آباد (اب ضلع فرخ آباد میں) ایک قدیم و مشہور قصبہ، دریائے گنگ کی پرانی اور بلند پہاڑیوں پر واقع ہے۔ طول البلد ۲۷ درجہ ۳۲ دقیقہ شمالاً اور عرض البلد ۷۹ درجہ ۲۸ دقیقہ شرقاً ہوگا۔ فتح گڑھ (ضلع کے صدر مقام) سے اس کا فاصلہ اٹھارہ میل سمت شمال و مغرب ہے۔ ۲۲ محلے ہیں۔ مردم شماری سنہ ۱۹۰۱ء میں ۸۳۷۵ تھی لیکن بیس برس کے زمانہ (سنہ ۱۹۲۱ء) میں ۶۹۹۵ رہ گئی۔ قصبہ روز بروز شکستہ حال و تباہ ہوتا جاتا ہے۔ پختہ مکانات اور شاندار عمارات اسکی گزشتہ عظمت و عروج کی دلیل ہیں۔ عز آباد حصول میں کاشت

صالحین کا تھا ماثر الکرام میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ سید میر عبد الجلیل کے یاران خاص میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میری تحصیل علم کا باعث میر عبد الجلیل ہوئے تھے میں پابند و متاہل ہو چکا تھا کہ کسب علم کی ترغیب دی میں نے عذر کیا کہ اب مرحلہ شباب میں قدم رکھ چکا ہوں اس کا حاصل کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اصرار کیا اور فرمایا کہ ضرور بالضرور نفع ہوگا مختصرات کو خود پڑھایا۔ باقی کتابیں اور علوم دیگر علماء و اساتذہ سے پڑھیں۔

(۱۷) سید محمد باقر بلگرامی نے ابتداءً علوم متداولہ مقامی علماء و مشاہیر فضلاء سے حاصل کئے تھے۔ خود بڑے جید فاضل اور طباع تھے۔ فن لغت عربی میں لانہایت خوض فرماتے آخر میں میر عبد الجلیل کی صحبت میں پہونچے اور خوب استفادہ کیا اور ہر فن میں دستگاہ کامل بہم پہونچائی۔ خط نہایت شیریں اور دل پسند ہو گیا تھا۔ بالکل میر کے خط کی روش اور شان تھی۔

ہونے لگی ہے۔ بلندی پر سے دیکھنے سے زراعت کے دلفریب قطعات اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ زار ہر طرف نظر آتے ہیں۔

پرانا شہر کھور ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر گنگا کی پہاڑی پر آباد تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک راٹھور راجہ نے جسکا نام زیادہ تر پرتھن پال بتایا جاتا ہے اور کبھی کبھی جے سنگھ دیو، اور جو مشہور و معروف جے چند راٹھور کی نسل سے تھا اسکی بنیاد ڈالی تھی۔ اسوقت سے لیکر اکبر بادشاہ کے عہد تک دریا اسی پہاڑی کے نیچے بہتا رہا ہے۔ ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) کے قریب شمس الدین التمش جہازوں کا بیڑہ لیکر یہاں آیا اور بحری حملہ کر کے راٹھوروں کو مغلوب کیا۔ موجودہ قصبہ سے دو میل پورب کو شمس آباد کی بنیاد ڈالی ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں شہنشاہ محمد تغلق بھی یہاں ہو کر گزرا تھا ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں راٹھوروں کی تنبیہ و تادیب کے لئے شہنشاہ سید خضر خاں کو بھی آنا پڑا تھا۔ سلطنت شرقیہ جونپور کی تواریخ و واقعات میں بھی شمس آباد کا نام بارہا آیا ہے ملک بہلول لودی بادشاہ دہلی کے ہاتھ سے جب اس سلطنت کا قلع و قمع ہوا تو ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں کھور کے خاندان کا بھی قطعی فیصلہ ہو گیا۔ ۹۰۱ و ۹۰۲ھ (۱۴۹۴ و ۱۴۹۵ء) میں سکندر لودی نے بھی کچھ زمانہ یہاں بسر کیا تھا۔ موضع سکندر پور اسی قیام کی یادگار ہے۔ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں یہ قصبہ اور پرگنہ اس نے عماد خاں و سلیمان خاں، افاغنہ فرملی کو دیا تھا۔ بابر نے اولاً بہ نظر الیتام ۹۳۵ھ (۱۵۲۸ء) میں اسکو راجہ چند بیر کو دینا چاہا تھا مگر بعد ازاں اسی سال پھر ماجیت سسودیہ کے حوالہ کر دیا، جس نے رن تھمبور سا حصن حصین دے کر اس کے عوض میں شمس آباد لیا تھا اس سے پیشتر پٹھانوں نے

(۱۸) حاجی عفت اللہ خیر آبادی جو اجلہ مشائخ وصنادید فضلاء سے تھے، ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰-۲۱ء) میں وارد بلگرام ہوئے تو اپنے مرتبہ اور علو شان اور جماعت معتقدین و مسترشدین کی تعظیم و تکریم کا کچھ خیال نہ فرمایا بلکہ میر عبد الجلیل سے ملنے کے لئے خود اُنکے دیوان خانہ پر تشریف لائے۔ اور بہت سے خواہشمندوں کو اپنے جمال باکمال اور مقال فیض اشتمال سے مشرف فرما گئے۔

(۱۹) ارباب دولت وحشمت میں سے حاجی سید حسین صفاہانی متخلص بہ خالص و مخاطب بہ امتیاز خاں، دیوان صوبۂ عظیم آباد پٹنہ خاصکر قابل ذکر و اعتنا رہے۔ جیساکہ ایک موقع پر تحریر ہو چکا ہے شاہ عالم کے عہد میں اُس نے اپنے وطن (ایران) کا عزم کیا۔ شہر بھکر میں پہونچا۔ میر عبد الجلیل سے ملاقات ہوئی خود بڑا سخن سنج و سخن فہم امیر تھا۔ میر سے بڑی پر لطف صحبتیں رہیں۔ امتیاز خاں اپنے ساتھ کثیر مال ومتاع اور لاکھوں روپیہ نقد اور جواہر بیش بہا و پارچہ لیکر جا رہا تھا۔

شاہی گورنر ابو المحمد نیزہ باز سے شمس آباد چھین لیا تھا اور ۹۰۳ھ (۱۴۹۷-۹۸ء) میں ایک اور صوبہ دار حسین خاں ٹکریہ کو رخصت کر چکے تھے

کھور اور اُسکے راجگان کے رفیع ومنیع وزر کا نام ونشان صرف ایک بلند ٹیلہ سے قائم ہے جو کوٹ کہلاتا ہے اراضی نشیبی کی سطح سے اسکا ارتفاع تیس فٹ ہوگا۔ پرانے شہر کے نام سے انتساب کرنیوالی، قنوجیہ برہمنوں کی ایک جماعت باقی ہے جو اپنے کو کھور کا پانڈے کہتے اور اُس پر فخر کرتے ہیں۔

موجودہ قصبہ کی بنیاد ۹۹۷ھ (۱۵۸۸-۸۹ء) میں مرزا طاہر نے ڈالی تھی۔ آئین اکبری میں اسکا تذکرہ بہ ذیل سرکار قنوج ان الفاظ میں ہے "شمس آباد۔ قلعہ وار دبر کنار آب گنگ" اپنی پریشانی و سرگردانی کے ایام میں مشہور مورخ شیخ عبد القادر بدایونی بھی کچھ روز یہاں پناہ گیر اقامت گزیں رہے ہے بدایوں کا عام راستہ اُسوقت شمس آباد ہو کر تھا۔

آثار قدیمہ میں، قلعہ کے کھنڈرے یعنی کوت پر، سب سے پرانی تعمیر جامع مسجد ہے۔ بالائے محراب ایک پتھر پر اُبھرے ہوئے حروف میں یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے ؎

دیں پرورِ محمد خانِ بلند رتبت ، گردا ست گوئے دولت باصولجان احساں
وار دچو ذوق طاعت آں محسن زمانہ ، ترتیب داد مسجد از عون و لطف یزداں
تاریخ آں رضائی جست از خرد۔ بگفتا ، شد خانۂ الہی تاریخ مسجد خاں
(۹۲۰ھ ۱۵۱۴ء)

اسی کے قریب سید سالم کا مزار ہے جو یہاں کے اکثر سادات قبائی کے مورث اعلیٰ ہیں۔ میر عزیز اللہ کی کی درگاہ پورب کو ہے نیز اردو تیرا کاٹ یہ بڑے مرتاض اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ کھور کی شکست اور

میر صاحب کو اطلاع تھی کہ خدا یار خاں والی سندھ اس دولت و سامان کو بڑے حسد و حرص سے دیکھ رہا ہے۔ میر نے امتیاز خاں کو آگے بڑھنے سے رُوکا اور وہیں سے واپس جانیکا مشورہ دیا اور اصرار کیا لیکن وہ کب سننے والا تھا۔ جولانگاہِ قاتل کی طرف سرنگیف روانہ ہوا سیوستان پہونچا تو میر محمد اشرف (میر عبد الجلیل کے داماد) وہاں نائب خدمت تھے اُنہوں نے کمال گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی حویلی میں فروکش رکھا۔ خدا یار خاں نے کسی تقریب یا حیلہ سے محمد اشرف کو خدا آباد بلا یا اور اپنے آدمیوں کو بھیجکر امتیاز خاں کا کام تمام کرا دیا۔ میر نے "آہ آہ۔ امتیاز خاں" ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) تاریخ نکالی۔ امتیاز خاں میر کے کمالات اور تبحر کا نہایت دلدادہ تھا اور بیحد توصیف کرتا اور معتقدانہ

شمس الدین کی فتح آپ ہی کی برکت و دعا سے منسوب کیجاتی ہے۔ جانب[57] غرب جھوٹا کھار نالے پر نواب جعفری بیگم رئیسہ مرحومہ کا تعمیر کردہ پختہ پل ہے، جسکے قریب ایک ولی اللہ حسین شاہ زندہ دوست کا مقبرہ ہے جو ایک صاحب کمال درویش تھے۔

شمس آباد کی شہرت و ناموری حقیقتاً پون صدی سے یہاں کے نواب صاحبان کے دامن دولت سے وابستہ ہے۔ اپنے باپ اعتماد الدولہ ضیاء الملک نواب سید فضل علی خاں سہراب جنگ وزیر اودھ کی وفات کے بعد نواب جعفری بیگم صاحبہ اور اُنکے شوہر نامدار سید محمد علی خاں عرف نواب دولہ صاحب نے ۱۸۳۵ء میں یہاں قیام اختیار فرمایا تھا۔ بیگم صاحبہ کے اجداد سادات بارھہ سے تھے۔ باپ کی طرف سے یہ عشیرۂ عالیہ موسوی سید (امام ہفتم سید ناموسی کاظم علیہ السلام کی نسل محترم)، شاہ صفی اردبیلی کی اولاد سے ہے جو ایران کے ملوک صفوی کے دادا تھے۔ "این خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق یہی دودماں محتشم ہے، جسکے ممتاز ارکان باہمہ ایالت و حکومت، امارت و دولت کریم الاخلاق، پیکر خلوص و وفا زیور علم و کمال سے آراستہ، نہایت روشن خیال سراپا تہذیب و شائستہ اولوالعزم ہیں قصبہ اور اُسکے اطراف میں عظیم الشان مساجد اور امام باڑے، محلات، کوٹھیاں تعمیر کرائی ہیں اور ہر طرح کی ترقی و رونق دی ہے ؎

للہ قوم اذا حلوا بمنزلۃ حل الرضا و لسیر الجود ان ساروا

۵۴ ولادت ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء)۔ وفات صفر ۱۱۶۵ھ (دسمبر ۱۷۵۱ء)

۵۵ ساٹھ برس کی عمر میں ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں رحلت فرمائی

۵۶ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں انتقال کیا۔ سن مبارک اسی سال تھا۔

۵۷ خدا آباد۔ یہ ویران قصبہ تعلقہ دادو ضلع لاڑکانہ ملک سندھ صوبہ بمبئی میں سیوان سے سولہ میل بہ شمال و مشرق کے سمت ریل کی سڑک پر واقع ہے تھارنٹن صاحب نے اسکی نسبت ۱۸۴۰ء میں لکھا تھا

ملتا تھا۔ اپنے دیوان کا ایک انتخاب بھی پیش کیا تھا۔

(۲۰) مرزا احمد یار خاں برلاس متخلص بہ یکتا عالمگیر کے عہد میں صوبہ دار ٹھٹھ [شہ] تھا اور بہت سے کمالات و فضائل کا جامع خط نہایت پاکیزہ و پختہ لکھتا۔ تصویر بکمال نفیس و تحفہ بناتا۔ ہر قسم کے شعر نہایت خوب کہتا محمد عاقل خاں یکتا لاہوری کے ساتھ اُسکا مقابلہ اور اہل فن کا احمد یار کے حق میں فیصلہ مشہور ہے۔ سنہ ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں وارد بھکر ہوا تو میر عبدالجلیل کی صحبت میں معتقدانہ حاضر رہا۔ اپنے قلم کا خط نسخ میں لکھا ہوا کلام اللہ کا ایک نسخہ بطریق یادگار حوالہ کیا تھا۔ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۷۳۴ء کو قصبہ خوشاب اعمال لاہور میں وفات پائی۔

(۲۱) سید قریش بلگرامی متخلص بہ عجیب میر عبدالجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ خوش خلق و

تیس سال سے کچھ زائد گزرا کہ وسعت اور آبادی میں حیدر آباد سندھ کا مقابلہ کرتا تھا۔ نہایت سرسبز و بارونق تھا مگر آج اس قصبہ میں ایک گھر بھی ایسا باقی نہیں ہے جو آباد ہو۔ یہ سندھ کے تال پوری امیروں کا نہایت دلپسند مسکن تھا۔ اُن سرداروں میں سے اکثر اب اُن مقبروں میں استراحت گزیں ہیں جنکی سادہ اور ستھری تعمیر بنوانے والوں کے حُسن انتخاب اور سلامت ذوق کی یادگار ہے یہاں کے مخصوص اور دلچسپ مقامات میں سے فی الحال ایک پرانی مسجد باقی ہے جو ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں تعمیر ہوئی تھی اور جسپر نہایت خوشنما چینی کا کام ہے۔ دوسرا یار محمد کلہورہ کا مقبرہ ہے جو ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اسکی تزئین بھی ویسی ہی رنگین پتھروں سے کی گئی ہے۔ مقبرہ تو ابھی اچھی خاصی حالت میں ہے لیکن مسجد کو بہت نقصان پہونچ چکا ہے اور ویران و شکستہ حال ہے۔ یہاں کی زبان سندھی ہے۔

شیخ حزیں اپنی رویداد سفر میں لکھتے ہیں کہ نواحی تتہ (ٹھٹھہ) سے حیدرآباد تک ایک رودخانہ (نہر سا) بنا ہوا ہے اور مسافت بھی چند روز کی ہے۔ یہ بھی کشتی پر آئے تھے۔ سارا راستہ نہایت لطف و تفریح کیساتھ طے ہوا تھا لیکن حیدرآباد پہونچکر سات مہینے پڑے رہے۔ گرمی کی شدت اور ہوا کی خرابی سے مختلف امراض صعب میں گرفتار ہوگئے تھے

واضح ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جماعت ڈائرکٹران کے حکم سے کپتان تھارنٹن نے یہ گزیٹیر مرتب کیا تھا جو لندن میں ۱۸۴۴ء میں دو جلدوں میں شائع کیا گیا A Gazetteer by Cap. E. Thornton R.N.

ٹھٹھہ (یا ٹھاٹو جسکو باشندگان زیادہ تر نگر ٹھٹھا کہتے ہیں) ضلع کراچی ملک سندھ میں ایک قصبہ اور ایک تعلقہ کا صدر مقام رہ گیا ہے۔ دریائے سندھ یہاں سے سات میل پر ہوگا۔ عہد عالمگیر میں ٹھٹھہ ایک زرخیز صوبہ تھا جسکے متعلق چار سرکاریں ستاون محال اور پانچ بندرگاہ تھے۔ اور ٹھٹھہ یا دیبل شہر عظیم مانا گیا تھا۔ نمک و آہن کی معادن یہاں نہیں۔

یہ قصبہ مکلی Makli پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے کسیوقت دریائے سندھ کا پانی اسکی ہر طرف موج زن تھا اب بھی جب طغیانی فرو ہوکر پانی نکل جاتا ہے تو جا بجا تالاب اور گڈھے بھرے رہ جاتے ہیں۔ آب و ہوا سخت تکلیف دہ اور سردی ناسازگار ہے۔ بخار شدید پھیلا رہتا ہے۔ ریل اسٹیشن سے تیرہ میل کا فاصلہ ہے پتھر کیں

ظریف تھے۔ سلیقۂ نظم خوب حاصل تھا میر صاحب کی مدح میں کہتے ہیں ؎

گل ہماں بہ کہ ز گلزار پیمبر باشد — دُر ہماں بہ کہ ز میخانۂ کوثر باشد
گوہر آں نیست کہ از نطفۂ نیساں زاید — گوہر آن است کہ از معدنِ حیدر باشد
اے خوشا تازہ نہالے کہ بہ بستان شرف — دست پرور دۂ زہرائے مطہر باشد
آنکہ از جبہۂ او نور سیادت پیداست — عالم افروز تر از نیر اکبر باشد
ور ز مینے کہ بخند و گلِ خلقِ حسنش — برکفِ خاک بخاصیت عنبر باشد
چشم بد دور ز سیمائے حسینی نسبی — چمن آرائے جہاں ایں گل احمر باشد
مدح او را نتواں در قلم آورد عجیب — زانکہ از حوصلۂ خامہ فزوں تر باشد

پختہ کردی گئی ہیں۔

ٹھٹہ کی تاریخ نہایت دلچسپ و قدیم ہے۔ حالات زیادہ تر تاریخ[1] حاجی محمد قندہاری دخلاصۃ[2] احکام و محبت[3] نامہ میں ملتے ہیں۔ اوڈرم صاحب لکھتے ہیں کہ اسکی بنیاد ۱۴۴۵ء (۸۴۹ھ) میں پڑی تھی۔ دیگر مورخین ۱۵۲۲ء (۹۲۸ھ) بتاتے ہیں۔ اجماع روایات اسی قدر ہے کہ جام نظام الدین عرف جام نندا جو سما کے شاہی خاندان سے تھا اسکا بانی تھا ٹھٹہ جب سما سلاطین کا دار السلطنۃ تھا تو یہاں کا فرمانروا جام کہلاتا تھا) پوسٹنس Postans راوی ہے کہ ۱۵۵۵ء (۹۶۲ھ) میں زردوست پرتگالی اجورہ داروں نے ٹھٹہ پر حملہ کیا اور غارت کر ڈالا تھا ۱۵۹۲ء (۱۰۰۱ھ) میں جب اکبر نے سندھ کو اپنے قلمرو میں داخل کیا تو اُسوقت یہاں کا والی مرزا جانی بیگ تھا آزاد دہلوی دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ تیموری خاندان کے باغی شاہزادے مرزا کہلاتے تھے) بادشاہ نے ٹھٹہ بطور جاگیر اُسکو واگذار کر دیا ۱۷۳۹ء (۱۱۵۲ھ) میں نادرشاہ بادشاہ ایران کے حوالہ ہوا۔ پھر کلھوڑ خاندان میں آیا وہاں سے تال پور کے میر صاحبان کے یہاں پہونچا۔

الیگزینڈر ہیملٹن ۱۶۹۹ء (۱۱۱۱ھ) میں یہاں سے گزرا تھا وہ اسکو ایک عظیم اور دولتمند شہر بتاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ اُسکے پہونچنے سے کچھ پہلے ٹھٹہ میں اسّی ہزار نفوس طاعون سے ہلاک ہو چکے تھے۔

ایک دوسرا یورپین سیاح پاٹنجر Pottinger لکھتا ہے کہ جب نادرشاہ اپنی فوج لیکر ۱۷۴۲ء (۱۱۵۵ھ) میں یہاں داخل ہوا تھا تو چالیس ہزار پارچہ باف بیس[2] ہزار صناع اور دستکار اور ساٹھہ ہزار دیگر تاجر اور اہل حرفہ یہاں بستے تھے

ٹھٹہ کی آبادی اٹھارہویں صدی مسیحی میں بہت گھٹ گئی کپتان جے وڈ J. Wood نے جب ۱۸۳۷ء میں دیکھا ہے تو اُسکے تخمینہ میں دس ہزار سے زائد تھی۔

بحالت موجودہ ٹھٹہ کی مردم شماری ساڑھے آٹھہ ہزار کے قریب ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۵۸ء (۱۱۷۱ھ) میں یہاں ایک کوٹھی کھولی تھی جو ۱۷۷۵ء (۱۱۸۹ھ) میں بند کردی۔ ریشم اور روئی کے منسوجات اور بعض دیگر مصنوعات اور غلہ کی تجارت اب بھی کسیقدر باقی ہے۔

اُمرا و سلاطین

عہد اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر عصر محمد شاہ بادشاہ تک تمام اُمرائے عظام میر عبدالجلیل کا بڑا اعزاز واحترام فرماتے اور صحبت والا کے تشنہ وتمنی رہتے۔ حسین علی امیر الامرا کو بالخصوص کمال اُلفت تھی۔ اپنی مجلس میں برملا کہا کرتے تھے کہ میر عبدالجلیل در ہیں عصر نظیر ندارند اور لوازم احترام فوق الحد بجالاتے تھے۔ میر صاحب نے بھی دل کھول کر اُنکی مدحت سرائی فرمائی ہے اور اُنکا نام دنیائے علم میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ میر صاحب کے قصائد ومراثی جو امیر الامرا کی شان میں ہیں دونوں کے مراسم وارتباط اور مخلصانہ تعلقات کے شاہد ہیں۔

ایک موقع پر میر عبدالجلیل امیر خسرو سے اپنا تشابہ (مثنوی طوے فرخ سیر بادشاہ کے فخر یہ میں)

عہد اسلامی کی یادگار قلعہ کے اندر ایک مسجد جامع ہے جو شاہجہاں کے حکم سے ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں تعمیر ہوئی تھی شاہجہاں جب اپنے باپ جہانگیر کے پاس سے بھاگ کر یہاں آیا تھا تو ٹھٹہ والوں نے اُسکی شایان شان عزت و توقیر کی تھی وہ بے ہراس یہاں کی قدیم جامع مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا تھا۔ اسی حسن سلوک کی یادگار میں تاج وتخت پانے کے بعد شاہجہاں نے یہ خوشنما اور نفیس مسجد تیار کرادی تھی۔ مسجد بہت مرمت طلب ہوگئی تھی مگر کچھ عرصہ ہوا کہ عوام کے چندے اور سرکاری امداد سے کافی درستی کرادی گئی ہے۔ شہر کے جنوب میں دیگر مسجد Dabyar Mosque بہت پُرانی ۹۱۵ھ (۱۵۰۹ء) کی تعمیر ہے اس پر نہایت عمدہ چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ ٹھٹہ کا قلعہ بعہد اورنگ زیب ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں زیر اہتمام نواب حفیظ اللہ خاں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ تکمیل کی نوبت نہیں پہونچی۔ اب تو لوگوں نے بنیادیں تک کھود لیں اور اینٹ اور مصالح دوسری عمارات میں لگا دیا ہے۔

مسلمانوں کے زمانہ میں ٹھٹہ کا نام برہمن آباد تھا۔

کپتان ہملٹن (جسکا نام ابھی لے چکا ہوں) ایک نامور عالم سیاح اور تاجر تھا۔ وہ ہندوستان میں عہد اورنگ زیب میں آیا تھا۔ اس نے پچیس ۲۵ سال کے قریب اس ملک میں گزارے تھے۔ اپنا مکمل سفرنامہ تحریر کیا تھا۔ اُس میں شہر ٹھٹہ اور سورت کے حالات، مسلمانوں کی حکومت اور انکی مذہبی رواداری اور مختلف اقوام کے مراسم و دستورات کو بخوبی و بہ تفصیل لکھا ہے۔ وہ ایک موقع پر لکھتا ہے کہ سندہ کا شہر تٹہ (ٹھٹہ) دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے نہروں اور موریوں کے ذریعہ سے دریا سے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

شیخ علی حزیں بھی ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں ٹھٹہ آئے تھے۔ دو ماہ قیام کیا تھا۔ اپنے سوانح حیات میں شہر کی بڑی تعریف کی ہے اور یہاں کے تاجروں کی کمال تحسین۔

ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں سہ

چناں کردم سخن در نغمہ انشاد　　　کہ روح میر خسرو گشت زو شاد

... ...　　　... ... ...

اگرچہ میر خسرو بود اوستاد　　　ندارد چرخ چوں او دیگرے یاد

بفکر دور دو پرواز دارد　　　نبی نبود ولے اعجاز دارد

در انواع سخن کاندر جہان است　　　بقدرت خسرو صاحب قران است

ولے من ہم ازیں گلدستۂ نو　　　دریں عصرم بجائے میر خسرو

کمال از ہر نمط دل خواہ دارم　　　امید تربیت از شاہ دارم

... ...　　　... ... ...

صلہ گر داد خسرو را خضر خاں　　　بہ نظم مثنوی گنج فراواں

شہِ ما چشمۂ آب حیات است　　　کہ صد چوں خضر خاں راز و برات است

واقعہ بھی یہی ہے کہ امیر کے ساتھ میر کا تشابہ جامعیت علم و عمل کی راہ سے تھا اور ارباب دول کی مصاحبت سے بھی۔ آغاز سے انجام تک امیر نے بادشاہان دہلی کے ساتھ بسر کی اور بقول اُن کے سات بادشاہوں کی خدمت کی تھی۔ طرفہ یہ ہے کہ میر بھی سلاطین تیموریہ (دہلی) میں سے سات بادشاہوں[۵۹]

[۵۹] موجودہ نصاب تعلیم کی بدولت، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے حالات، واقعات اور کارنامے کسی تفصیل کے محتاج نہیں بالخصوص خاندان تیموریہ کے آخر زمانہ کی تاریخ تو کافی و وافی شہرت رکھتی ہے اس لئے زمانہ کا تعین کرنے اور اُس کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

نمبر	نام	ازبطن	ولادت	تخت نشینی	وفات و مدفن	لقب بعد وفات
۱	ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بن شاہجہان بادشاہ	ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل	۱۱۔ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ شب یکشنبہ مطابق ۱۰۔ اکتوبر ۱۶۱۹ء قدیم	۹ رمضان ۱۰۶۸ھ کو عالمگیر سلطنت ہوا جلوس فرخجستہ غرہ ذیقعدہ سال مذکور مطابق ۲ اگست ۱۶۵۸ء جشن	جمعہ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء قدیم و ۳ مارچ ۱۷۰۷ء جدید مقام احمد نگر دکن مدفن روضہ شاہ زین الدین واقع خلد آباد اورنگ آباد	خلد مکان

کے لوازم خدمت بجالائے تھے یعنی (۱) عالمگیر اورنگ زیب (۲) شاہ عالم بہادر شاہ (۳) محمد معز الدین جہاندار

نمبر	نام	از بطن	ولادت	تخت نشینی	وفات و مدفن	لقب بعد وفات
۲	قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر شاہ (شاہزادہ محمد معظم) خلف دوم عالمگیر بادشاہ	نواب بائی (ہندو رانی)	۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء برہان پور دکن	دوشنبہ ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷ جون ۱۷۰۷ء آگرہ۔ شمار جلوس از ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ	دوشنبہ ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۷۱۲ء دہلی قطب صاحب	خلد منزل
۳	محمد معز الدین جہاندار شاہ فرزند بہادر شاہ (محمد معظم)	نظام بائی	۱۰ رمضان ۱۰۷۳ھ چہار شنبہ مطابق ۱۰ اپریل ۱۶۶۳ء دکن میں	آخر صفر یا ۱۴ ربیع الاول ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۷۱۲ء سہ شنبہ لاہور شمار از ۱۰ محرم ۱۱۲۴ھ	۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ کو یعنی آخر دسمبر ۱۷۱۲ء یا شروع جنوری ۱۷۱۳ء میں قتل ہوا	+
۴	معین الدین محمد فرخ سیر پسر عظیم الشان ابن شاہ عالم	صاحبہ نسواں	۱۸ رمضان ۱۰۹۴ھ مطابق ۱۸ جولائی ۱۶۸۳ء	۱۷ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ اکبرآباد جلوس جمعہ ۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۹ جنوری ۱۷۱۳ء قلعہ دہلی	۱۸ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۷۱۹ء یا ۹ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۷۱۹ء کو قتل کیا گیا دہلی مقبرہ ہمایوں	شاہ شہید ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷/۱۸ فروری ۱۷۱۹ء کو گرفتار و محبوس ہوا۔ اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو فرمان آزادی تجارت ملا تھا
۵	شمس الدین محمد ابو البرکات بادشاہ رفیع الدرجات پسر شاہزادہ رفیع الشان بن شاہ عالم	نور النسا	....	۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء دہلی	۹ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۷۱۹ء دہلی، قطب صاحب	راجہ جیت سنگھ و رتن چند کے کہنے سے ہندوؤں کی استمالت کے لیے جزیہ اٹھا دیا تھا
۶	شمس الدین رفیع الدولہ محمد شاہ جہاں ثانی برادر کلاں رفیع الدرجات	ایضاً	....	۱۹/۲۰ رجب المرجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۷۱۹ء	۷ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۷۱۹ء دہلی قطب صاحب	×

شاہ۔ (۴) محمد فرخ سیر (۵) رفیع الدرجات (۶) شاہجہاں ثانی (۷) محمد شاہ۔ رفیع الدرجات اور شاہجہاں ثانی برائے چندے سریر آرائے فرمانروائی رہے تھے، غارتگر اجل نے اُنکو زیادہ فرصت و مہلت نہیں دی تھی۔ تاہم میر نے شاہجہاں ثانی کی شان میں ایک زبردست قصیدۂ میمیہ لکھا تھا۔

جب میر عبدالجلیل محض طالب علم تھے اور اُن کو سید طفیل محمد کے ساتھ اکبرآباد جانیکا اتفاق ہوا تو نواب فضائل خاں کے یہاں بڑے بڑے علمی جلسے دیکھے۔ جماعت فضلاء کی اکثر نشست ہوتی تفسیر و حدیث و کلام اللہ کا مذاکرہ ہوتا، ہر قسم کی چھیڑ چھاڑ رہتی۔ میر صاحب کو یہاں بھی بلند جگہ ملتی۔ وہ اپنی استعداد و قابلیت، یادداشت و جودت و ذہانت کی بدولت اکثر فائق و برتر رہتے۔

نواب آصف جاہ

نواب نظام الملک آصف جاہ طاب ثراہ کی نسبت میر غلام علی بلگرامی سرو آزاد میں لکھتے ہیں کہ

"بر واقفان اسرار سلف ہویداست کہ در طبقۂ سلاطین تیموریہ و طبقات پیشیں امیرے بایں اقتدار چشم روزگار کم مشاہدہ کرد۔ قریب سی سال بایالت ممالک دکن پرداخت و قلمروے کہ زیر فرمان چندیں سلاطین ذوی الاقتدار بود تنہا در تصرف داشت و فتوحاتے کہ کارنامۂ روزگار باشد بجلوہ آمد و مستحقین را بہ خیرات و مبرّات فراواں نواخت۔ از دفتر صدارت تحقیق نمودہ شد کہ سہ لکھ روپیہ بدستخط او سوائے انعامات بادشاہی در صوبجات دکن بطریق یومیہ و ماہانہ بہ ارباب استحقاق می رسید وسوائے این قریب یک لکھ روپیہ بمردم رجوع رد و غیرہم رعایت می فرمود"

۷ - ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ بادشاہ معروف بہ سلطان روشن اختر پسر جہان شاہ خجستہ اختر فرزند بہادر شاہ	نواب قدسیہ بیگم	۲۳ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ شب جمعہ مطابق ۷ اگست ۱۷۰۲ء نواحی غزنیں	۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء اکبرآباد	۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ شب پنجشنبہ مطابق ۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء [illegible] دہلی نظام الدین اولیاء	فردوس آرامگاہ

سادات و علماء و مشائخ دیار عرب و ماوراءالنہر و خراسان و عراق عجم و ہندوستان آوازۂ قدردانی استماع یافتہ رو بہ دکن آوردند۔ و در خور قسمت حظے از احسان عام اندوختند۔"

نواب کے احوال ذاتی کے بیان سے پہلے اُن کے خاندان عالی اور آباء عظام اور بزرگان تمام کی نسبت گزارش کرنا ضروری ہے۔

صاحبقران ثانی (شاہ جہاں) کا وزیر اعظم سعد اللہ خاں، ان کا نانا (جد مادری) تھا۔ دادا کا نام عابد خاں تھا۔ پردادا شیخ عالم، اکابر رؤسا سمرقند اور شیخ شہاب الدین سُہروردی کی اولاد سے تھے۔ عابد خاں عہد شاہجہاں میں ہندوستان چلے آئے۔ یہاں ہو کر بادشاہ کی روشناسی اور شاہزادۂ اورنگ زیب کی خدمت و ملازمت سے شرف و افتخار حاصل کیا۔ جب اورنگ زیب اور اُسکے بھائیوں سے محاربہ ہو رہا تھا یہ ملتزم رکاب تھے۔ اورنگ زیب، زیب دہ اورنگ ہوا تو ان کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔ جلوس کے چوتھے سال میں صدارت کل کی خدمت پر سرفراز ہوئے۔ بعد ازاں پنج ہزاری منصب اور قلیچ خاں خطاب پایا۔ اعزاز و افتخار بڑھا۔ صدارت سے ایکبار علحدہ ہو کر وہی عزت دوبارہ پائی۔ رعایا و برایا کو دفور عدل و احسان سے شادکام و خوشدل بنادیا اور مہاد امن و اماں بچھادیا۔ ؎

آرام یافت در کنف عدل وحش و طیر   و آسودہ گشت در حرم امن انس و جاں

قلعۂ گلکنڈہ (حیدرآباد) کے محاصرہ میں ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۲۰ جنوری ۱۶۸۷ء) کو توپ کا گولہ لگا۔ زخم کھایا اور جان عزیز اپنے شہریار اور اُسکی شہریاری پر نثار کردی۔

الولد سر لابیہ۔ عابد خاں کے فرزند میر شہاب الدین نے بڑے بڑے مرتبے پائے۔ سات ہزاری منصب سات ہزار سوار اور "غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ" خطاب مرحمت ہوا۔ بیجاپور کی فتح میں اس شیر دل نے بڑی شجاعت اور مردانہ ہمت سے کام لیا تو "فرزند ارجمند" کا طرہ القاب سابق پر اضافہ ہوا۔ شاہ عالم کے عہد میں صوبہ داری گجرات پر مامور ہوئے اور اسی زمانہ حکمرانی گجرات ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں عالم آب و گل کو خیرباد کہا۔

نواب نظام الملک آصف جاہ نواب غازی الدین خاں کے خلف الرشید تھے۔ اصلی نام میر قمرالدین

اور سال ولادت ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) تھا آغاز شباب میں اس جوہر قابل پر خلد مکاں کی نظر پڑی تو چار ہزاری منصب اور چین قلیچ خاں خطاب سے سرفراز فرمایا۔ واکنکیرہ کے قلعہ کی تسخیر میں کمال استقامت وجوانمردی اور خوش نظمی دکھائی تو ہزاری اضافہ ہوکر پنج ہزاری منصب پر عروج پایا۔ خلد مکاں کی رحلت پر شاہزادوں کے باہم تنازع دیکھا تو کمال حزم واحتیاط سے کام لیا اور کسی فریق کی جانب داری و حمایت پسند نہ کی۔

شاہ عالم تخت نشین ہوا تو "خان دوراں بہادر" خطاب دیا اور صوبہ داری اودھ مع فوجداری اودھ کے ممتاز کیا۔ اسوقت تک لکھنؤ کا فوجدار حضور عالی سے مقرر ہوکر آتا تھا۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے اسی خطاب "خان دوراں بہادر" میں خطاب کی تاریخ پائی۔

نواب نظام الملک نے جب تھوڑے ہی دنوں میں امرائے جدید کا بازار گرم اور امرائے قدیم کا کاسد دیکھا تو نوکری سے مستعفی ہوکر دارالخلافہ شاہجہاں آباد کو چلے آئے۔ درویشانہ لباس پہن لیا اور خانہ نشین ہوگئے ؎

از بال و پر غبار تمنا فشاندہ ایم　　بر شاخ گل گراں نبود آشیانِ ما

شاہ عالم کی رحلت پر جب محمد معزالدین نے چندروز کے لئے تاج تیموری پہنا تو عروس سلطنت کے جعد بلند یا کمند مشکیں نے آصف جاہ کو گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ لیا۔ اصل منصب وخطاب سابق پھر عنایت ہوا۔ ہندوستان کے فقرائے بے قید نواب پر طعنہ زن ہونے لگے کہ خرقۂ درویشی اتار کر لباس دنیا اختیار کیا۔ اس جماعت کا طریقہ اگرچہ دریوزہ گری ہے لیکن ان حضرات کی وضع وغیرت بھی قابل ستایش ہے کہ پھر اُس وقت سے کبھی نواب نظام الملک کے روبرو دست سوال نہیں بڑھایا۔

جب محمد فرخ سیر تخت نشین ہوا تو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" خطاب دیا۔ ہفت ہزاری منصب پر ترقی دیکر انتظام دکن پر مامور کیا۔ فرخ سیر کے معزول ہونے پر اولاً حکومت مراد آباد بعد ازاں حکومت مالوہ سپرد کی گئی۔ ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں آصف جاہ دکن چلے آئے۔

دکن کے انتظام وتسلط میں سید دلاور خاں و سید عالم علی خاں وغیرہ سے سخت مقابلہ ومقاتلہ ہوا

نواب نے فتح پائی۔ اورنگ آباد میں داخل ہوگئے۔ امیر الامرا حسین علی خاں اپنے ایک عزیز اور ایک بھتیجے کے واقعات سنکر بیقرار ہوگئے۔ محمد شاہ کو ساتھ لیکر دکن جانے کا عزم کیا۔ لیکن تقدیر کا قلم سادات بارہہ کی دولت کے زوال کے لئے چل چکا تھا۔ اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک سے میر حیدر کاشغری نے امیر الامرا کو خنجر سے ہلاک کر دیا۔ قطب الملک فوج لیکر مقابلہ کو بڑھا۔ لڑا اور گرفتار ہوگیا۔

محمد امین خاں (برادر زادہ نواب عابد خاں) کے انتقال پر نواب نظام الملک دکن سے دہلی چلے آئے۔ اور خلعت وزارت پہنا۔ نواب نے عالمگیر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اُسکی آن بان اور شان حکومت پر فریفتہ تھے چاہا کہ اُسکے آئین و قواعد کو جو ترک ہوگئے تھے تازہ کریں اور از سر نو رواج دیں۔ خود غرض امرا نے اس کو اپنے مقاصد و اغراض کے منافی و مغائر سمجھا۔ بادشاہ کے مزاج کو نواب کی طرف سے گونہ منحرف کر دیا۔ اُسی زمانہ (۱۱۳۵ھ یعنی ۱۷۲۳ء) میں حیدر قلی خاں ناظم گجرات نے بغاوت کی تو نواب اُسکی تادیب کے لئے مامور ہوگئے۔ خود کام امیروں کو حضوری سے نواب کے ہٹانے کا موقع ملا۔ نواب اُدھر گئے تو حیدر قلی دیوانہ بن گیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔ نواب دہلی واپس چلے آئے۔ جلد وہی خدمت میں حکومت دکن و وزارت کے علاوہ صوبہ داری مالوہ و گجرات بھی مرحمت ہوئی۔ امرا کی سازش اور نفاق سے یہ بہت برداشتہ خاطر ہو رہے تھے۔ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) میں جب نواب مبارز خاں جو سالہا سال سے ناظم حیدر آباد تھے معزول ہوئے تو نواب نظام الملک اُنکی جگہ تمام ممالک دکن کے حاکم مقرر ہوئے۔ نواب علی سبیل الاستعجال دکن کی سمت روانہ ہوئے۔ مبارز خاں نے مزاحمت کی مارا گیا اور ممالک محروسہ مجموعہ نواب کے قبض و تصرف

---

۹۰ حیدر آباد کی ریاست یا سلطنت انگریزی میں **The Nizam's Dominions** کہلاتی ہے۔ اس کا رقبہ بیاسی ہزار چھ سو اٹھانوے میل مربع ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے اس کا قلمرو انگلینڈ کے رقبہ سے ڈھائی گونہ (سے بھی زائد) اور انگلستان اور ویلس (دونوں) کے مجموعی رقبہ کے ڈیوڑھے سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں دکن پر حملہ کیا۔ اُس وقت دیوگری میں یادو نسل کا راجہ حکمران تھا۔ علاؤ الدین نے اُسکو مفتوح و مغلوب کیا۔ پھر دولت آباد برہم بھی بعد ازاں دارالملک پر محمد بن تغلق نے ان فتوحات کو اور بھی وسعت دیدی حتیٰ کہ شمال سے جنوب تک کل دکن اسلام کے زیر نگیں ہوگیا۔ اس مردم خیز خطہ میں مسلمانوں کی متعدد سلطنتیں کسیوقت قائم تھیں۔

میں آ گئے۔ اب محمد شاہ بادشاہ، نواب کی استمالت و دلداری اور بھی کرنے لگا۔ ہمیشہ فرامین بھیجکر اظہار عنایات و نوازش کرتا۔ انعامات مخصوص مبذول ہوتے۔ اسی زمانے میں نواب نے آصف جاہ کے خطاب سے شہرت پائی۔ سنہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں بادشاہ نے بمبالغہ تمام نواب کو حضور میں

---

(۱) بہمنی۔ جس کی بنیاد علاء الدین بہمن شاہ نے ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں ڈالی تھی ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) تک اس خاندان کے اٹھارہ بادشاہوں نے ایک سو چھیاسی سال (قمری یا ایک سو اسی سال شمسی سے زائد) فرمانروائی کی۔ دارالسلطنت پہلے گلبرگہ تھا پھر بیدر رہا۔ احمد آباد اسی خاندان کا آباد کیا ہوا ہے۔

(۲) عماد شاہی۔ ایلچ پور واقع برار دارالملک تھا۔ چار بادشاہوں نے ۸۹۰ھ (۱۴۸۴ء) سے ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک سلطنت کی۔

(۳) عادل شاہی۔ دارالسلطنت بیجاپور۔ دس بادشاہ۔ مدت دو سو دو سال۔ ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) سے ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) تک۔ اسکندر شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ۱۰۹۷ھ میں قید کر لیا گیا تھا۔

(۴) نظام شاہی۔ احمد نگر۔ ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) سے ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) تک، مدت ایک سو سات سال دس بادشاہ اس تخت پر بیٹھے۔ دولت آباد یا دیوگیر بھی مستقر سلطنت رہا تھا۔ اخیر فرمانروا بہادر بن ابراہیم، شہنشاہ اکبر کے عہد میں گرفتار ہوا۔

(۵) برید شاہی بیدر۔ ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) سے ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) تک

(۶) قطب شاہی۔ دارالسلطنت گلکنڈہ تھا۔ دور حکومت ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) سے ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) تک رہا۔ سب سے اخیر بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ نے ۱۰۹۸ھ میں بمقابلہ اورنگ زیب شکست پائی۔ اور گرفتار رہا۔ حالت اسیری میں ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں فوت ہوا۔

دکن میں جب نواب آصف جاہ نے اپنی خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اولاً زیادہ وقت مرہٹوں کے استیصال میں صرف ہوا۔ پھر امرائے دربار نے حسد و رقابت کی وجہ سے سازش کر کے ایک نیا فتنہ برپا کیا۔ مبارز خاں صوبہ دار خاندیس کو مقابلہ و مجادلہ کی خفیہ تحریک کی۔ وہ شامت زدہ میدان میں آ گیا۔ شکر کھیلدہ (فتح کھیلدہ) واقع ضلع بلڈانہ ملک برار میں ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) میں معرکہ عظیم ہوا۔ مبارز خاں نے داد مبارزت دی مگر ملک اور جان دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسی لڑائی سے نواب کی آزادی و خود مختاری قائم و مسلم ہو گئی۔ اب نواب کے دائرۂ حکومت میں برار بھی شامل اور سلطنت میں داخل ہو گیا۔ حیدر آباد دارالحکومت قرار پایا۔ انگریز مورخین لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت یعنی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وہ ایک سلطنت کے خود مختار و آزاد بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کی بادشاہی موجودہ ریاست بشمول صوبہ برار کے برابر وسعت و دور میں تھی۔

۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں جب ٹیپو سلطان نے اپنی نصف جاگیر انگریزوں وغیرہ کے حوالہ کر دی تو انھیں

طلب کیا۔ اپنے خلف الصدق نواب نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر کو نیابت دکن پر مقرر کر کے خود بہ عجلت تمام دہلی کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کیا۔ نواب کی تشریف آوری کی تاریخ فضل علیخاں نے نظم کی ہے

صد شکر کہ ذات دیں پناہی آمد | رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف | گفت آیت رحمت الٰہی آمد

نواب نے کمال قدردانی اور اپنی سخاوت جبلی سے ایک ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا مع ساز نقرئی کے صلہ مرحمت فرمایا۔

دہلی میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد بادشاہ نے نواب کو دکن کے مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے رخصت کیا

بھی نظام کو رسدی حصہ ملا۔ بعد ازاں ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں سرنگا پٹم فتح ہوا اور ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو بروئے معاہدۂ میسور نظام کو علاقہ مفتوحہ میں معتدبہ حصہ ملا۔ چونکہ پیشوا اس عہد و قرار سے منکر و دست بردار ہوگیا اسلئے نظام کا حصہ اور بھی بڑھ گیا۔

ایک باقاعدہ اور منتظم سلطنت میں جتنے محکمے اور صیغے ہوتے اور ہو سکتے ہیں حیدرآباد میں سب موجود ہیں۔ علاقہ مال، پولیس، متفرقہ، فوج، منصب، خزانہ، ڈاک خانہ، ٹکسال، کرنسی، ریاست کی ریلوے، تعلیم، بندوبست، سروے (مساحت) صفائی (میونسپلٹی) تعمیرات و کارہائے رفاہ عامہ، صحت خلائق، ورجسٹری و تائق وغیرہ۔ اور اعلیحضرت شہریار دکن ادام اللہ سلطنتہ ہر صیغہ و محکمہ پر بہ نفس نفیس توجہ اور التفات فرماتے ہیں۔

آثار قدیمہ و تاریخی سے کل ریاست مالا مال ہے۔ متفرق یادگاریں ہر طرف ادھر ادھر پھیلی ہوئی موجود ہیں۔ انمیں سے بہت زیادہ قابل لحاظ و نمود غارہائے ایلورہ، اجنٹا، اورنگ آباد و عثمان آباد (دھارا سیو) ہیں۔ جو بودھوں اور جینیوں اور برہمنوں کے طرز تعمیر کے عمدہ نمونے ہیں۔ کثیر التعداد قلعوں میں سے گلکنڈہ، گلبرگہ، وارنگل، رایچور، مدگل، پرینڈا اور نلدرگ بہت مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے مندر اور معابد مختلف حیثیت، حالت اور قدامت کے، ریاست کے ہر ایک حصہ و سمت میں موجود اور بالکل محفوظ ہیں۔ مثلاً ہنم کنڈہ کا ہزار ستون والا مندر اور تُلجا پور اور امبا جوگئی کے مندر۔ ایک مندر مع اپنے ویران صحن کے قلعہ وارنگل کے اندر ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے عمدہ اور نادر نمونے ہندوؤں کے مذہبی طرز تعمیر کے بھی ہیں۔

عہد اسلام کی قدیم اور بہترین عمارات یہ ہیں۔ گلبرگہ کے پرانے قلعہ کی مسجد اور مکہ مسجد، جامع مسجد، چارمینار، چار کمان، دار الشفا (بیمارستان) موسلی ندی کا پرانا پل (یہ سب حیدرآباد میں ہیں) قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں

نواب جلد جلد منزلیں طے کرتے ہوئے بھوپال پہونچے۔ دوسری طرف سے مرہٹوں کی فوج آئی، مقابلے بہم اور سخت ہوئے۔ نادر شاہ کے آنے کی خبر گرم تھی اسلئے نواب نے مصالحت منظور کرلی اور دہلی واپس چلے آئے۔ نادر شاہ آیا اور جو کچھ کرنا تھا کر ڈالا۔ لیکن باایں ہمہ تمام امرا کی بہ نسبت نواب کے ساتھ بڑی رعایت و مدارا کرتا تھا ؎

پاس آداب بزرگاں ہے بہ ایں وضع جنوں
جب ملے ناصح، جھکے ہم بندگی کے واسطے

اب امیر الامرا کا منصب بھی نواب کے دیگر مراتب کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

سنہ ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) سے لیکر سنہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) تک نواب میر ورا انتظامات ملک دکن و استیصال باغیان میں مصروف رہے۔ احمد خاں ابدالی کا کابل سے آنا سنا تو برہان پور آئے، وہاں معلوم ہوا کہ احمد شاہ

کے مقبرے، جو گولکنڈہ کے پاس ہیں۔ بہمنی اور بریدشاہی سلاطین کے مقابر، جو شہر بیدر کے متصل ہیں۔ اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ۔ ان کے سوا ہندوانہ اور اسلامی ساخت کی عمارات کے بہت سے نمونے ہیں جو اب شکستہ حالت میں ہیں۔ مثلاً محلات گولکنڈہ و بیدر و گلبرگہ و دولت آباد۔

زبانوں میں سے زیادہ تر اردو، مرہٹی، کناری، تیلگو اس ملک میں بولی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے سنہ ۱۸۳۳ء میں انگریزی کی تعلیم حیدرآباد میں شروع ہوئی اور اب تو کثیر تعداد میں کالج اور مدرسے اور انگریزی خانقاہیں ریاست کے مختلف جوانب میں قائم و جاری ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ کل ہندوستان بلکہ اقلیم ایشیائی میں اپنے طرز اور جامعیت کی ایک ہی یونیورسٹی ہے۔

زراعت، فلاحت اور نصب درختان نے اعلیٰ حضرت دام دوامہ کے عہد دولت مہد میں بہت ترقی کی اور عروج پایا ہے۔ امدادی بنکیں کھلی ہوئی ہیں۔ مزارعین کی اعانت و فلاح اور عطائے تقاویات کا مکمل انتظام ہے، حیدرآباد کے حکمرانوں اور انکے امرا و وزرا نے بڑے بڑے تالاب اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ جیسے حسین ساگر، ابراہیم پٹن، میر عالم، افضل ساگر، جل پلی وغیرہ۔

دکن کے پالوانی بار کشی اور قوت برداشت و تیز روی کے لئے مشہور ہیں۔ عرب اور آسٹریلین نسل کے گھوڑے باہر سے آتے ہیں، انکی نسل کی افزائش یہاں بھی ہوتی ہے۔ گھوڑوں اور مواشی کی تجارت نہ صرف شہر و قصبات بلکہ دیہات میں بھی رو بہ ترقی ہے۔

معدنیات کے لحاظ سے یہ ریاست نہایت زرخیز ہے۔ کوئلے کے معادن ورنگل میں اور سونے کی کان ہٹی گونڈ میں بہت وسیع ہیں۔ سنگاریني میں بھی کوئلہ کی کان ہے۔ لوہے اور تانبے کی کانیں بھی اس ریاست میں پائی جاتی

نے فتح پائی۔ احمد خاں ابدالی شکست کھاکر کابل واپس چلا گیا۔ اسی حالت میں نواب یہاں ایک مرض میں مبتلا ہوئے۔ ۴۔ جمادی الآخرہ سنہ ۱۱۶۱ھ (۲۲۔ مئی سنہ ۱۷۴۸ع) کو وقت عصر راہگرائے ملک جاوداں ہوئے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ نعش اُٹھانے کے وقت خلق سے اس قدر شور و غریو برپا ہوا کہ زمین و زماں لرزہ میں آگئے بڑے بڑے اولیاء کرام و صلحای عظام اور امرائے با احتشام جنازۂ مبارک کو ایک میدان وسیع تک دوش بدوش لے گئے، وہاں نماز ادا کی، پھر شاہ برہان الدین غریب قدس سرہٗ کے روضۂ مطہرہ میں لائے اور پایان مرقد شیخ مائل بہ قبلہ راحت کدۂ ابدی میں پیکر عالی کو پہونچا دیا۔ "متوجہ بہشت" (سنہ ۱۱۶۱ھ) تاریخ رحلت ہے۔

مسلمان اور ہندو تذکرہ نگاران کو چھوڑ دیجئے انگریز مورخین بھی نواب کو بڑی عظمت و احترام سے یاد کرتے اور اُن کی شجاعت و بسالت اور حسن تدبیر و دانائی و فرزانگی کی نہایت تحسین و ستائش کرتے ہیں۔ ہندوستان کا امپریل گزیٹر

(*a*) A Distinguished general of Aurangzeb

(*b*) Distinguished alike in war and political sagacity

لکھکر ان چند منتخب و ممتاز الفاظ میں آپ کا نام نامی لیتا اور اپنا فرض مردم شناسی ادا کرتا ہے۔

نواب کی طبیعت نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ آپ کے نتائج طبع سے ایک دیوان ضخیم یادگار ہے سنہ ۱۱۳۶ھ (سنہ ۱۷۲۴ع) میں جبکہ نواب بہ تقریب وزارت دکن سے شاہجہاں آباد تشریف لائے

پیداوار معدنی میں بالخصوص ہیرا، سونا اور کوئلہ داخل ہیں۔

تجارت اور مصنوعات میں دستر، گوٹہ، لیس، اور بدری کی اشیا ہیں۔ نہایت بیش قیمت چیزیں ہر قسم کی اور اعلیٰ درجہ کے قالین اور غالیچے یہاں تیار ہوتے ہیں۔

ڈاک کا محکمہ اور طریقہ اس ریاست میں اپنے قلمرو کے لئے خود اپنا قائم ہے اور ڈاک کے ٹکٹ بھی اپنے ہی جاری ہیں۔

اس سرکار ابد قرار کی فیاضیاں، عطیات، وظائف اور مدد معاش۔ اوقاف۔ جاگیر و سمستھان پوری تفصیل اور مکمل بیان کی مستحق ہیں، مگر ان معدود صفحات میں گنجایش کہاں۔

ریاست کا سکہ جو حالی سکہ کہلاتا ہے سنہ ۱۸۵۸ع سے جاری ہے، وقتاً فوقتاً اُسکی شان اور وضع میں اصلاح اور ترمیم ہوکر مجموعہ روپیہ اور عثمانی سکے مضروب و رائج ہوئے ہیں سکہ سمی کے چہرہ پر چار مینار کی شکل منقوش ہے۔

ہوئے تھے اور میر عبدالجلیل بھی مع اپنے دونوں نواسوں کے وہاں وارد تھے۔ نواب نے اپنا ایک شعر مجمع شعرا میں پیش کیا اور غزل پوری کرنے کی خواہش کی ؎

امروز کہ آئینۂ گلزار بدست است — کے سوے چمن می رود آن دست حنائی

اور اپنا یہ مصرع بھی پڑھا تاکہ کوئی صاحب پیش مصرع لگا سکیں تو لگادیں ع

گلِ آئینہ از آبِ رخ او تازگی دارد

اس مصرع کا قافیہ صعوبت و دشواری سے خالی نہ تھا۔ نواب امین الدولہ وقائع خواں حضور معلٰے نے میر عبدالجلیل سے تحریک کی اور اسکی انجام دہی کے لئے تکلیف دی۔ میر نے اُسی زمین میں پورا قصیدہ لکھ ڈالا۔ مطلع یہ ہے ؎

تا حسن ترا مشعل انوار بدست است — مہ را ہمہ شب کاسہ گدا وار بدست است

اور جس مصرع کو پیش کیا تھا اُس پر پیش مصرع بھی لگا دیا اور کچھ شعر اور لاحق کر کے غزل تمام کردی یہ تین شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

رخِ او از بہارِ حسن زیبا ماندگی دارد — گلِ آئینہ از آبِ رخِ او تازگی دارد
ز تم پاشید اوراق دلِ صد لخت نادیدم — کتابِ حسنت از چینِ جبیں شیرازگی دارد
بفکرِ صاف نوابِ نظام الملک می نازم — کہ فطرت از خیالِ او بلند آوازگی دارد

نواب امین الدولہ نے وہ قصیدہ اور غزل نواب نظام الملک آصف جاہ کے روبرو پیش کی۔ بغایت محظوظ ہوئے اور ملاقات کے لئے تکلیف دی اور اصرار فرمایا۔ مجبورانہ میر صاحب نے ایک دوسرا قصیدہ مدحیہ تیار کیا اور ایک شب کو امین الدولہ کے ساتھ نواب کی مجلس میں پہونچے۔ نواب نے واذا اتاکم کریمًا فاکرموہ پر عمل فرمایا اور اندازہ اور توقع سے زیادہ اعزاز و احترام کیا اور اپنے برابر بے فاصلہ جگہ دی۔ جب قصیدہ کی کیفیت معلوم ہوئی اور کاغذ پر نگاہ پڑی تو شمع قریب منگا کر پڑھنے کے لئے اشارہ کیا۔ ہر ایک شعر کو کمال اطمینان و جمعیت خاطر کے ساتھ آہستہ آہستہ سنتے اور سمجھتے رہے مضامین رنگین اور ترکیبات دلکش کی تحسین و آفرین کی۔ قصیدہ سننے کے بعد پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ

وجہ صلہ میں دینا چاہا۔ میر صاحب نے اپنے ضابطۂ قدیم کے مطابق اُسکو بھی قبول نہیں کیا۔
یہ قصیدہ بھی بڑے زور کا ہے اور محاسن و تکلفات شاعری سے مملوٗ۔ اس میں عربی و فارسی و ترکی و ہندی چاروں زبانوں میں کہن سالی و کہنہ مشقی سخنور کی قوت تخیل و توصیف جلوہ افروز ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے ؎

بہار آمد و وا کرد غنچہ بند قبا — گرہ ز خاطر بلبل کشود فیض صبا
ز بسکہ سبزہ و گل در چمن ہجوم آورد — نسیم کرد بصد حیلہ جائے خود را وا
گرفت قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت — برائے شاہد نوروز لالۂ حمرا
ببیں بہ لالہ و تحریک غنچہ در ہر برگ — چو طوطئے کہ ز منقار وا کند پر ہا
شکنج طرۂ سنبل کمند صید نظر — نگاہ دیدۂ نرگس فسوں ہوش ربا
دمید نغمہ ز منقار بلبل خوشگو — چو گلبنے کہ ازو بشگفد گل رعنا
فزود حسن چمن از سحاب گوہر بار — چنانچہ شان وزارت ز عمدۃ الوزرا
نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم — قوام دیں و دول آفتاب مجد و علا
بود بحسن وزارت بہ از نظام الملک — کہ نقش ثانی بہتر کشد نگار آرا
مشابہ کف او بحر چوں تواند شد — کہ نقص خیز بود مد بحر را بقفا
حباب نیست کہ بحر از تشبہ کف او — کلاہ فخر بیند اخت از خوشی بہ ہوا
رسن ز موج زدہ بر میان بکف کشتی — کز و سوال کند چوں قلندر دریا
ز بیم کثرت جودش محیط نالہ کند — گواہ اوست بریں بیم رعشۂ اعضا
گرفت خنصر یمنیٰ خرد ز دانشش او — چنانکہ خلق ز جودش اصابع یسریٰ
رسیدہ است بجائے تقدس ذاتش — کہ چوں ملک بود از جنس انس مستثنےٰ
چو او ندیدہ امیرے مہذب الاخلاق — بعینک مہ و مہر ایں سپہر پشت دوتا
مثال روح مصور بود بپاکی ذات — نشان عقل مجسم بود بہ فہم و ذکا

چکد ز سنبل و گل شیشہ شیشہ عنبر و عطر
چو گرم جوشی خلقش شود چمن پیدا

صفائے آئینہ رائے او بود چنداں
کہ می نماید از و آنچہ رود ہر فردا

کرم ز دست گہربار او بود ممنوں
ظفر بہ تیغ چمن کار او بود شیدا

تعجب است ز شمشیر آتش افروزی
کہ جائے تیغ کف است و کف است بحر عطا

گرہ گرہ بنود سینۂ عدو شکنش
کہ بندگشتہ درد جا بجا دل اعدا

کہ نبرد بود ہمچو ابر صاعقہ بار
کماں چو قوس قزح تیر چوں شہاب رسا

ہزار شکر کہ ز مسند وزارت یافت
ہماں کہ یافت تن عاذرا ز دم عیسے

برسم جشن طرب چید بزم رنگینے
کہ از تصور آں خامہ گشت شاخ حنا

ترانہ سنج زمزمۂ غولہ ساخت چو گانے
ربود گوی دل سامعاں بحسن ادا

سپہر شد ہمہ تن دیدۂ تماشائی
پے نظارۂ ایں محفل نشاط افزا

بو قولبا و تو توک ن چو چوک تو شوق حقدی
تو توکی تولو د تو توک بولدی یشکر موندا

تو شوق نسیم دن آچیلدی کوپ گل ہندک
پینوز بقتلنغ بولسون بلند قلدی نوا

محیط مدحت او را کرانہ پیدا نیست
بزور رق قلمی چوں تواں نمود شنا

شعار من نبود شعر بس کنم زیں حرف
کز اہل فضلم و خواب است ز اہل فضل دعا

اَقُوْلُ وَفَّقَكَ اللّٰہُ دَاعِیًا بِالْخَیْرِ
لِانْتِظَامِ اُمُوْرِ الْاَنَامِ فِی الدُّنْیَا [۱]

اَدَامَ قَدْرُكَ فِی الْجَاہِ مَا سَمَا الْاَفْلَاكُ
وَشَدَّ اَزْرَكَ بِالْعِزِّ مَا دَسَتْ رَضْوٰی

فَاَنْتَ خَیْرُ ظَہِیْرٍ لِمَنْ رَمَاہُ الدَّھْرُ
وَاَنْتَ خَیْرُ نَصِیْرٍ لِزُمْرَۃِ الضُّعَفَا

قَدِ اسْتُجَابَ دُعَائِیْ اِلٰھَنَا الْمُتَعَالْ
بِمُرْسَلٍ عَرَبِیٍّ وَّ اٰلِہٖ النُّجَبَا

ز فضل گر گرزم تیغ و نیزہ می گیرم
کہ بر جلادت من شاہد اند ایں دو گوا

ز ذو الفقار چو برہان قاطعے دارم
بروز معرکہ فیصل نمایم ایں دعوی

[۱] انتظام (افتعال) کا ہمزہ وصلی ہے۔ گرنا چاہیے تھا یہاں باقی رکھا گیا ہے۔ ضرورت شعری سے مجبوری ہے۔

قلم نوشت برائے وزارتش تاریخ
"وزیرِ کشورِ ہند آصف دوام البقا"

"ہزار و یکصد و سی و چہار نفسِ نشاط"
دو گونہ جوہر تاریخ ازو شود پیدا

نظمت فی العربی الفصیح تاریخاً
جَلیٰ وِزَارَتَہٗ سَالِکُ التَّبیْعِ لَنَا

اسیں دے کے کہی ہندوی موں یوں سنبت
"ہے جگت موں اچل باس یہہ وزیر سدا"

خرد بجامۂ عبد الجلیل کرد ارشاد
کہ ختم کن بدعا ایں قصیدۂ غرا

ملائک از پے آمین ایں دعا شدہ اند
برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

ہمیشہ ہر دو زہم شاد و کامران باشند
دے از وزارت واز دے وزارتِ اعلیٰ

نواب آصف جاہ جیسے خود سخن سنج اور سخن فہم امیر تھے ویسے ہی قدر شناس اہل کمال بھی تھے۔ مرزا بیدل سے تلمذ تھا، شاکر تخلص فرماتے۔ مرزا صاحب جب ان کے یہاں جاتے تھے تو نواب اُن کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے۔ استقبال و مشایعت کرتے اور اپنی مسند پر بٹھاتے تھے۔ مرزا کے نشاآت میں کئی رقعے چین قلیچ خاں کے نام ہیں جو نواب کا پرانا خطاب تھا۔

۹۲ھ سمبت، ہندی میں سال کو کہتے ہیں۔ راجہ وکرمادیت کا سمبت تقریباً پونے ستاون (۵۶ ۳/۴) برس قبل حضرت مسیح سے شمار شروع ہوتا ہے۔ میرے حساب سے اس وقت ہندی سمبت ۱۸۴۵ رہا ہوگا۔

سادات بارہہ

خلد مکاں عالمگیر نے اپنی وصایا میں شاہزادۂ عالیجاہ محمد معظم (بہادر شاہ) کو تحریر کیا تھا:-

"نہم آنکہ با سادات لازم کہ آں سعادت نشان بموجب آیۂ کریمہ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ محبت ایں جماعہ کہ اجر نبوت است ہرگز مقصر نباید بود کہ مثمر خیر دنیا و عاقبت است لیکن با سادات بارہہ کمال احتیاط باید نمود در محبت ظاہری و باطنی قصور نباید کرد بحسب ظاہر مرتبہ ایہا را نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ شریک ظالم۔ بلکہ اگر اندک استرخاے عنان شود ندامت فائدہ ندارد۔ مصرع۔ دریغ سود ندارد چو رفت کار از دست"

"نویں یہ کہ اُس سعادت مند فرزند کے لئے لازم ہے کہ سادات کے ساتھ محبت رکھنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں جو آیۂ قرآنی کے بموجب رسالت کا اجر قرار پائی ہے [(اے پیغمبران لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے اِس (تبلیغ رسالت) پر کوئی مزدوری تو مانگتا نہیں مگر رشتے ناطے کی محبت (تو قائم رکھو (جزو ۲۵۔ سورۃ الشوریٰ ع۔۳۔۴)] کیونکہ اس سے دنیا اور آخرت کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن سادات بارہہ کے ساتھ نہایت احتیاط رکھنا چاہیئے، اور ظاہری و باطنی محبت میں کمی نہ کرنا چاہئیے البتہ اُن کا ظاہری مرتبہ نہ بڑھانا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ شریک غالب بلکہ شریک ظالم ہوتے ہیں اور اگر ان کی باگ ذرا بھی ڈھیلی کر دی تو پھر پشیمانی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

سادات صحیح النسب کے بارہ گاؤں دریائے گنگ و جمن کے مابین ضلع مظفرنگر میں مدتہائے دراز سے مشہور و معروف ہیں۔ اکبر کے عہد میں یہ قطعہ سرکار سہارنپور میں داخل تھا۔ یہاں کے سادات شجاعت و بہادری میں ہمیشہ ممتاز و نامور رہے ہیں۔ ان کے اسلاف کی نسبت کہا گیا ہے کہ ۷۵۱ھ (سنہ ۱۳۵۰ء) کے قریب یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اُس وقت دہلی میں سادات کا خاندان فرمانروا تھا۔ اُس خاندان نے سرپرستی فرمائی تو ان غریب الدیار سیدوں نے اپنے جوہر دکھائے اور اعزاز و عروج

خوب بڑھا۔ ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں سلطان خضر خاں نے سہارنپور کی حکومت و نگرانی سید سلیم کے سپرد کی۔ وہی اس وقت اس خاندان کے مقدم و پیشوا تھے۔ اس کے بعد ان سادات کا اثر دربار اول دربار پر برابر بڑھتا رہا۔

اس دلاور طبقہ نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ چنانچہ سید محمود بارہہ جو سکندر شاہ سوری کے ساتھ قلعہ مان کوٹ میں محصور تھا مجبور ہو کر اکبری فوج سے آکر ملا اور اس کی ملازمت اختیار کی۔ چار ہزاری منصب تک پہونچا۔ سید ہاشم اس کے بیٹے نے بھی باپ کے برابر رتبہ پایا۔ اور سرکاری خدمت میں جان دی۔ سید احمد، سید راجو، سید عبدالمطلب اور سید عبداللہ خاں (اول) کے کارنامے عہد اکبری کے ہمیشہ بہار چمن سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ خاں کو بادشاہ نے داؤد خاں باغی بنگالہ کے استیصال کے لئے بھیجا تھا۔ سید محمود کو مع افواج شاہی کے پٹن میں مرزایان و شیر خاں فولادی نے گھیر لیا۔ عبدالمطلب خاں عین وقت پر مدد کو پہونچا اور بادشاہی شان و شوکت کو قائم و برقرار رکھا۔ رانا میواڑ کے مقابلہ میں (اسی اکبری عہد میں) سادات بارہہ نے بڑی مردانگی و بہادری سے کام لیا تھا اور کمال ثابت قدمی سے لڑے تھے۔ سادات بارہہ کے بہت سے نام آئین اکبری میں بزرگان جاوید دولت کے ذیل میں ملتے ہیں۔ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں جہانگیر نے سید سیف خاں بارہہ کو شاہزادہ پرویز کا اتالیق مقرر کر کے لشکر جرار کے ساتھ خانخاناں کی مدد کے لئے دکن کی مہم پر بھیجا تھا۔ مرزا عزیز کوکلتاش کا یہ قول بالکل سچا تھا کہ "سادات بارہہ دولت اکبری پر فدا ہیں۔"

اکبر اور اس کے عالی حوصلہ اخلاف کے زمانہ میں اس خاندان نے بڑے بڑے عہدے اور منصب اور وسیع جاگیر ادیں اور جاگیریں پائی تھیں۔ اگر ایک طرف منتظمین و مدبرین سلطنت کی حیثیت سے سارے شاہی قلمرو میں ان کی شہرت و نیکنامی کا سکہ چل رہا تھا تو دوسری طرف فوجی بہادر اور دلیر سپاہیوں کے طور پر دریائے سندھ سے نربدا تک ہندوستان ان کے گھوڑوں کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ انھیں کی قوت و بسالت کا نتیجہ تھا کہ بہادر شاہ اول نے ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں آگرہ فتح کیا اور تاج و تخت کا مالک ہوا۔

اسی تذکرہ کے صفحات سے واضح ہوگا کہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کے انقلابات اور فرخ سیر کی تخت نشینی میں بھی سادات بارہہ کا ہاتھ کام کر رہا تھا جس کے صلہ و جلدوے خدمت میں سید عبداللہ خاں (دوم) وزیر مطلق اور سید حسین علی خاں سپہ سالار اعظم (کمانڈر ان چیف) بنا دیے گئے تھے۔ مگر اس کے بعد ہی زوال شروع ہوگیا اور سادات بارہہ کی قوت اور جمعیت ان کے مخالف و معاند وزیر قمر الدین خاں کی تدابیر اور دوراندازیوں سے منتشر و پراگندہ ہوگئی حتیٰ کہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں اس خاندان کا تعلق دہلی اور سلطنت سے بالکل قطع ہوگیا۔

سادات بارہہ سے تعلقات

میر عبدالجلیل کے تعلقات و روابط سادات بارہہ سے نہایت صادق و راسخ تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ جس شان واخلاص وعقیدت کے ساتھ انھوں نے نباہی اور جو اختصاص واحترام انھوں نے مبذول رکھا صفحات تاریخ پر یادگار و مرتسم رہے گا۔ تفصیل اوراق آئندہ میں ملے گی۔ ایک وجہِ موافقت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ سادات بارہہ کا نسب اوپر جا کر سیّد ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو سید محمد صغرے بلگرامی کے بھی مورث تھے۔ گویا سادات بلگرام اور سادات بارہہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ضلع ہردوئی کا گزیٹر بعنوان "باشندگان" بذیل "سادات" رقم طراز ہے:-

"بلگرام اور شاہ آباد میں زیدی زیادہ ہیں۔ اس سے اس روایت کا ثبوت ملتا ہے کہ خاندان بلگرام کا تعلق سادات بارہہ مظفر نگر سے ہے۔ زیدی سادات (اضلاع مظفرنگر و میرٹھ و بجنور میں زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ضلع ہردوئی میں عموماً اور پرگنہ جات پنڈرواد بلگرام میں ان کے پاس زمینداری بھی بہت ہے" ......

"سادات کا خاندان سید محمد صغریٰ کی اولاد میں ہے جو بعہد التمش بلگرام میں آئے تھے جنکو

اس مقام کی فتح کے بعد ایک جاگیر وسیع ملی جو اب تک اُن کے احفاد کے قبضہ میں ہے........
بلگرام کے شجرہ سے پایا جاتا ہے کہ محمد صغریٰ کی چھٹی پشت میں سید ابو الفرح واسطی تھے۔ انھیں کی نسل میں مظفر نگر کا مشہور خاندان بارہہ بھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اُن کا لڑکا داؤد سادات بلگرام اور رسولپور کی شاخ نسل بارہہ دونوں کا مورث ہوگا۔"

آغاز

میر عبد الجلیل اور نواب دلیر دل خاں سے بھکر میں روشناسی ہوگئی تھی۔ اسی وسیلت شناسائی سے نواب بخشی الممالک امیر الامرا کی ملازمت میں میر پہونچے۔ دلّی کا قیام اُدھر بیماری سے مجبور اُدھر بیکاری سے پریشان۔ جب بیماری سے کچھ فرصت پاتے تو دلیر دل نواب کے ہمراہ جاکر امیر الامرا کے مجرائی ہوجاتے۔ ایک نفیس قصیدہ (یا خود اُنھیں کے الفاظ میں "ایک رنگین کاغذ") امیر الامرا کے لئے تیار کیا تھا جس کو دیکھکر فضلائے دہلی متعجب تھے۔ دلیر دل خاں نے اُسکی تقریب کی۔ امیر الامرا نے فرمایا کہ صبح جب فضلائے وقت یکجا ہوں تو پیش کیا جائے۔ روزوں کی وجہ سے وہ صحبت منعقد نہ ہوسکی اور نہ رمضان بھر وہ کاغذ نظر سے گذر سکا۔ اِدھر نواب دلیر دل خاں آخر رمضان میں صوبہ دار مقرر ہوکر چلے گئے۔ اور اُردوے معلّے (پایۂ تخت) میں میر عبد الجلیل کا جو کچھ سہارا یا مربی تھا رخصت ہوگیا۔ مگر نواب صاحب چلتے وقت امیر الامرا سے "پروانگی مجرائے کر ان کو دیتے گئے تھے۔ چنانچہ اُن کی روانگی کے بعد میر صاحب نے دو تین بار حاضری دی۔ عید کے دن رباعی تہنیت بھی پیش کی۔ اس مبارکباد کو مطالعہ فرماکر متبسم ہوئے اور کہنے لگے کہ "نہایت خوب کہی ہے" حسب دستور میر صاحب تسلیمات بجالائے۔ امیر الامرا نے بیٹھ جانے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اُس زمانہ میں اُن کے جبروت کا یہ اقتضا تھا کہ اگر کسی کی طرف اتنا بھی متوجہ ہوجاتے تو گویا اُس کو نہال کردیتے تھے۔ ع

اُن کا نہ دیکھنا نظر التفات تھا

رباعی یہ تھی ؎

نواب فلک رتبہ امیر الاُمرا — ہر حرف ز عید بہر او شد ایما

عین از عیش دیار مین است نشاں   دال آمدہ رمز دولت فیض آرا

جس زمانہ میں میر عبد الجلیل دہلی میں مقیم اور مبتلائے بخار تھے۔ امیر الامرا کے مشکوے معلّٰے میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس سے قبل جو اولاد ہوئی تھی اُنکی ولادت میں بڑی خوشی و شادمانی کیگئی تھی۔ ضیافت و انعامات میں زر خطیر خرچ کیا گیا تھا۔ مگر کسی بچہ نے زندگی نہیں پائی اور والدین کو مفارقت کا داغ دے گئے۔ اس لئے اس بچہ کے پیدا ہونے پر نواب نے نہ کسی کی نذر لی نہ کچھ خوشی کی میر عبد الجلیل نے عربی فارسی و ہندی میں علیٰحدہ علیٰحدہ رنگ سے تاریخ تولد باسلوب دعا لکھی اور دربار میں پیش کی۔ نواب نہایت محظوظ ہوئے۔ مولوی جیون اور جُوجُو صاحب کہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے دیکھکر بہت خوش ہوے۔ مولوی صاحب نے سب کے سامنے فرمایا کہ "ہمکو تمہاری ذات پر افتخار ہے کہ ہمارے زمانہ میں تم جیسے اہل استعداد موجود ہیں"۔

فی العربیۃ ؎

نال امیر الامرا[۹۳] نعمۃ[۹۴]   وھی قدوم الولد المستنیر

ارخ فی ذالك عبد الجلیل   امتعہ اللہ بعمر کبیر ۱۱۲۶ھ

فارسی ؎

گلے شگفت بگلزار خاندان حسین   زمانہ شد بہ دوام بقاے اُو ضامن

فرشتہ آمین گفتا[۹۵] چو گفتم ایں تاریخ   ہزار سال شود عمر ایں گل آمن[۹۶] ۱۱۲۶ھ

۵۹۳ امیر الامرا ایک نعمت پر پہونچا۔ یہ نعمت فرزند روشن کا آنا ہے۔ اس بارہ میں عبد الجلیل نے تاریخ کہی۔ اللہ تعالیٰ اُسکو عمر دراز نصیب فرمائے۔

۵۹۴ الامرا کی ہمزہ کا حذف کرنا عربی ترکیب میں محل اعتراض ہے۔ وزن جمع الف ممدودہ کے ساتھ ہے نہ کہ الف مقصورہ کے ساتھ۔ ضرورت شعری کی توجیہ بھی ضعیف ہے۔

۵۹۵ موزونی مصرع میں تامل ہے۔ آمین اسم فعل ہے، بمعنی دُعا کو قبول کر یا ایسا ہی ہو۔

۵۹۶ آمن بمد الف و کسرہ میم۔ امن کا اسم فاعل جو بحالت امالہ امین ہو جاتا ہے۔ آمین و امین بے خوف و بے وحشت

ہندی ؎

پتر جنم سینت کھوں ہنس حسین مہیپ
چرنجیو جگ جگ صدا بہ سپتسر کل دیپ ۱۱۲۶ھ

سوانح نگاری بھکر و سیوستان اور بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان سے میر عبدالجلیل کی معزولی خدمت کی وجہ یہ تھی کہ پرگنہ جنوبی سرکار بھکر میں ایک بار بارش ہوئی جس کے قطرے درختوں کے پتوں پر منجمد ہو گئے جو رنگ و ذائقہ میں نبات (مصری) سے اصلاً تفاوت نہ رکھتے تھے میر صاحب نے یہ رباعی لکھی اور فرد سوانح میں لکھ دی ؎

فرخ سیر آن شہنشہِ بابرکات
چرخ از ادب او شدہ شیریں حرکات
در سندِ ہیں عہد عشرت مہد شش
باراں بارید ریزۂ قند و نبات

اتفاقاً اس رباعی کا تذکرہ دربار امیر الامرا میں آ گیا کہ اس پر میر جملہ نے اعتبار نہ کیا اور عرض والا تک پہونچایا تھا۔ شعیب خاں نے امیر الامرا سے عرض کیا کہ فلاں نے خوب رباعی لکھی ہے جو سننے کے قابل ہے نواب صاحب میر عبدالجلیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے رباعی پڑھ دی اور ساری روداد عرض کی۔ رباعی بہت پسند کی اور وہ "فرد رباعی (پرچہ)" اسی طرح ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ظاہر النواب قطب الملک (وزیر اعظم) اسی روز امیر الامرا کے یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تخلیہ میں فرد مذکور قطب الملک کے حوالہ کی اور کہا کہ یہ مقدمہ عرض معلی کے قابل ہے۔ انھوں نے بھی تصدیق کی اور فرد کو لئے ہوئے جب دربار پہونچے تو سب سے پہلے یہی فرد حضرت ظل سبحانی کے ہاتھ میں دیدی۔ حضرت بدولت نے مطالعہ فرما کر نہایت پسند کیا اور آفرین و تحسین کی قطب الملک نے گزارش کیا کہ یہی رباعی تو قائل کی تغییر کا باعث ہوئی ہے۔ حضرت نے تعجب و استبعاد کر کے خود فرمایا کہ ہم نے بدستور خدمات سابق پر بحال کیا۔ دوسرے دن جب میر صاحب امیر الامرا کے یہاں حاضر ہوے تو فرمایا کہ "لیجئے صاحب! آپ تو اپنی خدمات پر بحال ہو گئے۔ یہ بحالی کی پروانگی آ گئی ہے۔"

میر صاحب کے دوست شیخ محمد رضا تتوی نے بھی جو بھکر کے بخشی و وقائع نگار بڑے بزرگ اور موزوں طبع تھے اسی واقعہ کے متعلق دو تین رباعیاں فرید وقائع میں درج کردی تھیں انھیں شیخ صاحب کو میر عبدالجلیل اپنے نجی خطوط میں "شیخ محمد رضا جیو" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۵

چو فرخ سیر بادشاہِ جہاں | بیاراست گیتی چو باغ جناں
بجشن ہمایوں جلوسش ملک | نثار شکر کرد از آسماں

میر کی یہ رباعی شیخ مرتضیٰ حسین الہ یار بلگرامی نے بھی حدیقۃ الاقالیم میں نقل کی ہے سیوستان کے جغرافیہ میں لکھتے ہیں کہ اُس دیار میں قند و نبات کے ریزوں کی بارش تو سو جریب سے لیکر ایک ہزار جریب تک کے رقبہ میں ہوئی تھی۔ میر نے اس واقعہ کو صحیح روزنامچہ کیا اور بحکم فرخ سیر بادشاہ معزول ہوئے تو اپنی تصدیق کے لئے خدا یار خاں ناظم صوبہ و دیگر رؤسائے معتبر اور قاضی شہر وغیرہ ارباب شرع کی مُہر و دستخط سے محضر مرتب کرا کے شاہجہاں آباد لے گئے۔ تحریری شہادت کی تائید میں ایک بار شتر کے بقدر اصلی عطیہ قدرت بھی ہمراہ تھا اس کو وارائی کے خریطوں (تھیلیوں) میں بھروا کر حسین علی خاں کی معرفت حضور معلیٰ میں پیش کیا اور کامیاب ہوئے۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہ آسمانی قند ایک وام میں بہت سا ملجاتا تھا۔ برسوں ٹھہرتا تھا۔ رنگ کی صفائی اور براقی میں یہ ریزے اُولوں (ژالہ) یا نمک سنگ کے مشابہ تھے انکا قوام اتنا سخت تھا کہ آہنی ہاون دستہ سے بہ دُشواری ٹوٹتے تھے۔ خواص یہ تھا کہ چند روز تک آنکھ میں لگانے سے ناخنہ، جالا، ماندہ، آنکھ کی پھلّی وغیرہ امراض جو مانع بصارت ہوتے ہیں دُور ہوجاتے تھے۔ اچھی خاصی آنکھوں میں کوئی لگاتا تو روشنی بڑھتی تھی۔ اس کو آنکھ میں رکھنے سے سُعال (کھانسی) جاتا رہتا تھا۔

سید حسن علی خاں

سید حسن علی خاں برادر کلاں عالمگیر خلد مکاں کے عہد میں خطاب خانی[۵۹۷] سے سرفراز اور فوجداری ندربار[۵۹۸] و سلطان پور[۵۹۹] توابع بگلانہ[۶۰۰] پر ممتاز تھے۔ بعد ازاں حاکم اورنگ آباد مقرر ہوئے۔ جب شاہزادہ محمد معزالدین شاہ عالم کو خلد مکاں نے صوبہ دار ملتان مقرر کر کے بھیجا تو حسن علی خاں کو شاہزادے کے ہمرکاب جانے کا حکم دیا۔ لیکن حسن علی خاں کی شاہزادہ سے موافقت مزاج نہیں ہوئی اور وہ آزردہ خاطر ہو کر لاہور واپس آئے۔ عالمگیر نے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا اور عمدۃ الملک امیر الامرا امیر خاں کو لکھا ہے کہ

"حسن علی خاں با فرزند زادہ معزالدین برہم زدہ نیکی نمود بے اجازت ایشاں برخاستہ آمد و شاہزادہ شکوہ نوشتہ منصب کم باید کرد و جاگیر ضبط نمود۔ تا دیگراں را عبرت شود بیت

کند تحمل بسیار مرد را بے قدر　　کماں چو تن بہ کشیدن دہد کشادہ شود

اعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔"

میر عبدالجلیل کا قیام اس وقت بھکر و سیوستان میں تھا جب حسن علی خاں نے نواحی بھکر سے ہو کر لاہور جانے کا قصد کیا تو میر عبدالجلیل نے ان کے ساتھ نہایت پسندیدہ اور ان کے شایان شان

---

۵۹۷ خان ترکی یا تاتاری خطاب ہے۔ اصل ملک (ترکستان یا تاتار) میں بادشاہ یا کسی فرقہ کے امیر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بمعنی سردار و امیر و رئیس مستعمل ہے۔ ایران میں بھی امراد سلاطین کے نام کے ساتھ لگایا جاتا تھا

۵۹۸ سرکار ندربار۔ محال ندربار با حویلی۔ صوبہ مالوہ میں تھا۔

۵۹۹ سلطان پور [illegible] صوبہ بمبئی کے ضلع خاندیس مغربی میں ایک اجڑا ہوا یا نیم ویران قصبہ ہے جو کسی وقت ندربار کا دار الملک تھا۔

۶۰۰ بگلانہ، صوبہ مالوہ میں ایک سرکار تھی۔ آئین اکبری میں بذیل صوبہ گجرات لکھا ہے "میان سرکار سورت و ندربار کوہستانے است آباد آں بگلانہ گویند (بفتح با و سکون ہا کاف فارسی و لام و الف و فتح نون و ہائے مکتوب) بومی راٹھور" صوبہ گجرات کے یہ کوہ و قلعے بعض کتابوں میں بگلانا بھی لکھے گئے ہیں۔

خدمات و مراعات کیں سادات سے ارتباط کی ابتدا ہیں سے ہوئی۔ شاہ عالم کے عہد میں حسن علی خاں چار ہزاری منصب پر فائز ہو کر صوبہ داری اجمیر[۱۵۱۰] اور بعد ازاں صوبہ داری الہ آباد[۱۵۱۱] پر متعین ہوئے

[۱۵۱۰] اجمیر کے شمال میں ریاست جودھ پور (مارواڑ)، جنوب میں اودے پور (میواڑ) و میرواڑہ مشرق میں ریاست ہائے جے پور و کشن گڈہ اور غرب میں جودھ پور واقع ہیں۔

کہتے ہیں کہ اجمیر کا نام اُس کے بانی راجا اجا کے نام سے پڑا تھا۔ وہ چوہان راجپوت تھا اُس نے شہر و قلعۂ اجمیر کی بنیاد قریب ۱۴۵ء کے ڈالی تھی لیکن ڈاکٹر بہلر Bühler وغیرہ کا خیال ہے کہ اس راجہ اجا اور اجے کا زمانہ قریب ۱۱۰۰ء کے رہا ہوگا۔ تو پھر یہی زمانہ اجمیر کی آبادی پڑنے کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ اجے کے لڑکے آنا یا ارنو نے ۱۱۵۰ء کے قریب آنا ساگر کا خوبصورت بند بندھوایا تھا جس پر بعد ازاں شاہجہاں نے ایک شاندار سلسلہ سنگِ مرمر کے محلات اور کوشکوں کا تعمیر کرا دیا۔ ۵۸۷ھ (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج دہلی و اجمیر کا فرمانروا تھا، اُس کے زمانہ میں شہاب الدین محمد غوری نے دہلی پر حملہ کیا۔ اور ناکام رہا۔ ۵۸۸ھ (۱۱۹۳ء) میں محمد غوری پھر افغانستان اور وسط ایشیا سے تازہ دم فوج لیکر آیا، پرتھی راج نے شکست پائی گرفتار اور قتل ہوا۔ دہلی سے فارغ ہو کر محمد غوری اجمیر آیا اور یہاں باشندگان کا قتل عام ہوا۔ پہلے پرتھی راج کا ایک لڑکا پھر اُس کا چچا ہری راج حاکم ماتحت کے طور پر اجمیر میں رہے۔ اس کے بعد قطب الدین غوری نے جو اُس وقت محض نائب السلطنت تھا اجمیر کو سلطنت دہلی سے ملحق کر لیا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں میر سولنکی قبائل کے اہل گجرات نے رات کے وقت تارا گڈھ پر حملہ کیا یہی قلعہ شہر اجمیر کا محافظ پناہ دہندہ ہے۔ ان لوگوں نے قلعہ کی مسلمان محافظ فوج کا ایک ایک شخص قتل کر ڈالا۔ سید حسین خنگ سوار شقہ دار (گورنر) کی درگاہ جنہوں نے اس حملہ میں جان بحق تسلیم کی تھی تارا گڈھ میں اب بھی نہایت قابل لحاظ مقام ہے اسکی قبر مع اُسکے رفقا اور اُسکے گھوڑوں کی قبروں کے اُسی ایک احاطہ میں ہے جو "گنج شہیداں" کہلاتا ہے۔ اسکے بعد شمس الدین التمش نے پھر یہاں حکومت اسلامی قائم کی جو تیمور اعظم کے حملہ تک رہی۔ رانا کومبھ والی میواڑ نے اُس زمانہ کی بدعملی اور ملکی بے انتظامی سے فائدہ اُٹھا کر اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں مار ڈالا گیا۔ اسکے بعد ۸۶۰ھ (۱۴۵۵ء) سے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) تک اجمیر مسلمان فرمانروایان مالوہ کے تحت میں رہا۔ حتی کہ سلطنت مالوہ کا الحاق گجرات سے ہو گیا۔ مال دیو راٹھور نے مارواڑ کی گدّی پانے کے بعد ہی اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر اکبر کے اوائل عہد میں اجمیر پھر سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔

اکبر کے زمانہ میں اجمیر اُسی نام کے ایک صوبہ میں داخل تھا جس کا اطلاق تقریباً پورے راجپوتانہ پر ہوتا تھا۔ قلعہ او راطراف اجمیر کی اہمیت ریاست ہائے راجپوتانہ کے قلب میں واقع ہونے کی حیثیت سے سلاطین اسلام نے فوراً دریافت اور محسوس کر لی تھی۔ یہ بڑے بڑے شوارع کا مرکز اور جائے اتصال تھا شمالی ہند کی

محمد معز الدین اور فرخ سیر کی معرکہ آرائی میں جو کھجوہ ۱۱۲۵ھ (ضلع فتح پور) میں ہوئی۔ فرخ سیر نے فتح پائی۔ اس میں حسن علی خاں اور اُن کے بھائی نے نمایاں شجاعت و مردانگی کا اظہار کیا۔ فتح کا سہرہ انھیں کے سر رہا اس حسن خدمت اور فوز عظیم کے صلہ میں بادشاہ نے حسن علی خاں کو منصب ہفت ہزاری اور

گجرات تک ایک طرف، اور مالوہ تک دوسری طرف، سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اجمیر خود تجارت کا مرکز و مرجع تھا، اس کے مستحکم قلعہ سے اسکی بخوبی اور کامل حفاظت ہوتی تھی۔ اطراف و نواح کے خشک و بے آب مقامات کے مقابلہ میں وہاں پانی بافراط تھا۔ اسلئے بادشاہان مغلیہ کے وقت میں اجمیر مسکن شاہان بھی رہا تھا۔ اکبر نے منت مانی تھی کہ اگر اس کے بیٹا ہوگا اور زندہ رہے گا تو وہ زیارت کے لئے آگرہ سے اجمیر جائیگا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند کے مرقد مبارک پر حاضر ہوکر سجدۂ شکر بجالائے گا۔ چنانچہ کمال عقیدت و استقامت کے ساتھ اس نے پا پیادہ چلکر اس منت کو پورا کیا۔ سلیم (جو تاج و تخت پاکر جہانگیر کہلایا) ۹۷۷ھ ۱۵۶۹ء میں اکبر کے مشکوئے معلی میں پیدا ہوا اور پھر مراد ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں۔ تو اکبر نے آکر اس متبرک درگاہ کی زیارت کی شہر کے گرد قلعہ بندی کرائی۔ تین برس میں دولت خانہ مکمل ہوا۔ اُمرا و ارکان سلطنت نے عالیشان عمارات بنوائیں۔ اکبر نے آگرہ سے اجمیر تک راہ بتانے کے لئے سڑک پر برابر ستون بنوائے تھے جو اب تک اچھی حالت میں ہیں جہانگیر و شاہجہاں نے بھی اپنے عہد کا معقول حصہ اجمیر میں صرف کیا یہی مقام ہے جہاں جہانگیر کے دربار میں سرٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول بادشاہ انگلستان کا سفیر حاضر ہوا تھا اور جہاں محرم ۱۰۲۵ھ (جنوری ۱۶۱۶ء) میں اسکو پہلا موقع بجا آوری آداب و کورنشات کا ملا۔ اجمیر کے قریب چھ میل جنوب کو ۹ رمضان ۱۰۶۹ھ کو (جون ۱۶۵۹ء میں) اورنگ زیب نے اپنے بھائی دارا شکوہ کو شکست دی تھی۔ دارا کی شکست کے زمانہ سے فرخ سیر کے وزرا یعنی برادران سادات کے زوال و وفات ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) تک اجمیر کی تاریخ قابل ذکر واقعات و ہنگاموں سے خالی نظر آتی ہے۔ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں اجیت سنگھ ولد راجہ جسونت سنگھ والی ماروار نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال سے فائدہ اُٹھاکر بادشاہی صوبہ دار کو مار ڈالا۔ اور اجمیر پر قبضہ کرلیا۔ محمد شاہ کا تسلط عارضی طور پر پھر ہوگیا تھا لیکن دس سال بعد اُس نے ابھے سنگھ پسر اجیت سنگھ کو صوبہ دار اجمیر اور احمد آباد کا مقرر کردیا ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) سے ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) تک راٹھور راجگان مارواڑ اجمیر پر برابر حکمراں رہے۔

شہر اجمیر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۷۳۸۳۹، تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ۸۶۲۲۲ ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں ۱۱۳۵۱۲ پر پہونچی۔ اسمیں شک نہیں کہ اس اضافہ شمار میں غالب حصہ زائرین درگاہ شریف کا ہے لیکن ویسے بھی

سات ہزار سوار کا مرحمت فرمایا۔ ان کے باپ کا نام سید عبداللہ خاں تھا۔ اس لئے ان کو سید عبداللہ خاں قطب الملک یار وفادار ظفر جنگ خطاب عطا کیا۔ وزارت اعلیٰ کا بلند پایہ تفویض ہوا۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ قطب الملک نے عنان وزارت راجہ [۱۵] رتن چند کے ہاتھ میں دیدی تھی اور خود عیش و عشرت

مجموعی حیثیت سے شہر کی آبادی ترقی پر ہے۔ ریلوں کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہے۔

یہاں کئی ریلوں کا مرکز ہے۔ شہر کے گرد سنگین دیوار تھی، جواب شکستہ حال ہے۔ پانچ پھاٹک ہیں۔ آثار قدیمہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) اڑھائی دن کا جھونپڑا بیسال دیو چوہان راجہ کا تعمیر کردہ تعلیم گاہ تھا۔ محمد غوری کے عہد میں مسجد بنا۔ اس مسجد اور قطب مینار دونوں کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی بتایا جاتا ہے۔ (۲) آناساگر کے بند پر شاہجہانی محلات و قصور۔ جو محض تفرج گاہیں تھیں۔ ان میں سے چار اب بھی اچھی حالت میں ہیں مع فرش حمام سابق۔ (۳) درگاہ خواجہ صاحب مع مساجد اکبری و شاہجہانی اور دیگر عمارات اور پھاٹک۔ حضرت خواجہ نے ننانوے سال کی عمر میں بروز جمعہ ۶۔ رجب ۶۳۳ھ (۱۶ مارچ ۱۲۳۶ء) کو وفات پائی۔ روضہ کی تعمیر ۶۳۳ھ میں بعہد شمس الدین التمش شروع اور زمانہ ہمایوں میں ختم ہوئی۔ ماہ رجب میں ۶ روز تک عرس ہوتا اور زائرین و طالبین کا ازدحام کثیر رہتا ہے۔ (۴) اکبر کا تعمیر کیا ہوا قلعہ۔ یہ ایک مربع اور بھاری، عظیم الشان عمارت ہے۔ یہی بادشاہوں کا قیام گاہ اور جائے دربار عام تھا۔ (۵) نور چشمہ، باغ و مسکن شاہان مغلیہ (۶) دولت باغ۔ اسکو جہانگیر نے نصب کیا تھا۔ آناساگر کے قریب شہر کی طرف ہے اس میں بڑے کہنہ سال درخت موجود ہیں۔

[۱۵] الہ آباد۔ ہندو اور اسلامی تاریخوں کے لحاظ سے نہایت قدیم اور اہم مقام ہے۔ پانڈو برادران نے اپنی جلاوطنی کا کچھ زمانہ اس کے اطراف میں بسر کیا تھا۔ راجہ رام چندر اور سیتا جی بھی اپنی طویل اور دیر طلب سفر کے دوران میں یہاں سے ہو کر گزرے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوسم جو جنوب میں ہے وہی کوسمبھی ہے جس کا مہابھارت اور پرانوں میں ذکر ہے لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد اب وثوق کے ساتھ صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں مگدھ کے گپت حکمرانوں کی عملداری میں شامل تھا۔ چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ الہ آباد ہرش وردھن بادشاہ قنوج کی مملکت میں ساتویں صدی کے شروع میں شامل ہوا تھا۔ ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) میں سلطان معز الدین محمد سام مشہور بہ شہاب الدین غوری نے اس پر حملہ کیا اور اس وقت سے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں نواح الہ آباد کے قطعات کڑا کے متعلق تھے یعنی وہی قصبہ گورنر کا دار الصدر تھا ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں معز الدین کیقباد اور اس کے باپ سے کڑے میں ملاقات ہوئی۔ لڑکا ابھی بچ

میں پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد جو موافقت بادشاہ سے رہی اور بعد چندے جس قدر ناموافقت و مخالفت بڑھی اور فرخ سیر اور ان بھائیوں اور ان کے ہوا خواہوں کا جو حشر ہوا جو واقعات و انقلابات نظم سلطنت

کے تحت پر اپنے دادا غیاث الدین بلبن کی جگہ پر بیٹھا تھا اور باپ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بنگالہ سے آیا تھا۔ دونوں کڑے میں یکجا ہوئے اور اس نیت سے کہ خونریزی کی نوبت نہ آئے دریائے گنگ کے شکم میں اپنی اپنی کشتیوں پہ سوار ہو کر دونوں گفتگو کرنے لگے۔ ارادہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ دارالسلطنت کو جائیں گے۔

اواخر تیرھویں صدی میں الہ آباد علاؤالدین حکمران کڑا کے قبضہ میں تھا۔ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ (۱۷ جولائی ۱۲۹۶ء) کو اسی دریائے گنگ کے ظرف پار یگ کے میدان میں مانک پور و کڑا کے مابین علاؤالدین نے اپنی زشت اعمالی و شقاوت قلبی سے اپنے معمر چچا سلطان جلال الدین فیروز شاہ کو دغا و فریب سے مار ڈالا۔ اس کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک یہاں بغاوت کے اعلان، مطلق العنانی کے اشتہار اور تشددات و خونریزی کے واقعات ہوتے رہے۔ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اسکو پٹھانوں کے ہاتھ سے ظہیرالدین بابر نے چھینا۔ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر مہم ٹھٹھ پر جا رہا تھا، پریاگ سے گزرا تو حکم دیا کہ گنگا و جمنا کے اتصال پر جو ہندوؤں کی تیرتھ کا مقام ہے قلعہ آگرہ کے نقشہ پر ایک عظیم الشان اور مضبوط قلعہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ۲۵ سنہ جلوس میں یہ کام تمام ہوا۔ جسمیں چار قلعے اور بارہ باغ اور کئی مکانات دلکشا بیگمات اور شاہزادوں کی محلسرائیں اور دولت خانۂ شاہی تعمیر و تکمیل کئے گئے۔ ٹکسال قائم کی گئی۔ شریف سرمدی کا یہ شعر سکہ پر منقوش ہوا ؎

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد　　　بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

شاہزادہ سلیم جو بعد کو جہانگیر کہلایا ہے اپنے باپ کے عہد میں الہ آباد کا صوبہ دار تھا۔ خسرو باغ کے نام سے مشہور پرفضا اور روح افزا روضہ، جہانگیر کے باغی و طاغی بیٹے خسرو کی شوریدہ سری کی یاد اب تک تازہ کر رہا ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بوندیلے بسر کردگی چھتر سال، سلطنت مغلیہ کے خلاف یورش و سرکشی کر رہے تھے کہ نواب محمد خاں بنگش (والی فرخ آباد) صوبہ دار الہ آباد مقرر کر کے انکے استیصال کے لئے بھیجا گیا۔

شہر الہ آباد کی مردم شماری ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار چھ سو پانچ نفوس کی تھی۔ شہر جمنا کے بائیں ساحل پر جہاں وہ گنگا سے آکر ملگئی ہے آباد ہے۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کا نام پریاگ یا پراگ (قربانی کی جگہ) تھا۔ دونوں دریاؤں کے اتصال کی وجہ سے یہ مقام ہمیشہ متبرک سمجھا گیا ہے۔ عام طور پہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک تیسرا دریا سرسوتی جو پنجاب کے جنوب و غرب میں بہو کر ریگزار میں ناپید ہو گیا تھا، یہاں آکر پھر نمودار ہوا ہے اور گنگا جمنا سے مل گیا ہے۔ سب سے پرانی یادگار قلعہ کے اندر ایک ستون ہے جس پر اشوک

میں پیش آتے رہے، بادشاہ گردی کی جو داستانیں یکے بعد دیگرے سنائی گئیں صفحات تاریخ اُن سے سیاہ ہیں تفصیل و نقل کی ضرورت نہیں۔ قطب الملک اور اُن کے رفقا و اعوان نے سلطان ابراہیم بن رفیع الشان بن شاہ عالم کو تخت پر بٹھایا۔ ایک طرف سادات بارہہ اور اُن کے انصار تھے، دوسری طرف محمد شاہی فوج

کا کتبہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اسی پر دوسری تحریر سامودر گپت کی فتوحات واقع چوتھی صدی مسیحی کی ہے اور تیسری نور الدین جہانگیر کے عہد کی۔

پہلے پراگ نام تھا، اکبر نے عظیم الشان قلعہ بنوایا تو اُسی زمانہ سے شہر کا نام الٰہ باس۔ الٰہ آباس اور الٰہ آباد قرار پایا اور ایک صوبہ کا صدر مقام ہو گیا۔ اکبر کے عہد کے اختتام پر شاہزادہ سلیم (جہانگیر) اس صوبہ کا گورنر تھا اور قلعہ میں رہتا تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں شہر اور صوبہ کو بھی اُنھیں تمام انقلابات و شور و شر سے سامنا کرنا پڑا جو بالائی ہند میں زوال سلطنت مغلیہ کے پیش خیمہ تھے ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) سے ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) تک محمد خان بنگش فرخ آباد یہاں کا گورنر رہا۔ پھر ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں مرہٹوں نے شہر پر حملہ کیا۔ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں صفدر جنگ نواب اودھ کے ہاتھ میں عنان حکومت آگئی۔

پُرانے وقت کی عمارتیں قلعہ میں بہت کم باقی ہیں، ان کی بجائے زیادہ تر انگریزی بارکیں و سلاح خانہ وغیرہ قائم ہوئے ہیں۔ خسرو باغ شاہی تفریح گاہ ہے۔ خسرو جو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جس نے اکبر کے بعد آگرہ کا تخت چھین لینے کی کوشش کی تھی مگر شکست پائی، اس باغ میں خود اُس کا، اور اُسکی ماں و بہن کا روضہ ہے۔

عہد حاضرہ میں الٰہ آباد نہ صرف تین ندیوں کا سنگم بلکہ ہر قسم کے علمی و عقلی، ذہنی و مادی دریاؤں کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی اپنے قابل و فاضل اساتذہ اور پروفیسروں کے طفیل میں، اور پبلک لائبریری اپنی نادر و بیش بہا کتابوں کے ذخیرہ کے ساتھ اہل شوق اور تشنگان کمال کو صلائے کرم دے رہی اور فیض ابدی پہونچا رہی ہیں۔ ہائی کورٹ اور بورڈ مال کی عدالتیں اہل مظلمت اور اہل دولت کے لئے سب سے بڑی نصفت گاہیں ہیں ریلوں کا مرکز ہے جہاں سے ہر سمت سڑکیں جاتی ہیں۔ تجارت و آمد و رفت کے لیے ہر قسم کی سہولت و آسانی مہیا ہے۔

روحانیات کے تعلق سے پریاگ راج، ایک بڑا پرستش گاہ اور مرتاض رشیوں کا مرجع ہے۔

عمارات محدثہ میں یونیورسٹی کا سینٹ ہال۔ لا کالج، یونیورسٹی لائبریری، میور سنٹرل کالج، میو ہال، تھارن ہل مین میموریل (جس میں کتب خانہ عامہ ہے) ہائی کورٹ، پتھر کا گرجا، بہت سے مدارس و کالج اور ہوسٹل و بورڈنگ ہوس (طلبا کے دار الاقامت) قابل دید ہیں۔

کا توپ خانہ۔ ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ مطابق ۲۔ نومبر ۱۷۲۰ء کو لڑائی ہوئی۔ سادات نے شکست پائی قطب الملک مجروح ہوئے۔ حیدر علی میر آتش انکو اپنے ہاتھی پر سوار کر کے بادشاہ کے سامنے لے گیا۔ بادشاہ نے جان بخشی کر کے حیدر قلی خاں کے حوالہ کر دیا۔ قطب الملک بادشاہی قید میں کئی سال رہے۔ دوبار زہر دیا گیا۔ پہلی مرتبہ اُن کے وفا کیش خدمتگار نے زہر مہرہ گھس کر پلا دیا تھا خوب استفراغ کیا اور قے سے زہر نکل گیا۔ دوسرے دن بادشاہی خواجہ سرا بھر پیالہ لے کر آیا۔ حسن علی خاں نے راضی بہ قضا ہو کر پی لیا۔ اور سلخ (۳۰) ذیحجہ ۱۱۳۵ھ

نواب شایستہ خاں بن نواب آصف جاہ کی شاہجہانی مسجد جو ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں تعمیر ہوئی تھی گردش روزگار کے نذر ہو چکی، حسب روایت مسٹر ہیل اوائل علداری ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی ۱۸۰۰ء میں کرنیل کیٹ نے اسکو تغیر دیکر اپنی بود و باش کا مکان بنا لیا تھا۔ دس سال بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں کمپنی کے حکم سے پھر اصلی صورت میں تبدیل کر دیگئی بشپ ہیبر نے بھی اس مسجد (جامع) کو دیکھا تھا وہ اسکی بڑی تعریف کرتا اور اسکی خوبی موقع' بلندیٔ حسن مناظر قرب دریا کی تحسین کرتا ہے۔ مدت تک جمعہ و عیدین کی نماز یہاں ہوتی رہی آخر یہ حالت بھی انقلابات حکومت۔ و شدائد غدر سے قائم نہ رہی۔ اب اینٹ اور چونے کا ڈھیر ہے۔ عہد اسلام کی مفصلہ ذیل یادگاریں اب بھی باقی ہیں (۱) خلد آباد کی سرائے ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) (۲) مسجد شیخ محمد افضل (بقعہ افضل) ۱۰۸۰ھ (۱۶۷۰ء) (۳) خانقاہ شیخ محمد افضل (مقام افضل) ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) (۴) مسجد دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) (۵) خانقاہ دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) کی تعمیر ہیں۔ (۶) مقبرہ شاہ عبد الجلیل جو نہایت مرتفع اور شاندار و مستحکم ہے۔ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد غلام محی الدین نے ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ (۷) روضۂ زینت النسا بیگم واقع بہادر گنج ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) (۸) مسجد حسام الدین علی خاں، نزدیک باغ بادشاہی بزمانہ قیام شاہ عالم بادشاہ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) (۹) مسجد قدم رسول ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) (۱۰) مسجد رسول پور (سادات۔ حال انگریزی آبادی) قریب قدم رسول۔ تعمیر نو عبدار خاں، فیلبان منصبدار شاہ عالم ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) (۱۱) مقبرہ منور علی شاہ۔ شاہ صاحب بڑے معمر و سن رسیدہ ہو گزرے ہیں۔ آپ کے متعلق عجیب غریب روایات مشہور و مذکور ہیں۔ تاریخ پیدایش ۱۱۔ رمضان ۱۰۹۱ھ (۱۵۔ اگست ۱۶۸۰ء) اور تاریخ وفات ۱۴۔ جمادی الآخر ۱۱۹۹ھ (۱۵۔ اپریل ۱۷۸۵ء) بتائی جاتی ہے۔

الہ آباد کے آثار خصوصی میں بارہ سرائیں اور بارہ دائرے شمار کئے جاتے تھے۔ سرائے مسافروں کی قیامگاہ اور وارد و صادر کے لئے جائے راحت تھی۔ دائرہ Monastery یہاں کے باشندے فقرا اور اہل اللہ کے مساکن اور درویشوں کے مقامات کو کہتے ہیں۔ جس کے احاطہ میں متعدد مکانات بلکہ مساجد و خانقاہیں بھی ہوتی ہیں

(۱۹ ستمبر ۱۸۲۳ء) کو تین سال قید رہکر اس جہان ناپائدار کے تردداتِ و صعوبات سے نجات پائی اور وہیں دہلی میں دفن ہوئے ؎

عجب رنیق ہے یہ بیکسی کہ بعد فنا　　　سرِ مزار مجاور ہے نوحہ گر بھی ہے!

یہاں کبھی ذوق و شوق والوں کا مجمع اور طالبانِ فضل و کمال کا ہجوم رہتا تھا۔ علوم صوری و معنوی سے افادہ وافاضہ کرتے تھے۔ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں جو دوائر شہرت و منود رکھتے تھے۔ صاحب آرائش محفل نے انکو مختصراً تحریر کر دیا تھا کچھ ان میں سے بھی اب نابود ہو چکے ہیں۔ ان کے آثار زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

محو ہونا ہی تجھے ہے اگر اے یاد دنا　　　میری تربت پہ نشانِ سرِ تربت ہونا

چند باقی ہیں۔ مثلاً دائرہ شاہ اجمل (سابق دائرہ شیخ محمد افضل و شاہ خوب اللہ) ۲۔ دائرہ شاہ محبت اللہ (اصلاً دائرہ شاہ محب اللہ) ۳۔ دائرہ شاہ غلام علی (حال محمدی شاہ) ۴۔ دائرہ شاہ نور علی وغیرہ۔ مگر ان میں نہ وہ رونق ہے نہ وہ عالم۔ شرف المکان بالمکین بزرگوں کے نام لیوا اور نقش قدم پر چلنے والے اخلاف حتی الوسع ان کو آباد کئے ہوئے ہیں، اور اس دورِ خزاں میں بھی محرمان بادِ صبا کے مشامِ جاں میں گل و یاسمن کی روح پرور نکہت پہونچا رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں اس سیاہکار نقاش سطور کو دائرہ شاہ رفیع الزماں قدس سرہ اور مرقد مبارک حضرت شاہ عبد اللطیف نور اللہ مضجعہ کا تبرکاً و تیمناً ذکر کرنا چاہئے تھا [(حضرت شاہ عبد اللطیف کا سال وفات ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء اور تاریخ وفات "ہائے شیخ عجم" ہے) گنج گل چین تو از تنگی داماں گلہ دارد۔ حضرت قدسی منزلت "ملاذی و ملجائی سیدی و مولائی شاہ محمد عبد اللطیف (ثانی) الحسنی الحسینی القادری النقشبندی طاب ثراہ (متوفی ۱۳۳۶ھ) کی بارگاہ والا میں بھی مجھے اپنی عقیدت و امتنان کا اظہار لازم ہے جنکی آرامگاہ خاکی کے زیر سایہ بیٹھکر میں نے ان اوراق کو سیاہ کیا ہے۔ اور جن کے حریم پاک کے آستانے پر بہت سے فیوض ربانی اور لطائف و برکات روحانی راقم قلیل البضاعت کے شامل حال رہے ہیں۔ مقبول نامقبول نہ رہے گا مگر صفحات روزگار پر یہ سطریں آپکی بدولت یادگار رہجائینگی۔

ع　مانہ مانیم و بہ گیتی سخن از ما ماند

۲۰۱۰ کھجوا، ضلع فتح پور صوبجات متحدہ میں ایک قصبہ و تحصیل کا نام ہے۔ آبادی تین ہزار ہوگی۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع پر ۱۹۔ ربیع الاول ۱۰۶۹ھ کو (۱۶۵۹ء میں) فتح پائی تھی انے موضع کھجوہا کے موقع پر ایک نئے قصبہ کی بنیاد اس کی یادگار میں ڈالی۔ اور نگ آباد نام رکھا مگر پرانا نام بدستور مشہور رہا۔ سرائے اور بارہ دری، باغ اور تالاب جو اسی زمانہ میں بنائے گئے تھے ابھی عمارتیں ہیں اور سرکار کی طرف سے ان کی قدر ضرورت

میر عبدالجلیل نے ان کی مدح میں مثنوی لکھی تھی جو مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسب موقع شامل و داخل کردی۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

مگر نواب قطب الملک یک رنگ — وزیر صاحب شمشیر و فرہنگ
ارسطو فطرتے، آصف نشان است — یمین الدولہ عبداللہ خان است
نظر پروردۂ فضل الٰہی — جوان بخت، تفضل دستگاہی
بدیوان چوں نشیند نوبہار است — بمیدان چوں درآید ذوالفقار است
امیر واہب جود و کرم اوست — وزیر صاحب سیف و قلم اوست
دلیل سیف، جدش شاہ مرداں — بدیہی کے بود محتاج برہان

مرمت و درستی بھی ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۱۲۴ھ (سنہ ۱۷۱۲ء) میں فرخ سیر نے اپنے برادر عم زاد عزالدین کو اسی مقام کے قریب شکست دی تھی اور یہاں سے فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی گیا تھا۔

۱۵۱ راجہ رتن چند، عبداللہ خاں وزیر کا دیوان بلکہ اس کے سارے خان ومان کا منتظم اور مختار مطلق تھا۔ اس کی دست اندازی شاہی احکام و دفاتر تک پہونچ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ رتن چند کسی وقت پرچونی کی دوکان رکھتا تھا۔ اپنے ایمان و عقائد میں کامل و پختہ تھا۔ فرائض کو پوری پابندی واحتیاط سرگرمی سے ادا کرتا تھا۔ مگر چنداں عاقبت اندیش نہ تھا۔ اپنے سود و بہبود پر نگاہ رکھتا۔ اپنے آقا کے نام سے اُسکے اختیارات نافذ کرتا تھا اور کل سلطنت پر حکمرانی کرنے لگا تھا۔ اس کی مطلق العنانی و دست درازی کی شکایت مسامع بادشاہی تک پہونچی مگر وزیر نے کبھی توجہ نہ کی۔ اُسکو برطرف کیا۔ رفیع الدرجات کے تخت نشین ہونے پر اس کی اور راجہ اجیت سنگھ کی خواہش سے جزیہ اُٹھا دیا گیا۔ آخر زمانہ میں وہ قاضیوں اور مفتیوں کے تقرر اور امور مذہبی میں بھی دخل دینے لگا تو لوگوں کی نفرت اور بیزاری بہت بڑھ گئی۔ نواب نظام الملک کا بالخصوص بدخواہ اور بداندیش تھا۔

حسن علی خاں کے قتل ہوجانے پر رتن چند نے عبداللہ خاں کے پاس خبر بھیجا اور خود پالکی میں سوار ہوکر قیامگاہ کو بھاگا جارہا تھا کہ مغلوں نے دیکھ لیا۔ اس کی سخت گیری کی وجہ سے عوام الناس عاجز تھے ہجوم کثیر ہوگیا۔ رتن چند کو پالکی سے باہر کھینچ لیا اور خوب زد و کوب کی۔ اور تن برہنہ کرکے محمد امین خاں کے مکان پر لوا گئے۔ خان موصوف نے ستر پوشی کرائی، کپڑے پہنائے اور پابجولاں کرکے قید خانہ بھیجدیا۔

بخاطر خصم را اگر خار خار است | برو برہانِ قاطع ذوالفقار است
وطن او را چو واسطا از قدیم است | قلم ہم زو است۔ حجت مستقیم است

شاہجہاں آباد میں بے آبی کی شکایت سخت تھی۔ قطب الملک نے پرپت گنج کی نہر ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں اصل نہر شاہجہانی سے نکلوائی اور وہاں کے لوگوں اور زمین کو سیراب اور جل تھل کر دیا میر عبدالجلیل نے تاریخ لکھی ؎

بحر جود و فیض، قطب الملک، عبداللہ خاں | نہر خیرے کرد جاری، آن وزیرِ محتشم
بہر آں عبدالجلیل واسطی تاریخ گفت | نہرِ قطب الملک مد بحرِ احسان و کرم

میر عبدالجلیل اور اُن کے ارکانِ خاندان کا مسلک باوجود ان تمام تعلقات و مراسم کے نہایت منصفانہ رہا ہے۔ یہ حضرات جہاں سادات بارہہ کے فضائل و محامد و احسانات کو یاد کرتے، اُنکی سخاوت و شجاعت کی داد دیتے ہیں، اُنکے کارہائے نیک و مآثر شریفہ کو شمار کراتے، اُنکی خوبی و نیکنامی کا ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کا قلم اس حقیقت کے لکھنے سے باز نہیں رہتا کہ "....... در اواخرِ دولت، راہ غلط پیمودند و تا روز قیامت داغ بدنامی بر خود بُردند۔" ...... دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "سبحان اللہ ہر چند سادات خود دعوائے سلطنت نہ کردند و اولاد تیموریہ را بر تخت نشاندند۔ اما حرکتے کہ با محمد فرخ سیر کردند مبارک نیامد۔ دمے بآسایش نگزارید ند نفسے بہ طمانیت نہ کشیدند۔ دریاہائے فتنہ از ہر چہار طرف تبلاطم درآمد و اسباب زوال دولت آمادہ گشت" (سرو آزاد)

یہ بھی میر صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میر غلام علی آزاد بھی بادشاہ کو ہر جگہ "فرخ سیر شہید مرحوم" کے نام سے یاد کرتے اور احترام مناسب کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔

فرخ سیر کی نسبت خاتمہ مثنوی میں جبکہ وہ ناشاد و نامراد دنیا سے رخصت ہو چکا تھا میر صاحب لکھتے ہیں

(۱) کہ شاہنشہ سوئے جنت خرامید

(۲) پے تاریخ ایں مصرع برآمد | بہ بحر رحمت ایزد درآمد

(۳) شہنشہ را بغفراں یاد آرند۔

میر سید محمدؒ امیر الامرا حسین علی خاں کی نسبت ایک گفتار (نوٹ) میں لکھتے ہیں "چوں بادشاہ از گفتہ سادات تخلف نمی کرد، بداں رضا داد، ہشتم ماہ مذکور (ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ - ۱۰ فروری سنہ ۱۷۱۹ء) ہفت چوکی و منصبداران خاص حلبو[۱۱۵] و حلبو قدیم را شکوہ برخیزانیدہ در قلعہ بند و بست خود نمود و مردم معتبر از نوکران خود جا بجا نشاندہ خود در حویلی دارا با فوج مسلح نشستہ و نواب قطب الملک و اجیت[۱۱۶] سنگھ راٹھور

---

۱۱۵ ایم ریان فرانسیسی لکھتا ہے کہ فرخ سیر کا باڈی گارڈ (عسکر محافظ ذات) کئی سو عورتوں کی جماعت پر مشتمل تھا۔ اس میں حبشنیں بھی تھیں، گرجنیں بھی، قلماقنیاں بھی۔ تیغہ و سپر سے سب مسلح رہتی تھیں۔ اکثر کے پاس نیزہ و بندوق بھی ہوتی تھی۔ حبشیہ اور نیگرو اس ملک میں عموماً حبشن کہلاتی تھیں۔ قلماق تاتاری عورتیں ہوتی تھیں۔ گرجن عورتیں وہی ہیں جن کے حسن وجمال کا اس قدر شہرہ و غلغلہ ترکستان اور ایران میں پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں تو یہ کسی قدر موٹی اور بھدی سمجھی جاتی ہیں۔ حسن و نزاکت کے لئے اتنا لحم و شحم یہاں ناموزوں اور ناشایان بتایا جاتا ہے۔ نورس و نوخیز نازک و نازنین عورتیں، جن کی تازگی و رعنائیت کا آغاز ہو، اہل ہند کی نظر میں جذب خاص رکھتی ہیں اور ذوق سلیم کی چیزیں ہیں

۱۱۶ راجہ اجیت سنگھ کی معرکہ آرائی کا ذکر سید حسین علی خاں کے ذیل میں آچکا ہے، نیز جودھ پور ماڑواڑ کے سلسلۂ تاریخ میں۔ اجیت سنگھ جودھ پور کا راجہ یا اُس زمانہ کے بعض مورخین کے بقول "موروثی زمیندار" تھا۔ راجپوت ٹھاکر راٹھور نسل سے تھا۔ سنہ ۱۰۹۱ھ (سنہ ۱۶۸۰ء) میں مسند نشین ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اجیت سنگھ نے خود مختاری و بغاوت و شرارت اختیار کی تھی۔ بہت ہی ناشائستہ حرکات و افعال کا مرتکب ہوا تھا۔ مساجد کو منہدم کر کے اُن پر مندر تعمیر کرائے تھے۔ سنہ ۱۱۲۷ھ (سنہ ۱۷۱۵ء) میں اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر بادشاہ سے کی۔ دار الخلافہ کے واقعات اور ہنگاموں کے سلسلہ میں حتی کہ فرخ سیر کی معزولی و قید و بند میں بھی اجیت سنگھ کا نام بارہا آیا ہے۔ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) میں دہلی سے چلے جانے کے بعد اُس نے سنہ ۱۱۳۴ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں اجمیر پر قبضہ کر لیا اور سکہ بھی اپنے نام سے جاری کیا۔ لیکن دو سال بعد محمد شاہ کے حوالہ کر دیا۔ اسکی حالت دیکھ کر اہل تدبیر اور واقعہ طلبوں نے اس کے بیٹے ابھے سنگھ کو ترغیب دی کہ ریاست جودھ پور کو تباہی و بربادی سے بچانا ضروری ہے اور اس ضرورت سے باپ کا قتل کرا دینا اور خود ابھے سنگھ کا گدی پر بیٹھنا عین مصلحت۔ نظر بر آں ابھے سنگھ نے سنہ ۱۱۳۷ھ (سنہ ۱۷۲۴ء) میں اپنے بھائی بخت سنگھ کو آمادہ کیا، اُس بدبخت نے اس عمل زشت کا ارتکاب کر کے اپنے باپ کے قتل کا پاپ اپنے سر پر لے لیا۔ یہ واقعہ محمد شاہ کی شروع عملداری کا ہے۔

راجہ جودھ پور و میرٹھ را در قلعہ فرستاد تا بادشاہ را در قید آوردہ میل در چشمش کشیدہ کور کردہ محبوس داشتند۔"

اس کا دستور یہ تھا کہ لوہے کی سلائی آگ میں گرم کرکے آنکھ کے اندر پھیر دی جاتی تھی۔

اجیت سنگھ ایک رات خواب شیریں میں تھا کہ قتل کردیا گیا۔ بارہ تیرہ برس باپ دادا کی گدی پر رہا۔ ابھے سنگھ مسند نشین ہوا۔ ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) میں اس نے محمد شاہ بادشاہ کی بڑی خدمت و نمک حلالی کی احمد آباد کو فتح کیا۔ سربلند خاں کی بغاوت و سرکشی کا استیصال کیا۔ چھبیس سال حکمراں رہا

اجیت سنگھ علم و ہنر اور اہل کمال کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے ایک مبسوط کتاب تالیف کرائی تھی جس میں سورج بنسی خاندان کے حالات شروع سے لیکر اپنے عہد تک کے درج کرائے تھے۔ اس کا سال ولادت ۱۶۷۹ء تھا۔ اجیت سنگھ کا بیٹا ابھے سنگھ جو ۱۷۵۰ء تک حکمران رہا اس بارہ میں اپنے باپ کا ہم قدم صاحبان فن کا سرپرست اور شعرا کا محسن و مربی تھا۔ جسونت سنگھ (پدر اجیت سنگھ) جو ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۸۱ء میں فوت ہوا۔ ہندی اور بھاشا میں کامل بتایا جاتا ہے۔ اس نے بھاشا بھوشن اور کئی کتابیں فلسفہ ویدانت پر یادگار چھوڑی تھیں۔

۳۱۰ ریاست جودھ پور، مارواڑ، راجپوتانہ میں سب سے بڑی، سب سے پرانی اور تاریخی ریاست ہے۔ چاروں طرف سے دیسی ریاستوں سے محصور ہے۔ مارواڑ کو اسکی خشکی اور کم آبی کی وجہ سے ارض الموت Region of death کہتے ہیں۔ مکرانہ کی سنگ مرمر کی مشہور کانیں بھی اسی ریاست میں ہیں، جہاں سے مرمر اراولی کے بلوری پتھروں کی طرح برآمد ہوتا ہے۔

مہاراجگان جودھ پور، رام چندر جی فرمانروائے اجودھیا کی نسل سے ہونے کے دعویدار، اور راٹھور راجپوتوں کے مسلم سردار ہیں۔ خاندان مغلیہ کے ساتھ عرصہ تک اس خاندان کے تعلقات قرابت و رفاقت نہایت مخلصانہ و عزیزانہ و راستبازانہ رہے ہیں۔ راجہ اُدے سنگھ نے اپنی بہن جودھ بائی اکبر کو اور اپنی بیٹی مان بائی شاہزادہ سلیم جہانگیر کی زوجیت میں دی تھیں۔

مہاراجہ کا خطاب سب سے پہلے جسونت سنگھ نے پایا۔ وہ مالوہ کا صوبہ دار اور افواج شاہی کا سالار تھا۔ بہت سی مہمات اور لڑائیوں میں بادشاہ کی طرف سے شریک ہوا اور داد تہور و شجاعت دی۔ اسی کا بیٹا اجیت سنگھ تھا جو باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اور جس نے اورنگ زیب کی وفات (۲۸۔ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۱۔ فروری ۱۷۰۷ء)

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "ہشتم ماہ ربیع الآخر (۱۸ - فروری ۱۷۱۹ء) سادات بارہہ فرخ سیر بادشاہ را گرفتہ اسیر زنداں کردند۔ شاہ تا دو ماہ محبوس ماندہ جان بجاں بخش سپرد۔ بالآخر ہشتم جمادی الآخر جنازۂ آں بادشاہ مغفور را بیروں آوردہ در مقبرۂ ہمایون مدفون ساختند۔"

کے بعد اپنے آبائی مقبوضات و ملوکات پر قبضہ کرلیا اور راجگان اودے پور و جے پور سے اتحاد و موافقت کرکے مسلمانوں کے دست تصرف یا ماتحتی سے خلاصی حاصل کی۔ معاہدۂ اتحاد میں اہم شرط یہ تھی کہ والیان جودھ پور و جے پور خاندان راجہ اودے پور سے پھر رد ام قرابت و ازدواج قائم کرلیں گے جو سلاطین مغلیہ سے قرابت کرلینے کی وجہ سے منقطع ہوگئے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ اقرار بھی تھا کہ اودے پوری شہزادیوں سے جو اولاد ہو اسکو اور رانیوں کی اولاد کے مقابلہ میں مسند نشینی کا حق فائق حاصل ہوگا۔ اسی عہد و پیمان کی بنا پر ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں سانبھر میں راجگان موصوف سے سخت لڑائی ہوئی۔ جس کے ایک دو سال بعد بالآخر بادشاہ سے صلح ہوگئی۔

براوران سید (بارہہ نے) جن کو فرنگی مورخین "نفتیلہ جنگ" یا **the Warwick s of the East** کہتے ہیں جب حکومت و اقتدار پایا تو اجیت سنگھ کو مجبور کیا کہ حسب دستور قدیم اور معمول شاہانہ اپنے وارث و ولی عہد کو مع کسی قدر فوج کے بطور یرغمال (کفیل یا ضمانت) آستان خلافت کو بھیجکر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرے۔ اس نے انکار کیا۔ تو تنبیہ و سرزنش کے لئے فوج کشی کی گئی۔ تنگ ہوکر اس نے اپنا بڑا لڑکا ابھے سنگھ دہلی بھیجا اور اپنی لڑکی (راج کنواری) فرخ سیر کو بیاہ دی۔ پھر پائے تخت کو خود بھی گیا۔ کئی سال تک مہاراجہ مذکور نے وہاں حاضری دی اور امرائے دربار اور ارباب حل و عقد کی سازشوں اور مشوروں میں شریک رہا لیکن جب ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں فرخ سیر قتل کردیا گیا تو اس نے سادات کی موافقت اور شرکت کار و رفاقت سے انکار کردیا۔ اُن کے افعال و اعمال سے بیزاری و تنفر کا اعلان کیا اور ابھے سنگھ کو دہلی میں چھوڑ کر خود ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں جودھ پور واپس چلا آیا۔

شہر جودھ پور پرانا اور سرسبز مقام ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء میں ۸۰۴۳۰ تھی۔ اس کو راو جودھا نے آباد اور اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ یہاں کی تجارت خوب اور روز افزوں ترقی پر ہے۔

ؔ میرٹھ کا قلعہ مشہور ہے جس پر اکبر کے حکم سے ۹۶۹ھ (۱۵۶۲ء) میں مرزا شمس الدین نے فوج کشی کی تھی جس وقت رانائے اودے پور کی حکومت میں تھا۔ جے مل رانا کی طرف سے حاکم تھا اس نے کمال دلیری و مردانگی سے مقابلہ کیا۔ آخر ٹھہر نہ سکا اور قلعہ خالی کردینا پڑا۔ اکبر کے عہد میں یہ سرحدی مقام اور نہایت زبردست

مسٹر طامس بیل Thomas W. Beale مفتاح التواریخ میں لکھتے ہیں کہ "فرخ سیر دو ماہ بعد از معزولی خود بتاریخ دوازدہم ماہ جمادی الثانی سال مذکور حسب ایمائے قطب الملک در زندان بقتل رسید۔ لاش او را در مقبرہ ہمایوں بادشاہ دفن کردند"۔ لیکن اپنی تاریخ انگریزی میں تاریخ قتل ۹۔ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ امئی ۱۷۱۹ء تحریر کرتے ہیں۔

حسب روایت سیر المتاخرین فرخ سیر ترپولیہ کے اوپر ایک تنگ و تاریک کمرہ میں محبوس رکھا گیا تھا۔

واضح رہے کہ فرخ سیر کے مظالم کی فرد بھی کچھ کوتاہ نہیں ہے۔ اُس نے ۱۷۔ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ (۷۔ دسمبر ۱۷۱۲ء) کو جہاندار شاہ پر فتح پائی۔ تخت فرمانروائی پر اکبر آباد میں جلوس کیا۔ مرزا ایزد بخش رسا کو جو کسی وقت عالمگیر کا میر منشی تھا اور پھر اعظم شاہ کا متوسل اور خیر طلب ہو گیا تھا" طلب کر کے حکم دیا کہ اُسکی مونچھوں کا ایک ایک بال جڑ سے اکھاڑ ڈالا جائے بعد ازاں اُس کو ایک ستون سے باندھ کر آگرہ میں بڑی خواری و بے دردی سے ہلاک کرا دیا۔ شاہجہاں آباد پہونچکر جہاندار اور امیر الامراء ذوالفقار خاں اور بہت سے دیگر اعیان دولت کو قتل کرایا۔ ان کے سرتن سے جُدا کر کے نیزوں پر آویزاں کئے گئے۔ لاشیں پانوں کی طرف سے رسیوں سے باندھ کر ہاتھی کی پشت پر ایک اس طرف، اور دوسری دوسری طرف لٹکا دی گئیں۔ خود بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا۔ راجہ سُبھہ چند دیوان امیر الامراء کو گرفتار کر کے اُسکی زبان کٹوالی۔ جہاندار کے بہت سے مشیروں کو پکڑوا کر مروا ڈالا۔ اعز الدین پسر جہاندار شاہ، عالی تبار پسر اعظم شاہ اور ہمایوں بخت اپنے چھوٹے بھائی کو معدوم البصر کر کے محبس بھیجدیا۔

اسی بنا پر بعض مورخین نے اسکو حجاج[۱] ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ تشابہ (ایک بے اختیار بادشاہ کا ایک باقتدار وزیر سے) صحیح ہو یا نہو مگر اس میں شک نہیں کہ اسکی شمشیر خون آشام نے اپنی پیاس

سمجھا جاتا تھا۔ اجمیر و ناگور سے اُس طرف میرٹھ تعاجب مل کی تعریف و تحسین کے ترانے راجپوت اب تک گاتے ہیں۔ آئین اکبری میں اس کو متعلق سرکار ناگور کے لکھا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ "قلعہ از سنگ دارد۔" آزاد دہلوی دربار اکبری میں راجہ میرٹھ کے ذیل میں ناقل ہیں کہ سہارٹ باشندگان میر داڑہ کا نام تھا۔

[۱] حجاج بن یوسف ثقفی عبد الملک بن مروان اموی کا امیر الامرا تھا مورخین عرب اسکو "وزیر عظیم الوزر لتقصیر" کہتے ہیں۔ شاید اپنے جرائم اور جور و ستم کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، نہایت ظالم و سنگدل، نا خدا ترس

بہت سے گنہگاروں اور بے گناہوں کے لہو سے بلا امتیاز بھائی تھی بلکہ بدنصیب و نادانشمند فرخ سیر اپنا دامن زیادہ تر

شخص تھا۔ اسکی گورنری و وزارت کی یادگار بہت سے دردانگیز و روح فرسا واقعات صفحۂ روزگار پر مرتسم ہیں۔ اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ کیا تھا۔ یکم ذیحجہ ۷۲ھ (۲۰ اپریل ۶۹۲ع) کو مکہ معظمہ کا محاصرہ شروع ہوا۔ چھ ماہ تک عرصہ پیکار گرم رہا۔ ام القریٰ کے باشندے اور حرم بیت اللہ میں اماں پانے والے سامان رسد اور خورد و نوش کے بہم نہ پہونچنے سے عاجز آگئے تھے۔ بہت سے صحابۂ پاک قتل ہوئے۔

بایں ہمہ اس کے اعمال حسنہ سے بھی کچھ باتیں قابل تحریر ہیں۔

(۱) قرآن پاک پر اعراب لگائے۔ سچ یہ ہے کہ یہ کام نہایت ضروری اور اچھا تھا۔ اور وہ دنیائے اسلام پر بڑا احسان کر گیا ہے۔ اگر یہ شخص حجاج "سفاک" نہ ہوتا تو خدا اعلم کہ اس کار خیر کے اجر و مزد میں اس کا شمار نیک و برگزیدہ مسلمانوں کے کن کن طبقوں میں کیا جاتا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر کے تعمیر کرائے ہوئے خانہ کعبہ کو ۷۴ھ (۶۹۳ع) میں تغییر دے کر اپنی طرف سے بنوایا

(۳) ملوک عرب میں سب سے پہلے اپنے بادشاہ عبدالملک بن مروان کا سکہ سونے چاندی پر ۷۶ھ (۶۹۵ع) میں منقوش کر کے جاری کیا۔ اس سے پیشتر بادشاہان عجم کے سکے چلتے تھے۔ (بروایت دینوری)

(۴) بلاذری لکھتا ہے کہ ۷۸ھ (۶۹۷ع) تک محکمہ خزانہ میں فارسی طریقے، فارسی زبان اور فارسی رقوم و ہند سے رائج تھیں۔ صالح بن عبدالرحمن کاتب نے جو سیستان کے گرفتار شدہ قیدیوں میں سے کسی کا بیٹا تھا زادان پسر فرخ (فرخ حجاج کا میر منشی تھا) ایک دوسرے فارسی یا مجوسی سے جو سواد (کلدانیہ) کے دفتر مالی میں باش کاتب اور محاسب کے عہدہ پر ممتاز تھا شیخی یا طنز سے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو حسابات کلیتاً عربی میں کر دیئے جائیں۔ حجاج نے سنا تو اسکے موافق حکم دیدیا۔ زادان کا بیٹا مردان شاہ چلا اٹھا کہ "خدا تیری نسل دنیا سے قطع کر دے جیسے تو نے فارسی زبان کی جڑ کاٹی ہے۔" دربار کے پارسیوں نے رشوت کے طور پر اسکو ایک لاکھ درہم بھی پیش کئے تاکہ وہ اس خدمت سے عجز و ناقابلیت کا اعتراف کر کے دستکش ہو جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ حتی کہ ۸۱ھ (۷۰۰ع) میں عراق کا سارا دفتر عربی زبان میں مستقلاً منتقل ہو گیا۔

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ "عبدالملک کا قابل مگر بے رحم نائب حجاج بن یوسف تھا۔ (یہ ایسا نام ہے جو یزید، ابن زیاد اور شمر کے نام سے کسی طرح کم نفرت و تباغض کے ساتھ نہیں سنا جاتا۔ یعقوبی)۔ مکہ کے محاصرہ اور گولہ باری اور ابن زبیر کی بغاوت کے استیصال کے لئے اسکی تیاری و آمادگی ہی نے سب سے پہلے اسکی سفارش، اسکے آقا سے کی تھی۔ پھر تو بائیس برس (۷۲ھ ۶۹۱ع سے ۹۵ھ ۷۱۴ع) تک یہ تشنہ خوں اور بے درد شخص دنیائے اسلام میں ملعون و مطرود بنا رہا۔ اپنی سنگدلی اور شقاوت سے جن لوگوں کو اس نے قتل کرایا تھا ان کی تعداد کا تخمینہ ایک لاکھ بیس ہزار کیا جاتا ہے

ناکردہ گناہ لوگوں کے خون سے داغدار کرکے رخصت ہوا ہے۔ ؎

بجرم عشق مرا گر کشی، چہ خواہی گفت؟ جواب خون رقیباں کہ بے گناہ اند!

میدان جنگ میں جان دینے والوں کا شمار اس کے علاوہ ہے (مروج الذہب مسعودی) باشندگان کوفہ کو اس کا ان کلمات سے خطاب کرنا "خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ گردنیں میری طرف بڑھی ہوئی ہیں۔ اور سر درد ہو جانے کے لئے خود بخود جھکے ہوئے ہیں۔ کاٹے جانے کے لئے تیار ہیں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جو اسکو انجام تک پہونچاؤں گا۔ اس شخص کی خون آشام طبیعت کے خاصہ کو ظاہر کرتا ہے۔ (الفخری) اس کے آقا عبدالملک کے الفاظ بھی اس سے کم درجہ نہیں رکھتے جو اُس نے مسند خلافت پر اپنے جلوس کی خبر پاکر کہے تھے۔ جب بار یاب نوید لیکر پہونچا وہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ سنتے ہی اُس نے کتاب مقدس بند کر دی اور اُس کی زبان سے نکلا هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ

حجاج سلام (سنہ ۶۶۱ء) میں پیدا ہوا۔ ترپن چون سال کی عمر پاکر شوال ۹۵ھ (جولائی ۷۱۴ء) میں فوت ہوا۔ مدفن کوفہ ہے۔ مگر طبری لکھتا ہے کہ پندرہ روز مرض آکلہ میں مبتلا رہا تھا۔ پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے سخت تکلیف و ایذا تھی، اسی حالت میں جمعہ ۲۱۔ رمضان المبارک ۹۵ھ کو چون سال کی عمر میں اُس کا خاتمہ ہوا۔ واسط میں دفن کیا گیا مگر قبر نیست و نابود ہو گئی۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ

عراق و خراسان میں بیس سال حکومت کی۔ مرنے کے بعد قیدیوں کا شمار کیا گیا تو پچاس ہزار نکلے بیس ہزار عورت اور تیس ہزار مرد۔ اس کے زندان خانہ پر چھت نہیں ہوتی تھی۔ برف اور بارش قیدیوں پر گزرتی اور دھوپ کی شدت اور آفتاب کی طپش و تابش سے جلتے بھنتے تھے۔

اگرچہ یہ سب مظالم بھی اختلال عقل کا نتیجہ تھے مگر کچھ دن پہلے سے حواس ظاہری میں اختلال فاحش ہو گیا تھا جو جان کے ساتھ گیا۔ مرض الموت میں ایک منجم سے پوچھا کہ امسال کوئی بادشاہ مریگا یا نہیں۔ اس نے کہا کہ عنقریب وہ فوت ہونیوالا ہے جسکا لقب کلیب ہے۔ حجاج بولا کہ صغر سن میں تو میری ماں بھی مجھے کلیب کہا کرتی تھی۔ منجم نے جواب دیا وَاللّٰهِ اَنْتَ تَمُوْتُ۔ حجاج نے کہا "اچھا۔ پیشتر میں تمھیں کو روانہ کرتا جاؤں"۔ اور بیچارے بیگناہ کی گردن اڑوا دی۔

رجال کے سلسلہ میں حجاج کا شمار تابعین میں ہے۔

حجاج کے سوانح حیات "الحجاج ابن یوسف ۴۱ھ-۹۵ھ ہجریہ" کے نام سے جے، پیریہ J. Perier نے قلمبند کئے اور ۱۹۰۴ء میں پیرس میں طبع کرائے ہیں۔

سید حسین علی خاں

امیر الامرا سید حسین علی خاں، اگرچہ قطب الملک سے چھوٹے تھے لیکن شجاعت و بسالت، سخاوت و علو ہمت، وقار و تمکنت میں بڑے بھائی سے بدرجہا فائق تھے۔ خلد مکاں کے عہد میں یہ پہلے حکومت رن تھنبور[۱] اور آخر کو فوجداری سدول تھانہ پر مقرر تھے۔ محمد اعظم کی لڑائی میں شاہ عالم نے انکی بہادری و مردانگی اور حسن تدبیر و کامیابی دیکھ کر سہ ہزاری منصب اور نقارہ عنایت کیا۔ پھر عظیم آباد پٹنہ کی نائب صوبہ داری پر مامور ہوئے۔ معز الدین اور فرخ سیر کی جنگ آزمائی میں حسین علی خاں نے کمال تہور و بہادری دکھائی۔ گھوڑے سے عین وقت پر اُتر کر پیادہ ہو گئے اور خوب لڑے کاری زخم کھائے۔ زمین پر گرے۔ فتح ہونے پر بادشاہ نے حسین علی خاں کو امیر الامرا بہادر فیروز جنگ خطاب، اور ہفت ہزاری و ہفت ہزار سوار کا منصب اور میر بخشی گری کی خدمت مرحمت فرمائی۔ جلوس کے دوسرے سال مہاراجہ اجیت سنگھ مارواڑ نے تمرد اختیار کیا۔ اُس کی تنبیہ و استیصال کے لئے سید حسین علی خاں مع ایک

---

[۱] رن تھم بھور (جس کا صحیح اور اصلی نام رنستمبھ پور (یعنی "ستدِ جنگ کا مقام" ہے) نظامت سوائی مادھو پور ریاست جے پور، واقع راجپوتانہ میں ایک مشہور قلعہ ہے جو مضبوط حصار اور دمدموں اور برجوں سے محاط و محفوظ ہے۔ اس کے اندر ایک محل، ایک مسجد، اور ایک قبر کسی مسلمان ولی کی باقی ہے، باقی سب فوجین باکرین ہیں سب سے پہلے سلطان التمش نے ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں اس کو فتح کیا تھا۔ مگر قبضہ صرف چند روز رہا۔ ۶۸۹ یا ۶۹۰ھ (۱۲۹۰ یا ۱۲۹۱ء) میں جلال الدین خلجی نے اور ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں علاء الدین کی افواج نے محاصرہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں خود علاء الدین گیا اور قلعہ فتح کیا۔ راجہ ہمیر دیو چوہان اور اُس کے رفقاء تہ تیغ ہوئے۔ یہ قلعہ کچھ زمانہ تک ریاست مالوہ کے، اور کچھ روز میواڑ کے، اور پھر ریاست بوندی کے تصرف میں رہا۔ ۹۷۶ھ (۱۵۶۹ء) میں اکبر نے خود محاصرہ کر کے اس کو ایک ماہ میں فتح کیا۔ اور سرکار رن تھم بھور کے نام سے مع تراسی محالات کے صوبہ اجمیر میں شامل کر دیا رن تھم بعد عرصہ تک خانخاناں کی جاگیر میں تھا۔ اسیران شاہی اور پولیٹیکل مجرم اکثر اسی قلعہ میں رکھے

فوج سنگین وجرار کے مامور ہوئے۔ فوج نے میرٹھ تک جہاں جہاں راجہ کا علاقہ تھا غارت و تاراج کرڈالا مظفر و منصور لشکر کی ہیبت و صولت سے راجہ بیکانیر کی طرف بھاگ گیا۔ مستحکم و استوار مقامات میں چھپتا اور پناہ لیتا رہا۔ اس بارہ میں امیرالامرا کا حکم جس طرح عمل پزیر ہوتا تھا حسب ذیل بتایا جاتا ہے "چونکہ اجیت سنگھ و جے ؎۱۱۱ سنگھ سوائی کے دیہات باہم مخلوط تھے۔ تعلقہ اول کی رعایا ہراس زدہ ہوکر فرار ہوجاتی تھی۔ اس لئے تاراج کرنے والوں کو حکم تھا کہ خالی مواضع کو لوٹ کر آگ لگادیں آباد مکانات سے مزاحمت نہ کریں۔ یہ حالت دیکھکر اجیت سنگھ کی رعایا جے سنگھ کی رعایا کی وساطت سے اماں مانگ کر آجاتی تھی۔ اُس وقت سزاول متعین کردئے جاتے تھے جو تاراجیوں کو ہدایت کرتے کہ آگ بجھادیں اور جو کچھ لوٹا ہو واپس کردیں۔ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہونے پاتی تھی۔ بعض ثقہ لوگوں نے گانوں والوں سے جاکر دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق کہا تھا کہ جلنے کے سواے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

امیرالامرا کا ضبط و نسق اس حد تک تھا کہ اُن کی فوجیں دو کھیتوں کے اندر ہوکر تنگ و باریک راستہ سے نکل جاتی تھیں مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ راہ سے ذرا ہٹ جائے۔ کھیتی کو ہاتھ لگانا معلوم جاتے تھے۔

زوال سلطنت مغلیہ پر سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں یہاں کے قلعہ دار نے خود اسکو راجہ بندی کے حوالہ کردیا تھا۔

اکبر نامہ میں وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ رن پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ قلعہ رن پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا جس پر بڑے بڑے پتھر تھے، اس لئے رن تھمبور جوشن پوش پہاڑ ہوا۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں ایک دوسری وجہ لکھی ہے۔ دو پہاڑ برابر برابر ہیں، ایک کا نام رن، دوسرے کا تھنبور ہے قلعہ تھنبور پر ہے۔

کندھار کا مشہور و مستحکم قلعہ رن تھنبور سے پورب کی جانب چند میل پر تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "قلعہ سنگین دارد بالاے کوہ"۔

؎۱۱۱ راجہ جے سنگھ ثانی، اجمیر یا جے پور میواڑ کا موروثی رئیس اور کچھواہہ راجپوتوں کا سردار۔ مرزا راجہ جے سنگھ کا پرپوتا تھا۔ معمولاً مرزا راجہ جے سنگھ سوائی کہا تا ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں "دھیراج راجہ جے سنگھ

اجیت سنگھ نے جب اپنی خرابی اور ملک کی تباہی دیکھی تو معتبر وکلا کی معرفت پیش کش حاضر کیا۔ اپنے بڑے لڑکے ابھے سنگھ کو بھیجا۔ اپنی لڑکی بادشاہ کی تزویج میں دینا چاہی، جس کو اس ملک میں ڈولہ دینا کہتے ہیں اور اس طرح اپنے عفو جرائم کا خواستگار ہوا۔ امیر الامرا نے بھی مصالحت پسند کی اور ابھے سنگھ کو ہمراہ لے کر حضور میں پہونچا۔ ڈولہ کے لئے فوج مامور کردی۔ ڈولہ پہونچنے کے بعد بادشاہ کی شادی کے مراسم ادا ہوئے۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ بادشاہان ماسبق کے زمانہ میں بھی ایسی عظیم الشان تقریب کبھی جلوہ پزیر نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے حسن انصرام کا سہرا انھیں بھائیوں کے سر باندھتے ہیں۔ میر عبد الجلیل نے ایک مثنوی رنگین اس رسم طوی کے متعلق لکھی اور داد سخنوری دی تھی۔

کچھ دن بعد امیر الامرا صوبہ دار دکن مقرر ہوگئے۔ میر جملہ سمرقندی، شکایت و سعایت کرکے فرخ سیر کا مزاج اُن کی طرف سے برابر برہم کرتا رہا۔ بہت سے ناگوار و خلاف شان واقعات اور نا ملائم مکالمات پیش آئے۔ مخالفت بڑھتی رہی۔ بعض امرا و والیان ملک نے سرتابی اختیار کی جن کی سرزنش و گوشمالی اور باقتضائے مصالح، کسی کسی سے مصالحت کے لیے، امیر الامرا کو حزم و ہوشمندی سے کام لینا پڑا۔ قطب الملک، دار الملک کی روز افزوں سازشوں اور دربار کی نزاعات سے پریشان و دل شکستہ

خطاب پایا۔ محمد شاہ نے "سوائی" اضافہ کیا۔ بڑا مدبر و منتظم تھا ہندوستان کے ہر حصہ میں اس نے بازار و کاروان سرائے تعمیر کرائے۔ بڑا دانشمند و حکیم تھا۔ اپنی یادگار پانچ رصدگاہیں چھوڑی تھیں۔ (۱) دہلی (۲) بنارس (۳) متھرا (۴) اوجین (۵) جے پور۔ زیج محمد شاہی کا مجوز و بانی بھی ہے۔ ۹۔ شعبان ۱۱۵۶ھ (۱۰۔ ستمبر ۱۷۴۳ء) کو وفات پائی۔ افواج بادشاہی کا سپہ سالار تھا۔ بڑے بڑے کارہائے نمایاں اس نے کئے تھے۔

۱۳ ؎ امیر الامرا کے بھائی قطب الملک عبد اللہ خاں، وزیر اعظم نے رفیع الدرجات کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اس کے حکم سے بادشاہ معزول (فرخ سیر) کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ باقتضائے صلاح ملکی دو بار زہر دیا گیا سخت جانی کا بُرا ہو، کارگر نہ ہوا۔ آخر تسمہ کشی کی، اور رگ گلو سے فنا بنایا۔ کہتے ہیں کہ یہ بدعت متعددہ خود اسی بادشاہ مخذول کی نکالی ہوئی تھی۔ جس روز فرخ سیر کا تابوت ہمایوں کے مقبرہ کو لئے جاتے تھے، دہلی میں بلوائے عام ہوگیا تھا۔ شہر کے ہزارہا حاجت مندوں نے، جو بادشاہ مخیر کی فیاضیوں اور خوان کرم و نوال سے روٹی پاتے تھے، کہرام برپا کر رکھا تھا۔ مخالف فریق لکھتا ہے کہ دو تین ہزار مرد و عورت خاصکر بچے اور بازاری فقیر جمع ہو کر ساتھ ساتھ روتے ہوئے چلے

ہو گئے تھے ان کی متواتر و مسلسل تاکید و اصرار پر امیر الامرا آخر ربیع الاول ۱۱۳۲ھ (فروری ۱۷۱۹ء) میں دہلی آئے۔ بادشاہ سے علانیہ مخالفت کی۔ ایک ہفتہ بعد قطب الملک اور راجہ اجیت سنگھ کے مشورہ سے قلعہ کا بندوبست ہوا۔ فرخ سیر قید کر دیا گیا۔[۱] اب بھی امیر الامرا کو آرام و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ پہلے شاہزادہ نیکوسیر اور اس کی فوج سے مقابلہ رہا۔ صلح ہوئی تو چھبیلہ رام ناگر، ناظم الہ آباد اور اس کے بھتیجے و جانشین گردھر بہادر نے مخالفت کی۔ بالآخر ان سے بھی مصالحت ہو گئی۔ اب نواب نظام الملک ناظم مالوہ[۳] کو امیر الامرا سے رنجش پیدا ہوئی۔ جس کا نتیجہ ایک معرکۂ عظیم تھا۔ صاحب سیر المتاخرین اور حاجی مصطفٰے لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں دونوں (بھائیوں) کے باہم صفائے قلب تھی اور اندرونی تعلقات صمیم و خالص نہ رہے تھے۔

اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک و تجویز اور نواب نظام الملک کی اجازت و مرضی سے ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء) روز یکشنبہ کو ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کو جس کا نام پہلے روشن اختر تھا تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا۔

۶۔ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ (۲۷۔ ستمبر ۱۷۲۰ء) کو میر حیدر ترک نے اپنی "فرد احوال پیش کرنے کے حیلہ

سادات کے متوسلین پر پتھر پھینکتے۔ نفریں کرتے، اور آوازے کستے تھے۔ بادشاہ کی قبر پر تین روز تک مجمع ہو کر مولود خوانی کرتے رہے۔ اُن میں بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حیدری، دوسرا نعمت اللّٰہی تفصیل محل مناسب پر آئیگی

[۳] مالوہ سے کشور ہند کا وہ مسطح حصہ مراد ہے جس کا رقبہ ۳۰،۶۲۰ میل مربع ہوگا اور جس میں وسط ہند کے مغربی تعلقہ کا بڑا حصہ داخل ہے۔ وہ جزیرہ نمائے ہند کا سب سے زیادہ زرریز سرسبز اور آباد و قابل سکونت جزو سمجھا جاتا ہے۔ اور جو تاریخ ہندوستان کے عہد قدیم و متوسط میں ہمیشہ نمایاں و ممتاز رہا ہے۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کے حدود حسب ذیل تھے۔ جنوب میں سلسلہ کوہ وندھیاچل۔ شرق میں سلسلہ کوہ مذکور جو شمال میں بھوپال سے چندیری تک چلا جاتا ہے۔ مغرب میں وہ شاخ جو اُم جھیرو سے چتوڑ (راجپوتانہ) تک پھیلی ہے شمال میں مکندوارہ سلسلہ جو چتوڑ سے چندیری کے پورب تک جا کر مل گیا ہے۔ مسلمانوں کی عملداری میں صوبہ مالوہ اور بھی وسیع تھا۔ یعنی علاقہ مندرجہ بالا کے علاوہ، ضلع نماڑ جنوباً مابین وندھیا دست پورہ سلسلہ ہائے کوہ کے، میواڑ (واقع راجپوتانہ) مغرب میں ہاروتی (یعنی ریاست ہائے بوندی و کوٹہ واقع راجپوتانہ) شمال میں،

سے قریب جاکر امیر الامرا کے پہلو میں خنجر مار دیا۔ قابو طلبان خوشامد پرست نے تن سے سر جدا کرکے بادشاہ کے روبرو حاضر کیا۔ صاحب مفتاح التواریخ تاریخ قتل ۲۷۔ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ لکھتے ہیں جو ۱۰ اپریل ۱۹۰۴ء کے مطابق ہوتی ہے۔

اور موجودہ ممالک متوسط کا بڑا حصہ جنوب و مشرق میں معہ گڑھا منڈلا کے شامل تھا۔

مالوہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بودھوں اور ہندوؤں کے زمانہ کے حالات بھی تفصیل کافی فراہم و قلمبند بتائے جاتے ہیں۔ لیکن اس زنجیر کی کوئی کڑی اپنے اندر دلچسپی و اہمیت کا کوئی نمایاں پہلو نہیں رکھتی اس لئے اُس کے تذکرہ سے گریز کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے سلطان التمش یہاں آیا اور ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں اوجین پر قابض ہوا۔ پھر بھیلسہ پر تاخت کی۔ ان دونوں شہروں پر تسلط ہوجانے سے تقریباً سارا مالوہ مسلمانوں کے تصرف میں آگیا جس کا زمانہ سلطان غیاث الدین بلبن کے وقت سے سلطان محمد بن فیروز شاہ کے عہد تک شمار ہوتا ہے۔ بالآخر ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں دلاور خاں غوری استقلال و بادشاہی کا دعویدار ہوا۔

۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) سے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) تک وہ ایک خود مختار سلطنت سا رہا جو صوبہ مالوہ یا مانڈو کے نام سے موسوم تھا۔ مانڈو وہ مشہور قلعہ ہے جو ان حکمرانوں کا دارالملک تھا۔ ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) میں اس کا الحاق گجرات سے ہوا۔ اس کے امرا اس سے پہلے برابر شاہان گجرات و شاہان دکن (خاندان بہمنی) و دیگر روسائے قرب و جوار سے معرکہ آرا ہوتے رہے۔ ابتداً فیروز شاہ نے دلاور خاں غوری کو (جس کا زمانہ ۷۹۳ھ سے ۸۰۳ھ تک یعنی ۱۳۹۰ء سے ۱۴۰۱ء تک تھا) مالوہ بطور جاگیر دیا تھا۔ لیکن تیمور کے حملہ سے جو انقلابات رونما ہوئے اُن سے منتفع و متمتع ہوکر وہ خود مختار بن گیا اور دھار کو اپنا دار السلطنت مقرر کیا۔ اس کا بیٹا الپ خاں عرف والی خاں جو ہوشنگ شاہ کے نام سے بھی مشہور ہے جانشین ہوا۔ اس کا زمانہ مابین ۸۰۸ھ و ۸۳۸ھ (۱۴۰۵ء و ۱۴۳۲ء) کے تھا۔ اُس نے ہوشنگ آباد کی بنیاد ڈالی، اس کا عظیم الشان مقبرہ سنگ مرمر کا بنا ہوا قلعہ مانڈو میں موجود ہے۔ وہی یہاں دار السلطنت کو اُٹھا لایا تھا۔ اُس نے ایک پسر نابالغ محمد غزنی خاں چھوڑا تھا جسکو اُس کے ولی و سرپرست محمود خلجی نے بعجلت ہلاک کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہوگیا۔ اس محمود خلجی کے عہد (۸۳۹ھ سے ۸۷۳ھ مطابق ۱۴۳۶ء سے ۱۴۶۹ء تک) میں مالوہ کو ... عروج و ترقی نصیب ہوئی۔ اُس کی مستعدی حدِ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اُس کی نسبت یہ مقولہ زبانزد ہوگیا تھا کہ "اُس کا خیمہ اُس کا گھر ہے اور میدان جنگ اُسکی آرام گاہ"۔ باایں ہمہ اُس کے انتظام اور ملک داری کی خوبی یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں عناد و عداوت قطعاً مفقود تھی۔ محمود نے اپنا قلمرو ہر طرف بڑھایا، منجملہ دیگر مقامات کے اجمیر ودرن تھمبور واقع راجپوتانہ اور ایلچپور واقع دکن کو بھی شامل کرلیا۔ ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں چند امرا کے

ہنگامہ فرو ہوا تو بادشاہ کے حکم سے لاش کی تکفین کی گئی اور نماز جنازہ پڑھکر اجمیر بھیجدی گئی وہاں ان کے باپ سید عبداللہ خاں کے جوار میں دفن ہوئی۔ [امتیاز کے لئے یہ سید عبداللہ خاں اجمیری عرف میاں خاں کہلاتے ہیں۔]

بلانے سے وہ دہلی کی طرف بڑھا۔ لیکن بہلول لودی نے مقابلہ کرکے اُسکو پسپا کردیا۔ اُسی زمانہ سنہ ۸۴۶ھ میں اُس نے رانا کمبھ والی چتور پر حملہ کیا۔ حیرت ہے کہ اِس کے نتیجہ اور اپنی اپنی فتح کے بابت دونوں فریق یکساں مدعی ہیں۔ رانا نے مشہور "فتح مینار" قلعہ میں تعمیر کرایا جو اس جنگ میں اُسکی کامیابی و باعزت نکلنے کی یادگار ہے۔ محمود کا بیٹا غیاث الدین سنہ ۸۷۳ھ (سنہ ۱۴۶۹ء) میں تخت نشین ہوا، اس نے باپ کی حیات میں نہایت صبر و ضبط سے کام لیا اور بہت محنت و تکان اُٹھایا تھا۔ لہذا عنان حکومت اپنے بیٹے ناصرالدین کے سپرد کی اور خود عزلت نشین و گوشہ گزین ہوگیا ناصرالدین کا زمانہ سنہ ۹۰۶ھ سے سنہ ۹۱۶ھ تک (سنہ ۱۵۰۰ء تا سنہ ۱۵۱۰ء) تمام تر بیرحمی و بیدردی و سنگدلی کے واقعات سے داغدار ہے۔ اُسکی بدنامی و جفا کاری کی داستان طویل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے خود اپنے باپ اور ولی نعمت کو بھی زہر دلا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا قبیح فعل تھا کہ جب سنہ ۱۰۲۵ھ (سنہ ۱۶۱۶ء) میں سفر کرتا ہوا جہانگیر مانڈو پہونچا تو اُس کو بحد غیظ و اشتعال پیدا ہوا اور اُس نے بادشاہ کے فرسودہ استخوان نکلوا کر دریاے نربدا میں پھینکوا دیے۔ ناصرالدین کالیا دیہہ محل کے ایک تالاب میں اوجین کے متصل غرق ہوگیا تھا۔ شراب کے نشہ سے بدمست تھا گرا اور پھر کس کی مجال یا کس کو پروا تھی کہ اُس کو نکالے۔ سنہ ۹۱۶ھ (سنہ ۱۵۱۰ء) میں محمود ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کی نسبت مورخین کا اجماع و اتفاق ہے کہ اُس کا یہ خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ سلطنت و حکمرانی محض تلوار سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اُس نے اس خیال یا ارادہ کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے طریق عمل کے دردناک نتائج دیکھے۔ اُس نے خود اپنے مقربین سے بدگمانی پیدا کرلی۔ میدنی رائے ایک راجپوت کو بلا کر وزیر سلطنت بنایا۔ اس شخص کے روزافزوں اثر اور قوتِ بازو سے خائف ہو کر اُس نے سنہ ۹۲۳ھ (سنہ ۱۵۱۷ء) میں سلطان مظفر شاہ والی گجرات کو اپنی دستگیری اور اس غاصب کے اخراج کے لئے بلایا۔ کچھ زمانہ بعد وہ میدنی رائے اور رانا سانگا والی چتوڑ سے نبرد آزما ہوا۔ گرفتار ہوگیا تھا مگر عزت و احترام کے ساتھ رہائی پائی۔ بااین ہمہ وہ باز نہ آیا اور چند سال بعد اُس نے رانا کے جانشین پر حملہ کیا۔ رانا کے رفیق و سرپرست بہادر شاہ والی گجرات نے پھر اسکو گرفتار کیا۔ فرار ہوجانے کی تدبیر و کوشش میں مصروف تھا کہ مار ڈالا گیا۔ اُس کے ساتھ بادشاہان مالوہ کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اور سنہ ۹۳۷ھ (سنہ ۱۵۳۱ء) میں یہ سلطنت گجرات سے ملادی گئی۔

سنہ ۹۴۲ھ (سنہ ۱۵۳۵ء) میں ہمایوں نے بہادر شاہ پر حملہ کیا اور مالوہ سے باہر نکالدیا۔ مندسور اور مانڈو میں متواتر شکستیں دیں۔ خاندان سوری کے عمل و حکمرانی میں (سنہ ۹۴۷ھ سے سنہ ۹۶۴ھ تک یا سنہ ۱۵۴۰ء سے سنہ ۱۵۵۷ء تک)

دنیا کی حالت دیکھئے! ایک وقت وہ تھا کہ ان دونوں بھائیوں خصوصاً امیر الامرا کی شجاعت وسخاوت، کرم وحلم، اور مواسات فطری کا ایک عالم معترف ومدح خواں تھا۔ ان کے احسانات کافہ انام پر مبذول ومشمول تھے۔ یہ کسی متنفس پر کبھی ستم وبیداد جائز نہیں رکھتے تھے۔ یا یہ کیفیت ہوگئی اور مقلب القلوب نے دلوں کو ایسا پھیر دیا کہ خود ان کے دست گرفتہ اشخاص سادات سے برگشتہ ومنحرف ہوگئے۔ جانتے تھے کہ ان کی قوت ودولت کا زوال خود اپنی خرابی وتباہی کا باعث ہوگا، مگر کہتے یہی تھے کہ "بار خدایا! یہ کشتی غرق ہوجائے اور ہم سب ڈوب جائیں۔" جب اپنوں کی یہ کیفیت تھی تو بیگانوں کی کون اور کیا شکایت کرسکتا ہے؟ ۵

مالوہ کا حاکم شیر شاہ کا باز دے راست شجاعت خاں تھا۔ جو اِن اطراف میں شجاول خاں کے نام سے شہرت خاص رکھتا ہے۔ اور جو شجالپورہ کا بانی تھا۔ جس کا تذکرہ آئین اکبری میں بھی کیا گیا ہے۔ [شجالپور یا شجاعت پور، واقع وسط ہند کا پرانا نام رائے کرن پور تھا] اُس کی وفات پر اُس کا لڑکا باز بہادر جانشین ہوا، اُس کی شہرت بالخصوص فن موسیقی اور دیگر علوم میں دخل ودستگاہ رکھنے کی وجہ سے ہے۔ اس سے زیادہ شہرت ودلچسپی اُس افسانہ آمیز وافسوں خیز تعشق سے باقی ہے، جو اِسکو روپامتی باشندہ سارنگ پور کیسی باکمال وصاحبِ جمال سے پیدا ہوگیا تھا۔ تفصیل وتشریح کی گنجایش نہیں ؎

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی   تاثیر حسن وعشق جو ہونا تھا ہو چکی

سنہ ۹۷۱ھ (سنہ ۱۵۶۲ع) یا ایک دوسری روایت کے مطابق سنہ ۹۶۸ھ میں باز بہادر کو مجبور ہوکر اکبر کی اطاعت کرلینا پڑی۔ اور مالوہ سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ ہوگیا۔ اور اٹھارھویں صدی تک رہا۔ آئین اکبری میں شیخ ابوالفضل نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ مالوہ کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں مختلف زمانوں میں اس صوبہ کے حدود اور اس کی وسعت مختلف رہی ہے۔ سنہ ۱۰۰۳ھ (سنہ ۱۵۹۴ع) میں اس میں بارہ سرکاریں یا اضلاع تھے۔ لیکن سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ع) میں صرف نو رہ گئی تھیں۔ مالوہ کو زیادہ اہمیت اپنے موقع ومحل کے لحاظ سے بھی حاصل تھی۔ وہ مغلوں کے شارع اعظم پر واقع تھا جس پر ہوکر شاہی فوجیں دہلی سے دکن کو جاتی تھیں، وہ ایک متعارف شاہراہ تھی، جو دھولپور، گوالیار، نرور، سرونج اور ہنڈیا میں ہوکر گزرتی تھی۔ اس زمانہ کے متعدد صوبہ داروں میں سے شاہزادہ مراد سنہ ۱۰۰۰ھ (سنہ ۱۵۹۱ع)، ونظام الملک اول سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۱۹ع)، اور مہاراجہ سوائی جے سنگھ والی جے پور سنہ ۱۱۴۷ھ (سنہ ۱۷۳۴ع) خاصکر قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد مختصراً مرہٹوں کا قدم مستقل طور پر مالوہ کی سرزمین پر قریب سنہ ۱۷۴۳ع کے جم گیا۔ جب کہ پیشوا اس

بجوں دیدہ نوشتیم بر درودیوار
کہ چشم مردمی از اہل روزگار مدار

سادات کی دولت کے زوال کے بعد لوگوں میں دو فرقے ہو گئے تھے۔ ایک انکو نیکی و بھلائی کے ساتھ یاد کرتا تھا۔ "نعمت اللہی"۔ دوسرا بری و برائی سے۔ "حیدری"۔ یہ مناقشے اسی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ مجالس اور باہمی صحبتوں میں دونوں فریق کے مابین بڑی بڑی بے لطفیاں ہو جاتی تھیں۔ میر عبدالجلیل اور ان کے متبعین اپنی وضع نمک حلالی و وفاداری پہ قائم رہے۔ سادات کی مدح سرائی و منت شناسی میں ان کی نوا سنجی برابر جاری رہی۔ میر صاحب کی ستائش گرانہ عربی رباعیاں موقع مناسب پر نقل کی جائینگی۔

فرخ سیر کی معزولی کی تاریخ مرزا بیدل نے کہی تھی ؎

دیدی! کہ چہ با شاہ گرامی کردند
صد جور و جفا ز راہ خامی کردند

تاریخ چو از خرد جستم۔ فرمود
سادات بوے نمک حرامی کردند

۱۱۳۱ھ

میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی نے اس کے جواب میں لکھا تھا ؎

با شاہ سقیم، انچہ شاید، کردند
از دست حکیم، ہرچہ آید، کردند

بقراط خرد نسخہ تاریخ نوشت
سادات دوائش انچہ باید، کردند

۱۱۳۱ھ

صوبہ کا نائب گورنر مقرر ہو کر آیا۔ بعد ازیں رفتہ رفتہ سارا ملک مرہٹہ سرداروں کی سپاہ کا جولان گاہ بن گیا اور ان کا اقتدار قائم و راسخ ہو گیا۔ حتی کہ آج انھیں کے اخلاف، سندھیا والی گوالیار، ہولکر والی اندور، دیواران دھار و دیواس، قابض و دخیل ہیں۔

۱۱ے میر حیدر خاں کاشغری، ترکان دوغلات توران سے تھا۔ اسکا پردادا میر حیدر چغتائی، صاحب تاریخ رشیدی، بابر و ہمایوں کے ہمیشہ ہمرکاب رہتا تھا۔ حیدری گروہ اسی قاتل سے منسوب ہے۔ میر شمشیر ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو "میر" کہتے تھے۔ سنی مذہب تھا بعض سادات بارہہ شیعہ غالی تھے۔ سیاسی اور ذاتی اختلافات کے علاوہ تعصب و اختلاف عقائد بھی باعث منافرت تھا۔

محمد یوسف[۱۱۵] برہان پوری[۱۱۶] نکہت تخلص، نے جو بعد کو "سخنور خاں" کے خطاب سے ممتاز ہوا طبقہ

۱۱۵ خوش سلیقہ اور زمانہ شناس شاعر تھا۔ اس کے آباو اجداد اکبر بادشاہ کے تصرف سے پہلے کشمیر کے سلاطین تھے۔ خلد مکاں کے عہد میں نکہت' امیر الامرا ذو الفقار خاں کا مصاحب تھا۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں وزیر الممالک قمر الدین خاں کا متوسل اور حاشیہ نشین۔ بعد کو بادشاہ نے "سخنور خاں" خطاب دیدیا تھا۔ بہت سے قصائد امرائے وقت کے محامد میں اس نے لکھے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں انتقال کیا۔ اس قطعہ کا صلہ بارگاہ خسروی سے ہزار روپیہ نقد اور خلعت پایا تھا۔

۱۱۶ برہان پور۔ اب ایک قصبہ چھتیس ہزار کی آبادی کا اور ایک تحصیل کا مقام ضلع نماڑ، صوبہ متوسط میں رہ گیا ہے۔ اسی میں آسیر گڈھ کا پرانا قلعہ بھی تھا۔ گریٹ انڈین پنینشولا ریلوے کا اسٹیشن لعل گڈھ یہاں سے دو میل پر ہے۔ شہر کے گرد پختہ دیوار ہے جس میں بڑی بڑی سڑکوں کی نکاس پر عظیم الشان پھاٹک بنے ہوئے ہیں۔ اور جس کی جانب جنوب دریائے تاپتی رواں ہے۔ بہت سے آثار قدیمہ و صنا دید اسلامی اس حصار سے باہر بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مضافات شہر دور دور تک چلے گئے ہوں گے۔ شہر کے باشندگان میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث کے قریب ہے۔ ان میں بوہرہ یا گجراتی تاجروں کا شمار غالب ہے۔

برہان پور کی بنیاد سنہ ۸۰۳ھ (سنہ ۱۴۰۰ء) میں نصیر خاں نے ڈالی تھی جو خاندیش کے فاروقی خاندان کا سب سے پہلا آزاد فرمانروا تھا۔ اسی نے شہر کا یہ نام شیخ برہان الدین غریب، دولت آبادی سے منسوب کرکے رکھا تھا۔ دریائے تاپتی کی دوسری جانب زین آباد بھی اسی زمانہ میں آباد کیا تھا۔ یہ ایک دوسرے بزرگ شیخ زین الدین سے موسوم ہے۔ اس کے بعد سے برہان پور برابر سلاطین فاروقی کا مسکن بنا رہا اور ان کے زمانۂ حکومت میں جو دو صدیوں سے زیادہ رہا ہوگا دو بڑی بڑی مساجد یعنی جامع مسجد اور بی بی مسجد یہاں تعمیر ہوئیں۔ سنہ ۱۰۰۸ھ (سنہ ۱۶۰۰ء) میں برہانپور کو مع مملکت فاروقیہ کے شہنشاہ اکبر نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اکبر اور اس کے جانشین کے عہد میں برہان پور کی رونق و تزئین خوب ہوئی۔ ابو الفضل لکھتا ہے کہ اکبر نے خاندیس کا نام شہزادہ دانیال کے نام سے داندیس رکھا تھا۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "یہ شہر بڑا ہے۔ اس میں بہت سے باغات ہیں۔ بعض میں چوب صندل بھی برآمد ہوتی ہے ہر قوم کے لوگ یہاں آباد ہیں اہل صنعت و حرفت بکثرت ہیں۔ موسم گرما میں یہ شہر گرد و غبار سے بھرا رہتا ہے۔ اور برسات میں گلی کوچے کیچڑ اور پتھروں سے پُر ہوجاتے ہیں۔" سنہ ۱۰۴۵ھ (سنہ ۱۶۳۵ء) تک برہان پور اس سلطنت کے شاہزادگان متعین دکن کا دار الصدر رہا پھر اس کی جگہ اورنگ آباد نے لے لی۔ اس انتقال کے بعد برہان پور، خاندیش کے بڑے صوبہ کا صدر مقام ہوگیا جس کی حکمرانی کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاہزادہ، خاص خاندان شاہی سے مامور ہوتا تھا

سادات کے برہم ہوجانے اور محمد شاہ کے استقلال سلطنت پر قطعہ تاریخ لکھکر بادشاہ کی نظر سے

سنہ ۱۰۲۳ھ (سنہ ۱۶۱۴ع) میں جب سر ٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول James I. کی طرف سے مغل اعظم کے دربار میں بر سم سفارت آیا تھا اُس وقت تک یہ ردّ و بدل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے فرزند شاہزادہ پرویز کے حضور میں اسی جگہ وہ آداب بجالایا تھا۔ سر ٹامس رُو کے چوالیس سال بعد نامور سیاح ٹیورنیر Tavernier کا گزر ہوا وہ اپنی زبان میں برہان پور کو برام پور Brampour لکھتا ہے۔ وہ یہاں سے ہوکر دو بار گزرا تھا۔

ٹیورنیر تحریر کرتا ہے کہ "یہ ایک بڑا شہر بہت زیادہ ویران و تباہ ہے بہت بڑی تعداد مکانات کی محض خس پوش ہے۔" پھر لکھتا ہے کہ "شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بھی ہے جس میں گورنر رہتا ہے۔ اس صوبہ کی حکومت بڑی وقعت و عزت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ جو صرف بادشاہ کے بیٹے یا چچا کو تفویض ہوتی ہے۔ اس شہر میں تجارت بھی بہت ہے۔ خود برام پور میں جیسا کہ اور صوبجات میں بھی پایا جاتا ہے ایک عجیب و بے اندازہ مقدار چھینٹوں (کالی کٹ کے کپڑوں پر چھپی ہوئی) کی تیار کی جاتی ہے جو نہایت صاف اور سفید ہوتی ہے۔ یہ ایران، ترکی، مسکوویہ، پولینڈ، عرب اور قاہرۃ الکبریٰ و دیگر مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔"

مساجد و دیگر عمارات کے نشانات بتاتے ہیں کہ جب شاہان مغلیہ کے عہد میں برہان پور اپنے منتہائے عروج و رونق پر رہا ہوگا تو اُس کا رقبہ پانچ میل مربع کے قریب ہوگا۔ سلطنت کے متعلق جو لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اُن میں بھی برہان پور کا حصہ غالب رہا ہے، خاصکر عالمگیر کے زمانہ میں۔ سنہ ۱۰۹۶ھ (سنہ ۱۶۸۵ع) میں بادشاہ خلد مکان ایک عظیم الشان سپاہ یہاں چھوڑ کر جیسے ہی کہ دکن کے فتح کرنے کے لئے اُٹھا تھا کہ مرہٹوں نے برہان پور کو غارت و تاراج کر ڈالا۔ اس کے بعد متوالی و متواتر معرکہ آرائیاں اس کے اطراف و نواحی میں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۱۹ع) میں مرہٹوں کا مطالبہ چوتھ (مال کا حق چہارم) باضابطہ منظور کرنا پڑا۔ سنہ ۱۱۳۳ھ (سنہ ۱۷۲۰ع) تا سنہ ۱۱۶۱ھ (سنہ ۱۷۴۸ع) کے مابین برہان پور نواب نظام الملک آصف جاہ کا دار الریاست رہا۔ وہ اُس وقت صوبہ دار دکن تھے۔ موجودہ حصار شہر پناہ سنہ ۱۱۴۱ھ (سنہ ۱۷۲۸ع) میں نواب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۷۴ھ (سنہ ۱۷۶۰ع) میں برہان پور پیشوا کے قبضہ میں آگیا۔ پھر سنہ ۱۸۰۳ع میں سرکار انگریزی کے قلمرو میں داخل کر لیا گیا۔

تانہ گوجری کی مسجد کے مینار نہایت شاندار کوسوں سے نظر آتے ہیں۔ بی بی مسجد اب بہت خراب و مرمت طلب ہوگئی ہے۔ جامع مسجد کے عربی و ہندی زبان کے کتبے بتاتے ہیں کہ اس کو سلطان عادل شاہ بن مبارک

گزارا تھا۔ "آفتاب ملک اقبال از کسوف آمد بدر" مادہ تاریخ تھا۔

شاہ فاروقی نے ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ امپیریل گزیٹر لکھتا ہے کہ اس کو علی خاں (علی شاہ) نے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں بنوایا تھا، دوسرا کتابہ شاہد ہے کہ اس کو بارہ سال بعد یعنی رمضان ۱۰۰۹ھ میں اکبر نے آکر دیکھا تھا۔ یہ نہایت عمدہ و شاندار عمارت سنگ سیاہ کی ہے جس پر نقاشی و سنگتراشی کمال ذوق سلیم اور خوش سلیقگی سے کی گئی ہے۔ آبادی سے ملی ہوئی ساحل دریا کے ساتھ ساتھ قلعہ کی ویران عمارت اور شکستہ فصیل بڑی رفعت و بلندی تک چلی گئی ہے۔ سر بفلک ایوانات، کمرے اور دیوان خلانے شہادت دیتے ہیں کہ اس کی شاہی محلسرائیں اور قصو کیسے رفیع و عظیم رہے ہوں گے۔ دو تین پختہ حوض بھی باقی ہیں۔ قلعہ کی مسجد کے صرف مینار رہ گئے ہیں۔ مضافات شہر کے مقابر میں میراں عادل شاہ اور مبارک شاہ کے مقبرے قابل تذکرہ ہیں جن کی مرمت محکمہ آثار قدیمہ نے کرادی ہے۔ شہر کے جنوب و مشرق کے گوشہ میں ترکی وضع کا سنگ مرمر کا ایک زنانہ حمام بھی ابھی باقی ہے۔ یہ اب ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا ہے۔ اور اس کی مرمت و نگہداشت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی چھتیں گنبد دار مثمن ہیں۔ درمیان کے حوض بند کر دیے گئے ہیں۔ جھرنے اور نالیاں ہنوز قائم ہیں۔ دریائے تاپتی سے (جو نیچے بہتی ہے) اس کی کرسی اسی فٹ بلند ہوگی۔ نہایت دلکش و دلفریب منظر ہے۔ اتوارہ کے دروازے کے باہر شاہ سونا کا گنبد مع چار دیواری کے نظر آتا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ گنبد نہایت خوشنما خربزہ کی شکل کا ہے۔ اس کے نیچے کا حصہ بارہ پہل کا ہے۔ ہر پہل میں نہایت خوش نما در بنے ہیں۔ اور بہت نفیس نقاشی اور گلکاری کی گئی ہے۔ یہ اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ شیخ نظام الدین چشتی بھکاری (متوفی ۹۰۵ھ) شیخ بہاء الدین، شاہ منصور، شیخ عیسیٰ، شاہ برہان الدین راز الٰہی، شاہ جمال قادری، شاہ بیم، اور اور بہت سے اولیاء کبار اور بزرگوں کی درگاہیں مرجع خاص و عام ہیں، ان کی شاندار عمارات اپنے گنبدوں، وسیع و خوبصورت مساجد اور خوش نما خانقاہوں کے ساتھ قابل دید ہیں۔ کوس بھر کے فاصلہ پر شاہ نواز خاں (خطاب، مرزا ایرج نام، عبدالرحیم خاں خانخاناں کے بڑے بیٹے) کا نہایت خوبصورت اور رفیع الشان مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس پر چینی کا کچھ کام باقی ہے۔ خود مرزا عبدالرحیم کی یادگار ایک پختہ سرائے ہے جس میں اب بازار لگتا ہے۔ دروازے کی پیشانی پر کتابہ لگا ہوا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء) میں اسکی تعمیر ختم ہوئی تھی

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے برہان پور میں ایک مکمل سلسلہ آب رسانی کا قائم و جاری کرایا تھا۔ اس میں سے بعض راجبہاؤں اور چاہات اور حوضوں کے نشانات اب بھی باقی ہیں حال میں رد و بدل یہ کیا گیا ہے کہ سنگی نلوں کے بجائے آہنی نلکا دنے گئے ہیں۔ اہل نظر کہتے ہیں کہ اس سے بہتر اور

میر غلام علی لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں اس خوبی و شان کا کوئی امیر سُنا یا دیکھا نہیں گیا۔ امیر الامرا جامع اخلاق حمیدہ تھا۔ اُس کی سرکار کا صلائے عام اور افراط طعام مشہور ہے۔ اورنگ آباد میں لوگ بالاتفاق کہا کرتے تھے کہ اس کے عہد میں بہت سے آدمیوں کے گھر کھانا نہیں پکتا تھا امیر الامرا

باقاعدہ مصفیٰ پانی پہونچانے کا کارخانہ کہیں پایا نہیں گیا۔

شاہجہاں کی محبوب اور شہرۂ آفاق ملکہ ممتاز محل کا انتقال بھی اسی برہان پور میں ہوا تھا وُہ زین آباد کے مشہور وسیع باغ کے اندر' جو ایک خوبصورت عمارت' ایک حوض کے مابین واقع تھی چھ مہینہ تک دفن رہی تھی' اس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔

باایں ہمہ افراط آب و آبرسانی برہان پور میں کسی وقت کثرت گرد و غبار کی شکایت بدرجہ غایت تھی۔

آزاد بلگرامی کو دکن کے قیام کے زمانہ میں اولیائے کرام کی قبور طیبہ کی زیارت خصوصاً حضرات شاہ برہان (متوفی ۱۳۳۱ھ) اور اُن کے پیر و مرشد سید لشکر محمد عارف (متوفی ۹۹۳ھ) کے مزارات کی آستان بوسی کے لئے بارہا یہاں آنا پڑا تھا۔ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ اس وسیع قلمرو میں کوئی دوسرا شہر اسکی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اس کی شاعرانہ یا عقیدتمندانہ توجیہ یہ فرماتے ہیں ؎

فتاد بس کہ گزر لشکر محمد را | غبار خیز بود کوچہائے برہان پور

۱۱۷ بلغور۔ دال معروف۔ ہر غلّہ جو چکی میں ڈال کر پیس لیا یا توڑ لیا گیا ہو اُس سے جو چیز یا آش تیار کیا جائے وہ بھی بلغور کہلاتا ہے۔ معمولاً آش گندم سے مراد ہوتی ہے۔

۱۱۸ شہر سورت، برلبِ دریائے راپتی، جانب جنوب، سمندر سے چودہ میل بذریعہ دریا، اور دس میل بر براہ خشکی واقع ہے۔ عہد اورنگ زیب خلد مکان میں صوبۂ گجرات میں شامل تھا۔ کسی وقت ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ اشیائے درآمد و برآمد کا کثیر حصہ تو بمبئی کو منتقل ہو گیا، تاہم ابھی سوداگری کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں اس ملک ہندوستان میں سورت سب سے زیادہ آباد شہر تھا۔ ۱۷۹۷ء میں اُس کے باشندگان کا تخمینہ آٹھ لاکھ نفوس کا کیا گیا تھا۔ اگر اس میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش مانی جاوے تو بھی یہ شمار کہاں تک گھٹایا جا یگا۔ ۱۸۱۱ء میں دو لاکھ پچاس ہزار اور ۱۸۱۶ء میں ۱۲۴۴۰۶ آبادی تھی جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ ۱۸۴۷ء کے بعد بتدریج اضافہ ہو کر ۱۹۰۱ء میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب پہونچی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ۶۸ ۴۸ ۱۱، اور ۱۹۲۱ء میں ۳۴ ۷ ۱۱ رہ گئی۔

کی سرکار کے طباخ اپنے حصے کا کھانا بیچ ڈالتے تھے۔ مکلف پلاؤ کی قاب چند (تانبے کے) پیسوں کے عوض مل جاتی تھی۔"

دکن میں غلہ خام و پختہ کے بلغور خانوں کا جاری کرنا، ہر ماہ کی گیارھویں اور بارھویں کی مجالس کا دکن اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور مقامات میں قائم کرنا، امیر الامرا کے اعمال خیر سے ہے۔ ان مجلسوں میں فقرا و مشائخ کے ساتھ وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ پیش آتا، طرح طرح کے سلوک کرتا۔ خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ لیکر مہمانوں کے ہاتھ دھولاتا تھا۔

امین الدولہ اور امیر الامرا کی بدمزگی اور میر عبدالجلیل کی سعی و سفارش سے امیر الامرا کا امین الدولہ کی تقصیرات سے درگزر کرنا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اُس کے انصاف و جوانمردی کی متعدد حکایتیں اور واقعات زبانزد ہیں۔ دکن پہونچنے سے پہلے روپیہ کی شدید ضرورت تھی وہاں پہونچکر ضرورت اور بڑھی، سخت پریشانی ہوئی۔ عمال و متصدیوں نے آمدنی کی قلت اور اخراجات کی زیادتی کی اطلاعیں بھیجنا شروع کیں۔ اسی بنا پر حیدر قلی خاں حاکم بندر سورت نے ملا عبدالغفور ملک التجار بندر مذکور کا مال و متاع جو ایک کرور سے زیادہ کا تھا ضبط کر لیا۔ متوفی کا لڑکا ملا عبدالحی مستغیثانہ حضور میں آیا اور بشرط معافی

یہاں کی دولت، تمام تر پارسیوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان بجز بوہروں کے باقی سب شکستہ حال ہیں۔ بوہرے البتہ دولت مند اور مرفہ الحال تاجر ہیں۔ ان کے پیر صاحب "ملا" کہلاتے ہیں اور یہیں رہتے ہیں۔ سیر و تفریح کا شوق اور مشغلہ سورت کی ہر ایک ملت اور طبقہ کے لوگوں میں یکساں، اور تمام مقامات سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ باغات میں برابر مختلف اقوام کے جلسے اور دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتے ہیں، جن پر صرف کثیر کیا جاتا ہے۔ شہر سے کچھ فاصلہ پر میلے لگتے ہیں۔ ان ضیافتوں میں پارسی بھی شامل و شریک ہوتے ہیں۔ بوہرے اپنی مہمان نوازی اور خوش گزرانی کی بدولت دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ تمام فضول مصارف اور شاہ خرچیاں اُس زمانہ کی یادگار سمجھنا چاہیئے جب دولت و مال کا ان کے پاس حصر و شمار نہ تھا۔

دریا کے بیچ اور ساحل کے وسط میں قلعہ ہے۔ اس میں بہت سی بے قاعدہ قلعہ بندی و تحصین کی گئی ہے ہر گوشہ پر برج ہیں جن سے قلعہ بہت پرفضا اور دریا سے نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ خداوند خاں لیکسٹرک سپاہی نے جو

مال پندرہ لاکھ روپیہ امیر الامرا کو نیاز دینا چاہا۔ امیر الامرا نے ایک روز صبح کے وقت مُلّا عبد الحیٰ کو بلا کر مال مذکور معہ رقم نیاز کے معاف و واپس کر دیا خلعت دیکر اُس کے وطن کو رخصت فرمایا۔ اور کہا کہ "آج شب کو اس شخص کے مال کے متعلق مجھ سے اور میرے نفس سے مجادلہ رہا۔ آخر الامر میں اپنے نفس طامع پر غالب آگیا۔"

[ایک ایسا ہی واقعہ معدلت شاہجہانی کی یادگار ہے۔ سُورت اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ اور ممالک بیرونی کی تجارت کے لئے ممتاز تھا۔ وہاں کے حاکم محمد امین نے تشخیص مال و ابواب میں سختی اور تحصیل مطالبات میں بیجا سخت گیری کی۔ اطلاع ہونے پر حکماً دربار میں گرفتار کرکے لایا گیا۔ منصب و جاگیر ضبط ہوئی۔ ثبوت جرم پر اُس کی آستین میں علی رُوس الاشہاد والعوام سانپ چھوڑنے کا حکم صادر ہوا۔ امرائے مقربین نے سعی و سفارش کی۔ نامقبول ہوئی۔ سُورت بادشاہ کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم کی جاگیر میں تھا۔ اہل تدبیر نے بیگم صاحبہ سے عریضۂ شفاعت لکھا کر پیش کرایا۔ شاہجہاں سخت ناخوش ہوا۔ امین کو حراست خانہ میں بھیجدیا۔ اور محلسرا میں جاکر شاہزادی کو نہایت زجر و توبیخ کی۔ اُسی سزا کے نفاذ کا پھر حکم دیا اب کس کو سرتابی یا گریز کی مجال ہو سکتی تھی۔ مگر سعد اللہ خاں کا نائب راجہ رگھوناتھ رائے (جس کو عالمگیر

شاہان گجرات کا ملازم تھا۔ ۹۴۷ھ (سنہ ۱۵۴۰ء) میں پرتگالی انداز پر اس کا نقشہ بنایا اور اس کو تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ مغلوں کے عہد میں اور انگریزوں کے زمانہ میں بعد غدر تک فوجی مرکز و مسکن رہا ہے۔ اسی خداوند خاں کی تعمیر کی ہوئی مسجد اور مرزا سامی کا مقبرہ بھی اُسی سال کا ہے۔ اس پر نہایت عمدہ نقاشی اور گلکاری کی گئی ہے۔ اس کے سوا نو سید صاحب کی مسجد اور نو مقبرے شہداکے اور مسجد سید عیدروس تعمیر شدہ ۱۰۴۹ھ (سنہ ۱۶۳۹ء) قابل دید عمارات ہیں۔

ابو الفضل صوبہ گجرات کے ذیل میں یہ لکھتا ہے "سورت از نامور بنادر، دریائے تاپتی نزد او گزرد، ہفت کروہی بدریائے شور پیوندد۔ سورت با حویلی، قلعہ سنگین دارد"

سورت ایک تاریخی مقام ہے۔ یونانی سیاح و جغرافیہ نویس ٹالمی Ptolemy (سنہ ۱۵۰ء میں) اس شہر کے متبرک حصہ پھول پدا کا ذکر کرتا ہے۔

مسلمان مورخین تیرھویں صدی کے آغاز میں قطب الدین کا فتح کرتے ہوئے یہاں آنا بیان کرتے ہیں سنہ ۷۴۸ھ (سنہ ۱۳۴۷ء) میں بغاوت گجرات کے زمانہ میں محمد بن تغلق کے عہد میں افواج شاہی نے اس کو تباہ و غارت کیا۔ سنہ ۸۰۸ھ

بھی عزت ونیکی کے ساتھ یاد کرتا ہے) بڑھکر آداب فدویانہ بجالایا اور گزارش کیا کہ اس ظالم و خائن کے ذمے مظلوم وستم رسیدہ رعایا کا بہت سارو پیہ واجب ہے۔ جب تک پوری تحقیقات ہو کر رعایا کا زر باقیتی ادا نہ ہوجائے تعمیل سزا میں توقف ہونا چاہئیے۔ یہ عرض قبول ہوئی اور جس قدر روپیہ لوگوں سے بیجا وصول کیا گیا تھا راجہ نے حساب کرکے واپس کرادیا۔]

امیر الامرا نہایت ذہین تھا۔ شعر خوب سمجھتا۔ فن تاریخ دانی میں یکتا تھا۔ ارباب کمال کو نہایت دوست رکھتا تھا۔ نماز صبح کے بعد اذن عام تھا۔ صاحبان فضل وکمال آتے اور پہردن چڑھے تک اہل علم وہنر کی صحبت رہتی۔ تاکید تھی کہ اس وقت کوئی اہلکار یا متصدی سرکار آنے نپائے۔ میر عبدالجلیل امیر الامرا کی خوش فہمی کی اپنے اعزہ واہل رازسے ہمیشہ اپنی زبان وقلم سے تعریف وتوصیف کیا کرتے تھے۔ اُس کے مرثیہ میں ایک بڑا زبردست قصیدہ لکھا تھا جسمیں تاریخ بھی نکالی ہے۔ اُنکو امیر الامرا کے ساتھ جیسی محبت مفرط تھی اس کے لحاظ سے جلے ہوئے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے ہیں ؎

آثار کربلاست عیاں از جبین ہند — زد جوش خون آل نبی از زمین ہند
شد ماتم حسین علی تازہ در جہاں — سادات گشتہ اند مصیبت نشین ہند
نیلی است زین معاملہ پیراہن عرب — وز خون گریہ سرخ شداست آستین ہند

(سنہ ۱۳۷۳ء) میں فیروز تغلق نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا۔ سنہ ۹۲۰ھ (سنہ ۱۵۱۴ء) میں ایک پرتگیز سیاح باربوسہ Barbosa یہاں آیا۔ اُس کے بعد سے برابر پرتگالی سیاح اور غارتگر اور جہاز یہاں آنے اور لوٹ مار اور آتش زنی کرنے لگے۔ سنہ ۹۸۰ھ (سنہ ۱۵۷۳ء) میں خود اکبر نے محاصرہ سنگین کرکے سورت کو مرزایان کے ہاتھ سے فتح کیا۔ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) سال تک یہ مقام مغلوں کے اقتدار اور اُن کے امرا کے قبضہ میں رہا۔ اس کی دلچسپ تاریخ، اور اس کی تجارت کی روزافزوں گرم بازاری ایک مستقل تحریر اور تفصیل کی محتاج ہے جسکی ان مختصر حواشی میں گنجائش نہیں۔
تاریخ اسلام میں سورت "باب المکہ" اور "بندر مبارک" لکھا جاتا تھا۔ سنہ ۱۰۷۵ھ (سنہ ۱۶۶۴ء) سے سورت پر مرہٹوں کے حملے شروع ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات یعنی سنہ ۱۱۱۹ھ (سنہ ۱۷۰۷ء) کے بعد سے تو سلاطین دہلی کا اقتدار و اختیار برابر گھٹتا رہا۔ سنہ ۱۱۳۶ھ (سنہ ۱۷۲۳ء) میں تیغ بخت خاں گورنر نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ ۱۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء کو جو

گیتی چرا سیاہ نگردد ز دود غم — خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است — دیدیم داستان شہور و سنین ہند
از داغ دل زوند چراغان اشک جوش — این است نوبہار گل آتشین ہند
ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا — از شیون عظیم امیر مہین ہند
فرزند مصطفیٰ خلف الصدق مرتضیٰ — کز روے فخر بود بدانش یمین ہند
رستم نشان حسین علی خان شہید شد — از خنجرے کہ بود نہاں در کمین ہند
آن صفدرے کہ از قلم تیغ بارہا — تحریر کردہ نسخہ فتح مبین ہند
تیغش بروز معرکہ خصم تیرہ بخت — چوں برق می شگافت صف آہنین ہند
دریا دلے کہ بود ز ابر عطا یش — شادابی بہار بہشت برین ہند
از بہر ہر فلک زدہ عالی جناب او — در ترکتاز حادثہ حصن حصین ہند
منقاد او شدند ازاں سرکشان دہر — کز داغ ضبط کرد نشاں بر سرین ہند
ہند از شہادتش تن بے روح گشتہ است — یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند
عالم چو قیر در نظر خلق شد سیاہ — افتاد تا ز خاتم دہر آں نگین ہند

معاہدہ انگریزوں سے ہوا اُس نے سورت اور اُس کے مضافات وملحقات کا فیصلہ مختتم کردیا۔
میر غلام علی آزاد نے اپنے سفر حجاز کے تذکرے میں سورت کو بڑی محبت سے یاد کیا اور "سرۃ محروسہ" "بلدہ مانوسہ" اور "سرۃ مسرورہ" کا بارہا نام لیا ہے۔ تمام مورخین متفقاً لکھتے ہیں کہ سلاطین تیموریہ کے عہد نصفت وترقی میں سورت سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ اُس زمانہ میں اُس کی رونق تمام بندرگاہوں سے بڑھی چڑھی تھی۔
۱۱۱۹ھ ملک التجار عبد الغفور کی نسبت صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ وہ ایک ممتاز بوہرہ سوداگر تھا جس کی حشمت وثروت کا شہرہ اقصائے عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے زر ومال کا شمار کروروں سے متجاوز تھا
اس پر ہیان فرانسیسی نے (۱۶۶۸ء میں) اضافہ کیا تھا کہ "بوہرے مسلمان تاجران سورت کا ایک مشہور فرقہ یا طبقہ ہیں۔ یہ داڑھی رکھتے ہیں ایک مخصوص وضع کا عمامہ باندھتے ہیں اور آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں سورت کو سورت بندر انہیں دولت مندوں نے بنا رکھا ہے۔ اسی میں اپنی بود وباش محدود رکھتے ہیں" حیدر

گردوں ز اختراں ہمہ تن اشک گشتہ است | در اعتبار ماتم رکن رکین ہند
دل چاک چاک گشت و جگر داغ داغ شد | زیں غم کہ گشت زہر از و انگبین ہند
اِسْتَرْجَعَ الْمَلَائِکُ وَاسْتَعْبَرَ الْفَلَکُ | فِی ہٰذِہِ الْمُصِیْبَۃِ سُحْقًا لِّدِیْنِ ہِنْد
از دست ابن ملجم ثانی شہید شد | گوئی ز کوفہ است گل ماتمین ہند
تا کربلا و تا نجف و تا مدینہ رفت | سیلاب خون دیدہ و آہِ انین ہند
اے دوستانِ آل و محبانِ اہل بیت | غمگیں شوید بہر حسینِ حزین ہند
تا حقِ اہل بیتِ رسالت ادا شود | بر رغم ایں جماعۂ منصوبہ بین ہند
از کلکِ من بمرثیۂ سید شہید | ایں ہند بیت ریخت چو درِّ ثمین ہند
رضوانِ حق چو سبزہ قرین ضریح او | تا ہست حسن سبزہ بہ گیتی قرین ہند
سالِ شہادتش قلم واسطی نوشت | قتلِ حسین کرد، یزیدِ لعین ہند

۱۱۳۲ھ

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ بعض ثقات (جن سے مراد غالباً اہل عقیدت ہوں گی) کہتے تھے کہ امیر الامرا کے واقعۂ قتل سے پہلے کسی مرد صالح نے خواب دیکھا تھا کہ سید الشہدا ثالث ائمہ اثنا عشر (علیہ و علیٰ آبائہ السلام) نے امیر الامرا کو مخاطب کر کے فرمایا بلغ وعدک (۱۱۳۲ھ) و غلب عدوک (۱۱۳۲ھ)۔ اس سانحہ کے بعد جب حساب کیا تو ہر فقرہ تاریخ تھا اور صنعت تقلیب بھی۔

قلی خاں نے جس حصۂ دولت پر قبضہ کر لیا تھا اس کی مالیت ایک کروڑ ہوگی حالانکہ اس کا کاروبار کروڑہا روپئے کا تھا۔ اس شاہ تاجر کے یہاں انیس[۱۹] جہاز اتنے بڑے بڑے تھے جتنا دولت برطانیہ کا جہاز انڈیا میں Indiaman۔ مگر عجیب اتفاق یہ تھا کہ وہ اس شمار کو کبھی بیس[۲۰] تک نہ پہونچا سکا ہر سال ایک دو جہاز بنائے اور اضافہ کئے جاتے تھے مگر اتنے ہی بیکار یا ضائع ہو جاتے تھے۔"

اسی کا ایک ہم پیشہ، خواجہ جاوید فخر التجار تھا۔ پونے دو سو برس کی بات ہے کہ وہ ہندوستان کے گورنر جنرل سے بھی زیادہ شان و شوکت رکھتا تھا۔ اس کا احتشام و اقتدار اس زمانے کے ناظم بنگال کے مساوی تھا۔ پندرہ ہاتھی پچاس بیش قیمت گھوڑے، اس کے اصطبل میں رہتے تھے۔ ایک سو بیس عورتیں محل میں تھیں۔ پندرہ چوبدار اور دو سو خدمتگار تھے۔ پانچ جہاز تھے۔ دو ہزار کشتیاں تھیں۔ نمک کا کل اجارہ تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے

مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسین علی خاں کی ستائش میں بہت سے اشعار موجود ہیں ؎

سپہ سالارِ فوجِ نصرت آثار   امیرِ صاحبِ شمشیرِ خون بار
رسول اللہ را فرزندِ کونین   امیر المومنین را قرۃ العین
بہ والا دودمانی بے نظیر است   امیر ابن الامیر ابن الامیر است
امیر است وامیراں را بہ سیما   کہ سر باشد رئیس جملہ اعضا
فروغِ مہر شاہنشاہ والا   خلافت رتبۂ ایزد تعالا
نمایاں از دلِ او چشمِ بد دور   چو از مصحف شعاعِ سورۂ نور
متجلی دارد از مہرِ نبوت   ز آبا بر کرام ارثِ فتوت
کرم ممنونِ دستِ اوست در بزم   ظفر مفتونِ تیغِ اوست در رزم
بروزِ جنگ نصرت آفرین ست   نشانے از امیر المومنین ست
نہ تنہا او ز حیدر یادگار است   کہ تیغش نیز یاد از ذوالفقار است
ازاں دستش قوی چنگال دارد   کہ زور از موتم الاشبال دارد
ازاں در رزم باشد نصرت ایجاد   کہ ہست او از حسین واز علی یاد
چو ایجادش ازاں ہر دو امام است   مرکب نام او از ہر دو نام است
ز نواب وز خان قدرش بلند است   شرف ز اجداد خود او را بسند است
برائے مدعا بہ زیں مثل نیست   مکمل در لطافت چوں گل نیست
سیادت جامۂ پر افتخار است   کہ ایں او چوں گل و آں چوں بہار است
ثنا ہا جملہ خاطر خواہ گویند   چو فرزند رسول اللہ بینند

میر عبدالجلیل نے عید قرباں کی تہنیت میں یہ قطعہ امیر الامرا کی نذر کیا تھا ؎

پاس کتنی دولت تھی۔ لیکن اس کا خرچ معمولی ایک ہزار روپیہ روزانہ سے کم نہ تھا۔ ایک بار اس نے الہ وردی خاں (مہابت خاں، آخر گورنر بنگال) کو پندرہ لاکھ نورز کا پیشکش دیا تھا۔ یہ دولت و ثروت بنگال کی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ میں نمک تیس یا چالیس روپیہ فی سو من بکتا تھا

۵۱۲۰ آئین۔ نالہ و نالیدن

فَمَنْ بَعِيدِ النَّحْرِ يَامِنْ عَطَائِهِ — أَفَاضَ عَلَىٰ مَنْ جَاءَ جُوداً عَوَائِلَا
تَنَسَّكْتَ هَدْيَ الْجُودِ فِي كُلِّ مَوْقِفٍ — وَأَلْبَسْتَ نَحْرَ الْمُعْتَفِيْنَ قَلَائِدَا ۱۲۲

امیر الامرا ہر سال مولدِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خوب روشنی وچراغاں کیا کرتا تھا۔ کعب بن زہیر کے ایک مشہور مصرع کی تضمین کرکے میرے اس اہتمام واحتشام کو خوب چمکایا ہے۔ ع

أَمْنَاءُ رُكْنُ الْهُدَىٰ عَالِي سَيِّدُ الْأُمَرَاءِ — شَهْرُ الرَّسُولِ شُمُوعًا فِي غَيَاهِبِهِ
أَسْنَىٰ الشُّمُوعَ عَلَى الْخَضْرَاءِ مُنْشَدَةً — إِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ

واقعہ یہ ہے کہ میر عبد الجلیل پر امیر الامرا کے احسانات وعنایات کا بار کچھ کم نہ تھا۔ ان کے تعلق دربار وقیام دہلی کے باعث وہی تھے۔ ملازمت مکرّر وجاگیر انھیں کی بدولت نصیب ہوئی۔ میر سید محمد کے تقرر خدمات کی سعی وتوجہ میں بھی امیر الامرا کا حصہ غالب تھا۔

سیاسی مصالح اور روپیہ کی ضرورت مسلّم مگر امیر الامرا کا یہ گناہ ناقابل عفو ہے کہ فرخ سیر کے زمانے میں اپنے اقتدار واختیار کا بعض اوقات بیجا استعمال کیا تھا۔ ممتاز محل (شاہجہاں کی ملکہ) کی شہرۂ آفاق قبر سے مروارید کی چادر جبر وستم سے لے لی۔ اُس دَورِ فلاح وارزانی میں یہ چادر لاکھوں کی تھی اور اب تو کروڑوں کی ہوتی۔ تاج محل سے جو چیزیں امیر الامرا نے غصب کی تھیں اُنکی قیمت تین کرور بتائی جاتی ہے۔ ع

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت — دامن کو ذرا دیکھ! ذرا بندِ قبا دیکھ!!

---

۱۲۱ تَنَسَّك - بفتحتین - کافی اور کافی ہونا

۱۲۲ معتفی - بعین مہملہ دفا - جو شخص طالب فضل ورزق ہو - از نہایہ جوزی

میر سیّد محمد المتخلص بہ شاعر

نِعَمُ الْاِلٰہِ عَلَی الْعِبَادِ کَثِیْرَۃٌ وَاَجَلُّھُنَّ نَجَابَۃُ الْاَوْلَادِ

میر سید محمد ہر اعتبار سے میر عبدالجلیل کے خلف الصدق تھے۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۱۰۱ھ (۱۶ دسمبر ۱۶۸۹ء) کو سہ شنبہ کے دن نماز ظہر کے بعد بلگرام میں پیدا ہوئے اور مصداق الولد الحر یقتدی بآبائہ الغر تمام علوم شریفہ و فنون لطیفہ کے جامع اور فضائل و کمالات کے حامل تھے۔ عربیت، لغت، محاضرات اور تاریخ دانی میں خاصکر دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ درسی کتابیں میر طفیل محمد سے پڑھی تھیں اور باقی کمالات و فنون اپنے پدر جلیل سے حاصل کئے تھے اور بقول السراج المستضئی بالسراج یکون مثل الاول تمام فضائل صوری و معنوی و خصائل رضیہ میں ممتاز اور باپ کے ہمقدم تھے۔ نہایت صدق و راستبازی، صفا، و یک رنگی سے بسر فرماتے، ان کا جوہر ہمت و سخاوت بہت بلند تھا۔ سید العارفین میر لطف اللہ عرف شاہ لدھا کے مرید تھے۔ اکثر اوقات مطالعہ و مباحثہ کتاب میں مصروف رہتے۔ کتب حقائق مثل فتوحات مکیہ وغیرہ کے اکثر زیر نظر رہتی تھیں۔ پڑھانے کا بھی شوق تھا۔ آزاد اور یوسف دونوں خواہر زادوں کو عروض و قافیہ اور بعض فنون و نکات ادب بتاتے تھے۔ صوفیہ کرام کے اقوال و حکایات، و اشعار عربی و فارسی اور ہندی کے گیت اور دوہے ان کو بے شمار یاد تھے۔

میر عبدالجلیل کو شفقت کے سوا جو لازمۂ ابوّت ہے، میر سید محمد سے عنایت و محبت خاص تھی جس زمانہ میں کہ میر صاحب بھکر میں تشریف فرما تھے میر سید محمد نے کئی بار وہاں جانے اور شرف قدمبوس حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن سفر کے شدائد اور بھکر کی آب و ہوا ناساز گار و ناموافق ہونے کی وجہ سے میر صاحب ہمیشہ (با وجود غایت الفت پدری و شوق لقا) مانع آتے رہے میر سید محمد کو آخر مرتبہ لکھا اور صاف طور پر سمجھایا تھا کہ

اگرچہ علیل می باشند بنابر آں ارادہ سفر ایں طرف دارند بر خوردار! خود می دانید کہ در بساط

ماہمیں شاید کسے کہ یک پسر داشتہ باشد، باختیار خود جدائی پسر را قبول نہ دارد۔ تمام آرزوئے ماہمین است کہ شمارا سیر بہ بینم۔ اما اسباب و دواعی مختلفہ نمی گزارند کہ شمارا بہ طلبم۔ اول خود ہوائے بھکر از سہ چہار سال ایں قدر مختلف شدہ کہ در نوشتن نمی آید۔ خصوص در موسم سرما ایں قدر تغیر فاحش در ہوا بہم می رسد کہ ہیچ متنفسے از آزار سالم نمی ماند۔ ایں معنی را از مداری۔ فیض اللہ کہ تازہ می رسند تحقیق نمایند و مقدمات دیگر کہ عدم دلجمعی کلمہ جائے تفسیر آں تواند شد نیز رادع ایں ارادہ اند بنا برآں جرأت بر رادپیمائی دور و دراز نمودہ تجویز مشاق نمی کنم۔"

جب میر عبدالجلیل بھکر سے شاہجہاں آباد پہنچے تو میر سید محمد کو اپنے پاس بلانا چاہا اور والا نامہ بھیجا لیکن باقتضائے وقت و مصالح فی الفور یہ حکم بھی بھیجا کہ توقف کیجئے اور دوسری اطلاع یا طلب ثانی کا انتظار فرمائیے۔ میر سید محمد نے اس کے جواب میں عرض کیا لَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْٓ اَبِیْٓ (جب تک مجکو میرے والد اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ جزو ۱۳۔ سورۂ یوسف ع ۱۰-۴)۔ میر عبدالجلیل اس جواب سے نہایت خوش ہوئے اور اپنی محبت و رضا کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا

ے تا یاذن لی ابی بخطت دیدم ؛ گلہائے طرب از چمن دل چیدم
از غایت اہتزاز پروانہ صفت ؛ اے شمع پدر ا گرد سرت گردیدم

میر سید محمد نے ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں کتاب مستطرف[۱۲۲] کا جو فن ادب عرب میں دلچسپ و مستند کتاب ہے نہایت دلپذیر انتخاب کیا اور الجزء الاشرف من المستطرف نام رکھا تھا۔ تبصرۃ الناظرین فارسی کی تاریخ بالخصوص بلگرام اور اہل بلگرام کے متعلق خوب لکھی ہے۔

---

۱۲۲ پورا نام المستطرف فی کل فن مستظرف ہے۔ امام الشہیر شیخ شہاب الدین محمد بن احمد الخطیب کی تالیف ہے۔ مصر میں دو جلدوں میں چھپی ہے۔ ادب و انشا کی بہترین اور جامع کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکے چوراسی بابوں میں محاضرات، اجتماع، سیاست، تصوف جملہ علوم و فنون کو مختصر حکایات و لطائف میں محفوظ و پیش کر دیا ہے۔ شیخ نے ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ء) میں وفات پائی رع کان متواہ جنۃ الماوی

جب میر عبدالجلیل نے ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں اپنی خدمات سے استعفا دیا تو سلطان فرخ سیر نے سرکار بھکر و سرکار سیوستان کی بخشی گری و وقائع نویسی و سوانح نگاری میر سید محمد کے سپرد کیں۔ سید محمد نے اپنے محل خدمات پر ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پہونچکر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہاں کی تمام رعایا اور رؤسا میر سید محمد کی نیک مردی، نیک نیتی، دیانت اور حسن معاملت سے نہایت راضی و مطمئن رہے۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں میر سید محمد سیوستان میں میر غلام علی آزاد کو اپنا نائب چھوڑکر بلگرام چلے آئے اور جب انکی خدمات میں خلل پڑنے کی خبر ملی تو دہلی پہونچکر بعض امرا کے توسل سے اسکو رفع دفع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں پھر سیوستان تشریف لے گئے۔ وسط ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں آزاد کو ہندوستان واپس جانے کی اجازت دی اور خود اپنی خدمات کی انجام دہی میں مشغول و مصروف ہو گئے۔ جب سندھ میں نادر شاہ کا تسلط ہوا تو میر سید محمد سے عہدہائے بادشاہی کا سررشتہ منقطع ہو گیا۔ خدایار خاں[۱۲۴] والی سندھ نے آپ کو عرصہ تک نہیں چھوڑا اور کمال اعزاز و اکرام کے ساتھ سیوستان میں مقیم رکھا۔ نہایت شایستہ خدمات اور پسندیدہ سلوک عمل میں لایا۔ چونکہ اس ملک میں نادر شاہی ہنگامہ گرم تھا اور سندھ کی حالت پرانے طریق پر نہیں رہی تھی اس لئے میر صاحب وہاں سے نہایت دل برداشتہ تھے۔ چار و ناچار خدایار سے اجازت لی اور ۲۵۔ رمضان ۱۱۵۵ھ (۱۶۔ نومبر ۱۷۴۲ء) کو سیوستان سے نکل کھڑے ہوئے اور براہ مارواڑ وطن کا رخ کیا۔ ۲۷۔ محرم ۱۱۵۶ھ (۱۳۔ مارچ ۱۷۴۳ء) کو داخل بلگرام ہوئے۔ فعاد

آھلا الی موطنه من غربة طال بها عهد النوی۔

نیرنگ روزگار سے چالیس سال بعد اس خاندان کا آب خور سندھ سے اٹھا تھا۔

حکیم عربی ابن خلدون نے اقوام و امم کی زندگی و اجل اور دولت و حکومت کی بقا و فنا کے بارہ میں ایک عمدہ تقریر لکھی ہے جسمیں یہ بحث بھی کی ہے کہ ان پر پیری و کہن سالی کیسے آ جاتی ہے اور جب تنزل نمودار ہوتا ہے تو اس کا زوال دشوار ہوتا ہے۔ اس بحث میں اکثر باتیں صحیح و

---

۱۲۴ خدایار خاں بہادر ثابت جنگ عباسی، زمیندار خدا آباد۔ منشورات آنند رام مخلص میں اس کے نام کا ایک خط ملاحظہ طلب ہے۔

درست لکھی ہیں لیکن بعض جگہ اُس کے ذہن نے خطا اور قلم نے لغزش بھی کی ہے جس طرح بعض اطبائے متقدمین نے افراد انسانی کی اجل طبعی (درازی حیات) ایک سو بیس سال قرار دی ہے اسی طرح اس نے بھی دولت کی عمر تین اجیال (مثر لیس) مانی ہیں۔ اہل نظر اس رائے کو صحت و صواب سے بعید مانتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خدا کے بنائے (ٹھہرائے) ہوئے دنوں میں تو صرف تین ہی دن دولت کی عمر ہوتی ہے۔ یعنی طفولیت۔ بلوغ اشد و رشد۔ ہرم و شیخوخت، اس میں سال ہا و قرنوں کی مہلت و میعاد کہاں۔ اس اعتبار سے میر عبدالجلیل اور بزرگان بلگرام کا اتنی مدت کے بعد اس ملک سے چلا آنا محض اقتضائے فطرت آئیہ یا گردش لیل و نہار تھا۔

اس سلسلہ میں ایک علمی لطیفہ یاد آ گیا جب نادر شاہ والی ایران نے ہندوستان پر تصرف و تسلط کر لیا اور اس کے بعد اپنے ملک کو واپس جانے کا ارادہ کیا تو کسی شخص نے نواب نظام الملک کو نادر شاہ کی واپسی و رجوع کی خبر دی نظام الملک نے پوچھا کہ آیا اس خبر کی کچھ اصل بھی ہے؟ حضار مجلس میں سے ایک صاحب بولے "النادر کالمعدوم" اس کے عربی کے معنی تو ظاہر ہیں "کل" ہندی میں یعنی "غد" یا "فردا" آتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ نادر کل معدوم ہو جائے گا۔ نادر میں توریہ بھی ہے۔

میر سید محمد نے آٹھویں شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۲۔ نومبر ۱۷۷۱ء) کو شنبہ کی شب میں بلگرام میں وفات پائی۔ ان کے بھانجے اور شاگرد میر غلام علی آزاد نے جو اپنی عمر کا ستر واں مرحلہ طے کر رہے تھے اور وطن اور اہل وطن کو چھوڑ کر دکن میں مقیم تھے ان کا نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا اور تاریخ نکالی ع

رفت قدسی جہاں سید محمد از جہاں۔ آزاد نے ان کے حالات پر ایک تذکرہ میں لکھے ہیں اور بڑے امتنان و عقیدت سے ان کی شفقت و محبت کو یاد کیا ہے۔ عربی میں ایک قصیدہ اور چند قطعات و اشعار مدحیہ بھی آزاد نے لکھے ہیں۔

میر سید محمد بڑے طباع اور نقاد شاعر تھے۔ شاعر تخلص تھا۔ فارسی و عربی و ہندی میں کمال مہارت تھی۔ تینوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے اور دیوان مرتب۔

دنیائے علم پر میر سید محمد کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ انکو وقتاً فوقتاً جو خطوط میر عبدالجلیل نے سفر کی

لکھے تھے اُن کو یکجا کر دیا اور بعض پر مختصر حواشی یا ضروری تتمہ جات بھی لکھ دیے ہیں۔ ان خطوط سے اُنکی اصلی خانگی حالت اور قدیم طرز معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ خطوط مطبوعہ کے ساتھ اُنکی تاریخ تحریر درج نہیں ہے ورنہ سلسلۂ مکاتبت اور تسلسل واقعات کا پتہ چلتا۔ دوسرے اُن کی تعداد نہایت کم ہے یعنی صرف بائیس (۲۲)، اگر سب رقعات میر عبد الجلیل کے محفوظ و مرتب ملجاتے تو فن انشاء و مکاتبت میں اُن سے بڑا قابل قدر اضافہ ہو جاتا۔

میر سید محمد نے منصور حلاج کے سال شہادت کی تاریخ صوری آیۂ قرآنی سے نکالی تھی: وَ لَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا [اور (اصحاب کہف) اپنے غار میں تین سو برس رہے اور نو اور رہے۔ جزء ۱۵۔ سورۃ الکہف ع ۴۰-۱۶] ایک مثنوی موسوم بہ "ناز و نیاز" بھی یادگار چھوڑی تھی۔ سید حسن ترمذی بلگرامی اور شاہ فیاض کا جو اُن پر عاشق تھے دلچسپ پیرایہ میں قصہ نظم کیا ہے۔

میر غلام علی آزاد

میر غلام علی آزاد میر عبد الجلیل کے سب سے بڑے نواسے اور اُن کے مایۂ نازش، بلکہ ساری خاندان کے لئے باعث افتخار تھے۔ وہ اپنے تذکروں، قصائد اور مثنویات سے بلگرام اور اپنے اسلاف و اعزہ کو شہرت عام اور بقائے دوام کی سند دے گئے ہیں۔

آزاد کی ولادت ۲۵۔ صفر ۱۱۱۶ھ (۱۲۔ جون ۱۷۰۴ء) کو بلگرام میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت تمامتر وہیں پائی۔ درسی کتابیں ابتدا سے انتہا تک وہاں کے مشہور عالم اور اُستاد میر طفیل محمد کے حلقۂ درس میں پڑھیں، لغت، حدیث، سیرت نبوی اور فنون ادب کو میر عبد الجلیل سے حاصل کیا۔ عروض و قافیہ اور بعض دیگر شعب ادب اپنے ماموں میر سید محمد شاعر سے حاصل کئے۔ عربی شاعری میر عبد الجلیل سے سیکھی۔ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) میں حسب مزاج خاندان میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی چشتیہ

طریقہ میں بیعت فرمائی۔ مذہباً حنفی تھے۔ اتباع امام کے ساتھ ضعیف الاعتقادی اور احداث فی الدین سے متنفر و محترز رہتے۔

جیسا کہ میر عبد الجلیل کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے میر غلام علی و میر محمد یوسف انکے پاس ۱۱۳۴ھ (۲۱-۱۷۲۰ء) میں تکمیل علوم کے لئے دار الخلافہ شاہجہاں آباد پہونچے۔ دو برس وہاں قیام رہا۔ ۱۱۴۲ھ (۳۰-۱۷۲۹ء) میں آزاد کو سیوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ میر سید محمد جو وہاں میر بخشی و وقائع نگار تھے ان کو نائب مقرر کر کے وطن چلے آئے۔ چار سال بعد واپس تشریف لے گئے تو ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں آزاد کو واپسی بلگرام کا موقع ملا۔

آزاد نے کسی وقت صغر سنی میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالم رویا میں زیارت کی تھی شوق تجرید اور ولولۂ زیارت حرمین محترمین اسی زمانہ سے مستولی اور سینہ میں موجزن تھا اسی حال میں جذبات الٰہیہ سے ایک جذبہ جسکو لجذبۃ من جذبات الرحمٰن یوازی عمل الثقلین کہنا چاہیے پہونچا اور آزاد اسی روز افزوں ذوق و شوق کے عالم میں اپنے اعزا و اقربا کی اطلاع بغیر رجب ۱۱۵۰ھ (اکتوبر ۱۷۳۷ء) میں تنہا اور پا پیادہ بلگرام سے چل کھڑے ہوئے سفر خرچ نہ لیا۔ صرف انی ذاہب الی ربی سیہدین (میں تو اپنے پروردگار کی طرف چلا جاتا ہوں۔ وہ مجھے ٹھکانے لگا دیگا۔ جزو ۲۳- سورۂ والصّٰفّٰت ع ۳-) زبان پر تھا اور جاذبۂ عقیدت و محبت دامنگیر راستے کی صعوبات ناقابل برداشت ثابت ہوئیں، درد و محبت، سوز و گداز، کشش و نیاز کی کل روداد کو آزاد نے ایک مثنوی میں درج کر دیا ہے جس کا تاریخی نام طلسم اعظم ہے۔ اتفاقاً اثنائے راہ میں نواب آصف جاہ کا لشکر اطراف مالوہ میں خیمہ زن تھا۔ کسی مرد صالح نے بے سابقۂ معرفت و شناسائی ان کو اپنا مہمان بنایا مراسم نیاز مندی و خدمتگزاری بجا لایا۔ سواری کے لئے ایک پر تکلف رتھ نذر کیا۔ ۲۲ شعبان کو نواب عالی منزلت کا شرف لقا نصیب ہوا، آزاد نے یہ رباعی برجستہ عرض کی ؎

اے حامی دین احمد جود و احساں	حق داد ترا خطاب آصف شایاں
ز تحفہ بدرگاہ سلیماں آورد	تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

میر غلام علی آزاد نے مدۃ العمر شاعری کی مگر اغنیا و امرا کی مدح سرائی سے دور رہے۔ تمام زندگی میں ایک یہی رباعی اور دو شعر اور نواب نظام الدولہ شہید کی شان میں کہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ رباعی محض مجبورانہ اور استعانت سفر بیت اللہ کے لئے گزارش کی تھی۔ آصف جاہ مبرور اس وقت مرہٹوں کی تنبیہ پر متوجہ تھے۔ صفوف اسلام کے ساتھ آزاد کو بھی شریک غزا و جہاد ہونا پڑا۔ سارا رمضان سواد شہر بھوپال[۱۲۵] میں گزرا۔ آخر رمضان میں مصالحت ہوگئی۔ نواب نے زاد و راحلہ حسب خواہ بہم پہونچا دیا۔ برہان پور ہوتے ہوئے آزاد سورت پہونچے اور جہاز پر سوار ہوگئے۔ ربیع الاول ۱۱۵۱ھ کا پہلا چاند (۹۔ اپریل ۱۷۳۸ء کو) سطح دریا پر کشتی کے عرشہ سے دیکھا۔ جہاز سے اتر کر جدہ سے مکہ پہونچے

۱۲۵ھ بھوپال، اکبر و اورنگ زیب کے عہد میں گنگ گونڈوانہ میں داخل، اور صوبہ مالوہ میں شامل تھا۔ اب ایک ریاست وسط ہند میں مالوہ کے حدود شرقی میں واقع ہے۔ حکمران خاندان کا مورث یعنی ریاست کا بانی تیراہ کا ایک پٹھان دوست محمد خاں نام، بہادر شاہ کے اوائل عہد یعنی ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں دہلی آیا اور رفتہ رفتہ آزادی واقتدار و اختیار حاصل کرتا گیا۔ بڑا دلیر و مستقل مزاج تھا پہلے تو اس نے کچھ زمین اجارہ پر لی، بعد ازاں ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) میں وفات پائی۔ فیض محمد خاں جب اسیر و حاکم تھا تو اس نے عنان حکومت ایک ہندو بیجے رام کے ہاتھ میں دیدی تھی وہ شخص فی الواقع نہایت منتظم و مدبر تھا مگر بعد کو اس نے مقبوضات بھوپال باجی راؤ پیشوا کے حوالہ کردی تھیں۔ فیض محمد خاں نے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں انتقال کیا۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں اس قطعۂ ملک پر جسونت راؤ پنوار راجۂ دھار نے اور اس کے بعد امیر خاں نے قبضہ کرلیا۔

ابتدائی کچھ روز تک اسلام نگر دارالریاست رہا تھا۔

بھوپال میں بعض عمارات نفیس و قابل دید بنائی گئی ہیں۔ شہر کی آبادی عرصہ سے مائل بہ زوال ہے۔ ۱۹۲۱ء میں صرف ۴۵۰۹۴ اشخاص شمار میں آئے تھے۔

بھوپال کی فرمانروا بیگمات میں، نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کا عہد نہایت ممتاز رہا ہے۔ ان کی خدمات نمایاں، معدلت گستری، حسن انتظام اور کارہائے رفاہ خلائق کے تذکروں سے صفحات تاریخ معمور ہیں مدبرین فرنگ اور غیر ممالک کے اہل وقوف وخبرت نے خاص الفاظ میں ستایش و تحسین کی ہے۔

تقریباً پون صدی سے بھوپال علم و ادب کا مرکز چلا آتا ہے۔ پہلے صرف علوم دینیۂ اسلامیہ اور فنون مشرقیہ کا مہد تھا۔ والیۂ عالیہ سابقہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ ادام اللہ ظلالہا کے عہد ہمایوں میں ہر قسم کے علوم و

بیت اللہ کی آستانہ بوسی فرمائی۔ مدینۃ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دیکھنے کا اشتیاق غالب تھا۔ تین دن مکہ شریف میں ٹھہر کر اُدھر کا رخ کیا۔ ۲۵ صفر ۱۱۵۱ھ (۲۸ جون ۱۷۳۸ء) کو سوادِ یثرب پاک سرمۂ کش چشمِ سعادت ہوا۔ وہاں کے دورانِ قیام میں شیخ محمد حیات[126] سندی مدنی سے صحیح بخاری پڑھکر سند حاصل کی۔ صحاحِ ستہ اور سائر مُفردات کی اجازت لی۔ کئی نعتیہ قصائد عربی میں لکھکر روضۂ اقدس میں پیش کئے۔ عید الفطر آستانِ اطہر پر ہوئی۔ ۱۴ شوال (۱۵ جنوری ۱۷۳۹ء) کو بارگاہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ادائے حج کے لئے رخصت حاصل کی۔ ۲۶ ماہ مذکور (۲۷ جنوری) کو پھر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ذی الحجہ (مارچ) میں مناسک حج بجالائے۔ طائف بھی گئے۔ مکۂ معظمہ میں شیخ عبد الوہاب[127] طنطاوی کی صحبت میں حاضر رہ کر فن حدیث کے فوائد حاصل کئے۔ انھیں کے مکان پر قیام تھا۔ شیخ اُس وقت سرآمد علمائے عصر سمجھے جاتے اور مکۂ معظمہ میں فروکش تھے۔ مجالس درس و موعظت اُنکی ذات اقدس سے گرم و منور رہتی تھیں۔ آزاد کے اشعار عربی سنکر شیخ صاحب بہت تحسین فرماتے تھے جب میر غلام علی کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی و مصرف کو سمجھا تو فرمایا کہ سیدی انت من عتقاء اللہ

فنون اور تمدن و تہذیب نے توسیع و ترقی پائی۔ جن کے دست جود و عطا کی بدولت اس وقت ہندوستان کی بڑی بڑی تعلیم گاہیں قائم اور سرسبز و شاداب ہیں۔ علیا حضرت کی کامیاب اور فیض رساں حکمرانی کو ایک عالم جانتا اور اعتراف کرتا ہے۔

فرمانفرمائے وقت، قوی شوکت سکندر صولت اعلیٰ حضرت حضور نواب لفٹیننٹ کرنیل افتخار الملک حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ وی۔ او، جو ایک سراپا خیر، روشن خیال، بیدار مغز اور قابل افتخار حکمراں ہیں، اپنی والدۂ ماجدہ کے نقش قدم پر چلتے اور اہل علم و ہنر کی سرپرستی و قدردانی فرماتے ہیں۔ ؎

علا عن المدح حتی ما یزان بہ کانما المدح من مقدار ہ یضع

۱۲۶؎ اطراف عادل پور تواریخ بھکر کے باشندے، قبیلۂ چاچر سے تھے۔ باپ کا نام ملا فلاریہ تھا۔ عادل پور آزاد نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد حیات نے آغاز شباب میں حجاز شریف تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں توطن و تاہل اختیار کر لیا تھا تحصیل علم بھی یہیں کی۔ باوجود فقدان وجہ معاش بڑی استقامت سے کام لیا۔ حرمین معظمین کی علمائے نامور مثل شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ و شیخ عبداللہ بن سالم البصری المکی سے تلمذ تھا۔ حدیث شریف کی خدمت میں تمام عمر صرف کر دی اور

اسی طرح وہاں کے صاحبان فضل وادب اور بزرگان عرب نے آزاد کی عربی دانی اور قادر الکلامی کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا اور تعریف کی۔

ربیع الآخر ۱۱۵۲ھ (جولائی ۱۷۳۹ع) میں طواف وداع بجا لائے۔ ۳۰ جمادی الاول (۲۹ جولائی ۱۷۳۹ع) کو جدہ سے جہاز پر سوار ہوئے۔ بندرگاہ مُخا (واقع ساحل یمن) ہوتے ہوئے سورت پہونچے۔ پانچ مہینہ قیام کیا وہاں سے سیدھے دکن چلے گئے۔ آخر ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ (وسط فروری ۱۷۴۰ع) میں وارد اورنگ آباد ہوئے۔ بابا شاہ مسافر نقشبندی کے تکیہ (مکان بود و باش فقرا) میں قیام اختیار کیا۔ سات سال تک اسی جگہ بسر کی۔ نواب نظام الدولہ خلف آصف جاہ سے بڑا ارتباط و اتحاد تھا۔ با ایں ہمہ آزاد، آزاد رہے، اور کوئی خدمت یا منت کشی اُن کی یا کسی امیر کی گوارا نہ کی۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۹ع) میں وحشت دل پھر دامنگیر ہوئی۔ دیار عرب کی کشش تھی اور وطن و اہل وطن سے قطع تعلق پر سرگرمی و انہماک۔ لیکن ایک شب سروش غیبی کی صدا آئی ع کمش دست از دامن روزگار۔ امتثال امر غیب پر مجبور ہوئے۔ ارادہ مصمم فسخ کرنا پڑا۔ سچ ہے۔ عرفت ربی بفسخ

اس فن مبارک میں تبحر عظیم حاصل کر لیا۔ اپنے اوقات عزیز کی بڑی نگہبانی کرتے اور برابر نشر علوم و فضائل میں مصروف رہتے۔ حرمین پاک کے خاص و عام اور مصر و روم و شام کے لوگ انسے اعتقاد و اخلاص رکھتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔

چہار شنبہ ۲ صفر ۱۱۶۳ھ (۲۲ جنوری ۱۷۵۰ع) کو رحلت فرمائی۔ بقعۂ مبارک بقیع میں دفن ہوئے۔

۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ع) میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ جنت المعلیٰ میں جگہ پائی۔

العزائم۔ اس زمانہ میں ان کو بارہا شہر حیدر آباد اور دکن کے مختلف مقامات کو کبھی از خود اور کبھی نواب نظام الدولہ کی معیت میں جانا پڑا۔ آزاد نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (اڑتالیس سال) دکن میں گزارا۔ شفیق ماموں اور استاد (میر سید محمد) کے مرنے، نوجوان اکلوتے بیٹے (میر نور الحسن[۱۴۱]) کے غرق آب

[۱۲۸] بابا شاہ مسافر خلیفۂ ارشد بابا شاہ سعید پلنگ پوش کے تھے۔ شاہ مسافر کا اصلی نام حافظ محمد عاشور اور مولد و منشا غجدوان تھا۔ مسافر، رہبر طریقت کا دیا ہوا خطاب تھا۔ بابا سعید ہندوستان چلے آئے تھے۔ اور نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نواب آصف جاہ کے لشکر کی نگہبانی و حراست پر مامور تھے، ہمیشہ ہمراہ رہتے۔ حافظ محمد عاشور نے اوائل میں میر عطاء اللہ ساکترہی کی خدمت میں حاضر رہ کر کبرویہ طریق پر ریاضتیں کیں۔ میر عطاء اللہ نے رخصت کیا تو سیاحت کی ہدایت کی۔ سیر غور چلے آئے۔ بارہ سال قیام فرمایا۔ وہاں سے کابل آئے اور بابا شاہ سعید کے مرید ہوئے۔ سات سال بعد اجازت لیکر حرمین شریفین گئے۔ سعادت حج حاصل کرکے ابتدائے عہد خلد مکاں میں ہندوستان آئے۔ اورنگ آباد میں جس جگہ کہ اس وقت مرقد مبارک کا تکیہ ہے اقامت گزیں ہو گئے۔ یعنی واپسیں تک وہاں سے نہیں اُٹھے۔ تشنگان ارادت و عرفان اس چشمہ ربانیت و رحمت سے خوب سیراب ہوتے رہے۔ ۹۔ رجب ۱۱۲۶ھ (۵۔ جولائی ۱۷۱۴ء) کو اس عالم سفلی کو چھوڑا اور اپنے پیر کے پہلو میں جانب قبلہ آسائش فرمائی۔

آزاد نے ان کو دیکھا نہ تھا لیکن بڑے اخلاص و عقیدت سے یاد کرتے ہیں ؎

قطب زماں صاحب شانِ عظیم — شاہ مسافر بہ درِ حق مقیم
خسرو بے تاج و نگین عَلَم — تاج دہِ قیصر و خاقان و جم
ریشہ بہ اسرار حقیقت دواند — دامن ہمت بہ دو عالم فشاند
نور شکنی ہا اثر ذکر او — روشنیٔ دل اثر فکر او
پادشہِ سلسلۂ نقشبند — یک نظر او دو جہاں را پسند

[۱۲۹] یہ خانقاہ ایک بڑے وسیع باغ میں محمود دروازہ کے پاس واقع ہے۔ اور اب درگاہ شاہ مسافر کے نام سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ اورنگ آباد میں یہ روضہ نہایت دلفریب ایر فضا اور فرح بخش مقام سمجھا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اور اُس کے اعیان سلطنت کو ان بزرگ سے کمال اعتقاد تھا۔ شاہ صاحب کے پیر و مرشد کے لئے شاہ ۱۱۰۰ھ (۱۶۸۸ء) میں امرائے دولت اور اہل ارادت نے اس خوشنما اور شاندار تکیہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے متعلق مدرسہ، مسجد، دیوان خانہ اور ایوان سرا و دیگر ضروری عمارات متعدد تیار کرائی تھیں۔ آصف جاہ

ہونے۔ خالہ زاد اور عزیز تر از جاں بھائی (محمد یوسف) کی وفات اور پیارے سے پیارے رشتہ داروں کی مفارقت دائمی اختیار کرنے کی خبریں آتی رہیں۔ مگر یہ دکن میں کچھ ایسے پاؤں توڑ کر بیٹھے تھے کہ اُٹھنا اور ہٹنا گوارا نہ کیا۔ حُبِ وطن کا جاذبہ، خاک دکن کی پابوسیوں پر غالب نہ آسکا شفقت بزرگانہ

اول ہبر درے کے عہد بابرکت میں درگاہ نے اور بھی وُسعت اور رونق پائی درگاہ کے احاطہ کے اندر کئی پختہ حوض ہیں اور فوارے لگے ہیں۔ باہر ایک نہایت لمبا چوڑا حوض ہے۔ جس کے لئے نہر سے پانی آتا ہے اور بڑی بلندی سے حوض کے اندر گرتا ہے۔ کسی وقت اس آبشار کے قریب ایک پن چکی بھی قائم تھی، جس کے اب صرف آثار و نشان باقی رہ گئے ہیں۔ درگاہ کی مسجد میں ایک دُرّہ رکھا ہوا ہے جس کی نسبت روایت یہ ہے کہ شاہ دیں پناہ (عالمگیر) خلاف شرع کام کرنیوالوں کو اس سے تعزیر دیتا تھا

۱۳۰ شہر حیدر آباد۔ عُرفاً ریاست حیدر آباد دکن کا دار الصدر حقیقتاً ایالت نظام خلد اللہ سلطنتہ کا دار الملک موسی ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ اس کی آبادی مع اس کے جملہ مضافات کے سنہ ۱۹۲۱ء میں چار لاکھ چار ہزار ایک سو ستاسی ۴۰۴۱۸۷ تھی۔ بلحاظ کثرت آبادی و زینت و رونق یہ شہر ہندوستان میں چوتھا مگر باعتبار تمدن و تہذیب پہلا سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر کی بنیاد سنہ ۹۹۷ھ (سنہ ۱۵۸۹ء) میں محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ (پانچویں قطب شاہی بادشاہ) نے ڈالی تھی۔ وہ اُس وقت گول کنڈہ کا فرمانروا تھا۔ جو حیدر آباد سے پانچ میل پچھم پر ہے۔ بانی نے اس کا نام بھاگ نگر رکھا تھا پھر حیدر آباد بدل دیا۔ سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ء) میں جب شہنشاہ اورنگ زیب محمد قلی اور اُس کے شکستہ خاطر و دل برداشتہ وزیر میر جملہ کے مابین التصفیہ کرانے آیا ہے اُس وقت تک شہر کی حالت رو بہ ترقی اور رونق روز افزوں تھی۔ سنہ ۱۰۹۸ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) میں شہنشاہ عالمگیر کا حملہ گول کنڈہ پر ہوا تو حیدر آباد مغلوں کے قبضہ میں آگیا اور اُن کے قبضے میں اُس وقت تک رہا کہ نظام اول نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور اس کو اپنا دار الصدر قرار دیا۔

شہر کے گرد سنگین دیوار ہے، جس میں بُرج بنے ہیں۔ تیرہ پھاٹک اور بارہ کھڑکیاں ہیں۔ یہ شہر پناہ بہ شکل متوازی الاضلاع تعمیر ہوئی ہے۔ دَور چھ میل اور رقبہ سواد و میل مربع ہوگا۔ اس کی تعمیر کا آغاز مغلوں کے اخیر صوبہ دار مبارز خاں نے کیا تھا۔ نظام اول نے اس کی تکمیل فرمائی۔ شمال و مشرق میں شہر اپنے اصلی حدود سے بہت بڑھ گیا ہے۔ موسی ندی پر چار پل بنے ہیں۔ "پُرانا پل" بالکل پچھم کو ہے اولی فنیٹ برج Oliphant Bridge مشرق اقصیٰ میں ہے۔ ان دونوں کے مابین دو پل (۱) افضل پل۔ اور

اور حقوق اعزہ کا اقتضا اسی قدر تھا کہ اپنے بھتیجے (غلام امام صادق کے بیٹے) میر اولاد محمد ذکا اور اپنے پوتے میر امیر حیدر ۱۳۲ھ کو اپنے پاس دکن میں بلا لیا اور وہیں ان کی تربیت و پرداخت عالمانہ اور امیرانہ طریقہ پر کی۔ اپنی صحبت گرامی کے فیض اور علوم عالیہ سے بہرہ وافر دے کر وطن کو رخصت کر دیا

(۲) چھپا دروازہ پل، واقع ہیں۔

عہد قطب شاہی کی سب سے خوبصورت اور شاندار عمارات میں سے ایک چار مینار ہے۔ اسکی تعمیر سنہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں ہوئی تھی۔ یہ شہر کے وسط یا مرکز میں واقع ہے۔ اس کے اندر سے چار سڑکیں نکل گئی ہیں۔ منارے ایک سو اسی فٹ بلند ہیں۔ ان میں سے ایک مینار پر مغلوں کے قبضہ کے زمانہ میں بجلی گری تھی۔ اسکی از سر نو تعمیر میں ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ فرانسیسی جنرل مانشو بسی M Bussy اور اس کی افواج سنہ ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) میں چار مینار پر قابض رہیں۔ سر سالار جنگ نے اپنی وفات سے کچھ روز پہلے اس عمارت کی تمام و کمال درستی و تجدید و تزئین کرا دی تھی۔ چار مینار کے قریب چار کمان واقع ہے جس کی تعمیر سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) میں ہوئی تھی چار شوارع پر جو شہر کے چار حصوں یعنی اسمات اربعہ کو جاتے ہیں بنائی گئی ہیں۔ چار سو کا حوض چار مینار کے شمال میں ہے۔ بادشاہ نے اس حوض کے پاس ایک کوشک تعمیر کرایا تھا۔ جہاں سے اپنی فوج کی قواعد و کمر بندی دیکھا کرتا تھا۔ دار الشفا (اسپتال) پرانی حویلی کے بالکل شمال میں دو گز کے فصل سے واقع ہے۔ اسکو سلطان قلی قطب شاہ نے بنوایا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے جس کا صحن پختہ اور چوگوشہ ہے۔ مریضوں کے قیام و آرام کے لئے ہر طرف کمرے بنے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک نفیس مسجد اسی زمانہ کی تعمیر شدہ ہے۔ ایک بڑی عمارت سر سالار جنگ کے محل کے پچھم جانب "عاشور خانہ" نام، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۴ء) میں تعمیر کرائی تھی۔ محرم وغیرہ میں اب بھی یہاں عزاداری اور ماتم گساری ہوتی ہے۔ "پرانا پل" شہر کو اس کاروان سڑک سے ملا دیتا ہے جو گولکنڈہ جاتی ہے۔ اس میں تئیس ۲۳ محرابیں ہیں۔ چھ سو ۶۰۰ فٹ لمبا تینتیس ۳۳ فٹ چوڑا اور چون ۵۴ فٹ ظرف دریا سے بلند ہوگا۔ یہ سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) میں تعمیر ہوا تھا۔ دریا یہاں سے بہت تنگ ہے اور اس کے کنارے ڈھالو ہیں۔ "قصر گوشہ محل" کی تعمیر ابوالحسن تانا شاہ آخر قطب شاہی بادشاہ نے کی تھی۔ یہ شہر سے ایک میل شمال پر ہے۔ اسمیں ایک بڑا حوض ہے اور بیگمات کے لئے نزہت گاہیں ہیں۔ "مکہ مسجد" جو چار مینار کے جنوب مغرب میں ہے سوا دو سو فٹ لمبی، ایک سو اسی فٹ چوڑی اور پچھتر فٹ بلند ہوگی یہ تمام و کمال پتھر کی عمارت ہے۔ اس کا پختہ چوکور فرش تین سو ساٹھ فٹ مربع ہے۔ اس کی سقف پندرہ محرابوں پر قائم ہے جس پر دو بڑے بڑے برج بنے ہوئے ہیں۔ یہ چھت سے سو سو فٹ بلند ہوں گے۔ اسمیں دس ہزار نمازیوں کی گنجایش ہے۔ محمد قطب شاہ (محمد قلی کے بھتیجے اور جانشین نے) اس کی تعمیر شروع کی تھی اس کے انتقال کے بعد

یہ لوگ یہاں آکر پھولے پھلے مگر آزاد کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے۔ آزاد نے چھیاسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) میں انتقال فرمایا۔ اور روضۂ شریفہ خلد آباد میں پیوند زمین ہوئے انکی قبر پختہ شہر پناہ کی جانب جنوب، حضرت میر حسن ابو العلائی سنجری کے احاطہ کے ایک گوشہ

ابو الحسن نے تعمیر جاری رکھی مگر تکمیل اورنگ زیب کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اسی مسجد کی جنت نشان اراضی میں نظام علی خاں مبرور اور اُن کے سب جانشین استراحت گزین ہیں" جامع مسجد چار مینار کے قریب ہے۔ یہ سنہ ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۶ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ مکہ مسجد اور گوشہ محل کو چھوڑ کر یہ سب باقی عمارتیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کرائی ہوئی ہیں، جس نے سوا تین کروڑ روپیہ (تین ملین اسٹرلنگ) رفاہ عام کی عمارات اور آبپاشی کے کاموں پر صرف کیا تھا۔ اُس کے مقربین اور امرا نے بھی تقلید و تبعیت کی اور کارہائے نیک پر بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ ایک بڑا وسیع گورستان ہے جو میر مومن کا دائرہ کہلاتا ہے۔ میر مومن نے جو بعہد عبد اللہ قطب شاہ کربلائے معلے سے حیدر آباد آیا تھا اس کام کے لئے وقف کیا تھا۔ سر سالار جنگ کے خاندان کا قبرستان دائرہ مذکور کے جنوب ہے۔

بعد کی تعمیرات میں پرانی حویلی ہے۔ یہ ایک وسیع عمارت شہر کے شمال و مشرق کے حصہ میں واقع ہے۔ اسکو نظام اول مبرور نے تعمیر کرایا تھا۔ ایوان چو محلہ میں، تین چوگوشہ محلات ہیں۔ اسکے ہر طرف نہایت خوشنما عمارات ہیں۔ وسط میں ایک بڑا حوض ہے۔ یہ محل نہایت پرتکلف اور سلیقۂ انتظام سے آراستہ ہے بیگمات عصمت سمات کی شاہانہ محلسرائیں تیسرے چوگوشہ سے اُس طرف ہیں۔

شاہی محلات و قصور گول کنڈہ، سرور نگر، مولا علی، آصف نگر، لنگم پلی اور ملک پیٹ میں بھی ہیں۔

سالار جنگ کا محل، افضل دروازہ کے قریب ہے اس میں دو قطعے یا حصے ہیں۔ ایک جس میں بارہ دری اور لکڑ کوٹ (محل چوبیں) ہے، موسیٰ ندی کے داہنے ساحل پر ہے اور دوسرا، پرانی حویلی کو جانے والی سڑک کے اُس طرف۔ دونوں نہایت وسیع عمارتیں ہیں جو بہت سی اراضی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ شمس الامرا کی بارہ دری شہر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کو ایک بڑے وسیع قطعہ زمین پر شمس الامرا اول نے تعمیر کیا تھا۔

فلک نما، ایک نہایت نفیس محل ہے اس کو شہر کے مضافات جنوبی میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پینتیس ۳۵ لاکھ روپیہ کے صرف سے سر وقار الامرا مرحوم نے بنوایا تھا۔ اس قصر رفیع سے شہر اور اس کے اطراف کا نظارہ نہایت دلکش اور نظر فریب ہوتا ہے۔ حیدر آباد میں کوئی عمارت، خواہ بلحاظ حسن تعمیر خواہ باعتبار خوبی تجویز نقشہ، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے جنت آشیان نظام سادس نے ۱۸۹۷ء میں ذریعہ خریداری اسکو مملوکات شاہی میں شامل و داخل فرمالیا تھا۔ چہاں نما محل، اور اس کے خوشنما باغات جو سر آسمان جاہ مبرور کے مملوکہ ہیں، فلک نما

میں حظیرہ (کٹھڑہ) کے اندر واقع ہے۔ اہل وقوف سے اُس کا پتہ زائرین اور مستدرکین کو کسی قدر دشواری سے چلتا ہے۔ افسوس ہے کہ کسی حوصلہ مند نے اُس پر کتابہ نہ لگادیا تاکہ کسی سے پوچھنے اور دریافت کرنیکی ضرورت باقی نہ رہتی۔

بارھویں صدی کے لئے ہندوستان میں آزاد کی ذات ایک نعمت بے مثال تھی۔ وہ مجسمہ ذہانت و قابلیت تھے۔ اپنی لازوال یادگار میں عربی و فارسی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہی۔ شعرائے ہند و ایران کے تین مبسوط تذکرے (۱) ید بیضا (۲) سرو آزاد (۳) خزانۂ عامرہ۔ اور

کے شمال میں ہیں۔ محل اور اُس کے بنگلوں میں جو باغات کے اندر بنے ہوئے ہیں، ایک بڑی تعداد باسلیقہ و ہنرمندانہ کلوں اور پرزوں کے کھلونوں کی موجود ہی۔

اطراف بلدہ، دو طور پر منقسم ہیں۔ ایک جو موسیٰ ندی کے اُس پار ہیں۔ دوسرے وہ جو شہر کے ملحق ہیں۔ اول الذکر میں بیگم بازار، کاروان، افضل گنج، مشیر آباد، خیرات آباد، سیف آباد اور چادر گھاٹ داخل ہیں جو پورب سے پچھم کو تین میل تک چلے گئے ہیں۔ اوسط عرض، شمال سے جنوب تک ڈیڑھ میل ہوگا اور رقبہ پانچ میل سے اوپر۔

رزیڈنسی بازار۔ ان بستیوں کے جنوب و مشرق، اور شہر کے شمال و مشرق میں واقع ہیں۔ باقی حصص ان مضافات کے جو شہر کے جنوب اور مشرق میں ہیں یا قوت پورہ، ملک پیٹ، اور جہاں نما کہلاتے ہیں اور چار میل مربع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں۔

رزیڈنسی۔ موسیٰ ندی کے ساحل چپ پر، شہر کے شمال و مشرق کے گوشہ کے مقابل واقع ہے۔ یہ شاندار عمارت ہی۔ ایک خوش نا رمنہ کی شکل کے قطعہ کے اندر واقع ہے۔ اس کے باغ نہایت خوبصورت و آراستہ اور اچھی حالت میں ہیں۔ اسکی تعمیر سنہ۱۸۰۳ء سے شروع ہوکر سنہ۱۸۰۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کے اندر اور باہر بھی افسروں کے لئے کوٹھیاں بنی ہیں۔ انگریزوں کا قبرستان بھی ہی۔

حسین ساگر پانی کی ایک بڑی چادر ہے۔ جب خوب بھری ہوتی ہے تو آٹھ میل مربع سے زائد رقبہ پر پھیل جاتی ہے۔ اس سے رزیڈنسی اور مضافات شمال دریائے موسیٰ کو پانی پہونچتا ہے۔ پشتہ یا بند (باندھ) ڈھائی ہزار گز لمبا ہے۔ اسی پر وہ سڑک رواں ہے۔ جو مضافات شمالی کو سکندرآباد سے ملاتی ہے۔ اسکو سلطان ابراہیم قطب شاہ نے قریب سنہ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) کے ڈھائی لاکھ کے خرچہ سے بنوایا تھا۔ پانی کی ایک اور عظیم چادر میر عالم نام آٹھ میل کے دور میں ہوگی۔ یہ شہر کے جنوب غرب میں ہے۔ اس کا طول

بلگرام کے علماء و مشائخ کی ایک اچھی تاریخ مآثر الکرام[۱۱۳۰ھ] فارسی میں لکھی ہے۔ ہندوستان کی ایک دلچسپ مختصر تاریخ عربی میں سبحۃ المرجان[۱۱۳۹ھ] نام تحریر کی ہے۔ جس میں اس ملک کے خصائص و فضائل و شرائف کے بیان کے علاوہ فضلاء و فقراء کا ایک پسندیدہ تذکرہ لکھا ہے۔ ہندوستان کے مخصوص فنون، موسیقی اور شاہد پرستی یعنی نایکہ بھید، پر ایک نہایت مدلل مقدمہ اور مفصل تبصرہ قلمبند کیا ہے۔ اس میں کچھ حصہ اپنی دوسری عربی تالیف شمامۃ العنبر فی ماورد فی الھند من سید البشر سے نقل فرمایا ہے۔ عربی میں سات دیوان سبعۃ سیارۃ[۱۱۳۰ھ]

۱۲۰ اگز ہوگا۔ اسکی تعمیر فرانسیسی انجنیروں نے کی تھی جو نظام کی ملازمت میں تھے۔ سرنگا پٹم کے فتح ہو جانے سے جو زر غنیمت میر عالم وزیر کے حصہ میں آیا تھا اُس سے اُس نے اس تالاب اور بارہ دری اور دیگر عمارات کو تیار کرایا۔ صرف اسی باندھ میں آٹھ لاکھ لگا ہوگا۔ ان دونوں تالابوں سے شہر اور مضافات کو خوب پانی پہونچتا ہے۔ واٹر ورکس بھی یہاں قائم ہے اور نفع عام ہو رہا ہے۔ باغ عامہ نہایت خوبصورت آراستہ و پیراستہ نوبت پہاڑ کے دامن سے ملحق واقع ہے۔ وسط میں دو بڑے بڑے تالاب ہیں خوشنما دیوار چار طرف محیط ہے۔

ایک تالاب گندی پیٹھ خاصکر قابل ذکر ہے جو گولکنڈہ سے دو میل جانب شمال واقع ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے طوفان موسیٰ ندی کے بعد حکومت کے اہل حل و عقد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دریا کو کہیں روک کر اسکا زور و تلاطم کم کر دیا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک قابل ہندوستانی انجنیر کی تجویز سے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر جانب شمال اسکو ایک مضبوط بند سے روک دیا گیا۔ ایک تند و پر زور طوفان خیز دریا کو جس سے تین سو مربع میل زمین زیر آب ہوتی ہو سوا سو فٹ بلند دیوار سے روک دینا دنیا کے محیر العقول انسانی کارناموں میں داخل ہے۔ اس سے دو غرضیں پوری ہوتی ہیں ایک تو پورے شہر حیدرآباد اور سکندرآباد کو صاف و شیریں پانی نلوں کے ذریعے سے بہم پہونچتا ہے۔ دوسرے رود موسیٰ کے آیندہ طوفان خیز اور باعث ہلاکت ہو جانے کے مواقع بہت گھٹ گئے ہیں۔ اب موسیٰ میں صرف اتنا ہی پانی آتا ہے جتنا کہ گندی پیٹھ کی چادر سے زائد سمجھکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وسعت و عظمت میں گندی پیٹھ حسین ساگر سے چار چند ہے۔ بعض انجنیروں کا خیال ہے کہ کسی وقت آفت سماوی یا زلزلہ وغیرہ کے صدمہ سے (خدا نہ کرے) اگر یہ ایک سو چھبیس فیٹ بلند بند ٹوٹ گیا تو گندی پیٹھ کا پانی شہر حیدرآباد میں بھر کر چار مینار کی بلندی سے بھی اونچا جائے گا۔

سر رشتہ آرایش بلدہ نے لاکھوں روپیہ کے مصارف اٹھا کر دو تین سال سے بعد اداے حاوضہ وسط

نام سے لکھے۔ حرمین شریفین وفارس ومصر میں انکی زندگی میں ان کے کلام نے بڑی شہرت و قبولیت پائی۔ سادات کے فضائل میں ایک جداگانہ کتاب ۱۱۴۲ھ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات تحریر کی ہے۔ روضۂ شریفۂ خلد آباد کے آسودگان خاک و بزرگان کرام کا ایک تذکرہ روضۃ الاولیا ۱۱۶۱ھ کے نام سے لکھا ہے۔ تسلیۃ الفؤاد ان کے تمام قصائد کا مجموعہ ہے حدیث پاک سے توغل تھا۔ صحیح بخاری اکثر زیر مطالعہ و زیر عمل رہتی تھی، اُس کی ایک شرح

شہر کی گنجان آبادی کے ہزارہا ناموزوں اور بدزیب مکانات منہدم کرادیئے ہیں۔ اب ان کے بجائے حفظان صحت اور رونق شہر کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک خوش آیند و آرام دہ وضع کے مناسب مکانات اور سڑکیں اور پارک وغیرہ بنائے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ تین چار سال کے اندر آرایش بلدہ کا یہ کام تکمیل پا جائیگا۔

۱۳۱ھ ۱۱۶۰ھ (۴۸-۱۷۴۷ء) میں نورالحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت عین شباب میں غرق ہوگئے تھے۔ آزاد نے ان کا نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا ہے ؎

قیامت بر سرایں بوستاں رفت   کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

۱۳۲ھ امیر حیدر کے باپ میر نورالحسن جب غرق ہوئے ہیں تو امیر حیدر تین سال کے تھے۔ ۱۱۶۵ھ (۵۲-۱۷۵۱ء) کی پیدائش تھی۔ اولاً تحصیل علوم بلگرام میں کی۔ اپنے دادا کے ماموں میر سید محمد شاعر سے اکتساب فضائل کیا۔ پھر اپنے جد امجد کے پاس اورنگ آباد چلے آئے۔ اور وہیں تکمیل و تربیت ہوئی۔ آزاد کی رحلت پر بلگرام واپس آئے۔ اور بود و باش اختیار کی۔ کلکتہ پریسیڈنسی میں عدالت کل (سپریم کورٹ) کے عہدۂ افتا پر مامور تھے۔ بنگالہ سے وطن آرہے تھے کہ مرشد آباد پہونچکر ہاتھ میں ایک پھنسی (دانہ) نکلا جو اس جہان فانی سے انتقال کا سبب ظاہری ہوا۔ "وائے ویلا امیر حیدر رفت" ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) تاریخ وفات ہے۔ جب مفتی امیر حیدر بلگرام میں تھے تو آزاد نے کئی خط ان کے نام عربی میں لکھے تھے جو آزاد کے دیوان میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب کے ایک رسالہ "بیان مالیہ ہائے سرکار و تقابض اراضی حسب شرع محمدی" کا ترجمہ انگریزی اورینٹل مسلینی Oriental Miscellany مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء (۱۲۱۳ھ) میں میری نظر سے گذرا ہے۔ نہایت قابلیت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ عہد اکبر بادشاہ کی ایک نہایت مستند و مکمل تاریخ سوانح اکبری کے نام سے لکھی ہے جس کی مورخین و محققین فرنگ بجد ستایش و تحسین کرتے ہیں۔

۱۳۳ھ تاریخ فرخ آباد مؤلفہ مفتی محمد ولی اللہ اور اتحاف النبلاء مصنفۂ نواب سید محمد صدیق حسن خاں اور تذکرہ خزان الشعرا اضافہ شاہ محمد فاخر افضلی اور مسٹر بیل کی اورینٹل بیاگرافی کل ڈکشنری

اول کتاب سے لے کر آخر کتاب الزکوٰۃ تک ضوء الدراری[۱۴۲] تحریر فرمائی۔ حضرت شیخ مجدد سرہندی کے مکاتیب میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

ان کے کلام کا بڑا حصہ مدائح و مناقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں واقع ہوا ہے اس لئے یہ حسان الہند[۱۴۳] کے لقب سے مشرف تھے۔

آزاد ہندی یا ہندوستانی (ریختہ یا اردو) میں شعر نہیں کہتے تھے وہ اسکو اپنے مرتبۂ عالی

اور اکثر مستند تذکروں اور تاریخوں میں آزاد کا Oriental Biographical Dictionary سال وفات سنہ ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) لکھا ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔ امام اہل سخن فخر اتقیا آزاد کہ بود سید والا نژاد نیک نہاد چو رخت بست ز دنیا بہ عالم عقبیٰ "بیا بہ روضۂ قدسی" فلک ندا در داد لیکن سہو کتابت یا عدم تحقیق سے ضلع ہردوئی کے گزٹیر مطبوعہ سنہ ۱۸۸۴ء میں صفحہ ۱۷۰ پر سن رحلت ۱۲۰۲ھ (۸۸-۱۷۸۷ء) تحریر ہے میر شیر علی افسوس نے بھی آرایش محفل میں سنہ ۱۲۰۲ھ لکھا ہے۔

۱۳۴ھ ید بیضا۔ غیر مطبوع ہے۔

۱۳۵ھ سرو آزاد۔ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۳ء

۱۳۶ھ خزانۂ عامرہ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۷۱ء

۱۳۷ھ مآثر الکرام۔ مطبوعہ مفید عام پریس۔ آگرہ۔ سنہ ۱۹۱۰ء

۱۳۸ھ سبحۃ المرجان۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۳۰۳ھ۔ جس کے ابتدائی اجزاء کا اردو ترجمہ موسوم بہ مظہر آدم، نولکشور پریس لکھنؤ میں سنہ ۱۸۸۰ء میں چھپا تھا۔

۱۳۹ھ السبعۃ السیارۃ کا انتخاب "مختار دیوان آزاد" کے نام سے مطبع آسی لکھنؤ سے سنہ ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا

۱۴۰ھ سند السعادات طبع ہو گئی ہے اور میرزا محمد شیرازی تاجر کتب بمبئی کے یہاں ملتی ہے۔

۱۴۱ھ روضۃ الاولیا۔ مطبوعہ اورنگ آباد دکن۔

۱۴۲ھ ضوء الدراری۔ شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری سے بزیادت بعض فوائد ملخص ہے۔

۱۴۳ھ حضرت حسان بن ثابتؓ کی کنیت ابو الولید تھی۔ آپ انصاری خزرجی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص تھے۔ آپ کا شمار فحول شعرا میں ہوتا ہے۔ ابو عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ اس امر پر عرب کا اجماع ہے کہ حسان بن ثابت سب سے بڑے شاعر اہل مدر (دیہات و صحرا والوں) میں سے تھے۔ آپ کی شان جلالت و مرتبہ یہ ہے کہ حضرات عمرؓ و ابو ہریرۃ و عائشہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے روایت کی ہے۔ سنہ ۵۴ھ (سنہ ۶۷۴ء) سے قبل زمانۂ خلافت حضرت علی

سے پست و دُون سمجھتے تھے۔ اپنے تذکروں اور احوال میں وہ اپنی ہندی شاعری سے انکار بحت کرتے ہیں۔ جو غزل ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے اُس کی روایت بے اصل اور غیر مستند ہے۔ اِن کو قائم چاندپوری کا شاگرد بتانا محض بُہتان و اتہام ہے، اور ان کے خاندان کی خصوصیات و محفوظ روایات کے بالکل منافی۔ بازاروں میں ایک چند ورقہ رسالہ گُربہ نامہ نام ملتا ہے۔ اس میں چوہے بلی کا قصہ عوام یا نوعمروں کی تفریح خاطر کے لئے اردو میں قلبند کر دیا ہے۔ پرانی زبان ہے جا بجا آیات قرآنی واحادیث بھی موجود ہیں۔ سادات و شیوخ بلگرام کا نسب نامہ "شجرہ طیبہ" کے نام سے نہایت احتیاط و تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ان کتابوں کے سوا آزاد کا دیوان فارسی، اور کشکول اشعار منتخبہ، اور چند منظومات اور رسائل بھی انکی یادگار ہیں۔

مآثر الامرا کی ترتیب جدید اور اس کی تہذیب و تکمیل، آزاد کی حیات علمی کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور انکی بقائے شہرت کی ضامن۔

آزاد کی پرورش اور تربیت، تعلیم و تعلم، رفاہیت اور امیرانہ گزران کے متعلق میر عبدالجلیل کے بہت سے حقوق آزاد پر تھے۔ اصل یہ ہے کہ میر عبدالجلیل نے ہی میر غلام علی کو "آزاد و حسان الہند" بنایا تھا۔ یہ شہرہ و فضل انھیں کے فیوض و برکات سے حاصل ہوا تھا۔ آزاد نے بھی ہر ممکن اسلوب سے ان حقوق کو ادا کیا اور ہر موقع پر ان کو یاد رکھا ہے۔ عبادات مالی و جانی ادا کی ہیں اور ید بیضا تو خاص کر میر عبدالجلیل کے تذکرہ و یادگار میں لکھا ہے۔ اس کے بیان کی تمہید میں معذرت کرتے اور فرماتے ہیں کہ:-

---

رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ میں وفات پائی اور بعض لکھتے ہیں کہ سنہ ۵۴ ہجری میں سن مبارک ایک سو بیس سال کا تھا۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گزارے تھے اور ساٹھ زمانۂ اسلام میں۔

جو شعرا رسول اللہ صلعم کی ہجو کرتے تھے انکا جواب حسان دیا کرتے تھے۔

خاقانی شروانی بھی آنحضرت صلعم کی مدح و نعت اکثر کیا کرتا تھا، وہ حسان عجم کہلاتا تھا۔

"برمطالعہ کنندگان ایں سطور مخفی و مستور نماند کہ علت غائی تسوید این کتاب ذکر آنجناب تقدس مآب است۔ پس اگر عندلیب ناطقہ زمزمہ بلند کشد داز درازنفسی نیندیشد کلیم وار معذور، لذت گفتار است ؎

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ ۔۔۔ ھوالمسك ما کررتہ یتضوع "

تسلیۃ الفواد میں آزاد نے اپنے بہت سے قصائد اور مختلف مضامین وحالات جمع کئے تھے۔ ان میں سے کچھ سبحۃ المرجان میں بھی نقل کر دیے ہیں۔ میر عبدالجلیل کے تذکرہ اور قصائد واشعار مدحیہ نے اس میں بھی حصہ غالب پایا ہے۔ ایک زبردست قصیدہ سینتیس ۳۷ شعر کا لکھا تھا جس نے اُدبائے عرب سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے ؎

ادرك علیلا لقاء منك یکفیہ ۔۔۔ وطرفك الناعس المراض یشفیہ

ایک دوسرے محل پر میر غلام علی آزاد اپنے نانا کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

ان فاض امواہ العراق فاننی ۔۔۔ اسعی علی راسی الی البحرین

اعنی یدی سلطان مملکۃ الندی ۔۔۔ ینصب عن ھاتین ماء لسجین

آزاد کا مفصل تذکرہ قلمبند کر چکا ہوں، قدرے تحقیق مزید اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بارگاہ تعالیٰ شانہ میں دست بدعا ہوں کہ اس عاجز ناکارہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور وہ اوراق مطبوع ہو کر اہل علم کے حضور میں بار یاب ہوں۔ آزاد کے کلام اور تصنیفات کو بہت سے قدر شناسوں نے اپنی توجہ اور عنایت اشاعت سے زندہ کر رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ خود آزاد کے احیاء و ابقا کا شرف تقدیر الٰہیہ نے فقیر ہیچمدان کے لئے ودیعت فرمایا ہو۔ ؎

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

ردّ و قبول

شیخ وجیہ الدین اشرف، صاحب بحر زخار، موج احوال شمار ... میں تحریر کرتے ہیں کہ میر سید عبد الجلیل متخلص بہ واسطی، خواص اتقیا اور اجلّۂ علماء سے تھے۔ تزکیۂ قلب، تصفیۂ باطن، تقدس ذات اور جلائل صفات میں یگانۂ زمانہ تھے۔ راقم اوراق زخار کو آپ کے حالات کے لکھنے میں توقف و تامّل تھا۔ آپ کی ثروت ظاہری اور رفاقت و مصاحبت سلاطین پیش نظر اور وجہ تردد تھی۔ لیکن میں (شیخ اشرف) نے ایک شب حضرت سید غلام علی آزاد کو معالمہ (خواب) میں دیکھا کہ اپنی تصنیف مآثر الکرام کا نسخہ میرے سامنے رکھتے اور اپنے حالات کے متعلق اوراق دکھا کر فرما رہے ہیں کہ ان تین شخصوں کا حال ضرور لکھئے گا اور اس کے لئے اصرار فرمایا۔ صبح کو میں بیدار ہوا، کتاب کھول کر وہ جگہ نکالی۔ تحریر یہ تھا کہ بندہ آزاد نے علامی میر سید عبد الجلیل اور اُن کے خلف الصدق میر سید محمد و نیز سید طفیل محمد سے تحصیل علوم کی ہے۔ اس لئے میں (صاحب تذکرہ زخار) نے ان تینوں حضرات کا حال لکھ کر اپنی کتاب میں داخل کر دیا۔ خود میر صاحب کو درویشوں کی صف میں جگہ دی، اُن کے فرزند رشید کو مُریدان شاہ لدھا کے زمرہ میں، اور میر طفیل محمد کو متفرقات میں رکھا۔

صاحب بحر زخار نے میر جلیل کی بیعتِ علویہ اور طریقت اُویسیہ و حمویہ کا بھی حوالہ دیا اور آپ کو مصاحب و محرم اسرار مرتضویہ بتایا ہے۔ آپ کے کمال و کلام اور وفات اور نعش کے متعلق خرق عادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ حضرت کی رحلت کے بعد، ایک بار میر آزاد اورنگ آباد میں تپ محرق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت دن گزر چکے تھے اور تپ مفارقت نہیں کرتی تھی۔ ایک شب کو عالم رویا میں حضرت کو دیکھا فرماتے ہیں کہ بیشک بہت تکلیف اُٹھائی کل تپ جاتی رہیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

شیخ کا قول مختصر یہ ہے کہ آپ کو شعر گوئی میں مرتبۂ عالی حاصل تھا اور بلگرام کا نام آپ ہی کے وجود فائض الجود سے شہرۂ آفاق ہوا۔

مضل واعظم مفقود فجعت بہ   من لا نظیر لہ فی الناس یخلفہ

ذکر خیر

میر صاحب کے حالات کم و بیش اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ شہرت و ناموری جو انکو زندگی میں نصیب نہیں ہوئی تھی مرنے کے بعد اُنکے حصہ میں آئی اُنکی قابلیت و سخن سنجی کی داد اہل فن اور اہل نظر نے دی اور کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ بے شبہ میر کے نام کے احیاء اور اُنکو حیات ابدی بخشنے میں آزاد اور اُنکے قلم نے دم عیسوی کا کام کیا ہے اور اُنکے بعد مقبول ستہام گمنام نے لیکن کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنکو آزاد کے بعض اقوال و تحریرات سے اختلاف رہا ہے مگر میر جلیل کے متعلق وہ بھی متفق المدح اور رطب اللسان ہیں (۱) تاریخ آرائش محفل (۲) منتخبات ہندی و ہندوستانی برائے ترجمانان فوج مطبوعۂ کلکتہ سنہ ۱۸۲۷ء (۳) جامع التواریخ (۴) حدیقۃ الاقالیم (۵) تاریخ فرخ آباد۔ مولفۂ مولوی محمد ولی اللہ حسینی مفتی (۶) گلشن بیخار (۷) الفرع النامی من الاصل السامی، مصنفۂ نواب صدیق حسن خان میں میر اور میر کی شاعری کا حال درج ہے (۸) نواب صاحب نے غصن البان المورق بمحسنات البیان، مطبوعۃ الجوائب، قسطنطنیہ سنہ ۱۲۹۶ھ میں میر کی بعض لطیف عربی تاریخوں کا ذکر کیا اور (۹) تذکرہ شمع انجمن میں بڑے احترام سے یاد کیا ہے (۱۰) انتخاب اشعار سراپا موسوم بہ ارمغانِ گوکل پرشاد، مطبوعہ کانپور بھی میر کے اس رنگ کے کلام سے خالی نہیں رہا مسٹر طامس ولیم بیل نے (۱۱) مفتاح التواریخ فارسی تالیف سنہ ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۸ء اور (۱۲) تذکرہ مشاہیر شرق 1881 The Oriental Biographical Dictionary میں میر کے سوانح و احوال تحریر کئے ہیں (۱۳) میر حسین دوست سنبھلی نے جو آزاد کے ہم عصر تھے تذکرہ حسینی (شعرا) میں میر جلیل کو "سر حلقہ علمائے نامی عمدہ بلغائے زمان، قدوہ کمالات و دستگاہ" لکھا ہے۔

پایانِ سُخن

عذر و شکر

کارسازِ حقیقی کا شکر ہے کہ منزل ختم ہوئی اور قلم کا مسافر تھک کر بیٹھ گیا۔ جسکے آہنگ بلند سے کبھی مُتنبّی کی یہ، صدا آتی تھی ؎

لَاَستَسهِلَنَّ الصَّعبَ اَو اُدرِكَ المُنٰى   فَمَا انقَادَتِ الآمَالُ اِلَّا لِصَابِرِ

اُسکی نگاہ کے سامنے کوئی فراخ دست میدان نہین، بلکہ ایک پُرخار خطرِ دشت تھا جس کے طے کرنے کیلئے وہ کبھی چلا، کبھی بھاگا اور کبھی بیتابی سے دوڑا۔ بالآخر اُسکی آبلہ پائی نے جواب دیدیا اور وہ باہمّت، ہمت ہار گیا۔ ہر تنک حوصلہ شایستۂ رُسوائی نیست! الرفیق ثم الطریق مشہور مقولہ ہے مگر اس دلیر مسافر نے یکہ و تنہا قدم نکالا تھا اور اسی طرح اِس دیارِ بیگانہ سے گزار کیا۔ توفیقاتِ ربّانی اور تائیداتِ یزدانی نے دستگیری و رہبری فرمائی اور وہ یہ کہتا ہوا مرحلۂ مقصود پر پہونچ گیا ع

مُژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم۔ اس نے اپنی منزل کس طرح طے کی؟ اسکا فیصلہ اِس وقت نہین بلکہ غالبًا میرے بعد اہلِ نظر کرین گے مین نہ لذّتِ عاجل کا طالب ہون نہ مسرّتِ آجل کا متمنّی محنت کی داد اور کام کی قدر و تحسین کی آرزو مجکو نہ اب ہے نہ شاید کبھی ہوگی ؎

دل لذّتِ ظلم ذوقِ جراحت می خواست   بختہاے دل خود را بہ نمکدان زدہ ام

دُنیا معترضین سے خالی نہین، اگر جاننے اور سمجھنے والے نکتہ بینی و نکوہش فرمائین تو مجھ ایسے ہیچ میرز کے لئے سرمایۂ صد نازش اور موجبِ فخر و امتیاز ہے لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعض مدعیانِ ہمہ دانی (بھی) جو تصنیف و تالیف کے دشوار گزار کوچہ سے نابلد و ناآشنا ہوتے ہین

ترجمہ میں دشواریون کو ضرور آسان سمجھتا رہونگا، یہان تک کہ اپنی آرزؤن کو پورا کرلون۔ کیونکہ صبر کے ساتھ کام کرنیوالے کی سوا امیدین اور کسی کے قابو مین نہین آتین۔

اور جن کو چند سطرین صحیح یا غلط لکھنے کی نوبت اتفاق سے آتی ہے خوردہ گیری اور عیب جوئی کو اپنا جوہر و شعار بنا لیتے ہین۔ للہ الحمد کہ اس فقیر آزادہ رَو کو نہ تحسین ناشناس کی آرزو ہے نہ سکوت قدر شناس کی شکایت ہوگی۔ مین تو بلبل شیراز کا ہمنوا ہون ۔ع دل نہی بخوب ما طعنہ مزن بر سنت ما۔ مین اپنی تقصیرات و فروگزاشتون سے بے خبر نہین۔ آگاہی ہے کہ اس آوارہ گردی و بادیہ پیمائی مین بارہا غلط روی و کج راہی کا شکار ہوا ہون۔ اس لیے مجھے قارئین کریم النفس سے محض عفو و مکرمت کا سترصد و متوقع رہنا چاہیئے ؎

خوئے آدم وارم آدم زادہ ام　　　آشکارا دم ز عصیان می زنم

عُذر- بزرگان فرنگ کا دستور ہے کہ نقل و روایت کے وقت اپنی معلومات کا ذریعہ و ماخذ بتاتے جاتے ہین میرے ہم وطن ہم عصر صاحب قلم بھی اُن کا تتبع کرتے اور اس بارہ مین کوتاہی کرنے والون پر زبان طعن دراز فرماتے ہین۔ اس ناچیز تذکرہ مین حتی الوسع اس عاجز نے بھی اُنکی تقلید کی ہے۔ لیکن حواشی و ذیل تحت المتن مین پوری پابندی نہ کرسکا اور اس التزام کو خیرباد کہنا پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نکتہ بین حضرات کو اس سے ملامت و تشنیع کا موقع ملے ؎

ہاے زندہ دل نہ رفت سلامت زعیب جو　　　کین ماجرا بہ خضر علیہ السلام رفت

عذر مقبول اسی قدر ہے کہ اس پانسو صفحے کی کتاب مین ایسی باتین بہت کم درج ہین جو اس ہیچمدان تہی دست کی ذاتی واقفیت و معلومات پر مبنی ہون، اِلّا ماشاء اللہ۔ ان اوراق مین سیاہ و سفید، رطب و یابس جو کچھ ہے وہ دوسرون ہی کے دست دریا نوال سے بھرا ہے مین نے متقدمین و معاصرین کے خوان کرم سے زلہ ربائی اور خرمن علم سے خوشہ چینی کی ہے

۱۲۵ حقیقتاً یہ معمول تو ہمارے ائمہ حدیث اور سلف صالح کا تھا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ یورپ نے یہ دولت اکابر اسلام سے پائی اور اُس کی پوری حفاظت و قدر کی مصنفین متقدمین کی روش یہی تھی کہ نقل روایت کے ساتھ ساتھ سلسلہ رواۃ کو بھی بتاتے جاتے تھے۔ وہ نہ صرف کسی واقعہ کو ملا کے ہر ایک جزو کو علیحدہ سلسلہ سے ذکر کرتے تھے اس قسم کے محققانہ مگر پیچیدہ طرز بیان سے نہ تو مضمون کا تسلسل قائم رہتا تھا اور نہ مطالعہ کا لطف سُننے والون کی

کانٹون کو ہٹا کر چند برگ د گل چن لیے ہین اور اُن کو محل مناسب پر یکجا کر کے یہ دستۂ گل تیار کر دیا ہے۔ بندہ اپنی تنگ دامنی سے مجبور تھا۔ ورنہ خدا کے ہرے بھرے چمن مین مقبول دریوزہ کے لئے نہ پھولون کی کمی تھی نہ کلیون کی۔ کہان تک ان لکھنے والون کا حوالہ دیتا اور اپنے مآخذ و مسانید کو شمار کراتا جن کی تعداد احاد و اعشار سے تجاوز کر کے مآت تک پہونچتی ہے۔ تکوّنات الٰہیہ کی ازلی و قدیم ترین کتاب سے لے کر جس کی اس عالم کی تنزلی عمر بھی ساڑھے تیرہ سو سال سے زائد ہی۔ کل شام تک کی مفید مطلب تحریر جو میری نگاہ سے گذری ہی، مین نے اُس سے فائدہ اٹھایا اور اقتباس و استنباط کیا ہے مگر ہر ایک موقع پر ہر ایک راوی یا قائل کا نام لیتا جاتا تو تکرار بے سود کے علاوہ قرّاے معظم کی بے لطفی و زحمت کشی کا باعث ہوتا۔ ناگزیر ضخامت کتاب بھی بڑھ جاتی۔ اس لئے مدعیانہ و حریفانہ نہین بلکہ نیاز مندانہ و مخلصانہ، اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ اس عاجز نے بلا تحقیق و تحیص کچھ نہین لکھا ہے۔ بلکہ تا امکان خود متعدد و مختلف ذرائع سے اپنی معلومات کی توثیق کی اور اپنی تحریر کی صحت و صواب کا اطمینان کر لیا ہے ع زہر دیوانہ در زیر لب افسانہا دارم۔ روایات و منقولات کے مقابلہ مین معقولات یا اپنے معتقدات کو دخل نہین دیا ہے۔

شکر۔ مین جملہ بزرگان اہل قلم (الاحیاء منہم و الاموات) کا زیر بار احسان اور ان کے نتیجات قلم کا رہین منت ہون۔ بعض اوقات مین نے اپنی کم نظری کے باعث چند حضرات کے کسی خیال یا تحریر سے اختلاف کیا ہی۔ مگر یہ احساس باقی ہی کہ اس دریوزہ گر دکم مایہ نے انھین کے تیار کئے ہوے خوان کرم و نعم سے فائدہ اٹھایا اور انھین کے خرمن علم و ادب سے

دحشت بڑھنے لگی تو رفتہ رفتہ یہ طریقہ بھی اٹھتا گیا۔ ائمہ، افاضل اور علما نے اس تغیر کو پسند نہین فرمایا وہ توثیق و استناد اور ضبط اعتبار و اعتماد کے لئے سلسلۂ روایات کے بدستور متوقع و منتظر رہے۔ مگر طبقات مابعد کی خواہش غالب آئی اور اس کا رواج گھٹتا گیا۔

ریزہ چینی کی ہے۔ الفضل للمتقدم کی مصداق یہی نام آور دعالی قدر ہستیاں ہیں، جنکے درخشان کارنامے صفحات روزگار پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ یہی ذوات گرامی ہمارے امتنان وتشکر کی مستحق ہیں۔ مقبول عاجز بھی انہیں کی ہدایت و رہبری سے منتفع و مستفید ہوا اور اُن کے نقوش قدم پر چلا ہے۔ ترک ادب یا اعتراض، حتےکہ سوءِ ظن بھی اس عصیان کار کا شیوہ نہیں۔ معہذا، جانتا ہون کہ ناشکری و کفران نعمت کی حرف عیب جوئی و خوردہ گیری کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے ایک ممتاز جرمن فاضل کا قول یاد ہے جس نے اپنے سے بھی زیادہ ممتاز اور متبحرِ علوم باپ کے سایۂ شفقت مین تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس بلند فطرت انسان نے جب ایک اعلیٰ درجہ کی ادبی تصنیف شائع کی تو اس کی شرح و تحشیہ مین اپنے مطالعہ یا اپنے خیال کے اظہار کا آغاز ان کلمات سے کیا تھا (qutidissime qater meus)

"پوئی ڈِسی می پیٹرمی اس" بابائے بزرگ نے کمال غلط کاری سے، یا پدر مکرم نے بدترین ذوق سے ..... صریحاً مقصود یہ تھا کہ مین علیٰ سبیل البدل (اس کی بجاے) یہ تجویز کرتا ہون۔ ایسی رائے زنی یا خودستائی و خود پسندی دَورِ حاضرہ کی روز افزون روشنی اور کمال ارتقا و تہذیب کا نتیجہ سمجھی جاے یا فطرت کی نیرنگی کا اقتضاء، لیکن اکبر مرحوم اس کو درس عبرت و بصیرت بتاتا ہے ؎

یہ جو ہنگامہ ہے جبکی ہر طرف تائید ہے ۔۔۔ آپ کی تعلیم ہے، اور آپ کی تقلید ہے
مستحقانِ اَدَب کو آپنے رُسوا کیا ۔۔۔ آپکے دعوائے عظمت کی بھی اب تردید ہے

مین اُن تمام ارباب ادب و اصحاب علم کا منت شناس و سپاسگزار ہون جنھون نے اس کتاب کی تالیف کے دوران مین میری ہمت افزائی کی، اور نیک مشورون اور صحیح معلومات سے دستگیری و اعانت فرمائی ہے۔ حبیب لبیب مولوی زبید احمد صاحب ادیب العربیہ خطیب جامعۂ الہ آباد، جن کا نام نامی آغاز کتاب مین آچکا ہے بالخصوص قابل ذکر ہین جن کی متوالی و مسلسل تحریک نے مجھے مشتغل رکھا اور اس ناچیز تذکرہ کی اشاعت و طباعت

کے لئے ایک بہتر صورت تجویز فرمادی۔

صاحب مناقب فاخرہ مولانا حکیم سید اسحٰق علی پروفیسر نے بکمال شفقت ان اوراق پر نگاہ ڈالی اور اپنے فیضان کمال سے حتی الوسع مجھے جادۂ مستقیم پر گامزن رکھا۔

عزیز محترم منشی محمد شبیہ خان کا بھی رہین منت وکرم ہون جن کی توجہ والتفات سے تذکرہ ہذا کی کتابت بہ آئین بہین تذکرہ نگار کی نظرون سے دور مقام پر ہوئی اور جنھون نے باوصف اشتغال خدمات سرکاری کبھی دریغ عنایت نہ فرمایا۔

باایں ہمہ سعی وکاوش اس حقیر مجموعہ مین بہت سی غلطیان اہل نظر کی نظر سے گزرین گی کچھ تو کاتبین کرام (کاپی نویسون) کے طفیل مین مگر زیادہ تر خود اس غلط کوشش کی بدولت۔ سیدنا عمر فاروق رضؓ کا قول ہے رحم اللہ من اھدی الی عیوبی خدا اس کا بھلا کرے جو میرے عیبون کا تحفہ میرے پاس لائے مین ان صاحبون کا شکرگذار ہون گا جو میری تقصیرات اور غلطیون سے مجھے آگاہ فرمائین گے ہوسکا تو طبع آیندہ مین ان کی درستی و اصلاح کر دون گا۔ ورنہ "جس کسی کے دل مین جو کچھ آئے کہہ ڈالے کہ انسان اسی امر مین قابل سرزنش ہوسکتا ہے جو اسکے بس کا ہو"۔ ع

الا لیقل من شاء ما شاء انما   یلام الفتی فیما ستطاع من الامر

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ   سمدن ۔ (فتح گڈھ)

نامہ سیاہ مقبول

ملحقات

اِستدراک و اِضافہ

تذکرہ ہذا کی کتابت وطباعت میں پورے دو سال صرف ہوگئے۔ خودفراموش مقبول کو اس دوران میں بہت سی باتیں لکھنے کے قابل یاد آئیں۔ بعض طاق نسیاں میں محفوظ ہیں باقی سپرد قلم کیجاتی ہیں۔

قرائے کرام اِن سطور کو خواہ یہاں رہنے دیں خواہ کتاب میں مناسب موقع پر منتقل فرمائیں۔ حیات مستعار کا بھروسہ نہیں جو طبع آیندہ میں اضافہ و اصلاح کی امید کرسکوں ؎

ازہستی ما ہمیں نمونہ است چو موج — نقشے است وجود ماکہ برآب زدند

آخر جمادی الآخر ۱۳۴۷ھ
مقبول

حصّہ اول

صفحہ ۱۰۔ نوٹ ۲۳۔ اضافہ (آخر میں۔)

ذیل کی نقادیم دزایچات بھی قابل ذکر ہیں

(۱) ہیملٹن Capt. A. Hamilton نے سنوات ہندی کی

ایک کلید تیار کی تھی جو ۱۸۲۰ء میں کیمبرج سے دو جلدوں میں شایع ہوئی۔

(۲) ایک "جدول تقاویم" ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں چھپی تھی۔ اسمیں صوبجات بنگال، بہار، اوڑیسہ، بنارس و دیگر ممالک مفوضہ و مفتوحہ میں جو مختلف سال رائج تھے اُنکی تاریخیں بالمقابل درج تھیں۔

(۳) احاطۂ بمبئی میں جو مختلف سن یعنی عیسوی، ہندی، اسلامی و پارسی مستعمل تھے اُنکی متوازی و متقابل تاریخوں کا ایک زایچہ "جدول تقاویم" کے نام سے پوری ایک صدی کا (از ۱۷۵۲ء تا ۱۸۵۲ء) بمبئی سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴) بوناڈ W. A. Bonnaud نے بھی ایک جنتری ہندوستان کے مختلف سالوں (سنون) کی ۱۸۴۸ء سے لیکر ۱۸۷۵ء تک کی ۱۸۷۵ء میں مرتب کی تھی جو کلکتہ اور بمبئی دونوں مقامات سے شائع کی۔

صفحہ ۱۴۱۔ نوٹ ۲۷ متعلق سمدن۔ اضافہ (آخر میں)

"قنوج کی ہندو سلطنت کا وہ بڑا اور قدیم صومعہ اور آشرم جو ہندوستانی تہذیب و شایستگی اور تربیت و آموزش کا سرچشمہ تھا اور جسکا شمار ہندوستان کے لئے آریونکے بخشے ہوئے بڑے بڑے فیوض و برکات میں ہوتا ہے، اسی موضع میں اُس بلند مقام پر تھا جہاں اب بڑی عیدگاہ واقع ہے۔ اس خانقاہ یا مُنی نواس کے گرد جنگل تھا جہاں مُرتاض رشی مع اپنے کنبہ و خاندان کے رہتے تھے۔ انکے گوشہ عافیت مساکن "تپوون" کھلاتے تھے۔ اِن مقدس ہستیوں کی توجہات تمام تر توسیع و ترقی علم اور حُسن سیرت و نکوئی اخلاق کے سکھانے اور پھیلانے پر منعطف و مصروف رہتی تھیں۔

پرچم اسلام تو اس مقام پر محمود غزنوی کے عہد دولت میں بلند ہوا ہے لیکن سب سے پہلا مسلمان جس کے قدم سمدن کی خاک نے چومے تھے زید بن عمر

کلابی تھا جو پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی تقویم مسیحی کی آٹھویں صدی کے آغاز میں ولید بن عبد الملک اموی خلیفہ دمشق کا فرمان لیکر سفیرانہ حیثیت سے قنوج کے راجہ کے یہاں گیا تھا۔ تاریخوں کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم اول مجاہد و فاتح ہندوستان نے سندھ سے اپنے سپہ سالار ابو حاکم شیبانی کو ان اطراف میں دعوت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن مختلف انتظامی وجوہ اور فوجی مصالح سے وہ خود تو اودے پور میں ٹھہر گیا اور اُس اولوالعزم و بہادر جنرل (کلابی) کو ادھر بھیجدیا۔ اصابہ فی تمئیز اسماء الصحابہ میں جو علم رجال میں حافظ احمد بن حجر عسقلانی کی مستند و ضخیم تالیف ہے نیز کتاب الذیل میں اسحاق بن ابراہیم طوسی (جنکی عمر اُسوقت ستانوے برس کی تھی) اور سُر باتک بادشاہ ہند کی ملاقات و گفتگو کا حال مرقوم ہے۔ مگر اہل تحقیق عموماً اور امام ذہبی خصوصاً جو رجالی بھی ہیں محدث بھی اور عظیم الشان مورخ اور مصنف بھی اپنی تجریدمیں انکی یا (یوں کہئے کہ) سُر باتک کی باتوں کو کذب واضح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس واقعہ اور مکالمہ کو اور بھی بہت سے راویوں نے کم و بیش نقل کیا ہے۔ عمر بن احمد نیشاپوری کا قول ہے کہ سرباتک نے ۳۳۳ھ (۹۴۴ء) میں وفات پائی تھی۔ بھرکیف قابل وثوق ذرائع سے اسقدر ثابت ہے کہ اسحاق بن ابراہیم طوسی تبلیغ و ہدایت کے لئے اسیطرف ہوکر قنوج گئے تھے۔

چند سلاطین دہلی کو بھی سمدن میں ٹھرنے یا گذرنے کا اتفاق ہوا ہے تاریخوں کی ورق گردانی خصوصاً فیروز شاہی (وترجمہ ڈوسن Dowson) وملحقات طبقات ناصری و طبقات اکبری و مبارک شاہی و فرشتہ وغیرہ کے مطالعہ سے اسکا پتہ چلتا ہے۔

۱؎ سمدن۔ تقریباً قنوج اور بھوج پور کے وسط میں ہے غیاث الدین بلبن کو

وہاں کے آنے جانے میں دو بار یہاں آنیکا اتفاق ہوا تھا۔ پہلے ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء)
میں بزمانۂ وزارت بعد ازاں ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں بطور شاہنشاہ۔

۲۔ جلال الدین خلجی نے جب اُلغ خاں پر فوجکشی کی تھی جسکا ذکر امیر خسرو نے
مفتاح الفتوح (غرۃ الکمال) میں کیا ہے تو وہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) بن سمدن ہوتا ہوا
گیا تھا۔

۳۔ محمد جونا بن تغلق۔ پہلی مرتبہ سُرگ دواری جاتے ہوئے ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء)
میں دوسری دفعہ ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں واپسی قنوج پر اور

۴۔ ناصر الدین محمد تغلق اٹاوہ جاتے ہوئے ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں گذرے تھے۔

۵۔ محمود شاہ تغلق۔ ۸۰۴ھ سے ۸۰۸ھ (۱۴۰۱ء سے ۱۴۰۵ء) پانچ سال تک
قنوج میں مقیم فرمانروا رہا ہے سیر و تفریح کے لئے اس طرف اکثر نکل آتا تھا۔
وہ اس کشت زار کی لطافت و دلفریبی اور دلکشی کا بڑا معرف تھا سمدن کا پرانا
اور شیریں کنواں اُٹھ کونا اسی عہد کی یادگار اور فیض جاری ہے۔

۶۔ بہلول لودی یہیں سے دو بار شمس آباد گیا تھا۔ انہیں ہنگاموں یا کوکبۂ شاہی
کے غلغلوں سے متاثر و مرعوب ہو کر بعض سادات تلاش معاش اور ترک وطن کے لئے
مجبور ہوئے تھے۔ بعض اہل شوق تحصیل و تکمیل علوم و فنون کے لئے باہر نکل گئے تھے
صاحب شرائف عثمانی کا بیان ہے کہ میر غلام علی آزاد کے بزرگوں نے اسی زمانہ
میں اور اسی ضرورت سے سمدن کو چھوڑا تھا۔

۷۔ شاہزادہ جوان دولت و اقبال ہمایوں مرزا جب بابر کے حکم سے سلطان محمد
دہار خاں) پر فوج لیکر گیا ہے تو سمدن میں فروکش ہوا تھا۔ یہ روایت مقامی سینہ بہ سینہ
چلی آتی ہے کہ سمدن کے ساتھ ہمایوں کو اُسی وقت سے الفت ہو گئی تھی حتیٰ کہ جب وہ ایران
سے واپس آیا اور ہندوستان کو پھر فتح کیا ہے تو سمدن کو یاد کیا اور اپنے رفقا سادات

مشہدی کو یہاں اقامت گزیں ہونیکا مشورہ دیا تھا۔

؎۔ شاہ عالم بعض سیاسی وجوہ و مصالح سے خود تو یہاں نہ آسکا تھا مگر اُس نے اظہار ارادت و عقیدت کے لئے اپنا دیوان اشعار حجۃ الملۃ والامہ سید برہان الدین مولانا اناراللہ برہانہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ شقہ مصحوب میں لکھا تھا کہ آپ کا آستان مدتوں سے زیارت گاہ خلائق اور مرکز فیوض وسعادات رہا ہے۔ آپ کا قصبہ کئی جہت سے ایک مخصوص امتیاز و شہرت رکھتا ہے وہ علم کے لعل ہائے درخشاں کے لئے مدتوں سے بدخشاں اور فنون و کمالات کے لآلی آبدار کا عدن بنا ہوا ہے۔ (یہ شقہ بہ دستخط خاص شاہان سلف کے دیگر فرامین کے ساتھ میرے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے)

فرخ آباد کے نواب رئیس بھی بڑی قدر و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ انکی سرکار میں بعض باشندگان سمدن کو پورا اقتدار و اختیار حاصل تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آنے اور انکی دولت و قوت کے زائل ہونے کے ساتھ ساتھ سمدن کی عظمت ایک علمی و روحانی مرکز ہونے کی حیثیت سے روز بروز گھٹنے لگی حتیٰ کہ یہاں کے سادات و مشائخ کے بعض اخلاف سبحہ و سجادہ چھوڑ کر تلاش معاش اور تیغ و تفنگ اُٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس خرقہ پوش و طیلساں بردوش جماعت کے افراد چست فوجی وردی زیب تن کئے نظر آنے لگے تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی امن و سکون کے موجودہ دَور کے آغاز تک یہ مقام جنگی زاویہ نگاہ سے ایک اہم مقام رہا ہے مورخین متاخرین اسی حیثیت سے اسکی تقریب کرتے ہیں۔ شیخ مرتضیٰ حسین الہ یار خانی حدیقۃ الاقالیم (مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۷۳) میں اُس میدان کا نشان دیتے ہیں جہاں جولائی ۱۷۵۰ء میں نصیر الدین حیدر نے اُسکے بیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں اور سرداروں کو احمد خاں بنگش نے زبردست شکست دی تھی اور ہمیشہ (یا کم از کم ایک زمانہ کے لئے) نواب وزیرالممالک فرمانروائے اودھ کی حکومت اس قطعہ ملک سے اُٹھا دی تھی۔

احمد خاں بن محمد خاں باغوائے افاغنہ ... شمس آباد کہ سرگروہ آں رستم خان نام داشت خروج کردہ و با راجہ نول رائے متصل سمدن رزمے صعب نمودہ او را بقتل رسانید" انگریزوں کی نظر میں اسکی خاص وقعت تھی۔ اسکو بہت سے جنرلیوں اور افسروں نے سپردِ قلم کیا ہے۔

(۱) ایڈورڈ تھارنٹن Edward Thornton نے جو ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی تاریخ کا مشہور مولف ہے سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات اور اقلیم ہند کی دیسی ریاستوں کا گزیٹیر بحکم آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس مرتب کیا تھا اور جس میں خاص طور پر اُن وثائق و دستاویزات سے استنباط و استناد کیا گیا تھا جو کمپنی کے قبض و تصرف میں تھے۔

A Gazetteer of the Territories under the Government of the East-India Company, and of the Native States on the continent of India. Vol. IV,-page 615.

اسکی جلد چہارم صفحہ ۶۱۵ مطبوعہ ۱۸۵۴ء لندن میں سمدن کا حال لکھتا ہے اور گریں ایچ (انگلستان) کی مساحت کے اعتبار سے عرض البلد ستائیس درجہ سات دقیقہ اور طول البلد اناسی درجہ چھیالیس دقیقہ بتاتا ہے۔

(۲) وہ لکھتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اکثر سرکاری تحریرات و دستاویزات E. I. C. Mis Doc. میں اس کا ذکر موجود ہے "معروف نام سمدن Sumdun ہے مگر عوام کالانعام سمجن Sumjun بولتے ہیں"۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ a small town فرخ آباد کے برطانوی ضلع اور صوبجات شمال و مغرب کی

لفٹنٹ گورنری میں اُس سڑک پر واقع ہے جو کانپور سے چھاؤنی فتحگڈھ کو جاتی ہے۔

(۳) گارڈین اپنی کتاب "شوارع و سُبل" کے صفحہ ۱۲۱ پر۔

Garden. Tables of routes, 121.

اسکے موقع و مناظر کو بیان کرتا ہے اور اُس کا فاصلہ قریب کی بعض لشکرگاہوں سے بتاتا ہے۔

(۴) کپتان آر منڈی نے "قلم و پنسل کے نقوش" یعنی "ہندوستان میں ایک دورہ کا سفرنامہ" دو جلدوں میں لندن سے ۱۸۳۲ء میں شائع کیا تھا۔

Mundy (Cap.-R.)—Pen and Pencil sketches, being the Journal of a tour in India. London, 1832, Vol. I-44.

اسکی جلد اول کے صفحہ ۴۴ میں۔ اور

(۵) میجر ای سی آرچر نے اپنی سیاحت کی یادداشتیں نہایت مکمل لکھی تہیں جو "بالائے ہند اور بعض حصص کوہ ہمالیہ کے دورے۔ مع حالات دربارہائے امرائے ہند" کے نام سے لندن میں ۱۸۳۳ء میں دو ضخیم جلدوں میں چھپی تہیں۔

Archer (Maj. E. C.)—Tours in Upper India, and in parts of the Himalaya Mountains ; with accounts of the Court of the Native Princes. London. 1833. Vol. 1-43.

اسکی پہلی جلد کے صفحہ ۴۳ پر۔

یہاں کے راستہ کی عمدگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ زمین کے ہموار و سطح ہونے اور لہلہاتے ہوئے سرسبز قطعات اور مراتع و مزارع کی تحسین کی ہے۔

حال کی تاریخوں میں سے میر بہادر علی چھپرا موی (اصلاً صمدنی) کی "لوح تاریخ"

(۱۲۵۵ھ) رائے بہادر منشی کالی رائے ڈپٹی کلکٹر کے فتحگڈھ نامہ (مطبوعہ ۱۸۴۹ء) اور مسٹر ولیم آیروین کی انگریزی تاریخ نوابین بنگش فرخ آباد (۱۸۷۷ء) اور اُسکے اُردو ترجمہ (مطبوعہ حسنی پریس ۱۸۸۷ء) میں سمدن کا ذکر موجود ہے۔

حضرت قلندؔر کا خمیر پاک اسی خاک سے تھا جو وطن آبائی سے دور دیار مشرق میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں پیوند زمیں ملا طاہر غنی کشمیری نے اسی بلند پایہ صنف وشاعر کی شان میں فرمایا تھا ؎

از اہل سخن کس بہ قلندر نہ رسد — در شعر با عرفی و سنجر نہ رسد

العجب ثم العجب! کہ ایسا نکتہ شناس بالغ نظر ان کو عرفی کیسے قادر (کاشی) کے کلام سے برتر بتاتا ہے!!

زندہ جاوید فیضی کی گور معطر رہے جس نے بزرگان سمدن کے حسب حال یہ شعر کہا تھا ؎

شدیم خاک ولیکن بہ بوے تربت ما — تواں شناخت کزیں خاک مرد مے خیزد

بہو بیگم صاحبہ (زوجہ نواب شجاع الدولہ) کی رحلت پر اہل کمال فیض آباد سے رخصت ہونے لگے تو استاذ الاساتذہ میر مستحسن خلیق (پدر میر انیس) نے فرخ آباد کا رخ کیا۔ رجب ۱۲۴۰ھ میں سمدن پہونچے۔ سادہ دل سادہ منش سیدوں نے کمال محبت و احترام سے اپنے غریب الوطن بھائی کو روکا۔ خاطر و مدارات کی۔ مہمان عزیز بھی ان کے خلوص و بے تکلفی سے متاثر ہوا۔ کچھ روز یہاں بسر کئے نواب رئیس (والی فرخ آباد) کے یہاں بھی سمدن ہی کے ایک با اقتدار سید زادہ نے تقریب وسعی کی۔ سمدن کے بعض خاندانوں میں مرثیہ گوئی کی بنیاد اُسی زمانہ میں پڑی۔ اِن سادات کے اخلاف تحت اللفظ پڑھنے میں اب تک اُسی روش اجداد پر قائم ہیں۔

صفحہ ۵۲۔ نوٹ ۵۴۔ نواب مبارک خاں کا پورا قطعہ یہ ہے ؎

مالک ملک نظم شیخ نظام | شاعرے نادر و فصیح کلام
در قصیدہ شدہ ظہیر زماں | در غزل گشتہ خسرو ایام
بست رخت بقا ز ملک فنا | کرد آہستہ سوئے خلد خرام
کردم اندیشہ بہر تاریخش | خردم گفت "آہ آہ نظام" ۱۰۲۰ھ

صفحہ ۵۳۔ نوٹ ۵۵۔ آخر۔ شیخ سلیمان بلگرامی کی رحلت کا قطعۂ تاریخ مولانا ضمیری نے لکھا تھا ؎

سپہر جاہ و دولت اے سلیماں | کہ تاج مکنتش شد تا سر ماہ
شدہ پیمانہ اش پُر چوں بذیقعد | بوقت رحمت حق اولیں ماہ
حدیث خلق و احسان و حیایش | شدہ افسانہ در عالم با فواہ
بسوے جنت عالی رواں شد | بحکم ایزدی آں طاب مثواہ
چو با جاہ و جلال خویش آں شیخ | گرفتہ جانب خلد بریں راہ
پئے تاریخ فوتش در بدیہہ | خرد گفتہ کجا آں شیخ با جاہ ۹۹۷ھ

دوسری تاریخ ایک مصرع "شمار سال وفاتش میانِ خلد بریں" سے نکلتی ہے

صفحہ ۵۵۔ سطر ۱۰۔ حاشیہ متعلق شیخ الہ یار (پسر شیخ عبدالسبحان)۔ (شہید ہوئے کے بعد یہ واقعہ برسات میں عین دسہرہ کے دن ہوا تھا۔ شیخ روح الامین نے قطعہ تاریخ لکھا ؎

ناگہاں ہاتفے از در دکشیدہ آہ و بگفت | آبرو دادہ الہ یار بلشکر اسلام

سے تاریخ (۱۱۲۹ھ) نکالی تھی شیخ غلام حسین ثمین نے شعر آخر کو بدلکر دائرہ تاریخی تیار کر دیا

ناگہاں ہاتف غیب از سر اعلام بگفت | حرمتے دادہ الہ یار بفوج اسلام ۱۱۲۹ھ

صفحہ ۵۵ سطر ۱۳۔ اضافہ شیخ روح الامین کسیوقت نواب کمال الدین خاں کے مصاحب و رفیق تھے تین ماہ کے محاصرے کے بعد نواب نے قلعہ سمہر فتح کیا تو شیخ نے فی البدیہہ تاریخ لکھی ؎

چو تاریخش زعقل خویش جستم ۔ بگفت اینک شکست آزپا کفار ۱۰۲۰ھ

صفحہ ۵۸۔ سطر ۱۶۔ حاشیہ۔ رفع اشتباہ کے لئے یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ اسی نام (قاضی محمد یوسف) کے ایک اور مشہور بزرگ بھی بلگرام میں گزرے ہیں۔ جو قاضی بھکاری فرزند قاضی کمال کے بیٹے تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۸۴۴ھ کو وفات پائی سید ضیاء اللہ نے تاریخ لکھی ؎

آہ قاضی یوسفم کو آہ آہ ۔ بادشاداں او برضواں آلہ

درسن ہشتاد وچارم با ہزار ۔ خامس ذیقعدہ رفت آں یارغار

سال فوت آں شریعت دستگاہ ۔ آہ قاضی یوسف آمد آہ آہ ۸۴۴ھ

تاریخ بحساب مکتوبہ آہ قاضی یوسف آہ آہ سے نکلتی ہے۔ ایک (کا عدد) زائد معلوم ہوتا ہے اور لفظ آمد مادہ تاریخ سے باہر۔

صفحہ ۶۰۔ سطر ۸۔ اضافہ حاشیہ پر۔ تردی بیگ، نامور امراء اعیان دولت سے تھا۔ اوائل جلوس اکبر بادشاہ میں حکومت وحراست دہلی پر مامور تھا۔ ہیمو بقال کے معرکہ سے روگرداں ہوجانے یا منہ چھپانے کا اتہام لگا کر بیرم خاں نے بے اطلاع بادشاہ ۹۶۳ھ میں اسکو قتل کرادیا تھا یہی فعل خود بیرم خاں کے زوال ومعزولی کا سبب ہوا۔

صفحہ ۶۷۔ سطر ۱۰۔ ترجمہ آیت کے بعد۔ اُس کا قول ہے العلم افضل النسب اشرف اللقب۔ علم ہی بزرگ ترین نسب اور برترین لقب ہے۔ اس شرف سے بڑھکر کوئی شرف نہیں۔ شرافت خاندانی کوئی چیز نہیں۔

صفحہ ۶۸۔ نوٹ ۶۲۔ سطر ۱۲۔ اضافہ۔ لاڈلی بیگم کا روضہ مسٹر ہیل نے ۱۸۴۹ء میں دیکھا تھا۔ مفتاح التواریخ میں اسکے حسن تعمیر واستحکام کی تعریف کرتے اور ضروری حالات درج کرتے ہیں آگرہ کے دو دولتمند بنیوں کی بدولت یہ رفیع الشان سنگین عمارت

اب صفحہ روزگار سے محو ہو چکی ہے۔ اسکی شاندار باؤلی، بلند چار دیواری، خوشنما گنبد اور عمارات، پر تکلف تہ خانے سب کھد گئے۔ مقبرہ کا دمدمہ نہایت مضبوط تھا اور سے کھد نہ سکا تو سرنگین لگا کر اُس کا اینٹ پتھر سب نکال لیا گیا۔ رہے نام باقی بس اللہ کا

صفحہ ۱۰۷۔ نوٹ ۴۲ کے آخر میں۔ ہندوستان کے اول مسلمان فاتح عماد الدین محمد بن قاسم نے ابو حاکم شیبانی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ قنوج کی مہم پر بھیجا تھا وہ اودے پور تک (جسکو عربی مورخین اُوذافر لکھتے ہیں) پہونچا تھا کہ سپاہیوں کی بے انتہا تکلیف و زحمت، تعب سفر اور تجربہ نے اسکو آگے بڑھنے سے روکا تو وہ اودے پور میں ٹھر گیا اور اپنی طرف سے زید بن عمر کلابی کو سفیر بنا کر خلیفہ ولید بن عبد الملک اموی کے خط کے ساتھ قنوج بھیجدیا۔

مشہور مورخ Mill اپنی تاریخ ہندوستان جلد دوم (صفحہ ۳۵۰ میں) یا لکھتا ہے کہ ’’اودے پور ایک کوہستانی قطعہ مابین اجمیر و مالوہ کے واقع ہے۔ یہاں کا رئیس اگرچہ مسلمانوں کی اطاعت کا اعتراف کرتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اُس نے واقعی طور پر کبھی اطاعت نہیں کی تھی‘‘

تھارنٹن Thornton لکھتا ہے کہ ’’اودے پور کا شاہی خاندان تمام راجپوتوں میں بیحد ممتاز و محترم رہا ہے۔ اس خاندان کو افتخار و دعوی ہے کہ اُس نے دہلی کی شاہنشاہی سے رشتہ و قرابت کرنیکا عار و ننگ گوارا نہیں کیا‘‘

رینل Rennell اپنے تذکرہ سیر و سیاحت میں تحریر کرتا ہے۔ ’’رانا یعنی فرمانروائے اودے پور ہمیشہ راجپوت ریاستوں کا سردار شمار ہوتا رہا ہے ایسے راجہ بھی ہیں جو اُسکی برتری و تفوق کسی اور نہج پر تسلیم نہیں کرتے ہیں مگر قدیم الایام سے ان کا دستور بھی اطاعت و بندگی کا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ثبوت

رانا کے مورثوں کے ہاتھ میں اصلی قوت کے موجود ہونے کا تھا جسکو سب مانتے رہے ہیں غالباً کسیوقت راجپوتانہ میں اسکے تحت میں ایک مُسلّم بادشاہت یا شاہنشاہی قائم تھی۔"

ٹاڈ Tod راوی ہے کہ "حکمراں خاندان اور کُل قبیلہ اہل فارس کی نسل سے ہے۔ پہلے گہلوت کہلاتے تھے جو انکے ایک سردار کا نام تھا۔ پھر سیسودیا کا لقب اختیار کر لیا۔"

صفحہ ۱۰۱ سطر ۴۔ چتور پر نوٹ۔ حاشیہ۔ چتور گڈھ کا مشہور و زبردست قلعہ اودے پور کے شمال و مشرق میں پینسٹھ ۶۵ میل کے فاصلہ پر اور چھاؤنی نصیر آباد سے نوّے میل کے قریب جانب جنوب واقع ہے۔ چھٹویں صدی مسیحی میں اسکو راجہ چترنگ نے تعمیر کیا تھا۔ ترکوں اور مغلوں کے عہد میں یہ قلعہ اکثر جولانگاہ سپاہ بادشاہان رہا ہے یہاں کی خونریزیوں سے اوراق تاریخ ہمیشہ رنگین رہیں گے۔

قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اسکا طول شمالاً جنوباً تین میل کے قریب اور عرض شرقاً غرباً سوا دو میل ہوگا۔ دامن کوہ کی آبادی سے ایک وسیع و ہموار راستہ قلعہ کو جاتا ہے۔ اس راستہ میں تین موڑ پڑتے ہیں۔ اسوجہ سے قدرتاً چڑھائی کے بھی تین حصے ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پھاٹک بھی تین رکھے گئے ہیں۔ پہلا۔ پہاڑ کے دامن میں۔ دوسرا وسط میں۔ تیسرا قلعہ کی بلندی کے قریب۔ ایک چھوٹا سا دروازہ (یا کھڑکی) مشرق کی سمت بھی تھا جو اب بند کر (پاٹ) دیا گیا ہے۔ قلعہ کے آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ دو منارے یا استمبھا ہیں جنکو فرمانروایان وقت نے اپنی فتح کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ پورب طرف کا منارہ اگرچہ نہایت قدیم ہے لیکن جو منارہ قلعہ کے غربی پہلو میں ہے اُس سے زیادہ عظیم الشان البتہ اور خوشنما ہے۔

انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ اسکو پندرہویں صدی مسیحی کے وسط میں یہاں کے راجہ کوبھانے محمود خلجی پر فتح پانے کی یادگار میں تعمیر کیا تھا مگر تاریخی نقطہ نظر سے مجھے اس واقعہ کے اس زمانہ کو صحیح ماننے میں تامل ہے۔ اسکی بلندی اکتالیس گز ہے۔ آٹھ گز کے مربع چبوترے پر یہ قائم ہے۔ حسب دستور اسکے اندر زینے اور دریچے بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کوسوں تک کے خوشنما اور دلکش مناظر نظر آتے ہیں۔ اسکی بیرونی سطح پر سنگ تراشی اور نہایت عمدہ مینت کاری کی گئی ہے۔ بہت سی مورتیں بنی ہوئی ہیں لیکن اب انکے چہرے صاف طور پر نمایاں نہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فتح ہوجانے پر ان بتوں کے چہرے بگاڑ دئے تھے۔

صفحہ ۱۱۵- پانچویں سطر کے بعد اضافہ۔ سلطان احمد شاہ بہمنی سادات کی بڑی تعظیم وتکریم کرتا تھا۔ ملا قاسم فرشتہ لکھتا ہے ؎

ندیدے کس از خویش و از اجنبی   گرامی تر از اہل بیت نبی
بجاں معتقد بود سادات را   ہماں اہل تقویٰ وطاعات را
یقینش قوی بود ودینش درست   بجز داد گر یاری از کس نہ جست

صفحہ ۱۲۲- سطر آخر۔ حضرت شہر بانو۔ ترکی میں یہ نام اب بھی بہت مقبول ہے اور اکثر رکھا جاتا ہے مگر وہاں تلفظ اور املا دونوں "شہر بان" رہ گیا ہے۔

صفحہ ۱۲۳- سطر ۸۔ قاضی سید نور اللہ شوستری پر حاشیہ۔ قاضی صاحب جملہ خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے جامع اور تمام اصناف علوم معقول و منقول کے حامل تھے۔ علم وحلم کے سوا جودت طبع، صفائے ذہن اور زیرکی میں مثیل نہ رکھتے تھے۔ بیل لکھتا ہے کہ انصاف، نیک نفسی، حیا وتقویٰ اور تمام صفات شریفانہ آپکی ذات میں مجتمع تھیں۔ معاصرین کے کمال وکلام کی داد فیاضی سے دیتے۔ فیضی کی بے نقط تفسیر سوا طع الالہام پر نہایت لطیف ونفیس تبصرہ

کیا تھا۔ حکیم ابوالفتح شیرازی کی سعی و سفارش سے اکبر کے دربار میں جگہ پائی اور شیخ معین کے بجائے قاضی مقرر ہو کر لاہور بھیجے گئے۔ اپنے زمانہ میں خائن اور بد دیانت قاضیوں اور مفتیوں کو اچھا سبق دیا تھا۔ رشوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگرچہ مذہباً امامیہ تھے اور نہایت پابند مذہب، لیکن فقہ حنفی پر بھی عبور کامل حاصل تھا۔ مقدمات کا انفصال اُسی کے مطابق کرتے تھے۔ جہانگیر نے لاہور سے تبدیل کر کے اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کر لیا تھا۔

۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مرقد آگرہ میں مشہور اور مرجع اہل عقیدت ہے۔ اسی احاطہ میں اور بہت سی قبریں ہیں جنکے کتابے قابل دید اور عبرت آموز ہیں

صفحہ ۱۳۴۔ سطر ۷، متن کے خاتمہ پر۔ شرفائے بلگرام کو سادات ہوں خواہ شیوخ، متوطن ہوں خواہ مہاجر، میر عبدالجلیل اور میر غلام علی کے خاندان کو بلگرامی الاصل ماننے سے ہمیشہ احتراز رہا ہے۔ وہ انکے طبقہ کو پُھٹَّہ کے لقب سے ملقب بتاتے ہیں۔ انکے خاندان کے مراسم و رسوم اور طرز معاشرت برادران سادات صغراوی سے قطعاً جدا و مختلف رہی ہے۔

انکے نزدیک تمام پُرانی تاریخوں اور روایات اور متقدمین و سابقین کی تحقیقات و تحریرات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سید صغریٰ کے صرف ایک ہی فرزند سید سالار نام تھے۔ جو سید السادات اور دُر یکدانہ جد السادات کہلاتے ہیں تمام سادات صغراوی بلگرامی انہیں کی اولاد ہیں مگر میر عبدالجلیل نے اس قصیدہ (راجح میر غلام علی آزاد نے اپنے تصنیف کردہ نسب نامہ سادات بلگرام موسوم بہ شجرۂ طیبہ) میں سید محمد صغریٰ کا ایک اور فرزند سید عمر قائم کر کے اپنا سلسلہ نسب پیوند کر دیا اور اپنے خاندان کے سادات کو بھی صغراوی بلگرامی قرار دیدیا ہے

بلگرام کی ایک نہایت پرانی تاریخ جامع البرکات نام ہے۔ اسکے مولف شیخ برکت اللہ بن شیخ شاکر فرشوری رقم طراز ہیں "سید محمد واسطی از واسطہ بہ بلگرام تشریف آوردہ سکونت ورزیدند و میر محمد صغری یک پسر داشت بروایت صحیحہ سید سالار ..... واز قوم ٹہنہ سید عمر بعد آں سید حسین، باز سید نصیر، باز سید حسین، باز سید سالار، باز سید لطف اللہ لدہاکلاں، باز خداداد عرف دادن، باز سید محمود ٹہنہ لقب بود۔ ایشاں باز سید پیارے پسر داشت مسمی سید حسین و سید حسن ہمعصر شیخ المشائخ حافظ کمال علمائے دین متولی فرشوری بلگرامی۔ درہمیں عرصہ سادات ٹہنہ در بلگرام آمدہ سکونت ورزیدند سید حسین بن پیارا پسرش لطف اللہ، باز سید کرم اللہ، باز سید لطف اللہ، باز سید نوازش علی شاہ لالہ میاں، باز شاہ رحم میاں۔ دومی سید حسین بن پیارہ کہ بہ بلگرام آمدہ سکونت اختیار نمودند و قیام کردند"

صفحہ ۱۴۸۔ نوٹ ۱۲۷ فضائل خاں کا آخر۔ آزاد نے فضائل خاں کا اصلی نام نہیں لکھا۔ تحقیق مزید سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ سلیمان نہ ہوں بلکہ میر ہادی سے مراد ہو۔ میر ہادی نے بھی بارگاہ عالمگیری سے فضائل خاں خطاب پایا تھا۔ انکے والد عمدۃ میر حاجی، وزیر خاں، شاہزادہ محمد اعظم کے دیوان تھے۔ میر ہادی ملا شیخ عبدالعزیز اکبرآبادی کے ممتاز شاگرد تھے اور علم و فضل میں یگانۂ زمانہ۔ عربی فارسی کے سوا ہندی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ دربار سلطانی میں مختلف مناصب جلیلہ پر مثل میر منشی داروغہ کتب خانہ سرکاری و خانساما نی پر مامور رہے تھے۔ بڑے علم دوست تھے۔ آپکا دل و دماغ علوم اور کتابوں کا خزانہ تھا اور زبان مشاہیر کی ترجمان۔

۲۔ ذیقعدہ ۱۱۱۴ھ کو رحلت فرمائی مدفن آگرہ تھا۔ مگر اب مزار ہے نہ نشان مزار باقی ہے۔ ایک بے مثل و نادر کتاب خانہ یادگار چھوڑا تھا۔ اپنے استاذ معظم کے خدمت میں دم آخر تک موجود و کمربستہ رہے۔ ملا عبدالعزیز جسوقت بستر مرگ پر تھے اسوقت بھی تالیف و تصنیف

میں مشغول تھے۔ وہ جو کچھ ارشاد فرماتے اُسکو میر ہادی (فضائل خاں) اور محمد سعید اعجاز قلمبند کرتے جاتے تھے۔

صفحہ ۱۵۷۔ نوٹ ۱۳۳۔ آخر میں اضافہ۔ اپنی دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے یہ عنوان زیادہ تفصیل و تحریر کا مستحق تھا۔

ہندوستانی موسیقی میں بہت سے راگ راگنیاں تال اور ٹھاٹ ہیں سنگیت گورو انکو کہتے ہیں۔ ہر صنف موسیقی کے ماہرین اُسی خاص صفت سے منسوب مشہور ہوتے ہیں مثلاً جو بین (وین) میں یدطولےٰ رکھتے ہیں بین کار اور رباب بائی کہلاتے ہیں۔

تانسین یا میاں تانسین کو اکبر نے ۱۵۶۲ء میں مرزا کا خطاب دیا تھا۔ وہ رباب بجانے کے فن کا بادشاہ تھا اسکے کمال کے متقدمین و متاخرین سب معترف ہیں۔ اس کا گورو ہریداس سوامی تھا جو بندرابن میں جمنا کنارے رہا کرتا تھا۔ میں نے جو نام اوپر لئے ہیں ان میں سے ہر ایک فرد اپنے کمال فن میں فرد تھا۔ بیجو باورے کے گانے سے جنگل کے وحش و بہائم مسحور و متاثر ہوکر دوڑے چلے آتے تھے۔ گوپال نایک جب الاپتا اور دیپک راگ گاتا تھا تو چراغ خودبخود روشن ہو جاتے تھے اہل فرنگ کہتے ہیں کہ آرفیوز یونانی Orpheus جب اپنا بربط بجاتا تھا تو ہیبت ناک و خونخوار درندوں کے دل پر چوٹ لگائے بغیر نہ رہتا تھا۔ وہ بھی وجد و کیف میں آجاتے تھے۔ آرفیوز یورپ کا بہترین مغنی تھا جس پر مغرب کی دنیائے موسیقی کو بڑا ناز ہے مگر مشرق کا وہ یکتائے فن جسکی ہنرمندی و کمال کا اعتراف یورپ کو بھی کرنا پڑا ہے تانسین تھا مسٹر پوپلے نے "موسیقی ہند" میں Music of India—H. A. Popley. اسکے متعلق بہت سی حکایات اور عجیب و غریب واقعات نقل کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ

اکبر نے تان سین سے رات کا راگ گانے کی فرمایش کی۔ دوپہر کا وقت تھا چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی۔ تعمیل حکم بغیر چارہ نہ تھا۔ تانسین نے گانا شروع کیا تو وہ جس مقام پر کھڑا تھا وہاں رفتہ رفتہ تاریکی وسیاہی دوڑ آئی اندھیرا چھا گیا۔ اُسکی آواز جہانتک پہونچ رہی تھی تیرگی وظلمت طاری تھی۔ خود اکبر کی آنکھوں کے سامنے اندھیری رات کا سماں چھایا ہوا تھا۔

صفحہ ۱۶۴۔ نوٹ ۱۳۶۔ اضافہ۔ آخر میں مفتی صاحب دو کتابوں کا حوالہ اور دیتے ہیں (۱) حاشیہ قاموس موسوم بہ القول المانوس۔ شیخ عبدالباسط بن خلیل حنفی سبط سراج الدین بلقینی نے لکھا تھا۔ شیخ صاحب کا سال وفات ۹۲۰ھ ہے (۲) کسی اور فاضل نے بھی حاشیہ سعدی اور بلقینی کو یکجا کیا اور اُسکا نام القول المانوس شرح مغلق القاموس رکھا تھا۔

صفحہ ۱۶۰۔ سطر اول۔ حاشیہ متعلق نوشہرہ ــــ اقصائے مشرق ہند میں بیٹھ کر اس مقام کی تحقیق میرے لئے دشوار ہے تاہم دو مواضع کا تذکرہ لابد ہے۔

ایڈورڈ تھارنٹن اپنے گزٹیر کی جلد دوم مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں لکھتا ہے۔ نوشہرہ۔ یا نوشہر سرائے۔ ایک نہایت وسیع کارواں سرائے اُس راستہ پر ہے جو لاہور سے کشمیر کو پیرپنجل کے درہ ہوکر جاتا ہے۔ خشت پختہ سے تعمیر ہے مگر پہاڑیوں میں سامنے کی طرف پتھر لگا ہوا ہے۔ ابتداءً ایسی مستحکم و محفوظ تھی کہ قلعہ اور کارواں سرائے دونوں کا کام دیتی تھی۔ لیکن اب شکستہ حال ہے۔ یہ دریائے ٹوہی یا ٹھوئی پر واقع ہے جو پینتیس یا چالیس میل جنوب و مشرق کو چل کر چناب میں گرتا ہے۔ پھاٹک کے ایک کتبہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسکی تعمیر مغل شاہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئی تھی۔ نوشہر سرائے کا عرض البلد ۳۳ درجہ ۹ دقیقہ اور طول البلد ۷۴ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے۔

ایلف وان ہیوگل F. Von Hugel نے اپنے سیاحت نامہ کشمیر میں اور

مورکرافٹ Moorcroft نے سفرنامہ پنجاب و بخارا میں اسکا ذکر کیا ہے۔
تھارنٹن ایک دوسرے نوشہرہ کا نام بھی لیتا ہے۔ یہ سندھ میں ایک قصبہ زیر حکومت میر علی مراد کے تھا سکھر سے جنوب و مغرب میں چہتر میل پر اور شکارپور سے اٹھاسی میل پر جنوب و غرب میں۔ عرض البلد ۲۶ درجہ ۱۵ دقیقہ اور طول البلد ۶۸ درجہ ۵ دقیقہ
صفحہ ۱۷۱ نوٹ ۱۴۲۔ خاتمہ۔ مشاہیر کاملین میں چند حضرات اور مستحق تذکرہ ہیں جنکی بدولت اس شریف فن نے خاک ہند کو کیمیا بنا دیا تھا۔
میر[۱] عبدالحیٔ مشہدی اکبرآبادی۔ کمالات شاعرانہ میں یگانہ تھے اور حلیہ علم و عمل سے آراستہ و پیراستہ۔ اکثر فنون میں دستگاہ تام حاصل تھی۔ ہمایوں کے عہد ہمایوں میں منصب صدارت پر ممتاز ہوئے خط بابری مخترعہ بابر بادشاہ کو خوب جانتے اور خوب لکھتے تھے۔
محمد[۲] یوسف۔ قلمرو خوش نویسی کا بادشاہ تھا۔ کابل میں پیدا ہوا۔ تربیت و نشوونما ہندوستان جنت نشان میں پائی حسن خط کے سوا شعرگوئی میں دخل کامل اور سخن فہمی کا ذوق سلیم رکھتا تھا۔ اکبر بادشاہ کا منشی خاص تھا۔ ۹۷۰ھ میں ریعان جوانی میں وفات پائی۔
خواجہ[۳] ابراہیم حسین۔ بزرگ زادگان قصبہ بلونی سے تھا۔ خط نستعلیق نہایت عمدہ لکھتا۔ اسکے کمال خوشنویسی نے کمال شہرت پائی تھی۔ دربار اکبری کے منشیان خاص سے تھا۔ عین شباب میں صفر ۱۰۰۱ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔
میر[۴] عبداللہ تبریزی، شاہ نعمت اللہ دلی کی اولاد سے تھے۔ دینوی علوم شاہ غیاث اور مولانا راقمی سے حاصل کئے تھے۔ طریقت میں شیخ فیض اللہ حسینی سہارنپوری کے عقیدتمند و دست گرفتہ تھے۔ ہفت قلم لکھنے میں استاد تھے بالخصوص نستعلیق میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ دربار جہانگیری سے مشکین قلم خطاب پایا تھا۔ ایک موقع پر افتخاراً

فرماتے ہیں ؎

وصفیؔ تخلص من و مشکیں قلم خطاب
این نامہا ز شاہِ شہنشاہ یافتم

مختلف مقامات میں اکثر کتبے آپکی سحر طرازی و جادو نگاری کی یادگار اب بھی نظر آتے ہیں۔ سخنور و سخن فہم تھے۔ کلام نہایت دلکش و شیریں ہوتا تھا پانچ مثنویاں اور ایک دیوان اولادِ معنوی یادگار اور میر محمد صالح کشفی اور میر مومن دو نامور رشید فرزند چھوڑے تھے۔

۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں رحلت فرمائی۔ مزار آگرہ میں ہے۔ محمد صالح چشتی موصوف نے اسپر عالیشان گنبد بنوایا تھا متعدد قطعات تاریخ بخط نستعلیق کندہ ہیں۔

میر صالح مرد صالح اور الولد سر لابیہ کے پورے مصداق تھے۔ زہد و اتقا و تقدس میں بے نظیر تھے زیور علم و فضل سے متحلی۔ مذاق سخن آبائی تھا۔ فن خطاطی بھی پدر نامور سے سیکھا تھا۔ مشکیں قلم موروثی خطاب سے مفتخر تھے۔ شاہجہاں کے اصرار سے ملازمت سرکاری منظور کر لی تھی۔

آپکی تصانیف میں (۱) مناقب مرتضوی اور (۲) مجموعہ راز شہرت کافی رکھتے ہیں ۱۲۔ شعبان ۱۰۶۱ھ کو (۱۶۵۰ء میں) انتقال کیا۔ اپنے والد ماجد کے مقبرہ کے پہلو میں استراحت گزیں ہیں۔

صفحہ ۱۷۱۔ نوٹ ۱۴۳۔ فیروز نے قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا ؎

اے دریغا کہ مشفق و مکرم
عارف وقت خضر بحر نوال

آں محقق مدقق دوراں
آں مفتح در سرائے جلال

سال ہشتاد و چار در دینا
کرد تلقیں دہیں مبارک فال

چوں ندا در رسید از عالم غیب
گشت پنہاں بسان آب زلال

اسم و تاریخش از خرد جستم
گفت ہاتف بدانکہ شیخ کمال

باش آزاد از غمش فیروز   صبر بہتر ازیں ملال مثال ۷۸۶۳ھ

صفحہ ۲۰۶- نوٹ ۸۳- امام ابوحنیفہ- سطر ۵- کم وبیش انہیں حالات کو صاحب عجائب القصص نے بھی نقل کیا ہے اور وہ حوالہ محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا دیتا ہے حضرت محمد سے مراد امام محمد باقرؓ کا نام نامی ہے۔

صفحہ ۲۵۱- سطر ۱۷- ملانواں- اضافہ- درگاہ اب کسیقدر شکستہ حالت میں ہے اکبر کے عہد میں کنکر کے چوکوں سے تعمیر ہوئی تھی حسب معمول انگریزوں کا خیال ہے کہ یہ کنکر غالباً کسی قدیم عمارت سے لئے گئے ہونگے خواہ وہ ہندوؤں کی رہی ہو خواہ جینیوں خواہ بودھوں کی چونکہ یہ مقام قنوج کے قریب ہے اسلئے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ ملانوہ بھی بودھوں کے تابع رہا ہوگا جبکہ قنوج بدھ مذہب کا گھوارہ تھا۔

حصہ دوم

صفحہ ۲- سطر ۷- ہویدا است کے بعد اضافہ- شیخ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم (صفحہ ۵۱) میں آزاد پر اعتراض یا ان الفاظ میں طعن کرتے ہیں "....... در عہد سلطنت التمش سید محمد صغریٰ کہ جد سادات واسطی ساکنان محلہ سید واڑہ است وسلسلہ نسب خود را باو رسانیدہ .."

صفحہ ۵ اسطر ۶- حاشیہ پر اضافہ- قلعہ بسنت گڈھ ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۱۱۱ھ کو اولیائے دولت عالمگیری کے تصرف میں آیا تھا۔

صفحہ ۱۵ اسطر ۱۲- حاشیہ- اضافہ- برولی کا قلعہ بھی دکن میں ہے۔ ۳- محرم ۱۱۱۲ھ کو فتح ہوا تھا ھذا نصر اللہ ۱۱۱۲ تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۲۲ سطر ۱۲- حاشیہ ادونی اضافہ- ادونی کا قلعہ شہر بیجانگر سے پچاس کوس اور شہر احمد آباد بدر سے ایکسو ستر کوس پر ہے مورخ فرشتہ اسکو قلاع دکن میں عدیم المثال بتاتا ہے سلطان مجاہد شاہ بہمنی نے اُسکے محاصرہ کے لئے صفدر خاں سیستانی کو امیر الامرا بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کی معیت میں ۷۷۶ھ میں بھیجا تھا۔ عالمگیر نے گولکنڈہ فتح کرنیکے بعد ۱۰۹۸ھ میں اس قلعہ کو

فتح کیا اور امتیاز گڈھ نام رکھا تھا "فتح اودنی نمودہ بادشہِ دیں پناہ" تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۳۹ سطر ۱۹۔ حاشیہ۔ مولانا قاسم خطاب، سید نجم الدین محمد، نام کاہی تخلص تھا۔ عام طور پر میاں کالے کہلاتے تھے۔ مولد کابل تھا۔ فرماتے ہیں ؎

کاہی تو بلبل چمن آرا ے کابلی　　　زاغ و زغن نہٗ کہ بہ ہندوستان شوی

تفسیر، تصوف، ہیئت، تاریخ اور موسیقی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ فن موسیقی میں بہت سی کتابیں یادگار ہیں۔ اکثر مشاہیر اساتذہ کی خدمت کی تھی۔ صغر سن میں حضرت جامی کا شرف زیارت بھی حاصل کیا تھا۔ شاعری میں ایسی شہرت پائی کہ انکے اور کمال چھپ گئے۔ بڑے سیر چشم و غنی مزاج تھے۔ مرزا عسکری والی بدخشاں نے اپنا تمام خزانہ (جو زر خطیر تھا) صلہ سخن میں عطا کیا۔ آپ نے دفعتاً سارا مال تقسیم و خیرات کر دیا۔ بھکر کی راہ سے ہندوستان آئے دربار اکبری میں رسائی ہوئی۔ ایک غزل (لازم فیل) کے صلہ میں بادشاہ نے ایک لاکھ تنکہ مرحمت فرمایا۔ اسکو بھی ایک ہفتہ میں بانٹ کر بیٹھ رہے۔ شاعرانہ نازک مزاجی بھی رکھتے تھے۔ بادشاہ قدرشناس کا حکم تھا کہ دربار میں جب کبھی کاہی حاضر ہو تو اسکو ایکہزار ریو بصیغہ پامزد ملا کرے۔ طبع نازک پر گراں گزرا اور آپ برداشتہ خاطر ہو کر بہادر خاں (برادر خانخاناں) کے پاس بنارس چلے گئے۔ کچھ مدت بعد وہاں سے آگرہ آئے اور پانوں توڑ کر ایسے بیٹھے کہ اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ ایکسو دس سال کی عمر میں ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔ ایک شاگرد مولانا قاسم بخاری نے "رفت ملا قاسم کاہی" مولانا عارفی نے "زجہان رفت قاسم کاہی" میر یوسف استرآبادی نے "خوش طبع (۹۸۷) لکھی عدد یک، تاریخ کہی ملک الشعرا فیضی نے تاریخ نکالی۔

تاریخ وفات سال دماہش جستم　　　گفتا دو یم از ماہ ربیع الثانی

مقبرہ آگرہ میں مدار دروازہ کے قریب تھا۔ اب نشان بھی باقی نہیں۔

دیوان ضخیم چھوڑا تھا۔ بوستان سعدی کے جواب میں "گل افشاں" مثنوی لکھی تھی۔

پہلا شعر یہ تھا ؎

جہاں آفریدہ بجاں آفریں　　بجاں آفریں صد جہاں آفریں

اللہ عزاسمہ کے نام کا یہ معما لکھا تھا ؎

نیست از ہستیش کسے آگہ　　ابداً کان لا نہایۃ لہ

اسم نبی کا معمیٰ اوپر مذکور ہو چکا ہے ؎

تارہ شرع راشتافتہ ام　　از محمد نبی شگفتہ ام

میر آزاد نے بُرہ شرع لکھا ہے۔

ملا کاہی کے معاصر ایک اور معمیٰ گو شاعر مولانا شہاب الدین معمائی گزرے ہیں۔ بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ جملہ علوم عقلی و نقلی میں فرد کامل تھے فن معما میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ یہ کمال آپکے تمام کمالات پر غالب آگیا تھا۔ اس فن میں ایک نادر رسالہ لکھ کر ہمایوں کو پیشکش کیا تھا۔ سخن فہم سلطان نے صلہ جزیل کے علاوہ یہ رباعی آپکی شان میں لکھ کر بھیجی تھی ؎

نامت ز عجم رفتہ بملک عرب است　　وز نامۂ تو در دل محزوں طرب است

ہر کس بدر آرد ز معما نامے　　نام از تو بر آوردہ معما عجب است

سنہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں رحلت فرمائی۔ شہاب الثاقب تاریخ ہے۔ مدفن آگرہ متصل مسجد ہمایوں (کچھپورہ) امیر خسرو دہلوی کے مرقد پر آپ نے ایک لوح تاریخ کندہ کرا کے نصب کرادی تھی۔

صفحہ ۶۳۔ سطر ۹۔ شادی دختر پر حاشیہ۔ تاریخ فیض بخش میں بھی لکھا ہے۔ شرائط صلح میں یہ طے ہوا تھا کہ شادی کے تمام انتظامات کا انصرام خود راجہ کرائے، اور بادشاہ کے لئے ایک لڑکی بھیجے جو عمر کے لحاظ سے محل سرائے سلطانی میں داخل ہونیکے قابل ہو چکی ہو۔

صفحہ ۱۰۷۔ سطر ۶۔ شیلان پر حاشیہ۔ شیلان، دسترخوان یا خوان طعام، سفرہ۔ مجازاً محفل

طعام کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۰۱۔ سطر اول - پدماوت پر نوٹ - اس وفا شعار بہادر راجپوت رانی کا واقعہ حصہ اول میں صفحہ ۱۰۶ پر نوٹ نمبر ۸۲ میں مختصراً حوالہ قلم کر چکا ہوں۔ پدماوت کا سب سے پہلا مصنف ایک نامور مسلمان شاعر ملک محمد جائسی تھا۔ یہ قصبہ جایس ملک اودھ میں ۹۱۷ھ ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ پوربی ہندی میں یہ ایک عمدہ اپک گوری ہے یورپ میں بھی اسکی کم و بیش قدر ہوئی ہے۔ فرانس کے ایک شہرۂ آفاق موسیقی نواز البرٹ رسل Albert Roussel نے بھی پدماوت کا ڈراما مرتب و تصنیف کیا تھا جو پانشر روش M. Rouche مشہور آپرا ڈائرکٹر کے زیر اہتمام دکھایا گیا تھا بعض ہندو اہل نظر حضرات کا قول ہے کہ اس ڈراما اور اپنے مصنفہ قصہ میں مصنف نے بعض مقامات پر تاریخ کی متعارف شاہراہ سے لغزش کی ہے تاہم اُس نے پدماوت کی وفاداری و بہادری اور نسوانی خوبیوں کو بہ آئین بہیں نمودار کیا ہے۔

صفحہ ۱۰۲۔ نوٹ نمبر ۸۸ کے آخر میں۔ ملا احمد تتوی جو ملا قاسم فرشتہ کا استاد تھا ٹھٹہ کا رہنے والا تھا تاریخ الفی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا عبد الرشید حسینی مدنی بھی اسی شہر ٹھٹہ کے باشندے تھے منتخب اللغات شاہجہانی آپکی تالیف ہے شاہجہاں آپکی بڑی قدر و احترام کرتا تھا۔

صفحہ ۱۲۳۔ متن آخر میں اضافہ۔ پنڈت تربھون ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر۔ اودھ پنچ کے ایک طباع وحدت پسند مضمون نگار تھے کسی موقع پر ایک خط میں بے فصل کی بارش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

"...... ہاں آپ نے کچھ اور بھی سنا۔ فرخ سیر کے وقت میں ع
باران بارید ریزۂ قند و نبات

واللہ۔ اچھا چاشنی دار ابر تھا۔ مگر افسوس لکھنؤ میں ایسی بارش نہ ہوئی کہ ہر ایک

چھینٹے کے بعد ذرا منہ میٹھا ہوتا۔"
صفحہ ۱۳۱۔ سطر سوم کے بعد متن میں اضافہ۔ مولانا محمد فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں تحریر کرتے ہیں کہ قطب الملک سنی مذہب تھے۔
پانچ ہزار سالانہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی فاتحہ گیارھویں پر خرچ کرتے تھے۔ حالت اسر و حبس میں جب خبر پاتے کہ آج گیارھویں ہے تو کسی نہ کسی امیر یا درباری کو لکھ بھیجتے۔ وہ اس کار خیر کے لئے روپیہ سید کے پاس ضرور بھیجدیا کرتا تھا۔ اپنی اسیری کے چار سال پورے کر کے اُسی تاریخ پر قید ظاہری سے مخلصی پائی تھی۔
صفحہ ۱۳۷۔ سطر ۷۔ حاشیہ مرزا ایزد بخش رسا۔ یہ مرزا جعفر آصف خاں وزیر جہانگیر کے پوتے تھے۔ جملہ علوم و فنون میں کامل اور فصاحت و بلاغت و انشا پردازی میں یگانہ عصر تھے۔ عہد عالمگیری میں میر منشی رہے تھے۔ مدفن آگرہ حویلی ایزد بخش میں تھا جو اب محلہ سیلن گنج میں رابٹ صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ تعویذ قبر ۱۸۴۹ء تک سلامت تھا جب اسکو مسٹر بیل نے دیکھا تھا۔
صفحہ ۱۵۳۔ نوٹ نمبر ۱۸۔ سطر ۱۸۔ اضافہ۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ صفر آغا نامی غلام سلطان محمود گجراتی نے جسکا خطاب خداوند خاں تھا سورت میں یہ قلعہ نہایت مستحکم و استوار ۹۴۷ھ میں دریائے عماں کے کنارے فرنگیوں کے فتنہ و فساد کے دفع کرنے کے لئے بنایا تھا۔ تعمیر سے پہلے نیز دوران تعمیر میں ان لوگوں نے بڑا شر و فساد برپا کیا تھا۔ تمام رعایا خصوصاً مسلمانوں کو بہت ستاتے اور تنگ کرتے تھے
صفحہ ۱۷۹۔ متن۔ آخر میں اضافہ۔
مولانا[۱۴] مفتی سید محمد ولی اللہ حسینی نے اپنی تاریخ فرخ آباد میں میر عبدالجلیل کو بڑی عظمت و ادب کیساتھ یاد کیا ہے۔ چند باتیں قابل نقل ہیں۔

(۱) حکیم جعفر جونپوری در شاہجہان آباد بود۔ انتساب دارد بحکیم مصری کہ سرآمد اطبائے عہد بادشاہ اکبر بودہ۔ (نوٹ ۲۰۔ صفحہ ۲۰۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم۔ متعلق حکیم جعفر)

(۲) نواب صمصام الدولہ خاندوران خاں کی مجلس میں معمّوں کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ قرآن شریف میں رطب و یابس ہر چیز موجود ہے مگر معما کہاں ہے؟ ایک حاضر طبع درباری نے عرض کیا کہ اُس (کلام پاک) کا اول بائے (ب) اور آخر سین (س) ہے۔ دونوں کا مجموعہ "بس" ہوا یعنی یہ کتاب تکمو بس ہے۔ اور اس معمے کے استخراج کو امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالبؓ سے منسوب کیا۔ اعتراض پیش ہوا کہ "بس" تو فارسی لفظ ہے آنجناب سے اس کا استخراج کیا معنی رکھتا ہے؟ حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنی استعداد و فہم کے موافق جواب دئے۔ نواب کو انکے ماننے میں تامل تھا۔ حتےٰ کہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے "بس" کا عربی ہونا ثابت کر دیا اور شہادت میں قاموس کا حوالہ دیا اور عبارت پڑھ دی۔ نواب مستطاب نے نہایت پسند فرمایا چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں ؎

اول و آخر کلام اللہ — باؤ سین آمدہ دو حرف شگرف
یعنی اے اہل دیں برائے شما — بس بود ایں کتاب بے حرف

(صفحہ ۴۰۔ سطر ۱۱۔ آخر۔ حصہ دوم تذکرہ ہذا)

(۳) جب ۱۱۳۵ھ میں اودہم بائی کے بطن سے احمد شاہ فرزند محمد شاہ پیدا ہوا تو میر عبدالجلیل بلگرامی نے تاریخ لکھی ؎

خسرو جم نشاں محمد شاہ — رتبہ افزائے تخت و تاج و نگیں
حق تعالےٰ باو کرامت کرد — بادشہ زادہ شگفتہ جبیں
بہر تاریخ مصرعے گفتم — "شہریار ملوک روئے زمیں" ۱۱۳۵ھ

(صفحہ ۴۹۔ بعد سطر ۱۶۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم)

سطر ۸ صفحہ ۳ حصہ اول (نعت شریف کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرع) میں "قدسی انسان سرشت" کی بجائے "خاکی قدسی سرشت" بنا لیجیے۔

HAYĀT-I-JALĪL

OR

The Life, Teachings and Works of

'ALLĀMA MĪR 'ABD-UL-JALĪL BILGRAMĪ

CONTAINING ALSO THE BIOGRAPHICAL SKETCHES OF

NAWĀB ĀSAF JĀH I of the Deccan, SAIYIDS HASAN 'ALĪ KHĀN and HUSAIN 'ALĪ KHĀN of Bāraha, MĪR SAIYID MUHAMMAD, SHĀ'IR and MĪR GHULĀM 'ALĪ ĀZĀD, BILGRĀMĪ

WITH COPIOUS NOTES ON

Several useful subjects and interesting matters and on numerous new and ancient towns in India and detailed accounts of many men of learning and power.

BY

MAULAVĪ SAIYID MAQBŪL AHMAD SAMDANĪ,

Late Member of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, Fellow of the Royal Society for the encouragement of Arts, Manufactures & Commerce, London, etc., etc.

RAM NARAIN LAL,

Publisher and Bookseller.

ALLAHABAD,

1929